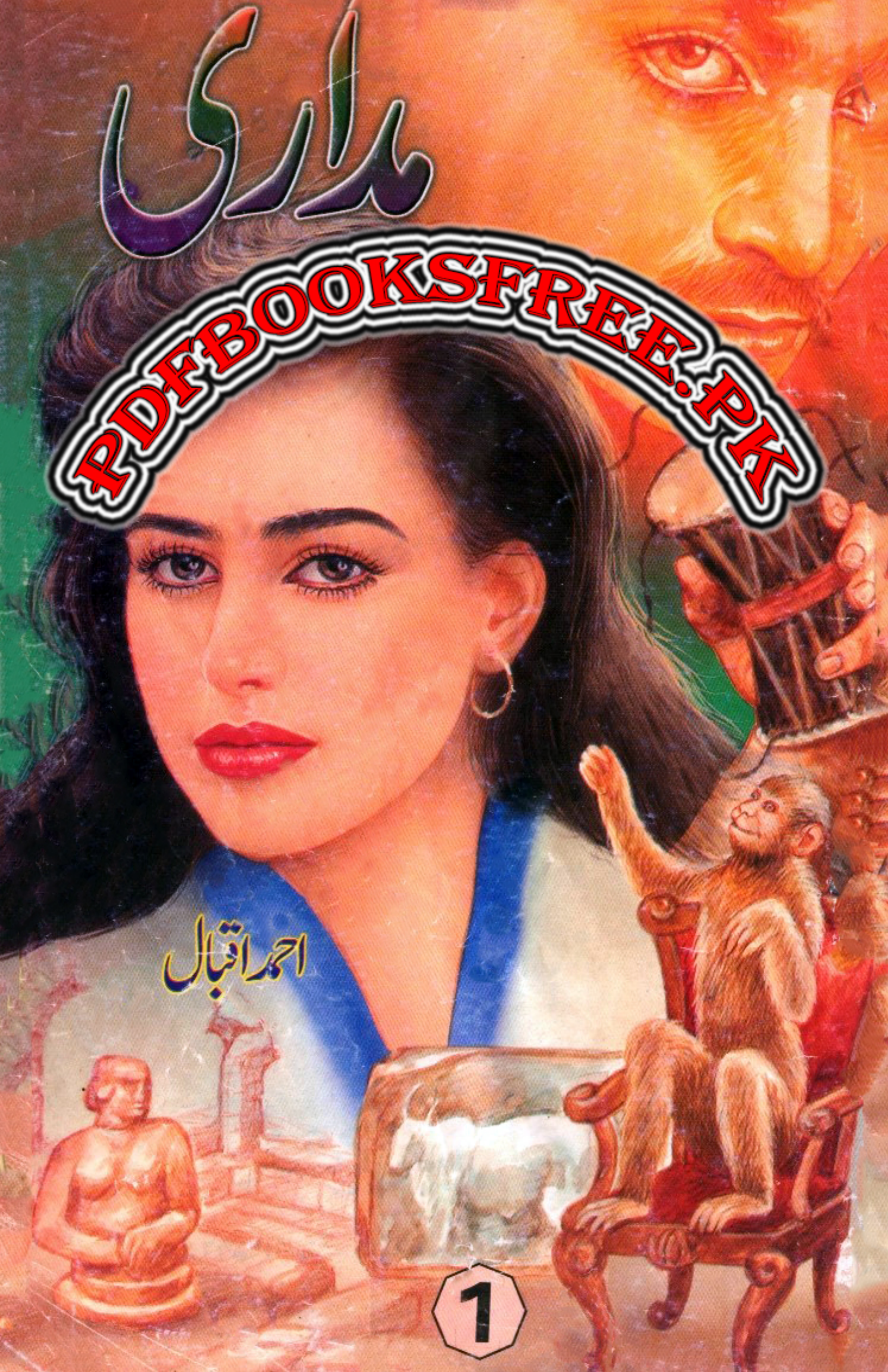
مداری
PDFBOOKSFREE.PK
احمد اقبال
1

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

حصہ 3

احمد اقبال

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۲۰۰۲ء
مطبع ——— یو اینڈ ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ISBN 969-517-082-0

اِسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراجِ تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردِ عمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچے جمورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

جب کمال آیا تو میں نہ نہانے کے باوجود سو گیا تھا چنانچہ اسے میرے منہ پر پانی کا لوٹا انڈیلنے کا اچھا موقع ملا۔

"مجھے تو ابھی رات کو جگا کے خود سو رہا تھا۔"

میں نے تولیے سے منہ صاف کیا "اچھا کیا تو نے منہ دھلا دیا۔ چل کچن میں اجلاس کرتے ہیں، قمر کہہ رہی تھی تو کافی اچھی بناتا ہے۔"

"میرا جذباتی استحصال مت کر۔ قمر ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات پندرہ نے مجھ سے تیرے بارے میں کہی تھی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہ کہہ سکتی ہے ہر فضول بات مجھ سے منسوب کر کے جو میری منسوبہ ہونے کا منسوبہ اتنا ہی ناقابلِ عمل سمجھتی ہے جتنا کالا باغ ڈیم کا منسوبہ۔"

"جلدی مت کر یار۔ جیسے ہی کالا باغ ڈیم بن کے تیار ہو گا وہ بھی مان جائے گی۔ تجھے بھی انسان کا بچہ بننے میں اتنا وقت تو لگے گا۔ خیر حاضر ہے یہ چیک۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

میں نے چیک کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پکڑ کے کہا "فاروقی صاحب یہ ہے انسان کی زندگی کی قیمت۔ اگر آج قضائے الٰہی سے یا برضا و رغبت آپ فوت ہو جائیں تو صرف دس لاکھ میں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ آپ زندہ ہیں۔ مرنے والا کوئی اور تھا۔"

کمال نے باہر دیکھا "یہ جو لوہڑی کی شکل والا میار صورت شخص کرنل خان سے شطرنج کھیل رہا ہے۔ اس نے دس لاکھ لے۔"

"ہاں۔ اس نے سرٹیفکیٹ دے دیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا، میں ہوں۔ اب اس کی لاڈلی بیٹی اپنی پسند کی وہ لینڈ کروزر خریدے گی جو ایسے ہی کسی چیک کے انتظار میں شوروم میں کھڑی ہے۔ اسے بھیجیر و پسند نہیں تھی یار، اس کا اسٹینڈرڈ اونچا ہے۔"

"اب شاہ عالم کیا کرے گا؟"

"میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حصول سے مزار کی منتقلی اور رخشی سے ملاقات تک داستان کا ہر موڑ اس کے لیے دلچسپی اور حیرت کا باعث بنا۔ حسبِ عادت وہ کہتا رہا "اے نہیں یار..... حد ہو گئی یار" میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ صبح میرا کیا پروگرام ہو گا۔

"مجھے افسوس ہے یار، میں ان معاملات میں تیری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "مسٹر قاصر۔ آپ نے اپنے معاملات میں اپنی مدد کے لیے کیا کیا ہے اب تک۔ مجھے ملنے والی اطلاعات بڑی خوش آئند ہیں۔"

اس کا منہ لٹک گیا "وہ پرانی اطلاعات ہوں گی۔ نئی صورتِ حال افسوس ناک اور مایوس کن ہے۔"

"کیوں۔ چندا کی طرح قمر بھی نہیں مان رہی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔ پہلے مان گئی تھی' سب طے ہو گیا تھا۔"

"پھر کیا اس نے بھی شرط لگا دی کہ پہلے انسان کے بچے بنو' اگر کسی بات ہے۔۔۔"

اس نے کہا "نہیں یار۔ اس سے زیادہ فضول بات ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اماں شریک ہو گی تو شادی ہو گی۔"

"کیا۔۔۔ اماں کیسے شریک ہو گی؟" میں نے غصے سے کہا "وہ تو سے میرے حوالے کر کے نکل گئی تھی اپنے شوہر کے قاتلوں سے نتقام لینے۔ اور آخری اطلاع یہ تھی کہ اس نے انتقام لینے سے لے کسی سے عقد ثانی فرما لیا۔ وہ بیٹھی ہو گی مزے سے اپنے نئے ولھا کے گھر میں۔ اسے پروا ہوتی قمر کی تو اسے چھوڑ کے کیوں آتی؟"

"قمر بھی تو پٹھان کی بیٹی ہے۔ کہتی ہے کہ اماں نے کہا تھا کہ وہ نتقام لینے کے بعد لوٹ کر ضرور آئے گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ قمر کے اسمگلر باپ کو قتل کرنے والے کیا یسے گئے گزرے لوگ ہوں گے کہ ایک عورت سب کو ٹھکانے ادے۔ وہ ایک نہیں چار تھے۔ کہیں وہ قمر کی ماں کا اور اس کے نئے شوہر کا کام تمام نہ کر دیں۔ یہ بے وقوف لڑکی کیا ساری عمر آس ائے بیٹھی رہے گی۔"

"یار خفا مت ہو۔ جذبات کا معاملہ ہے یہ۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ یہ میرے لیے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ قمر کی ماں تو حرام کی کمائی سے بھری ہوئی نوٹوں کی ایک بوری کے ساتھ قمر کو اس وقت چھوڑ گئی تھی جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ اس کی چالاکی دیکھو' قرآن میں خط چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اٹھا کے پڑھا تو سب سے پہلے لکھا تھا کہ تمہیں اس مقدس کتاب کی قسم جو اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بتا یار' کد' کیا کرتا' نہ میرے ماں باپ نہ بھائی بہن۔ کتنی مشکل سے قمر کو پالا تھا میں نے۔ نوٹ کام نہیں آئے تھے۔ وہ بوری جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھی میرے لیے کاغذ کے پُرزے تھے۔ آج وہ کہتی ہے۔۔۔"

"یار' غصے پر قابو رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل وہ تجھے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے تیرے کہنے کے مطابق ہر بات ان لی لیکن بعد میں اسے ماں کا خیال آیا اور اسی رات خواب میں سے اماں دکھائی دی۔ اس نے کہا کہ میں تجھے رخصت کرنے ضرور آؤں گی۔"

میرا پارا مزید چڑھ گیا "ایسی آنے والی ہوتی تو جاتی کیوں۔ خود شادی کر لی دوسری بار۔۔۔"

"قمر کا کہنا ہے کہ وہ اکیلی تھی۔ عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"خوب سہارا دیا اس نے۔ کتنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا؟ چار افراد تھے جن کو قمر کی ماں قاتل سمجھتی تھی۔ ان میں سے ایک بھی مارا گیا؟ میرا اس کا کون سا رشتہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو میرے سپرد کر کے نکل گئی تھی۔"

"اسے اعتماد تھا تجھ پر۔ وہ تجھے قمر کا بھائی سمجھتی تھی اور تُو نے حقیقی بھائی سے زیادہ ذمے داری نبھائی۔"

"پھر اب قمر اس بھائی کی بات کیوں نہیں مان سکتی۔ اماں نے خواب میں آ کے ایک جذباتی ڈائیلاگ بولا اور قمر کا دماغ خراب ہو گیا۔ اتنے سالوں سے جس عورت کی خبر نہیں 'وہ کیسے آئے گی قمر کی رخصتی کے وقت؟ بس قمر بے وقوف اس وقت کے انتظار میں بوڑھی ہو جائے گی۔"

"اس سے آرام سے بات کرنا۔ ایسی کون سی جلدی ہے؟"

"مجھے جلدی ہے۔ میں جس زندگی کے راستے پر جا رہا ہوں' اس پر جانے سے پہلے اپنی ذمے داری کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے قمر کو یا تجھے کوئی نقصان ہو۔ میرے دشمن تمہارے دشمن نہ ہوں۔ آدمی کمزور پڑتا ہے رشتوں کی وجہ سے۔ میں تم سے کوئی رشتہ رکھنا ہی نہیں چاہتا۔ صرف اسی طرح تم محفوظ رہو گے۔ قمر کو تیرے ساتھ تیرے گھر میں ہونا چاہیے۔ میں اس کی خبر گیری نہیں کر سکتا۔ جیسے پہلے خیال رکھتا تھا' اب نہیں رکھ سکتا۔"

"یہ سب قمر کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آ جائے گا کچھ دن بعد۔ رہی اس کا خیال رکھنے کی بات تو یہ سب کی ذمے داری ہے۔"

"کون سب؟" میں نے کہا "چندا کا رول مس خان کا ہو جائے گا۔ وہ میری سیکریٹری ہو جائیں گے۔ کرنل خان میرے اسٹاف آفیسر یا چیف آف سیکورٹی ہو جائیں گے۔ حالانکہ کرنل صاحب کی خواہش ہے کہ وہ سیاسی معاملات سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے مگر تعلق تو ان کا مجھ سے ہے اور چندا سے ہے۔ ہمارے معاملات سے لاتعلق وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں فاروقی صاحب' قمر النساء آپ کی اور صرف آپ کی ذمے داری ہے۔"

"وہ تو ہے" کمال نے سوچ کے کہا "مگر مجھے صبح سے رات تک فرصت کہاں۔ میرا کلینک سارا وقت مانگتا ہے۔"

"پھر شادی کیوں کر رہے ہو بردار۔ بیوی کے لیے وقت کہاں سے نکالو گے۔ دن تو ایسے ہی چوبیس گھنٹے کا رہے گا۔ نہیں گھنٹے کا نہیں کیا جا سکتا تمہاری خاطر۔"

"مسئلہ صرف دن کا ہے۔ وہ اپنے بوتیک میں اکیلی رہتی ہے۔"

میں نے فیصلہ کر دیا "قمر سے کہو اپنا بوتیک بند کر دے یا فروخت کر دے۔"

"یہ تو زیادتی ہو گی' بوتیک اس کا شوق ہے۔"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ اس کی مجبوری نہیں ہے۔ شوق تو

بہت ہوتے ہیں شادی سے پہلے لڑکوں کے بھی اور لڑکیوں کے بھی مگر سب چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اگر اسے مصروفیت چاہیے تو وہ کلینک کے انتظامی امور سنبھال سکتی ہے اور تیرے ساتھ رہ سکتی ہے۔"

"کمال ہے۔۔۔"

"ہاں ہے۔ ڈاکٹر کمال فاروقی' تخلص الو کا پٹھا۔"

"کمال یہ ہے کہ نہ جانے کب سے میرے ذہن میں ہے یہ آئیڈیا مگر میں اس لیے چپ تھا کہ قمر اسے میری خود غرضانہ سوچ سے تعبیر نہ کرے کہ شادی ہوئی نہیں اور شوہر صاحب نے حکم صادر فرما دیا کہ بوتیک بند کرو اور میرے ساتھ کام کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ کلینک کے انتظامی معاملات اور تعلقات عامہ سے نمٹنا اکیلی کوئن کے بس کی بات نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک کلرک' ٹائپسٹ کی ضرورت ہے جسے کمپیوٹر پر کام کرنا بھی آتا ہو۔ اس کے علاوہ قمر میرا ساتھ دے تو ہم اس کلینک کو بڑھا کے اسپتال بنا سکتے ہیں۔ ابھی تک میں اکیلا اسے چلاتا تھا تو اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔"

"فاروقی صاحب' اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دیکھو اس نے کیسے عمران خان کے لیے حالات پیدا کیے۔ عمران خان کی والدہ کی موت اس کا بہانہ بنی۔ قدرت کو عمران خان سے ایک بہت بڑا کام جو لینا تھا۔ اس نے عمران خان کو کس طرح وسائل مہیا کیے۔ کیسے اسے بااختیار بنایا۔ حالات کو اس کے تابع کیا۔ پہلے اسے ایک قومی ہیرو بنا دیا پھر بین الاقوامی عزت دی۔ وہ وقت آیا جب لوگ اس کے اشارے پر کینسر اسپتال کے لیے سب کچھ دینے پر تیار ہو گئے۔ اگر وہ عام آدمی ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا؟ وہ چندے کی صندوقچی لیے پھرتا رہتا اور جو پانچ روپے بھی دیتا وہ کسی کارِ خیر میں حصہ لینے کی نیت سے نہیں' خیرات سمجھ کے دیتا۔ آج دیکھ شوکت خانم میموریل اسپتال ہر پاکستانی کے لیے باعثِ افتخار ہے۔"

"برادر۔ ذرا نیچے آ جا' تو بہت اوپر اڑ رہا ہے۔ کہاں میں کہاں عمران خان۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک اسپتال بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں صرف اپنے وسائل پر انحصار کروں گا۔ مجھے کوئی چندہ نہیں دے گا چنانچہ میں مانگوں گا بھی نہیں مگر اسپتال آنے والے مریض اپنی استطاعت دیکھتے ہوئے خوشی سے جو دے جائیں' شکریے کے ساتھ قبول کر لوں گا۔ یہی ہے میرا پروگرام۔"

"وسائل تو ماشاء اللہ قمر کے بھی کم نہیں۔ اس کے اسمگلر باپ نے نوٹوں سے بھری ہوئی جو بوری چھوڑی تھی' وہ سب رقم میں نے بینک میں نکس ڈیپازٹ کرا دی تھی۔ اب وہ دگنی ہو چکی ہو گی۔ ایک کروڑ سے زیادہ ہی ہو گی۔ قمر کو بھی اس میں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ رقم بھی اسپتال کی تعمیر میں صَرف ہو سکتی ہے۔"

"نہیں یار۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ قمر کی کسی چیز پر میرا حق نہیں۔ میں اس کی دولت یا کمائی میں سے کچھ نہیں لوں گا۔"

"بے محبت کے مُحبّ۔ جو تیرا ہے کیا وہ قمر کا نہیں ہو گا؟"

"بالکل ہو گا۔ وہی مالک ہو گی سب کی۔"

"بیٹے۔ یہ یکطرفہ معاملہ کیوں؟ یہ محبت ہے یا زن مریدی؟ جب تم ایک دوسرے کے ہو گئے تو تمہارا سب کچھ ایک دوسرے کا ہو گیا۔ میرا تیرا کی کوئی بات ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کسی کے دل میں ایسا خیال آتا ہے تو یہ عدم اعتماد از خود محبت کے سارے دعووں کی نفی کرتا ہے۔ تو لاکھ انکار کر' جب وقت آئے گا تو قمر خود تجھے مجبور کرے گی۔ تم ایک شاندار اسپتال تعمیر کر سکتے ہو اور چلا بھی سکتے ہو۔ قمر بہترین مینجم ہے۔ بوتیک چلا کے اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کی انتظامی اور تخلیقی صلاحیت کا معیار کیا ہے۔ وہ بوتیک سے زیادہ بہتر چلا سکتی ہے اسپتال کو۔ بوتیک شوق ہے۔ اسپتال ایک مشن ہو گا۔ ایک مقصد کے پیچھے جو جذبہ ہوتا ہے وہ زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ تم دونوں اسی طرح ساتھ ساتھ ایک کام میں لگ گئے تو پھر ستارہ ایدھی اور بلقیس ایدھی بھی بن سکتے ہو۔"

کمال فاروقی کی آنکھوں میں خواب روشن ہو گئے تھے "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا فاروقی صاحب۔ تمہاری قوت کو متحد رکھنے والا جذبہ ہے محبت کا اور محبت میں ایک آدمی نے پہاڑ کاٹ کے دودھ کی نہر نکال دی تھی۔ تم دونوں مل کے ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہو۔ قمر سے اچھی بیوی یا منتظم اور پی آر او تجھے کہاں ملے گی' لوکے پٹھے۔"

"سچ کہا تُو نے سوُر کے بچے!" کمال بولا "مجھ پر فرطِ جذبات سے رقت طاری ہو رہی ہے۔ کیا میں قمر کے سامنے یہ تجویز رکھوں۔"

"نہیں۔ اس سے میں بات کروں گا" میں نے کہا "اسے بتاؤں گا کہ کمال کی کیا خواہش ہے اور اس کا خیال تھا کہ شادی کر کے قمر اس کا ساتھ دے گی تو وہ اپنی محبت کے جذبے کو یادگار بنا دیں گے۔ تاج محل سے بھی عظیم تر۔ تاج محل تو ایک مزار ہے۔ شوکت خانم میموریل اسپتال کوئی مزار نہیں ہے۔ ایک مقدس جذبے اور رشتے کا پیکر مجسم ہے جس کی عظمت کو الفاظ میں خراجِ تحسین پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ بیٹا جس نے ماں کے لیے اتنا بڑا صدقۂ جاریہ کا بیڑا اٹھایا۔ تم اپنی محبت سے ایک دوسرے کے لیے ایسا ہی کوئی بڑا کام کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا تجھے معلوم ہے فیض کا کوئی شاندار مزار کہیں نہیں؟ اس کے نام کی کوئی یادگاری نہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ سیالکوٹ میں ہے۔"

"ہاں۔ مگر وہ کوئی شاندار تعمیر کوئی عجائبِ عجمہ نہیں۔ فیض کی اہلیہ ایلس نے سیالکوٹ جیل میں ایک ہال تعمیر کرا دیا ہے جہاں قیدیوں کے ملاقاتی بیٹھ کے انتظار اور آرام کر سکتے ہیں۔۔۔ محبت کے کسی تاج محل سے کم ہے یہ ہال۔ اس کا حسن ہے وہ جذبہ جس نے اسے یہ صورت دی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر سچ کہا تو نے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے اس نقطۂ نظر سے۔"

"جب میں تمہارے بات کروں گا تو وہ بھی جذباتی ہو جائے گی۔ اور پھر فوراً شادی کے لیے مان جائے گی۔"

"یہ اس کا جذباتی استحصال ہوگا؟"

"ہاں۔ کسی نیک مقصد کے لیے کسی کا جذباتی استحصال اچھی بات ہے۔ اور وہ بعد میں بھی پچھتائے گی نہیں۔ اس کی عقل کے دلائل بھی وہی ہوں گے جو دل کے۔ بو تیک کی جگہ اور گڈول سے سرکو مزید پچاس لاکھ ضرور ملیں گے۔"

"مگر کیا یہ زیادتی نہیں ہوگی۔ اپنے مقصد پر اس کے شوق کو قربان کرنا" کمال نے کہا۔

"میں ایک جھانپڑ رسید کروں گا آپ کے بھی اور قمر کے بھی۔ شوق تو اسے بچپن میں گڑیوں سے کھیلنے کا ہوگا اور آج چاکلیٹ کھانے کا ہے۔ شوق سے کون روک رہا ہے۔ میں اسے شوق کی نئی راہ دکھاؤں گا۔ اس شوق کی راہ اور منزل نئی ہوگی اور یہ شوق میری ہے۔ اس میں نیکی ہے اور صرف کامیابی کی خوشی نہیں' سکونِ قلب کا سامان بھی ہے۔ اسے شوق نہیں ہوگا تو وہ انکار کردے گی اور کہے گی کہ کمال اپنا کام کرتا رہے' میں بو تیک ہی چلاؤں گی مگر میں جانتا ہوں قمر کی فطرت اور مزاج کو۔ میں اسے دکھاؤں گا کہ کمال یہ چاہتا ہے کہ تم اس کا غلط مطلب نہ سمجھ لو۔ اس میں ہمت نہیں ہے تم سے بات کرنے کی۔ میرا خیال ہے کہ دلائل کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ وہ اسی وقت دروازے کے شیشے پر "برائے فروخت" کا بورڈ ٹانگ دے گی اور مجھے فون کرکے کہے گی کہ ایک قاضی اور دو گواہ پکڑ کے سیدھے گھر آجاؤ۔"

کمال ہنسنے لگا "اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے قمر۔"

"یہ مت کہہ۔ تو جتنا سمجھتا ہے' وہ اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ثابت کرکے دکھادے گی تجھے۔ ماشاء اللہ یہ جذبہ ہر عورت میں ہوتا ہے۔"

اس نے گھڑی دیکھی "کیا یہاں لوگ ناشتا نہیں کرتے۔"

"شطرنج کھیلنے والوں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ چال سوچتے سوچتے ان کی عمر طبعی تمام ہو جاتی ہے۔ انہیں وقت گزرنے کا پتا ہی میں چلتا۔ مجھے ناشتا کرنا ہے چندا کے ساتھ ڈاکٹر صفدر کے گھر کے۔ اور خان اعظم کا ناشتا آپ کھا نہیں سکتے۔ میں نے سخت ریاضت کی مگر اب بھی مجھے گھوڑے پر رشک آتا ہے جب میں اسے ہری بھری گھاس یا دانہ کھاتے دیکھتا ہوں۔"

"پھر میں چلتا ہوں' بھوکا پیاسا آیا تھا' بھوکا پیاسا جاتا ہوں۔" میں نے کہا "سکندر جب گیا دنیا سے' دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"پیٹ تو بھرا ہوا ہوگا" کمال نے کہا "چلتے چلتے ایک سوال پوچھوں۔ یہ دس لاکھ آپ نے مجھ سے کیوں لیے۔ خیر سے کنگال ہو گئے ہیں کیا؟"

میں نے کہا "بہت جلد میں اپنے سارے اثاثے تیرے سپرد کردوں گا۔ میں اب ناصر عظیم نہیں رہا۔ شاہ عالم ہوں۔ بینک اکاؤنٹ' کاروبار' پراپرٹی۔ سب اپنے نام پر نہیں رکھ سکتا۔"

"پھر آپ یہ ذمے داری کسی اور کو دیں۔ میں یہ کام کرنے سے صاف انکاری ہوں۔"

"یار اس میں پریشانی کوئی نہیں۔"

"پریشانی کوئی نہیں تو کسی اور کو پکڑیں۔ چندا ہے' خان اعظم ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "خدا حافظ۔"

کمال کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر صفدر کو یاد دلایا "جناب' نو بجے ہمیں کورٹ پہنچنا ہے۔ اور آپ کی فیملی بھی آپ کے انتظار میں ہوگی۔"

اس نے چونک کے گھڑی دیکھی "اوہ۔ سات بج گئے۔"

خان جی نے کہا "بازی تمام نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "زندگی کی بازی تمام ہو جاتی ہے' شطرنج کی بازی تمام نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر صفدر کھڑا ہو گیا "بازی' بازی ہے۔ میں پھر آؤں گا۔"

"ضرور' مہروں کی پوزیشن یاد رہے گی آپ کو؟"

"ہاں۔ آپ بھی نوٹ کرلیں' بہت اچھا کھیلتے ہیں آپ۔" اس نے خان جی سے ہاتھ ملایا "میری ساری ٹینشن دور ہو گئی۔"

"بہت عرصے بعد ایک اچھے کھلاڑی سے مل کے خوشی ہوئی۔" خان جی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صفدر کے گھر میں بڑا سوگوار ماحول تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی رات بھر جاگتے رہے تھے۔ چندا نے انہیں تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ وہ سکون سے سو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب صبح خیر وعافیت کے ساتھ لوٹ آئیں گے مگر وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر ڈاکٹر صاحب کو کہاں لے جایا گیا ہے اور کیوں؟ اس سوال کا جواب چندا کیا دیتی؟ وہ خود بھی ان کے ساتھ جاگتی رہی اور اپنی باتوں سے ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہی۔

ڈاکٹر صفدر کا اکلوتا بیٹا ایڈنبرا میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہوا تھا۔ بیٹی میڈیکل کالج میں سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی۔ اس کی ماں نے کسی زمانے میں پروفیسری اور وکالت کے ساتھ حقوقِ انسانی کی تنظیم کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ وہ اچھے وقتوں کی بات تھی جب ہر جنگ کی انتہا قانون کی عدالت میں ہوتی تھی۔ اب صرف بے وقوف اور کمزور تھانے کچہری میں خوار ہونے جاتے تھے۔ ہر جنگ کا فیصلہ کلاشنکوف ہاتھ میں رکھنے والا جج بن کے کردیتا تھا۔ کیس کی سماعت سے پولیس بھی لاقانونیت کے سارے اختیارات استعمال کرنے پر آمادہ تھی اور ایک ٹھنڈا فورس بھی ہر گلی محلے میں قائم ہو چکی تھی جس کے جوشیلے نوجوان طاقت کے بل

پر ہر مقدمے کا فیصلہ کرا سکتے تھے۔ مقدمہ میاں بیوی کے جھگڑے کا ہو یا مالک مکان اور کرائے دار کا' رقم کی وصولی کا ہو یا جائداد کے قبضے کا' قانون نافذ کرنے والے ادارے (ٹریفک پولیس' ایف آئی اے' سی آئی اے اور نیم فوجی ادارے از قسم رینجرز وغیرہ) پیشہ ور مسلح بدمعاش اور بدعنوان انتظامیہ' یہ سب مل کے قانون کی بالادستی کو ختم کررہے تھے۔ لاقانونیت کے شارٹ کٹ کی پالیسی عام کررہے تھے۔

ڈاکٹر صفدر کو دیکھتے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے۔ بیوی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جو اس نے دوپٹے کے پلو سے صاف کرلیے۔ بیٹی دوڑ کے باپ سے چمٹ گئی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا ڈیڈی!"

ڈاکٹر صفدر ہنسا "بھئی تم تو کہتی تھیں ڈیڈی آپ بہت اچھے ہیں۔ آج مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ آپ ٹھیک ہیں'..... یہ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" بیٹی نے سمجھنے کے باوجود پوچھا۔

"I PROMISED YOU" ڈاکٹر صفدر نے کہا "خود جاکے وہ گاڑی لے آنا۔ کمی بیشی ہو تو اسے یہ چیک دے دینا۔ رقم وہ خود بھرلے گا۔"

ایک میرا دیا ہوا اور ایک بینک چیک دیکھ کے بیٹی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ اس نے بے اختیار اپنے بااختیار باپ کو چوم لیا۔ بیٹیوں کو یہ پیار بعد میں کسی سے نہیں ملتا۔ باپ کو بھی یہ محبت یاد آتی ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے پروگرام کے مطابق ڈاکٹر صفدر کے آفس کا رخ کیا۔ وہاں حسبِ توقع چوکیدار کچھ بدحواس تھا۔

"سر جی۔ رات کو تالا توڑا ہے کسی نے۔"

"کسی نے کیا' خود تم نے توڑا ہوگا۔ تمہارے سوا کون ہوتا ہے یہاں۔" ڈاکٹر صفدر نے تالے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

چوکیدار قسمیں کھانے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ رات کو یہاں نہیں ہوتا۔ گھر جاکے سو جاتا ہے' بارہ بجے اور صبح چھ بجے لوٹ آتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے آفس کو دیکھا اور پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ غالباً چوکیدار نے تالا ٹھیک سے نہیں لگایا ہوگا۔ بعد میں خود بخود کھل گیا۔ آفس میں سے تو کچھ بھی نہیں گیا۔

چوکیدار کو ڈانٹ ڈپٹ کرکے ڈاکٹر صفدر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی چار کاپیاں اپنے اسٹینو گرافر کی میز پر رکھ دیں اور چوکیدار سے کہا کہ ان کو فوراً ارسال کرنا ہے۔ یہ بات اسٹینو کو بتائے بغیر وہ گھر نہ جائے۔ دوسرا دن کا چوکیدار آجائے اس کے باوجود یہ اس کی ذمے داری ہے اور وہ اسی سے پوچھیں گے۔

کورٹ میں ہمارا نو بجے پہنچنا ضروری تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کیس کی سماعت کا وقت بعد میں ہو مگر کیس کی اہم نوعیت کو دیکھتے ہوئے مجھے امید تھی کہ کاز لسٹ پر پہلا کیس یہی ہوگا۔ میں نے ڈاکٹر صفدر کو عدالت کے دروازے پر چھوڑا اور خود گاڑی آگے لے گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے ڈاکٹر صفدر کے ساتھ دیکھے۔ سامنے سے عدالت میں داخل ہونے سے میرے بچ جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج عدالت میں کتنا رش ہوگا۔ اور وہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا جو مجھے شناخت نہ کرسکے۔

عقبی حصے کا راستہ عام نہیں تھا۔ یہ صرف ججوں کے لیے مخصوص تھا مگر میں ڈم ڈم کی گھنی باڑھ کے درمیانی شگاف سے گزر کے اندر پہنچ گیا۔ کینٹین کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے میں نے جیب سے اپنا فون نکالا اور چندا سے بات کی۔

"آدھے گھنٹے بعد تم چاہو تو گھر جاسکتی ہو۔"

"اگر میں کورٹ آکے تمہاری مداری کا کھیل دیکھنا چاہوں تو؟"

"عدالت کی کارروائی کو مداری کا کھیل کہنا توہینِ عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ ویسے بھی داخلہ بذریعہ پاس ہے۔ ہر ایرے غیرے کو آنے کی اجازت نہیں۔"

"اگر میں نے داخل ہو کے دکھادیا' پھر؟"

"تو جو شوہر کی سزا وہ میری" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں..... کینٹین کے کچن سے گزرا تو اندر کام کرنے والوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا مگر ان کے اعتراض سے پہلے میں ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں وکیل اور ان کے منشی بھرے پڑے تھے۔ ان سب کے مقدمات آج سماعت کے لیے پیش ہونا تھے۔ میں ہال سے گزر کے برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ مجھے آخری حصے میں ہجوم کے درمیان بہت سے شناسا چہرے نظر آئے۔ ان میں جج بھی تھا اور تیمور بھی۔ پھر میں نے قریشی کو دیکھا جو ڈاکٹر صفدر کے ساتھ چلتے ہوئے بحث میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر صفدر دروازے سے اندر چلا گیا تو مجھے قریشی کی صورت پر بے بسی اور برہمی کے آثار نظر آئے۔

مرحوم عمور راز کی طرف سے استغاثہ دائر کرنے والے اس کے اپنے ساتھی تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ درپردہ ان کی حمایت اور مدد کرنے والے قریشی اور جج ہی ہیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ شاہ عالم پر عمور راز کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے اور اس کے بعد یہ بھی ثابت ہو جائے کہ مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا بھی شاہ عالم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی طرف سے پیروی کے لیے تین وکیلوں پر مشتمل ایک پینل تھا جس میں سارے نامور وکلا تھے۔ ان میں ایک سابق جج تھا جو اب پریکٹس کررہا تھا۔ دوسرا فوجداری مقدمات میں نامور تھا اور یہ بات مشہور تھی کہ کوئی قتل کرنے کے بعد آلۂ قتل سمیت اس کی خدمت میں حاضر ہو کے سچ بتادے اور سچ کے ساتھ دس لاکھ روپے کا چیک بھی لگادے تو باقی سب کچھ وہ خود کرلیتا تھا۔ منشی اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے صاف بچ جاتا تھا۔ اس کے کسی منشی کو آج تک پھانسی تو کیا قید کی سزا بھی نہیں ہوئی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ ٹیک ہاٹی کی بات تھی مگر وکلا کا ایک طبقہ اسے اعانتِ مجرمانہ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ تیمور سب سے سینئر وکیل خالد بروہی اپنی عمر اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تجربے کے باعث وکیلوں کی اس ٹیم میں سربراہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ساڑھے نو بجے ڈاکٹر صفدر نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ جج کو پیش کی۔ جج نے اسے چشمہ لگا کے پڑھا۔ اس وقت میں سائڈ کے ایک دروازے سے اندر داخل ہونے میں تو کامیاب ہو گیا تھا مگر آگے جانا مشکل تھا۔ دروازے کے سامنے وکیلوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کا ایک ہجوم تھا جو میری راہ میں حائل تھا۔ محاورے کے مطابق عدالت کے کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور حکم میل پر جج نے برہمی کا اظہار بھی کیا تھا کہ عدالت میں داخلے کے لیے گنجائش سے زیادہ پاس کیوں جاری کیے گئے۔ پھر اس نے زبردستی گھسنے کی کوشش کرنے والوں کو وارننگ دی تھی کہ انہوں نے نظم وضبط خراب کیا تو انہیں پولیس کی مدد سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد لوگ ساکن وساکت ہو گئے تھے۔

جج نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے کے لیے وکیلِ استغاثہ کو آگے بلایا۔ پی جے ایف کی طرف سے بیرسٹر محمود کو شاہ عالم کا وکیلِ صفائی مقرر کیا گیا تھا اور اس کی اعانت بھی دو تجربہ کار وکیل کر رہے تھے مگر وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ پہلے وہ ثابت کر رہے تھے کہ عمر دراز کا قاتل شاہ عالم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ملک سے باہر تھا مگر اب صحافیوں، وکیلوں اور سیاسی اہمیت رکھنے والوں کے سامنے دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہو چکا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جب جج نے ڈاکٹر صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صفدر۔ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ میڈیکل بورڈ کے تمام ارکان کا اس پر اتفاق ہے۔"

ایک لمحے کے لیے عدالت میں سکوت چھا گیا۔ پھر سب سے پہلے بلند ہونے والی آواز پر میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ آواز شبنم کی تھی۔

○☆○

شاہد کی آواز پر میں آگے بڑھا۔ دس بارہ سال کے اس لڑکے کے ہاتھ میں لہو لہو خنجر دیکھ کے خوف سے شاہد کی گھگی بندھ گئی تھی۔ خون تازہ تھا اور خنجر کی نوک سے ایک قطرہ نوک کے فرش پر داغ کی صورت میں پھیل گیا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے تھام لیا "یہ کیا ہے؟"

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں شاہد کو مخاطب کیا "آپا جی..... میں نے اسے مار دیا۔ آپ مجھے بچالو۔"

اس کا بدن بھی ایسے کانپ رہا تھا جیسے زلزلے کے جھٹکوں سے زمین تھرتھراتی ہے۔ شاہد نے اپنی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کے دبا لیا تھا اور زینے کے نیچے کی جگہ میں دیوار سے چپٹ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ میں لڑکے کو دور لے جاؤں۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا "آپا جی کے بچے۔ کس کو مار دیا ہے تو نے، مجھے بتا۔"

وہ رونے لگا "قسم اللہ کی۔ وہ بدمعاشی کرتا تھا میرے ساتھ۔"

کے لیے عدالت کے حکم پر میڈیکل بورڈ بھی بنا دیا گیا۔

تاہم جب قبر سے لاش دوبارہ نکالی گئی تو شبنم کے یقین کی عمارت ریت کی دیوار کی طرح ثابت ہوئی۔ اس نے جان لیا اور مان لیا کہ مرنے والا شاہ عالم تھا مگر اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرا یقین غلط تھا کیونکہ اس کی بنیادیں جذبات کے تعلق پر استوار تھیں۔ ایک طرف اسے احساس تھا کہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے پر اصرار سے اس نے اپنی پوزیشن صحافتی حلقوں میں کتنی خراب کر لی ہے۔ قانونی طور پر اس کے دعوے کی نفی نے اس کو دنیا کی نظر میں تماشا بنا دیا تھا۔ مگر سب سے بڑا صدمہ جذباتی تھا جس کی تاب نہ لا کے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی امید کا آخری تنکا بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔

وہ عدالت میں سب سے اگلی صف کے آخری حصے میں جنجی خلا میں گھور رہی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا اور اب صحافیوں، وکیلوں اور سیاسی اہمیت رکھنے والوں کے سامنے دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہو چکا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جب جج نے ڈاکٹر صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صفدر۔ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ میڈیکل بورڈ کے تمام ارکان کا اس پر اتفاق ہے۔"

ایک لمحے کے لیے عدالت میں سکوت چھا گیا۔ پھر سب سے پہلے بلند ہونے والی آواز پر میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ آواز شبنم کی تھی۔

○☆○

شاہد کی آواز پر میں آگے بڑھا۔ دس بارہ سال کے اس لڑکے کے ہاتھ میں لہو لہو خنجر دیکھ کے خوف سے شاہد کی گھگی بندھ گئی تھی۔ خون تازہ تھا اور خنجر کی نوک سے ایک قطرہ نوک کے فرش پر داغ کی صورت میں پھیل گیا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے تھام لیا "یہ کیا ہے؟"

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں شاہد کو مخاطب کیا "آپا جی..... میں نے اسے مار دیا۔ آپ مجھے بچالو۔"

اس کا بدن بھی ایسے کانپ رہا تھا جیسے زلزلے کے جھٹکوں سے زمین تھرتھراتی ہے۔ شاہد نے اپنی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کے دبا لیا تھا اور زینے کے نیچے کی جگہ میں دیوار سے چپٹ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ میں لڑکے کو دور لے جاؤں۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا "آپا جی کے بچے۔ کس کو مار دیا ہے تو نے، مجھے بتا۔"

وہ رونے لگا "قسم اللہ کی۔ وہ بدمعاشی کرتا تھا میرے ساتھ۔"

میں اسے زینے سے دور لے گیا "آرام سے بات کر اور مجھے بتا کہ تو نے کس کو مارا ہے۔ یہ خنجر نیچے رکھ دے۔"

اس نے خنجر نیچے رکھ دیا اور مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا "وہ داڑھی والا۔ میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔"

زینے کا اوپر والا دروازہ کھلا اور میں نے روشنی کے فریم میں شاہ جی کا سایہ دیکھا "کون ہے؟ ناصر..... یہ کون ہے تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا "استاد جی۔ ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"قتل....." شاہ جی نے بے اختیار کہا اور پھر تیزی سے نیچے آیا۔ میں نے ابھی تک اس لڑکے کی کلائی مضبوطی سے تھام رکھی تھی اور وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ شاہ جی کی پشت زینے کی طرف تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے شاہد کو زینے کے نیچے سے نکلتے اور دبے پاؤں اوپر جاتے دیکھا۔ اس وقت میری اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اگر شاہ جی ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو کھلے دروازے سے زینے میں پھیل جانے والی روشنی میں شاہد کا چوروں کی طرح فرار ہونا سارا راز فاش کر دیتا۔ پھر شاید شاہ جی کو یہ بھی اندازہ ہو جاتا کہ مجھے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔

"اسے چھوڑ دے" شاہ جی نے کہا۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی "یہ ہے وہ خنجر استاد جی۔"

شاہ جی نے زمین پر پڑے ہوئے خنجر کو دیکھا جس کی آب پر لہو کی سرخی غالب آ گئی تھی۔ اسی وقت شاہد نے اوپر سے پوچھا "کیا ہو گیا ابا! یہ کیسا شور ہے؟" پھر اس نے ایک انگڑائی لی اور جماہی کے ساتھ منہ پر ہاتھ رکھا۔ میں مسحور سا ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ تو سو جا" جا کے" شاہ جی نے پلٹ کے کہا۔

شاہد کی اداکاری اور اس کے اعتماد نے مجھے حیران کر دیا۔ ابھی ایک منٹ پہلے وہ خوف سے بے ہوش ہونے والی تھی اور اپنے سامنے ایک خنجر بدست قاتل کو دیکھ کے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی اور میں نے اُجالے میں اس کے موتی جیسے دانتوں کی چمک کو محسوس کیا۔

لڑکا سمجھ دار تھا۔ اس نے شاہد کے رویے کی تبدیلی کا مطلب بھی سمجھ لیا۔ جب شاہد پلٹ کے غائب ہو گئی تو اس نے مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے سہلا کے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دلا دیا کہ میں اس کی پوری مدد کر سکتا ہوں بشرطیکہ وہ شاہد کے بارے میں شاہ جی کے سامنے کچھ نہ کہے۔

میں نے کہا "استاد جی۔ میں اکیلا نمٹ رہا تھا مردوں کی طرح۔"

شاہ جی نے مجھے گھور کے کہا "اس کو بولنے دے۔"

لڑکے نے روتے ہوئے کہنا شروع کیا "استاد جی۔ وہ بہت حرامی تھا..... روز مجھے..... تنگ کرتا تھا۔ بدمعاشی کرتا تھا۔ دھمکی دیتا تھا کہ کسی کو بتایا تو ذبح کر کے بھینک دوں گا چوزے کی طرح۔ آج میں نے اسے ذبح کر دیا۔"

شاہ جی نے کہا "یہ خنجر کہاں سے آیا تیرے پاس؟"

"آج ہی خریدا تھا استاد جی۔ پندرہ روپے میں۔ اپنے پاس چھپا کے رکھا تھا۔ وہ مجھ سے بہت گھبراتا تھا۔"

شاہ جی نے خلافِ توقع نہ برہمی کا اظہار کیا تھا اور نہ پریشانی کا۔ اس نے سہلایا "تجھے پتا ہے..... وہ مر گیا؟"

"میں نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا جی۔"

"اچھا۔ چل تو جا ناصر کے ساتھ....." شاہ جی نے کچھ سوچ کے کہا۔

"کہاں استاد جی؟"

"تھانے....." شاہ جی نے کہا۔

لڑکے نے ایک چیخ ماری "تھانے۔ استاد جی، مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔ مجھے بچالو۔"

شاہ جی نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "تجھے بچانے کے لیے ہی تھانے بھیج رہا ہوں..... بند کر یہ رونا دھونا۔ جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کر" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گیا "ناصر۔ دیکھ یہ معاملہ ٹھیک کرنے میں تو میری مدد کر سکتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تیرے دماغ میں بھوسا نہیں ہے، عقل ہے۔"

میں نے خوشی سے پھول کے کہا "آپ حکم کریں استاد جی!"

"اس کو لے جا تھانے دار غلام محمد کے پاس۔ تو نے دیکھا ہے اسے؟"

میں نے نفی میں سہلایا "کہاں ہوتا ہے وہ؟"

"تھانہ اکبری منڈی چلا جا۔ اس کی ڈیوٹی ہو گی رات کی۔ اس سے کہنا کہ میں نے بھیجا ہے اسے۔ ایک کچا پرچہ کاٹ دیں ایک سو سات یا نو میں۔ اور اس کو حوالات میں ڈال دیں ایک سو اکیاون لگا کے۔ اپنے علاقے سے گرفتاری دکھائیں اور ٹائم..... ٹائم شام کا ہو تو اچھا ہے۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات کو؟"

میں نے گھڑے کی طرح سہلایا "بالکل استاد جی۔"

"بس تو جا۔ تانگے میں جانا" اس نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کے مجھے دیا اور پھر سوگا "یہ سب انسپکٹر غلام محمد کو دے دینا۔"

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ کافی دور پیدل آنے کے بعد ایک تانگا نظر آیا مگر تانگے والا پہلے تو اکبری منڈی جانے پر ہی راضی نہیں تھا۔ پھر مانا تو اس نے دس روپے مانگے۔ وہ چلا جاتا تو مجھے نہ جانے کہاں تک دوسرے تانگے کے لیے پیدل مارچ کرنا پڑتی۔ پانچ روپے اپنے پاس سے دے کر ہم رات کے دو بجے تھانہ اکبری منڈی پہنچے۔ معمول کے مطابق وہاں "زور شور" سے تفتیش جاری تھی۔ مجرمان و پولیس کے درمیان حق کے لیے یہ مقابلہ ہر تھانے میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ بیشتر مقابلے پولیس بزورِ بازو جیت لیتی ہے اور حقائق کو مجرم کے اندر سے ایسے نکالتی ہے جیسے گنے میں سے رس نکالتے ہیں۔ جو بانس ہوں انہیں گنا ثابت کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے پولیس عدالت میں رپس کا بھرا ہوا گلاس پیش کردیتی ہے۔ پنجابی محاورے کے مطابق وہ کتا بھی چوہ سکتے ہیں اور بکری سے بیان دلوا سکتے ہیں کہ اس نے بچہ نہیں انڈا دیا تھا اور انڈے کے والد مرغ کو بھی حاضر کرسکتی ہے۔

سب انسپکٹر غلام محمد کچھ دیر بعد فارغ ہوا تو خاصا مشتعل اور مغموم تھا۔ وہ تفتیش سے مطلوبہ نتائج نہیں حاصل کرسکا تھا۔ جب مجرم نہ اعتراف کرے نہ مکا تو محنت رائگاں جانے کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اپنی کرسی پر گر کے وہ کچھ دیر ہانپتا رہا۔ پھر کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے تولیے سے منہ صاف کرکے اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا "اوئے چھوڑ دو ان..... کو۔"

ماتحت نے عرض کی "کہاں چھوڑ دوں سر!"

غلام محمد گرم ہوگیا "اپنی بیوی کے پاس....." پھر اس کی نظر ہم پر پڑی "اوئے کون ہو تم؟"

میں نے کہا "مجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔"

"ایک سو ایک شاہ جی رہتے ہیں میرے..... پر" وہ بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ مذکورہ شاہ جی کہاں رہتے ہیں تو وہ نرم پڑگیا "اچھا بولو کیا معاملہ ہے؟"

میں نے اسے "معاملہ" ایک لفافے میں پیش کیا "یہ خاص بندہ ہے شاہ جی کا۔ اس کو ادھیری رکھنا ہے۔ حاضری شام سے دکھانی ہے۔"

اس نے روزنامچہ منگوایا اور رات آٹھ بجے کی حاضری لگادی۔ ایک واردات کا سات بج کر پچپن منٹ پر اندراج پہلے سے موجود تھا۔

"شاہ جی نے ایک سو سات یا نو بولا تھا۔"

"چل چھٹ ادھر سے۔ زیادہ قانون مت پڑھا مجھے" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

میں نے لڑکے کو تسلی دی "اوئے اپنے تھانے دار صاحب بڑے چنگے بندے ہیں۔ جالیٹ جا حوالات میں مزے سے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

اس نے کہا "چنگے بندے تم بھی ہو۔ میں شاہ جی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"کیا نہیں بتائے گا؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"وہی ..... جو میں نے دیکھا تھا" وہ حوالات کی سلاخوں سے لگا کھڑا تھا۔

"کیا دیکھا تھا تو نے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ اور آپا جی..... غٹرغوں کررہے تھے۔"

میں مسکرانے پر مجبور ہوگیا "بے ہم کیا کبوتر اور کبوتری ہیں۔ مگر دیکھ' میں چنگا بندہ نہیں ہوں۔ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو میں تجھے بھی ذبح کرکے اسی قبر میں لٹادوں گا۔ اسی مردود کے ساتھ سوتا رہے گا قیامت تک۔"

"نہیں جی۔ آپ نے اتنی مدد کی ہے میری۔ کبھی آپ کو ضرورت پڑی تو میں بھی آپ کے لیے سب کچھ کروں گا۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔"

میں واپس پہنچا تو شاہ جی موجود نہیں تھا۔ اس کی گاڑی بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً لاش کو ٹھکانے لگانے گیا ہوا تھا۔ اوپر جانے والے زینے کا دروازہ بند تھا۔ نیچے والی درز سے دکھائی دینے والی روشنی سے میں نے اندازہ کیا کہ شادو جاگ رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اوپر جاکے دروازے پر دستک دوں اور اسے بتاؤں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شاہ جی نے کچھ نہیں دیکھا تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر یہ خطرناک کام تھا۔ شاہ جی کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ وہ سب سے پہلے مجھے تلاش کرتا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ جو ذمے داری اس نے مجھے سونپی تھی' اسے میں نے کسی خرابی کے بغیر پورا کردیا تھا یا نہیں؟

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میری نظر بار بار اس خالی جگہ پر جاتی تھی جہاں وہ داڑھی والا فقیر اور اس کا معاون سوتے تھے۔ وہ لڑکا حوالات میں تھا اور فقیر کی لاش کو شاہ جی نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ شاید وہ اسے کسی سڑک پر ڈال دے گا۔ کسی ایسے تاریک موڑ پر جہاں سے رات بھر میں درجنوں ٹرک گزریں گے اور سب اس کی لاش کو کچلتے ہوئے جائیں گے۔ صبح تک اس کی ہڈیاں تک پس جائیں گی اور گوشت کے ساتھ خون سڑک پر دور دور تک پھیل جائے گا جسے جانے کے لیے چیونٹے اکٹھے ہوجائیں گے اور مکھیاں بھنکنے لگیں گی۔ صبح پر نما داغ اور مکروہ خونی لکیروں کے سوا جو کچھ بچے گا' اس سے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ مرنے والا انسان تھا۔ یہ کسی کو کیسے پتا چل سکتا ہے کہ وہ کون تھا اور اس کی موت سڑک پر ٹریفک کے حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔

شاہ جی صبح ہوتے آیا۔ گاڑی کی آواز پر میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے باہر آیا تو وہ زینے پر رک گیا۔

میں نے کہا "سب ٹھیک ہوگیا استاد جی۔"

اس نے صرف سر ہلایا "جا سو جا اپنی جگہ پر۔"

میں نے کہا "استاد جی۔ اس بدمعاش کی لاش....."

شاہ جی نے پلٹ کر مجھے آتش فشاں نظروں سے گھورا "کیسی لاش! کس کی لاش! تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

میں خاموشی سے واپس آکے لیٹ گیا۔ شاہ جی نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دیا تھا۔ رات گئی بات گئی۔ مجھے اس موضوع پر کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ فرض کرلینا چاہیے کہ جیسے دوسرے سونے والوں نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا' ایسے ہی میں تمام رات بے خبر سوتا رہا۔ صبح سب کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ داڑھی والا فقیر' اس بچے کے ساتھ بھاگ گیا۔ دونوں راتوں رات کہیں چلے گئے۔ خیر' وہ جائیں گے کہاں۔ شاہ جی سے بچ کر کون جاسکتا ہے۔ پکڑے جائیں گے بالآخر اور گرفتاری کے بعد یہیں سب کے سامنے سزا بھی ملے گی انہیں۔

میں نے گزشتہ پورا دن رئیس کے ساتھ بھک منگوں کی دنیا کی سیاحت میں گزارا تھا اور میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ فوراً سو جانا چاہتا تھا مگر پہلے مجھے شادو کے انتظار نے نہ سونے دیا اور اس کے بعد ایک مظلوم اور معصوم بچے کے ہاتھوں ایک وحشی اور بدکردار فقیر کا خون ہوا تو میں نہ چاہنے کے باوجود اس واردات میں ملوث ہوگیا۔ اگر میں دوسروں کی طرح محوِ خواب ہوتا تو شاید مجھے صبح یہ خبر سننے پر نہ خوشی ہوتی نہ حیرت نہ غم کہ دو فقیر جن میں سے ایک بچہ تھا' گروہ سے نکل گئے ہیں۔ تھانے سے واپسی کے بعد کچھ دیر خیالوں کے انتشار نے مجھے بے چین رکھا مگر پھر ذہنی اور جسمانی سکون کی خواہش نے مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیا۔

میں اس وقت جاگا جب رئیس نے میرے ایک لات رسید کی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ آس پاس کی ساری جگہ خالی تھی۔ سارے فقیر اپنے بورے بستر سمیت کے روز کی طرح اپنا اپنا دھندا کرنے نکل گئے تھے۔

"ابے تو نے سنا ہے کوئی وزیرِ اعظم دوپہر تک پڑا سوتا رہے؟ اس ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے جہاں تیرے جیسے کو لوگ وزیرِ اعظم بنادیں" رئیس بولا۔

"لوگ؟" میں نے ایک جماہی لی "یہاں لوگ کچھ نہیں کرسکتے بیٹے۔"

"پھر کون کرسکتا ہے؟" میرے پاس بیٹھ کے ایک مڑی ہوئی خستہ حال سگریٹ کو وہ سیدھا کرنے لگا۔

"تین الف ہیں جن کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ' امریکا اور ایجنسی بلکہ ایجنسیاں۔ خیر یہ بتا تائم کیا ہوا ہے؟"

"ساڑھے گیارہ۔" اس نے ماچس سے سگریٹ جلا کے تیلی کو انگلی سے اچھال دیا۔

"کمال ہے۔ اتنی دیر ہوگئی" میں نے کہا۔

"رات کو دیر سے سویا ہوگا" رئیس نے کہا۔

"ہاں یار۔ پوری رات جاگتے گزر گئی۔ ابھی سویا تھا صبح ہوتے۔"

رئیس نے مجھے رشک آمیز دکھی نظروں سے دیکھا "ساری رات رہی وہ تیرے ساتھ۔ کیا کرتے رہے تم....؟"

میں نے کہا "شادو سے تو بس پندرہ بیس منٹ بات ہوئی تھی۔ باہر چل تجھے سب بتاتا ہوں۔ مجھے ناشتا بھی کرنا ہے۔"

"میں نہیں جاسکتا تیرے ساتھ۔ شاہ جی نے بلایا تھا مجھے۔ تو نکل جا فٹافٹ ورنہ شاہ جی نے دیکھ لیا تو تیری شامت۔"

میں نے مسکرا کے کہا "وہ کیوں؟"

"اوئے شنزادے۔ یہ دھندے کا ٹائم ہے۔ دوسرے سب لوگوں کے ساتھ تجھے بھی نکل جانا چاہیے۔ شاہ جی کو حرام خوری بالکل پسند نہیں۔"

میں نے جیب سے کنگھی نکال کے بال سنوارے۔ "شاہ جی نے مجھے بھیک مانگنے سے روک دیا ہے۔"

رئیس کی صورت سوالیہ نشان بن گئی "کیوں؟"

"شاہ جی کا کہنا ہے کہ یہ کام میرے شایانِ شان نہیں۔"

"کیا مطلب' شان کے گھوڑے۔"

"مطلب یہ کہ بھیک کوئی بھی مانگ سکتا ہے' یہ شاہ جی نے خود کہا مجھ سے کل رات۔ اس نے کہا کہ میں بھیک مانگنا نہیں چاہتا تو نہ مانگوں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ مجھے کوئی خاص کام دے گا۔ جو کوئی اور نہیں کرسکتا۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے۔"

"شادو کے سر کی قسم۔ میں تجھ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ویسے بھی۔ اس نے پھر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں ابھی تک کتابیں کیوں نہیں لایا۔ پڑھائی شروع کیوں نہیں کی" میں نے کہا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ قسم اللہ کی' تیری قسمت' تیری صورت سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ ہم تو بس ایویں پیدا ہوگئے یار۔ نہ ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "فرق مجھے پڑتا۔ میں ایک اچھے دوست سے محروم رہتا اور دیکھ' ایسے ہر وقت تقدیر کو رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بے شک تقدیر کے کچھ فیصلے اٹل ہوتے ہیں جیسے زندگی اور موت۔ مگر یہ امیری غریبی یا عزت ذلت کا معاملہ اللہ میاں نے انسان کی کوشش اور ہمت پر چھوڑ دیا ہے۔ جو سالا کچھ نہیں کرتا اسے کیا حق ہے قسمت سے شکایت کرنے کا۔ یہ جو اتنے دولت مند اور مشہور لوگ ہیں' کیا ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ان کو دولت اور شہرت مل گئی؟"

رئیس نے ایک کش لے کر دھواں خارج کرتے ہوئے کہا "خیر بات تیری بھی لاکھ روپے کی ہے۔ مگر یہ جو چماروں جیسی صورت ملی ہے ہمیں' اس کو کیا کریں؟"

"پھر وہی بے وقوفی کی بات۔ ابے شکل دیکھی جاتی ہے لڑکیوں کی۔ مرد کی عقل....."

میرے مزید ارشادات عالیہ سے پہلے شاہ جی نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ روز کی طرح سپاٹ تھا اور آنکھوں میں وہی جذباتی بے حسی جس سے سفاکی ظاہر ہوتی تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنے ہی سکون اور اطمینان' اتنی ہی آسانی اور بے نیازی سے کسی کو جان بچانے والی گولی بھی دے سکتا ہے اور جان لینے والی گولی بھی مار سکتا ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ گزشتہ رات کرچکا تھا۔

وہ سفید آب و تاب والے کلف لگے چیرمین لٹھے کی شلوار قمیص کے ساتھ سنہرے کام والی کھدر کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پیروں میں پشاوری سینڈل تھے اور سر پر قراقلی ٹوپی۔ اس حلیے میں وہ کوئی بہت بڑا علاقے یا فرقے کا آزادی' انگلیا ٹرانسپورٹر لگتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رئیس کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک کے اس نے خالی ہال پر ایک نگاہ ڈالی۔ مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے کیونکہ چند سیکنڈ کے لیے اس کی نظر وہاں رکی تھی جہاں فرش کچھ زیادہ صاف محسوس ہوتا تھا۔ غالباً اس جگہ کو خون کے داغ صاف کرنے کے لیے گیلے کپڑے سے خوب رگڑا گیا تھا۔

اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں دوپہر تک کیوں سوتا رہا تھا۔ اس نے رئیس سے کہا "شام پانچ بجے تک کولانا ہے۔"

"کہاں استاد جی!" رئیس نے پوچھا۔

"اس کے سسرال۔ ملّا کے گھر۔ میں وہیں ملوں گا۔"

"جی استاد جی!"

شاہ جی نے میری طرف دیکھا "اس کو ساتھ لے جانا۔ ہو سکتا ہے اس کے سمجھانے سے وہ سمجھ جائے۔"

رئیس نے پھر سر ہلا کے جی استاد جی کہا اور اسے بڑی رعونت کے ساتھ باہر جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے خوبصورت شکارے مارتی کار گیٹ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور وہ پچھلی والی سیٹ میں دھنس گیا۔ کار ابھی نکلی ہی تھی کہ شاورد نمودار ہوئی۔ اس نے جینز کی نیلی پتلون کے اوپر لال رنگ کی سیاہ دھاریوں والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دوپٹہ غائب تھا اور سر کے بال اس نے پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ گھوڑے کی دُم جیسی اونچی پونی ٹیل بنانے کے لئے اس نے بالوں کو خوب کھینچ کے باندھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور چاکلیٹ کھا رہی تھی۔

رئیس تو اسے دیکھ کے پلک جھپکانا ہی بھول گیا مگر شاورد نے اسے یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہاں اس کا وجود ہے ہی نہیں یا ہے تو فرش یا چھت اور دیواروں کی طرح کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ کچھ شنکر نظر آ رہی تھی۔

"کل رات کیا ہوا تھا؟" اس نے میرے قریب آ کے کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔

میں نے کہا "کل رات دنیا میں بہت کچھ ہوا تھا۔ عالمی خبروں کے مطابق۔"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور رئیس سے بولی "تو کیا کر رہا ہے اس وقت یہاں؟"

رئیس نے کہا "مجھے شاہ جی نے بلایا تھا۔"

"شاہ جی گئے تو کھڑا ہے یہاں کوئی کام نہیں ہے کیا؟"

"کام ہے تبا جی۔ ناصر کو ساتھ لے کر جانا ہے۔"

"اچھا پھر باہر سے حلوا پوری لا دے مجھے" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کے اسے دس کا نوٹ پکڑا دیا۔

میں نے کہا "جلدی تنا یار۔ میں نے ناشتا نہیں کیا ہے ابھی تک۔ بھوک سے بُرا حال ہے میرا۔"

یقیناً رئیس نے دس کا نوٹ لیتے ہوئے بڑی ذلت محسوس کی ہوگی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی صورت پر عیاں جذبات سے ہو گیا۔ اسے شاورد نے صاف لفظوں میں نہیں کہا تھا کہ باہر جائے کیونکہ اس کو مجھ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ شاورد کا اس کے اور میرے ساتھ رویہ واضح طور پر مختلف تھا۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا کیونکہ رات سے اب تک وہ تشویش اور پریشانی میں مبتلا تھی۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس لڑکے سے شاہ جی نے کیا پوچھا تھا اور کیا نہیں۔ اور جواب میں اس نے کیا بتایا تھا اور کیا نہیں بتایا تھا۔ وہ مجھے اور شاورد کو ایک ساتھ دیکھ چکا تھا اور وہ اتنا نادان بھی نہیں تھا کہ چوری چوری آدھی رات کو ملنے والے کسی جوان لڑکے اور لڑکی کے جذبات کے کھیل کو نہ سمجھ پاتا۔ اس نے اپنی زبان میں کہہ دیا تھا کہ میں اور شاورد غٹرغوں کر رہے تھے۔

رئیس کے جانے کے بعد میں نے اسے یہ بات بتائی تو وہ ہنس پڑی "یہ غٹرغوں کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو ہم کر رہے تھے" میں نے کہا "محبت کا ایک نام۔ مگر اس نے شاہ جی سے کچھ نہیں کہا۔"

"مجھے فکر کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح جب شاہ جی غسل خانے میں نہا رہے تھے تو میں نے نیچے آ کے دیکھا تھا، تجھے سوتا دیکھ کے۔۔۔"

"تو مجھی میں مر گیا۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں مار دوں گی ناصر" وہ چلائی "کیوں کرتا ہے ایسی بات۔"

"شاہ جی کا کیا بھروسا۔ انہیں شک ہو جاتا تو۔۔۔"

"تجھ سے پہلے وہ میرا گلا گھونٹ دیتے" وہ بولی "مجھے بہت ڈر لگتا ہے اب ناصر۔ آخر ایسے کب تک چلے گا۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا اور بنیادی نکتہ اٹھایا ہے تم نے۔ اور یہ مسئلہ بھی انسانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے چنانچہ ایک شاعر نے فلم مغلِ اعظم میں کہا ہے کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا اور اس سے پہلے استاد ذوق نے فرمایا تھا، کہ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"

اس نے مجھے آدھی چاکلیٹ پیش کی۔ "ابھی اس سے گزارا کر۔ خالی پیٹ سے خیالات الٹھ کے دماغ تک پہنچ رہے ہیں۔"

میں نے چاکلیٹ قبول کی "تمہارے سامنے آتے ہی دماغ کا کوئی کام نہیں رہتا۔ صرف دل کی بات چلتی ہے۔ اس وقت تم مجھے چاکلیٹ سے زیادہ حسین اور لذیذ لگ رہی ہو۔"

"تو آ سے کہاں لے گیا تھا رات؟"

میں نے کہا "تھانہ اکبری منڈی" میں نے کہا "وہیں بند رہے گا فی الحال۔"

"بے چارہ" اس نے دکھ سے کہا "ابھی کیا عمر ہے اس کی۔"

"مگر لڑکا جی دار ہے۔ زندہ رہنا جانتا ہے۔ شاہ جی نے بعد میں لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا۔"

"مجھے کیا معلوم؟"

"تو اوپر کھڑی سب دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔"

"ہاں۔ مگر میں شاہ جی کے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔ دو خاص آدمی تھے جو اس کے ساتھ تھے۔ صبح تین بجے لوٹے تھے۔ گاڑی شاید کہیں سروس کے لئے دے کر آئے تھے۔"

میں نے کہا "شاورد جی، اب میں سوال کرتا ہوں۔ آخر ایسے کب تک چلے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ شاہ جی مجھے تیرے ساتھ دیکھ لیں اور پھر میرے ساتھ جو ہوگا سو ہوگا، اس نے تجھ پر ظلم کیا تو۔۔۔"

"تو کیا کرے گا ہیرو؟ مار مار کے سب کو لہولہان دے گا اکیلا ہی جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے وہ۔"

"اور تم وہ سرمہ محبوب نظر اپنی چشمِ فسوں ساز میں لگا کے مجھے خواب میں دیکھو گی یا میرے مرقد پر آنسو بہانے آؤ گی۔ کیا کہتا ہے شاعر۔ شاید میری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی۔"

"تربت ہو گی کہاں۔ یہ جو رات مارا گیا تھا، اس کی لاش تک غائب کر دی ہو گی شاہ جی نے۔"

"شاورد۔ اگر اس نے تجھ پر انگلی بھی اٹھائی نا تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ ریوالور ہے میرے پاس" میں نے کہا۔

شاورد نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "کہاں ہے وہ ریوالور۔ لا مجھے دے۔ ایسے کھلونے بچوں کے ہاتھ میں خطرناک ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے دبوچ لیا "الو کی پٹھی۔ پھر پچہ کہا تجھے۔ بتاؤں تجھے میں کتنا بڑا ہوں۔ لے جاؤں اٹھا کے اندر اسٹور میں۔"

وہ مچھلی طرح کسمسائی "چھوڑ مجھے۔ پاگل، ابھی آ جائے گا کوئی۔"

"آنے دے" میں نے اسے کئی بار چوما "میں صرف تیری وجہ سے چپ ہوں ورنہ کوئی روک سکتا ہے مجھے؟" میں نے اس کے غصے اور مزاحمت کی پروا نہیں کی۔

اسی وقت رئیس اندر آ گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہو گئیں اس کا سارا وجود پتھرا گیا۔ پھر اس نے چیخ کے کہا "ناصر، حرامی کتے۔"

شاورد کو میں نے رئیس پر نظر پڑتے ہی چھوڑ دیا تھا مگر اس کے ردِ عمل نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ ایک جست لگا کے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے رئیس اپنے سر سے ٹکرا کے مجھے نیچے گرا چکا تھا اور میرے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میری گردن پر جم گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

شاورد نے ایک چیخ ماری "رئیس!"

میں نے ابھی تک مزاحمت نہیں کی تھی۔ مجھے اس کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ رئیس دیکھنے میں دبلا پتلا اور فاقہ زدہ نظر آتا تھا مگر ہلا کا پھرتیلا تھا اور چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑتا ہی رہتا تھا۔ جسمانی طور پر میں اس کے مقابلے میں بہت توانا اور صحت مند تھا اور اس جیسے کسی بھی نوجوان کو روئی کی طرح دُھنک کے رکھ سکتا تھا۔ کم سے کم میرا اپنے بارے میں یہی خیال تھا۔

کبھی رئیس سے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا، ایسا میں نے سوچا ہی نہیں تھا مگر وقت آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمزور حریف نہیں ہے۔ میں نے پورا زور لگا کے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے الگ کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کے لئے جسم کی ساری طاقت صرف کر دی مگر اس نے مجھے نہ اٹھنے دیا اور نہ پلٹنے دیا۔ چند سیکنڈ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی وحشت میں رئیس مجھے جان سے مار ڈالے گا۔

میں نے اس کے پیٹ میں مکّا مارا پھر اپنا سر اس کے سر سے ٹکرایا مگر اس کے شکنجے کی طرح جکڑ لینے والے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکا۔ اب میرا سانس رکنے لگا تھا اور میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے دن کا اُجالا ماند پڑنے لگا تھا۔

اس وقت وہ ہوا جو میرے یا رئیس کے لئے ایک حیران کن تھا۔ شاورد نے کئی بار چلا کے رئیس کو آواز دی تھی اور اسے اپنے کمزور ہاتھوں سے کھینچ کر الگ کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی مگر رئیس کے جسم کو یہ طاقت دینے والا بھی شاورد کا عشق ہی تھا۔ محبت کا جو دیا اس کے من مندر میں ہمیشہ روشن تھا، اچانک بھڑک کر جوالا مکھی بن گیا تھا۔ ایک فتنہ کام آرزو کی پرورش وہ بڑے تحمل اور ضبط کے ساتھ کر رہا تھا۔ یکلخت ضبط کی دیوار گر گئی اور شکستِ آرزو کے ایک لمحے نے اسے دیوانہ کر دیا۔

شاورد نے اس کے سر پر کچھ مارا۔ وہ چلّا کے گرا اور میں نے اس کے نحیف ہاتھوں کی گرفت کو کمزور پڑتے محسوس کیا۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر اسے اچھال دیا اور تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت میں اتنا مشتعل تھا کہ شاورد میرا راستہ نہ روکتی تو میں رئیس کو جان سے مار ڈالتا۔ اس وقت ہم دونوں جبلی طور پر حیوان ہو گئے تھے۔ ایک کتیا کے لئے لڑنے والے دو کتوں کی مثال یقیناً کراہیت پیدا کرتی ہے مگر الفاظ کی اس مصنوعی شائستگی سے حقیقت نہیں بدلتی جس میں ایک ہی جگہ کو لیٹرین، بیت الخلا، ٹائلٹ، جائے ضرورت، باتھ روم، فارمین آنٹی یا لیڈیز روم لکھ کے واضح کیا جاتا ہے کہ یہاں آپ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو تمام جانور کرتے ہیں۔

شاورد کے ہاتھ میں کشکول تھا۔ شاید اسی فقیر کا جس کی لاوارث لاش اپنے اعمال کی دنیاوی سزا بھگتنے کے لئے کسی گرلائن میں یا گوشت پوست کے بنے کچھے ٹکڑوں کی صورت میں سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ شاورد نے وہ کشکول رئیس کے سر پر مارا تھا۔ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے۔

رئیس کا سر نہیں پھٹا تھا مگر وہ فرش پر گرا ہوا اٹھنے کی کوشش میں کراہ رہا تھا۔ شاورد کشکول پھینک کر ایک ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آتشِ غضب کے شعلے لپکتے محسوس ہوتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھہر جا ناصر۔ تو کچھ مت کر" شاداب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر میری راہ میں روڈ بیریر کی طرح حائل کر دیا۔

رئیس آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ خجالت اور ذلت کے کرب کا ویسا ہی غلیظ مواد تھا جیسا کسی پھوڑے کے پھٹ جانے کے بعد بہہ نکلتا ہے جو درد کو پسپا کرتا ہے اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ شاداب کا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا "تو مارنا چاہتا تھا ناصر کو۔ جان لینا چاہتا تھا اپنے دوست کی؟ آخر کیوں..... بول....."

رئیس کا ہاتھ اپنے گال تک گیا اور رک گیا "مجھے..... معاف کر دو جی۔"

"اسے دوستی کہتا ہے تو کمینے۔ ذلیل آدمی' کیا تو جانتا نہیں کہ میں محبت کرتی ہوں ناصر سے۔ یہ مرجاتا تو خوش ہوتی تجھے؟ مجھے جیتے جی مار کے کیا ملتا تجھے کمینے! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس کے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

رئیس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے "مجھ سے بھول ہوگئی تھی۔ میں غلط سمجھا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ناصر زبردستی کر رہا ہے تمہارے ساتھ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔"

مجھے اس پر ترس آنے لگا "رئیس۔ میں نے کبھی کوئی بات تجھ سے نہیں چھپائی۔ پھر تو نے یہ کیسے فرض کر لیا۔"

"میں پاگل ہو گیا تھا یار۔ پتا نہیں کیسے..... میرے اندر شیطان گھس گیا تھا۔ اس نے میرا دماغ الٹ دیا....."

"چل دفع ہو جا یہاں سے۔ تو اب بھروسے کے قابل نہیں رہا۔ کیا پتا پھر کب تیرا دماغ الٹ جائے۔ میں تیری منحوس شکل دوبارہ نہ دیکھوں۔"

"ایسا مت کہو جی ایسا ظلم مت کرو" وہ منت سماجت کرنے لگا "میں اور کہاں جا سکتا ہوں' بس مجھے یہاں پڑا رہنے دو۔ میرا دنیا میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ تیری صورت اس شہر میں بھی نظر آئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تو جانتا ہے نا مجھے۔ تو نے ناصر سے دشمنی کی۔ اب تو میرا دشمن ہے۔ میں ایک موقع دے رہی ہوں تجھے۔ جان پیاری ہے تو چلا جا....."

رئیس نے التجائی نظروں سے میری طرف دیکھا "ناصر۔ کیا تو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے اب؟ تو بھی معاف نہیں کرے گا مجھے۔ میں نے مان لیا ہے نا کہ غلطی میری سمجھ کی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ تو زبردستی کر رہا ہے۔ شاداب کو بچانے کے لئے میں نے ایسا کیا' میں سمجھا..... وہ سب جھوٹ تھا جو تو نے کہا تھا۔"

"وہ جھوٹ نہیں تھا۔ شاداب نے تجھے صاف بتا دیا ہے۔ تیرے سامنے مان لیا ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

رئیس کا چہرہ تاریک ہو گیا "ہاں۔ آج کے بعد میں تیری حفاظت کروں گا۔ تیری بھی اور شاداب کی بھی۔ تو بھروسا کر مجھ پر۔"

شاداب نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ نہ مجھے کسی محافظ کی ضرورت ہے اور نہ ناصر کو۔ ہم اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔ اور کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں کسی سے تو یہ اس کی بھول ہے۔ جا بتا دے اپنے استاد کو۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "شاداب۔ تم جذبات میں بہہ رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ چلو جو ہونا تھا ہو گیا' وہ اپنی غلطی مان رہا ہے۔"

"نہیں" وہ چیخ کے اور پیر پٹخ کے بولی "تو اس کا حمایتی مت بن۔ یہ آستین کا سانپ ہے ناصر۔ ڈس لے گا تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

میں نے رئیس کا ہاتھ تھام لیا "یہ میرا دوست ہے اور دوست ہی رہے گا۔ تجھے ہمارے بیچ میں تھانے داری جتانے کی ضرورت نہیں۔"

شاداب کا چہرہ یوں زرد پڑ گیا جیسے میں نے رئیس کو اس پر ترجیح دے کے اسے بے عزت کر دیا ہے۔ اس کی بات نہ مان کے اسے رئیس کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ "یہ بات ہے تو پھر جا اس کے ساتھ تو بھی۔" وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

جو ناشتا میرے لئے رئیس لایا تھا' وہ فرش پر ایسے ہی رکھا ہوا تھا۔ مجھے شاداب کے ساتھ ناشتا کرنا تھا مگر اب یہ ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی کیونکہ میں نے اس کے جذبات کا پاس نہ کرتے ہوئے رئیس کی طرف داری کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ رئیس نے جو کیا' وہ ایک لمحے کے احساس کا ردِعمل تھا۔ میں نے شاداب کو زبردستی پکڑ رکھا تھا اور وہ غصے میں مجھے کوٹ رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی۔ رئیس نے یہ نہیں سمجھا کہ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔ اور شاداب کو بچانے کے لئے وہ بیچ میں کود پڑا۔ اس کی شاداب سے محبت یکطرفہ سہی مگر یہ معاملہ دل کا تھا' عقل کا نہیں۔ عقل کا مقابلہ اس نے ایک ناگزیر حقیقت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا اور شاداب کی محبت سے تائب ہوئے بغیر اس پر میرا حق بڑی فراخ دلی سے تسلیم کر لیا تھا۔ اسے نہ مجھ سے حسد تھا نہ رقابت کا کینہ۔ وہ اپنی دوستی میں بھی اتنا ہی مخلص تھا جتنا شاداب کے لئے اپنی چاہت میں مگر یہ چاہت صرف پرستش کا ایک جذبہ تھی جس میں طلب کا کوئی دخل نہیں تھا۔

میں یہ سب سمجھتا تھا چنانچہ میں نے رئیس کی دوستی کو بچا لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شاداب مجھ سے خفا نہیں رہ سکتی مگر رئیس سچ مچ چلا جاتا تو شاید پھر لوٹ کے نہ آتا اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ احساسِ جرم پر شرمندگی کا جذبہ اسے خودکشی پر مجبور کر دے۔ اپنی ذلت پر شرمندگی کا احساس اتنا شدید غلبہ حاصل کر لے کہ وہ کہیں جا کے ڈوب مرے۔ شاداب کو پھر منایا جا سکتا تھا۔ ابھی رئیس کے

احساسِ شکست کی ندامت اور اس کی اذیت کو کم کرنے کے لئے اس کا یقین اور اعتماد بحال کرنا ضروری تھا۔

میں نے اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کے کہا "ابے چھوڑ یہ رونا دھونا سالے۔ تیری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے مجھے۔ تو یار ہے میرا۔"

"نہیں ناصر۔ میں کمینہ' ذلیل اور شیطان ہوں۔ بڑا حرامی ہوں۔"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ میں بھی ہوں' اور اسی لئے ہم دوست ہیں۔"

"میں نے تجھے جان سے مارنے کی کوشش کی۔"

"جسے اللہ رکھے اسے رئیس چکھے۔ یہ ناممکن تھا بیٹے۔ تو غصے میں تھا۔ میں نے بھی غصے میں دو کے مارے تجھے' حساب برابر ہو گیا۔"

"میں حسد کرتا ہوں تجھ سے۔"

"کرتا رہ۔ حسد تو بھائی سے بھائی بھی کرتا ہے مگر اس سے رشتے میں فرق نہیں پڑتا۔ اپن ایسے ہی دوست رہیں گے یار۔ لڑیں گے' ماریں گے ایک دوسرے کو' گالیاں دیں گے اور ذلیل کریں گے مگر دوست رہیں گے۔"

رئیس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "مگر یار! شاداب....."

"بھاڑ میں گئی شاداب!" میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا "ایک یار پر ایسی دس شاداب قربان۔ لڑکیوں کا کیا ہے یار۔ ایسے ہی روٹھتی ہیں ناگہ کوئی منائے۔ میں بھی منالوں گا اسے۔ وہ خود مان جائے گی۔ آج رات میں لوٹ کے نہ آؤں اور کل فون کروں کہ میں آؤں گا تو رئیس کے ساتھ اور اس شرط پر کہ تم اس سے معافی مانگو گی۔"

"چھوڑ یار۔ ایسی بے وقوفی کبھی مت کرنا۔ وہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔"

"تو شرط لگاتا ہے مجھ سے۔ ایسی کی تیسی اس کی ضد کی" میں نے کہا "ابے یہ غصہ اسی لئے حرام ہے۔ آدمی کو کچھ خیال نہیں رہتا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ چل باہر چل کے ناشتا کرتے ہیں کمیں۔"

رئیس رک گیا "مگر یار۔ اس نے بھی تو کچھ نہیں کھایا صبح سے۔"

"یہ پڑا ہے ناشتا۔ کھالے گی اگر ضرورت محسوس کرے گی۔ اور نہیں کھاتی تو کھائے خماں نوں....." میں نے کہا۔

میرا ہرگز وہ مطلب نہیں تھا جو میں نے کہا مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری سٹی گم ہو گئی۔ شاداب پہلے زینے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی "خود غرض' کمینے آدمی۔ تیری فکر میں صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا "پھر آجاؤ۔ دیر کیوں کر رہی ہو؟"

اس نے پلٹ کر جاتے جاتے کہا "میں چائے کے لئے پانی رکھ آئی تھی۔"

میں نے رئیس کو آنکھ ماری اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "چل آجا میرے ساتھ۔ یاد کرے گا تو بھی کہ تیرا یار ناصر کیا چیز تھا جسے تو گلا گھونٹ کے مار رہا تھا سؤر کے بچے۔"

رئیس کے لئے یہ عزت افزائی ایک انہونی بات تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صرف میرا دوست ہونے کی وجہ سے وہ اتنا معزز ہو گیا ہے کہ شاداب کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھ کے اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیئے گا کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس کو ذلت سے بچا کے عزت کا یہ مقام دلوانے والا میں تھا۔ یہ ہماری دوستی کی تاریخ کا سب سے روشن دن تھا جب اس دوستی کی دیوار کو ہم نے خلوص' اعتبار اور یقین کی ناقابلِ شکست بنیادوں پر استوار کیا۔ اس دن کے بعد جہاں رئیس کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی وہیں شاداب نے بھی اسے میرے دوست اور بھائی کی حیثیت دے کر میرے دل پر اپنی محبت کے نقش کو زیادہ گہرا کر دیا۔

ہم دوپہر کے بعد نیکے سے ملنے گئے۔ شاہ جی کا نام تھانے میں معتبر تھا مگر نہ جانے کیوں ڈیوٹی افسر نے جو ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا ملاقات کرانے سے انکار کر دیا۔

"حوالدار جی! کیا مسئلہ ہے آخر؟" رئیس نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

"اوئے مسئلے دے پُتر۔ وہ نہیں ملنا چاہتا کسی سے۔ اس نے بولا ہے کہ جو آئے اسے کہہ دو نکل جائے" حوالدار بولا۔

"فیکا جو چاہے کہے' ہمیں شاہ جی نے بھیجا ہے تو ہم بات کر کے ہی جائیں گے۔" میں نے متانت سے کہا۔

"یہ کون ہے۔ ٹنڈے لاٹ راہ پتر" حوالدار گرم ہو گیا۔

"یہ..... شاہ جی کا چھوٹا بھائی ہے۔ ناصر شاہ!" رئیس بولا "ابھی نیا ہے' افسروں سے بات کرنا نہیں آتی۔"

"ہم سکھا دیں گے دو منٹ میں" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ سیدھی بات کرو کتنے پیسے چاہئیں۔ ورنہ میں واپس جا کے بتا دیتا ہوں شاہ جی کو۔ وہ پھر بات کر لیں گے انچارج صاحب سے....."

حوالدار کا رویہ گرگٹ کے رنگ کی طرح بدل گیا "ایسے بولو ناجی کہ انچارج صاحب نے کہا ہے۔ چھوٹے شاہ صاحب' غصے کی کون سی بات ہے۔ دراصل....."

"دراصل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بندہ ذرا مارا تھا۔ رات تفتیش کرنے والے کو کسی نے بتایا نہیں کہ اپنے شاہ صاحب کا آدمی ہے۔ آپ ادھر پیچھے چلے جاؤ۔ کوارٹروں کی طرف۔"

رئیس ان معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور بولا "آجاؤ ناصر شاہ جی۔ میں نے دیکھی ہے جگہ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ پولیس کے نچلے عملے کا ایک رہائشی کوارٹر تھا جس کو انہوں نے غیر قانونی طور پر ٹارچر سیل بنا رکھا تھا۔ شہری علاقوں میں جہاں معمولی سی بات پر اخبار والے رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ اعلیٰ عدالتی حکام مداخلت کرتے ہیں اور وکیل چھاپے پڑوا دیتے ہیں' پولیس تھانے کی حوالات میں ہر کام قاعدے قانون کے مطابق ہوتا نظر آتا ہے۔ حوالاتی دی ہوتے ہیں جن کا اندراج روزنامچے میں مکمل ہو۔ تفتیش بھی بے ضرر چھتروں تک محدود رہتی ہے۔ قانون کے نام پر ظلم اور تفتیش کے لئے تھرڈ ڈگری کے انسانیت سوز کارنامے سرانجام دینے کے لئے کوئی ایسی خفیہ جگہ تلاش کرلی جاتی ہے' جہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہ ہو۔

کوارٹر کا دروازہ سادہ کپڑوں والے پولیس مین نے تھوڑا سا کھولا "کیا بات ہے' کون ہو تم؟"

میں نے کہا "میں ناصر شاہ ہوں۔ شاہ جی کا چھوٹا بھائی۔"

"ہم فیکے سے ملنا چاہتے ہیں' انچارج صاحب کی اجازت سے۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دروازے کے پیچھے سے ہٹ گیا۔ کوارٹر کے برآمدے میں بھی دو پولیس والے سر کے اوپر تک چادریں تانے سو رہے تھے جو شاید رات بھر تفتیش کی مشقت سے تھک گئے تھے۔

فیکا اندر والے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے بند ہونے سے اندر اندھیرا تھا۔ میری نظر کچھ دیر بعد دیکھنے کے قابل ہوئی تو مجھے فیکا فرش پر چت پڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بے حس و حرکت تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے مگر اس نے سر گھما کے رئیس کی طرف دیکھا اور پھر گالیاں بکتے ہوئے رونے لگا۔ اس کا خیال تھا اور شاید غلط نہیں تھا کہ اس کی یہ حالت شاہ جی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر پھر درد ناک آوازیں نکالتا ہوا گر گیا۔ اس کے لئے سیدھا بیٹھنا ناممکن تھا۔

رئیس کے ساتھ میں بھی فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "پھر اب کیا سوچا ہے تو نے فیکے؟"

"میں بتا چکا ہوں" اس نے نفرت سے کہا "اور اپنے اس..... شاہ جی سے کہہ دینا کہ میں نے وکیل کرلیا ہے۔ وکیل نے ساری بات اخبار والوں تک پہنچا دی ہے۔ اب کوئی مجھے قتل نہیں کرسکتا۔ دفع ہو جا یہاں سے مردود۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو جا..... میں فیکے سے علیحدگی میں بات کروں گا۔"

رئیس چلا گیا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فیکا اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ملاّ ٹھیکے دار کی بیٹی سے شادی نہیں کرسکتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی نیت میں فتور تھا۔ ملاّ ٹھیکے دار کینسر سے مرنے والا تھا۔ اس کے مرتے ہی وہ ملاّ کی باگل بیوی کو پاگل خانے پہنچا تا اور مسئلہ رہ جاتا صرف چھوٹے بچے کا جو اتنا چھوٹا تھا کہ فیکے جیسے شخص کے لئے اسے اپنی راہ سے ہٹانا بہت آسان تھا۔ فقیروں کے اس کاروبار میں بچوں یا معذوروں کی خرید و فروخت' ان کا ایک شہر سے دوسرے شہر جانا یا غائب ہو جانا عام سی بات تھی۔ فیکا محبت کا جال پھیلا کے ملاّ ٹھیکے دار کے بزنس پر قابض ہو جانا چاہتا تھا مگر اس کی بدقسمتی کہ ملاّ ٹھیکے دار نے مرنے سے پہلے ہی سارے معاملات اپنے حریف شاہ جی کو سونپ دیے۔ شاہ جی اس کا کاروباری حریف ضرور تھا مگر موت نے حریف کو حلیف بننے پر مجبور کیا تو شاہ جی نے اخلاقی رواداری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساری ذمے داری قبول کرلی۔ فیکے کا سارا منصوبہ فیل ہو گیا۔

میرے سمجھانے کے باوجود اس نے انکار جاری رکھا "جب اسے بھروسا ہی نہیں مجھ پر تو میں اس چکر میں کیوں پڑوں؟"

"یہ چکر خود تو نے ہی چلایا تھا۔ کیا اب تجھے محبت نہیں رہی اس سے؟"

"محبت میں آدمی عزت نہیں گنواتا۔ ملاّ ٹھیکے دار کو کیا ڈر تھا مجھ سے کہ اس نے سارے معاملات شاہ جی کے سپرد کردیے۔ بچی کا گھر والا پیٹے جیسا ہی ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا' میں انکار کرتا تو الگ بات تھی۔ داماد سے بڑھ کر ہو گیا وہ' جسے ملاّ اپنا دشمن کہتا تھا۔"

میں نے کہا "فیکے۔ کاروبار کی بات مت کر۔ محبت تو نے کی تھی ایک لڑکی سے۔"

"اچھا ہوا اگر مطلب نکلتے ہی بھاگ جاتا۔ میں نے عزت کے ساتھ شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ بھاگنے کو بھی تیار تھی۔ میں بھگا لے جاتا اسے اور کسی کے حوالے کردیتا دس بیس ہزار میں' پھر ٹھیک رہتا۔"

"کیا تو ایسا کرسکتا تھا؟"

"نہیں کیا..... یہی بُرا کیا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ اچھا کیا تو نے۔ اب انکار سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لڑکی تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بکواس کرتی ہے وہ۔ جھوٹ بولتی ہے۔"

"پھر کس کا ہے وہ بچہ؟"

"مجھے کیا معلوم۔ تو کیوں اس کا وکیل بن کے آیا ہے۔ مجھے کیا پتا وہ کس کس کے پاس جاتی تھی..... اس کا باپ کس کس سے پیسے وصول کرتا تھا..... دلالچی آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہوتا فیکے تو پھر تو اس سے شادی بھی نہ کرتا۔ اب تو جانتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ الزام لگا رہا ہے تو اپنی جان بچانے کے لئے مگر اتنا سمجھ لے بیٹا' تو اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہا ہے۔" میں غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"..... جا۔ کہہ دے اپنے شاہ جی سے کہ میں نے اپنا معاملہ

اخبار والوں کو دے دیا ہے۔ دو وکیل بھی آئے تھے مجھ سے ملنے۔ میرا بیان بھی لیا انہوں نے اور دستخط بھی کرائے۔ تھانے دار کی بولتی بند کردی تھی انہوں نے۔"

میں نے طنز سے کہا "تیری حالت سے اندازہ ہوتا ہے۔"

"وہ تھے انسانی حقوق والے۔ انہوں نے کہا کہ وہ میری طرف سے جیل میں بیٹھ کر جائے کی درخواست گزار رہے ہیں۔ میری ضمانت ہو جائے گی۔ شاہ جی سے کہو' پتی خیر منائے۔ ہیومن رائٹس سیشن کا نام سنا ہے اس نے....؟"

"تو بڑا سیانا اور قانون داں ہو گیا ہے فیکے۔ مگر یہ مت بھول کہ تو ان کے لئے بس ایک کیس ہوگا۔ ایسے ہزاروں لاکھوں کیس دنیا کے ہر ملک میں ہوتے ہیں جن پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ یہ پاکستان ہے' یہاں تو گیا اور تیری اوقات کیا۔ مارنے والے سے بچانے والے مار دیتے ہیں۔"

میرا اسے قائل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ میں نے باہر آکے رئیس کو بتا دیا "اسے چھوڑ دے اس کے حال پر۔"

"شاہ جی نے کہا ہے کہ اسے شام کو ملاّ کے ڈیرے پر حاضر کرو" وہ افسوس سے سر ہلانے لگا "مارا جائے گا سالا۔"

"جس کی قضا آئی ہو اسے کون بچا سکتا ہے" میں نے کہا "بڑی نیت کا بُرا انجام۔"

تھانے سے نکلنے کے بعد میں رئیس کے ساتھ چمٹا رہا۔ وہ بلاشبہ شاہ جی کا بڑا مستعد نمائندہ تھا۔ بسوں' ویگنوں میں چڑھتے اترتے اس نے تقریباً ہر نھکانے کو چیک کیا اور بہت سے فقیروں کے ساتھ حساب کیا۔ ڈھائی ہزار روپے ایک تھانے میں پہنچانے اور پھر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے باقی رقم دوڑتے رہنا جو سات ہزار سے اوپر تھی' ساری رقم وہ اپنی ڈھیلی پتلون کی بیلٹ کے نیچے ایک خفیہ جیب میں ڈال کے رکھتا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا "یار ناصر۔ سچ سچ تو ناراض نہیں ہے مجھ سے۔"

"ابے اور کیسے یقین دلاؤں تجھے کہ میرے دل میں کوئی گلہ نہیں۔"

"مگر میں نے تیرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"تو جذباتی ہو گیا تھا۔ بھول جا یہ بات۔"

"کیا آپا جی بھی بھول جائے گی" اس نے شاذ و نادر ہی نام لینے سے گریز کیا۔

"وہ بھول چکی۔ تو دوست ہے میرا۔ اسے تیری عزت کرنی ہی پڑے گی رئیس۔ بالکل اسی طرح جیسے تو اس کی عزت کرتا ہے۔ آج شادی کے ڈر سے مگر ایک دن تمہیں بھائی بن جانے گی۔"

"کب یار..... کب؟" اس نے بڑے اشتیاق اور بے چینی سے پوچھا۔

"بہت جلد۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔"

"ہمیں کیسے پتا چلے گا یار کہ آپا جی اپنی بھابی ہو گئی۔"

میں نے کہا "کیسی بات کرتا ہے۔ تیرے بغیر یہ شادی ہو سکتی ہے؟ اور کوئی بھی نہ ہو مگر اپنا یار ضرور موجود ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں رئیس' تو بھی چل ہمارے ساتھ ورنہ بعد میں تیرے لئے مشکل ہوں۔"

"مشکل تو ہوگی۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کباب میں ہڈی....."

"بکواس مت کر۔ ہم ایک گھر میں رہیں گے۔"

رئیس نے اچانک سر پر ہاتھ مارا "اتنی ضروری بات بتانا بھول گیا میں۔ صبح دماغ ایسا خراب ہوا کہ ابھی تک اثر ہے۔ مجھے وسیم ملا تھا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "کون وسیم؟"

"اب کتنے وسیم ہیں خیر سے جاننے والے؟ ناصر کا قاتل چاچا اور کون....."

میں چونک پڑا "وہ..... کہاں ملا تھا؟"

"بس ایسے ہی شام کو چار ٹکٹ مل گئے تھے۔ بیس کے پچاس کا بھاؤ چل رہا تھا۔ بڑی خانم انگلش فلم لگی ہوئی ہے۔ وہاں وہ بھی آئیں۔ ایک موٹی اور کالی سی لڑکی ساتھ تھی۔ بڑا سرخی پاؤڈر نگار کھا تھا اور نخرے ایسے جیسے پری ہو کوہ قاف کی۔ سالے نے بعد میں پہچانا مجھے۔ مدتیں لگ لئے اور سو کا نوٹ دیا تو میں نے آنکھ ماری اسے۔ ہم تو ناز جاتے ہیں بیٹا کہ کون بیوی کے ساتھ ہے اور کس کے ساتھ ماشوق۔ میں نے کہا "جاؤ عیش کرو۔ تم عیش نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔"

"ایسا کیوں کہا تو نے؟"

"بس یار۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے کیسے تیرے دوست کا مال ہتھیانے کے لئے اس کی ماں کو بھی مروا دیا تھا اور پھر بیٹے کو بھی مروا دیا تھا۔ مکان زیور سب پر قبضہ کرلیا تھا۔ تو بہت جذباتی تھا پہلے اس سے بدلہ لینے کے لئے۔ اب بات پرانی ہو گئی ہے۔ تو بھی بھول گیا ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "میں بھولا نہیں ہوں رئیس۔ مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔"

"جانے دے یار۔ جو وقت گزر گیا سو گزر گیا۔ آدمی کے جذبات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔"

میں نے کچھ شرمندگی محسوس کی۔ "میں پڑ گیا تھا شاذو کے چکر میں۔ لیکن میں نے جو قسم کھائی تھی' وہ مجھے یاد ہے۔"

رئیس بولا "میری بات پر سالا بدک گیا۔ مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا کہ تمہارا وہ دوست کہاں ہے۔ جو میرے بھتیجے ناصر عظیم کا ہم نام تھا۔ میں نے زیادتی کی اس کے ساتھ۔ لیکن میرا کوئی قصور نہیں' اس پر جھوٹا الزام لگانے والی میری پہلی بیوی تھی۔"

"پہلی بیوی" میں اچھل پڑا "کیا اس نے دوسری شادی کرلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رئیس نے اقرار میں سر ہلایا "اس کی بات پر میں بھی چونکا تھا۔ میں نے کہا کہ کیا وہ مر گئی؟ اس نے کہا کہ نہیں' میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کلو پری دور کھڑی اشارے کر رہی تھی کہ چلو۔ میں نے تاڑ لیا کہ ہو نہ ہو' یہ اس کی دوسری بیوی ہوگی۔ میں نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ میں نے کہا کہ "یہ تمہاری دوسری بیوی ہے؟" وہ انکار کیسے کرتا' کہنے لگا کہ ہاں۔ اپنا دوست ملے تو اس سے کہتا کہ میری اس کی کوئی لڑائی نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا' وہ مجھے معاف کر دے۔"

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ میں نے اسے ایک سو ایک گالیاں دیں "اس کی تو..... وہ کہتا ہے اس نے مجھے معاف کر دیا۔ ابھی تو کچھ کیا ہی نہیں میں نے۔ اب تو مجھے اس..... سے دہرا حساب برابر کرنا ہے۔ ایک ناصر کا اور ایک اپنا۔"

رئیس نے کہا "ابے آہستہ بول۔ لوگ سن رہے ہیں۔ اچھا چل اُٹھ یہاں سے' لے پانی پی۔"

میں نے ایک گھونٹ پانی پیا اور رئیس کے ساتھ باہر آ گیا۔ رئیس کی باتوں نے انتقام کی پرانی آگ کی دبی ہوئی چنگاری کو پھر ہوا دے کر روشن کر دیا تھا۔ درد کی پرانی کسک میرے دل میں پھر جاگ اٹھی تھی۔

میں نے کہا "رئیس۔ تُو نے دیکھا۔ گیدڑ کی موت اسے شہر کی طرف لے جاتی ہے۔ وسیم کی شامتِ اعمال اسے تیرے پاس لائی تھی۔ تو کیا سمجھتا ہے وہ واقعی اپنے کیے پر نادم ہے؟"

"نہیں۔ اصل بات بعد میں سمجھی میں نے۔ اس سالے کی اکڑفوں نکل گئی ہے۔ وہ اکڑتا تھا اپنے سالے تھانے دار کی طاقت پر۔ تھانے دار کی بہن کو اس نے چھوڑ دیا۔ اب الٹا تھانے دار ہی اس کا دشمن ہو گا۔ یہ معافی کا ڈراما بھی اسی لئے تھا کہ اب کسی تھانے دار کی حمایت حاصل نہیں ہے اسے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھا تو نے۔ اب آیا نا اونٹ پہاڑ تلے۔ آخر پہلی بیوی کے ساتھ کیا جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"جھگڑا کیا ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس..... کے ہاتھ میں آ گیا صفت کا مال۔ وہ بھی لاکھوں میں۔ اسے سو بھی ہو گی عیاشی کی۔ شیطان تو ایسے دماغ کے ٹھکانے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کلو پری کے چکر میں پڑ گیا ہو سالا۔ مجھے وہ کوئی شریف لڑکی نہیں لگی تھی۔ وہ خود کون سا شہزادہ گلفام ہے تیرے جیسا۔"

"میری مثال مت دے۔"

"مثال کیوں نہ دوں پیارے۔ ایک وہ ڈاکٹرنی' پھر یہ شادو۔ دونوں کم دیوانی ہیں تیرے لئے۔ مگر ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے ..... بلکہ دو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کے بچے نہیں ہیں نا۔ مرد کو چاہے بہانہ خواہ قصوروار خود ہو۔ اور ایسے مردوں کی بیویاں بھی بڑی منہ زور ہوتی ہیں۔ ان کو شوہر کی کمزوری کا پتا چل جائے۔ کیا پتا اس کا بھی کسی سے آنکھ مٹکا ہو گیا ہو۔"

میں رئیس کی سمجھ فہمی اور ذہانت پر دنگ رہ گیا۔ "بالکل صحیح اندازہ ہے تیرا۔ بڑی گہرائی تک جاتی ہے تیری نظر۔ علالت کے ایسے ہی اسباب ہوں گے۔ تو نے بڑی دیر سے سائی اتنی اچھی خبر۔ اس کو کہتے ہیں قدرت کا انصاف بیٹے۔ ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے تو دماغ خراب ہو جاتا ہے اس کا۔ مگر بے گناہ کا خون رنگ لاتا ہے ایک دن۔"

"اس کے دل میں ڈر بیٹھا ہوا ہے ابھی تک۔" رئیس نے کہا "ورنہ اتنے عرصے بعد وہ خود ہر بات نہ چھیڑتا۔"

"شادو کو مت بتانا یہ سب۔ وہ پریشان ہو گی۔"

"تو کیا کرنا چاہتا ہے ناصر؟"

میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ ریوالور لے آؤں۔"

"کہاں سے؟ ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ چھت کے اوپر پانی کی ٹنکی میں ڈالا تھا میں نے۔ اچھی طرح پلاسٹک میں لپیٹ کر۔ زیادہ دن گزر گئے تو اس کا پتا چل جائے گا۔ اوپر والے ٹینک کی سال میں دو بار صفائی ہوتی ہے۔"

"پھر کیا تو خود اسے قتل کرے گا؟" رئیس کچھ پریشان ہو گیا۔

"ضروری نہیں۔ ریوالور تو بس ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ دہشت ہوتی ہے اس کی۔" میں نے کہا "ویسے بھی دو دن ہو گئے۔ میں کچھ بتائے بغیر بھاگ آیا تھا' ڈاکٹر صاحب کی فیملی پریشان ہو گی۔"

"فیملی" وہ ہنسنے لگا "مجھے تو لگتا ہے کہ تو فیملی کے لئے زیادہ پریشان ہے۔ بہت یاد آتی ہو گی اس کی۔"

"وہ اچھی عورت تھی۔ میرا مطلب ہے دل کی۔ اس نے مجھے گھر میں بالکل اپنا بنا کے رکھا۔"

"ابے دل کی کیا۔ ساری کی ساری اچھی لگتی تھیں تجھے۔ اور اپنا بنانے میں تو کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی۔ تو خود بھاگ آیا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ اللہ نے مجھے گناہ کی شرمندگی سے بچا لیا۔ پتا نہیں بعد میں حالات کیا رخ اختیار کرتے۔ ایک حرامی نوکر کو شک ہو گیا تھا اور صرف شک کی بات نہیں۔ وہ گھر کے اندر ہونے والے ڈرامے کا برسین دیکھ رہا تھا۔ وہ شکایت کر دیتا ڈاکٹر صاحب سے تو میں اس گھر سے بے عزت ہو کے نکلتا۔"

"دیکھ پیارے۔ اپن تو اس کے حق میں نہیں ہیں کہ آدمی ایک بار دلدل سے نکل آئے تو پھر ادھر کا رخ بھی کرے۔"

میں نے کہا "بات تیری سولہ آنے ٹھیک ہے مگر یار' کہیں ڈاکٹر صاحب نے پولیس کے پاس رپورٹ لکھوا دی تو کیا ہو گا۔ پتا نہیں کتنے تھانوں میں جا چکا ہوں میں تیرے ساتھ اور اکیلا بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اخبار میں اشتہار دے دیں۔ خلاصِ گمشدہ' اور

میری تصویر لگوا دیں۔ لیکن میری کوئی تصویر کہاں ہو گی ان کے پاس۔"

"تیرا جو پیسہ ہے ان کے پاس؟"

"اس کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یاران سے مانگوں تو کیا بہانہ کروں۔ یہ سالی عمر آڑے آتی ہے ہر جگہ۔ اٹھارہ سال ہوتی تو میں بالغ اور خود مختار ہوتا۔ اپنا اکاؤنٹ اپنے پاس رکھتا۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "ایک طریقہ ہے۔"

"میں شناختی کارڈ بنوالوں؟"

"ہاں۔ دیکھنے میں تو اٹھارہ کا لگتا ہے۔ کہہ سکتا ہے کہ انیس کا ہوں جو نہیں ہاتھ تو وہ شناختی کارڈ دیکھ لے اور نہ ماننے والی بات کوئی نہیں۔ تیری صحت اور تیرا قد سب ٹھیک ہیں۔ مجھے دیکھ کیا میں انیس کا لگتا ہوں؟"

میں نے کہا "تو بیس کا لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "بیس سال ہی ہے میری عمر۔ میرا ایک جاننے والا ایجنٹ ہے۔ شناختی کارڈ آفس کے باہر مرغ چھولے بیچتا ہے مگر اس دوسرے دھندے سے زیادہ کما لیتا ہے۔ بڑے مزے کے مرغ چھولے ہوتے ہیں اس کے۔ دفتر میں نیچے سے اوپر تک سب سالے مفت کھاتے ہیں۔"

"تیرا کام مفت کرے گا؟"

"مفت کیوں کرے گا؟ میرا ماما تو نہیں لگتا وہ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سو دو سو کم کر دے۔"

"سو دو سو کا احسان لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کل چلیں گے اس کے پاس۔ کیا خیال ہے کتنے دن میں کر دے گا وہ میرا کام؟"

"ابھی ایک دن میں۔ صبح فوٹو کے ساتھ فارم بھر کے دیں گے۔ شام کو یا اگلے دن شناختی کارڈ مل جائے گا۔ دو ہزار میں بچہ بالغ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ابھی میں ڈاکٹر صاحب سے فون پر بات کر لیتا ہوں تاکہ ان کے دل کو تسلی ہو جائے۔ بعد میں جب بینک اکاؤنٹ اپنے نام کرانے کا معاملہ ہو گا تو خود چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ہمیں گھومتے پھرتے شام ہو گئی تھی۔ رئیس نے کہا "چل یار' ملّا ٹھیکے دار کی طرف چلتے ہیں۔"

"وہاں کیا ہو گا؟"

رئیس نے کہا "ٹھیکے کا مقدمہ پیش ہو گا۔ ملّا کے علاوہ استاد بھی ہو گا۔"

"نیکا وہاں بھی انکار کرے گا؟"

"اس کا باپ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا نکاح ہو جائے گا آج ہی۔ استاد کچا کام نہیں کرتا۔"

"نیکا وہاں آئے گا بھی کیوں؟"

"وہ خود نہیں آئے گا' لانے والے اسے لائیں گے۔ تو چل کچھ تماشا" رئیس بولا اور دوڑ کے ایک ویگن میں چڑھ گیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے لپکتا تھا' کسی ویگن کی طرف۔ اور مجھے اس کا ساتھ دینے کے لئے دوڑ لگانی پڑتی تھی۔ اکثر یہ ویگن میں سوار ہوتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ آخر وہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتاتا کہ اب فلاں ویگن میں سوار ہو کے فلاں جگہ جانا ہے۔ ہم کسی بس اسٹاپ پر رک کے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی دن ایک ہی سواری کی جگہ ہو گی تو میں پیچھے رہ جاؤں گا۔

میں ویگن میں بیٹھا ہی تھا کہ میں نے ایک اور شخص کو ویگن کی طرف دوڑتے دیکھا۔ ویگن روانہ ہو چکی تھی مگر ابھی اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ اگر وہ شخص کوشش کرتا تو سوار ہو سکتا تھا مگر اچانک اس کی اور میری نظریں ملیں اور اسے ایک دم بریک لگ گئے۔ خود میں اسے دیکھ کے چونک پڑا تھا۔ وہ وسیم تھا۔

میں نے رئیس کو متوجہ کیا "ابے اُدھر دیکھ رئیس!"

رئیس نے میری طرف دیکھا مگر اتنی دیر میں ویگن بہت آگے آ گئی تھی "کیا ہے' کیا دیکھوں؟"

"کچھ نہیں۔ وسیم تھا۔ ویگن میں چڑھنے والا تھا کہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔"

رئیس ہنسنے لگا "کیسا عجیب اتفاق ہے۔ سالا کل مجھے مل گیا تھا آج تو نے دیکھ لیا۔ ضرور شامت اسے بلا رہی ہے۔ اگر وہ ویگن میں آ کر تیرے ساتھ بیٹھ جاتا تو بڑا مزہ آتا۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہوتا جیسے جنگل میں مسافر آرام کے لئے کسی سانپ کے بل پر بیٹھ جائے۔"

"سانپ کیا کرتا' میرا مطلب ہے تُو کیا کرتا اگر وہ آ کے تیرے ساتھ بیٹھ جاتا؟" رئیس نے کہا "یا اس کی نظر نہ پڑتی تجھ پر' تو اسے دیکھ لیتا۔"

"میں کچھ بھی نہ کرتا۔ جلدی کس بات کی آخر۔ وہ مجھ سے بات کرتا تو میں کہتا کہ چلو چھوڑو' بھول جاؤ پرانی باتوں کو۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ جب دشمن بالکل مطمئن اور بے خبر ہو تب وار کیا جائے۔"

ملّا ٹھیکے دار اس شان و شوکت کے ساتھ نہیں رہتا تھا جیسے شاہ جی اور اس کا گھر۔ اس کا گھر پرانے شہر کی گلیوں میں تھا۔ باہر سے اس کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جو قدیم وضع کی حویلیوں کا دروازہ لگتا تھا۔ تقریباً نو فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا۔ اس کے دونوں پٹ صدیوں پرانی شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان کی مضبوطی میں سیکڑوں کیلوں سے اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ کیلیں گول موٹے سر والی تھیں اور شاید پیتل کی ہوں گی مگر ان پر پالش ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کالی پڑ کے لوہے کی نظر آتی تھیں۔ دروازے کے پٹ بھی اپنا اصل نیلا رنگ کھو چکے تھے اور کہیں کہیں یہ نیلاہٹ جھلک رہی تھی۔

جیسا کہ مجھے رئیس نے بعد میں بتایا' یہ کسی ہندو کی حویلی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...ں پر آ کے باپ نے قبضہ کیا تھا۔ ملا اس اعتبار سے خاندانی فقیر تھا کہ اس کا باپ بھی امرتسر کے دربار صاحب جانے والے زائرین سے بھیک مانگنے کا ٹھیکا لیتا تھا۔ یہ موسمی ٹھیکے تھے جو میلوں پر عرس یا تہواروں پر بڑے ٹھیکے دار اپنے کسی خاص آدمی کو دیتے تھے۔ بعد میں ملا کا باپ دہلی کی بادشاہی مسجد کے ٹھکانے کا مالک بن گیا اور جب بنگلہ شروع ہوئے تو اپنا سب کچھ سمیٹ کے پاکستان آگیا۔ گداگری کے پیشے میں اس کا تجربہ کام آیا اور اس وقت جب ایک طرف کچھ لوگ ملک کی سیاسی اور معاشی بنیادیں استوار کر رہے تھے' تجارت اور صنعت کی طرف راغب تھے۔ ملا کے باپ نے گداگری کے پیشے کو منظم خطوط پر چلانے کا آغاز کیا۔ یہ پیشہ اب ایک صنعت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ کچھ لوگ اسے مافیا بھی کہتے تھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ملا کو جس کا اصلی نام باپ نے جلال حسین رکھا تھا' گداگروں کی یہ ٹھیکے داری ورثے میں ملی تھی۔ اسے دوسرے ٹھیکیداروں پر کچھ فوقیت اسی وجہ سے حاصل تھی کہ ان میں سے بیشتر اس کے باپ کے شاگرد تھے۔ کاروباری حریف ہونے کے باوجود پرانے لوگ آج بھی وضع داری میں شاہ جی کی طرح اس کا لحاظ کرتے تھے۔

اندر سے وہ حویلی کتنی بڑی تھی' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس میں پچاس کمرے ہیں جن میں سے بیس تہ خانے کا حصہ ہیں یعنی جتنی عمارت اوپر نظر آتی تھی' اتنی ہی زمین کے نیچے بھی تھی۔ دوسری اور تیسری منزل ملا کی رہائش گاہ تھی۔ دوسری منزل پر وہ اپنی نیم پاگل اور معذور بیوی' ایک بہنی اور بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ تیسری منزل پر اس کے کبوتر رہتے تھے۔ محلے میں ملا کو لوگ کبوتر بازی کے فن کے استاد کی حیثیت سے جانتے تھے اور اس کی بہت عزت تھی۔ وہ ایک پابند صوم وصلوٰۃ' خدا ترس اور نیک آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے وظیفے سے اسکول میں نہ جانے کتنے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور غریبوں' محتاجوں کے لئے اس کا ہاتھ کبھی تنگ نہ ہوا تھا۔ عام لوگ اسے نام کی وجہ سے دینا ہی ٹھیکے دار سمجھتے تھے جیسے خیرات کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ اس کے پاس آنے جانے والے بھی فقیر نہیں ہوتے تھے۔ اس نے ہر علاقے میں ایک ایجنٹ مقرر کر رکھا تھا جو فقیروں سے حصہ وصول کرتے اور وہ اسے آگے پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ رئیس کی معلومات کے مطابق بیس فقیروں کا ایک ایجنٹ تھا۔ مگر وہ سب سابق فقیر تھے اور جسمانی معذوری کے ساتھ اعتبار کی بنا پر نگراں بنا دیے گئے تھے۔ صرف یہی ملا ٹھیکے دار سے براہِ راست ملاقات کرتے تھے اور ہر دن یا ہفتے کی رقم کی وصولیابی کا یہ نظام بڑی رازداری اور کامیابی سے چل رہا تھا۔ رئیس کے خیال میں ملا خاندانی گداگر ہونے کی وجہ سے معاشی سے دور رہتا تھا جب کہ شاہ جی کو اپنی دہشت بٹھانے' پولیس اور بدمعاشوں سے مراسم رکھنے اور اپنے گروہ کو اپنی فورس کے طور پر استعمال کرنے کا شوق بھی تھا۔

نیچے کی منزل پر دس کمروں میں کیا ہوتا تھا۔ یہ رئیس کو بھی علم نہیں تھا مگر اندازے کی بنیاد پر اس نے بتایا کہ شاید وہاں سٹور ہوتا تھا اور ہر جمعرات کو لنگر کے بعد قوالی ہوتی تھی مگر یہ افواہ بھی تھی کہ وہاں سے ملا نے ہیروئن کی سپلائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔

رئیس نے کنڈی بجائی تو بارہ چودہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور ہونگ کھڑی ہو گئی۔ ہم بلند چھت والی نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزرے اور میں رئیس کے پیچھے چلتا ہوا دائیں جانب کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے باہر مجھے بھی جوتے اتارنے پڑے۔ وہاں اور بھی جوتوں کے چند جوڑے پہلے سے موجود تھے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک کے رک گیا۔ یہ کمرا نہیں ہال تھا جو شاید تین کمروں کی درمیانی دیواریں ہٹانے سے سرنگ کی طرح لگتا تھا۔ اس کی چوڑائی پندرہ فٹ ہو گی مگر لمبائی پچاس فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ چھت کو سہارا دینے کے لئے دیواروں کی جگہ سیمنٹ کی محرابیں سی بنا دی گئی تھیں اور ان کی انتہائی بلندی پر یعنی عین وسط میں فانوس آویزاں تھے۔ نیچے ایک جیسے قالینوں کا سرخ فرش تھا۔ آخری حصے میں تقریباً چھ انچ اونچے تخت جیسے پلیٹ فارم پر بچھا ہوا قالین سفید تھا اور اس کے نقش ونگار سرخ رنگ کے تھے۔

تخت پر شیشم کے کور والے گاؤ تکیوں پر کمینوں کے سہارے ملا ٹھیکے دار اور شاہ جی نیم دراز تھے اور آپس میں سرجوڑ کے کچھ صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ شاہ جی نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ہم جہاں تھے وہیں رک کر بیٹھ گئے۔ اب بھی ہم ان سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھے چنانچہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "یار نیکا نہیں آیا' کیا بات ہے؟"

رئیس نے مراقبے جیسی پوزیشن سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میری نظر شاہ جی کی طرف گئی تو اس نے ایک انگلی سے مجھے بلایا۔ میں سمجھا اب وہ ضرور مجھے تمیز سے خاموش بیٹھنے کے لئے کہے گا۔

شاہ جی نے خلافِ معمول دھیمے لہجے میں پوچھا "تو ملا تھا ٹھیکے سے؟"

میں نے سر ہلایا "ملا تھا استاد جی' کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"کیا بات ہوئی اس سے تیری؟" ملا نے کہا۔ وہ نرم گفتار آدمی تھا جو پُرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتا تھا۔

"سب بتا دے' تو نے کیا کہا' اس نے کیا کہا؟"

میں نے سب بتا دیا۔ ملا کی صورت پر کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا۔ شاہ جی کے چہرے کے نقوش میں سختی آگئی۔ میرے بعد رئیس کو بلایا گیا اور اس سے پھر کی پوچھا گیا۔ اس نے وہی بتایا جو میں بتا چکا تھا۔ رئیس کی بات جاری تھی کہ نیکا اندر آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے دروازے سے اندر دھکیل دیا ہو۔ وہ کچھ دیر سنبھل کے سیدھا کھڑا ان لوگوں کو دیکھتا رہا جنہوں نے اسے جج کی حیثیت سے اپنی عدالت میں طلب کیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے آیا "کیا بات ہے استاد جی؟"

شاہ جی یا ملا ٹھیکے دار میں سے کسی نے بھی اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ نیکا زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بیٹھنے لگا تو شاہ جی نے ملا ٹھیکے دار کی طرف دیکھا۔

"ایسے نیچے مت بیٹھ۔ میں کرسی منگواتا ہوں تیرے لئے۔" ملا نے کہا اور وہی لڑکی ایک کرسی اٹھا لائی جس نے دروازہ کھولا تھا۔

نیکا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اور رئیس اجازت نہ ملنے کے باعث ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ نیکا اس امتیازی سلوک کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ وہ پریشان ہی نہیں خوفزدہ بھی تھا۔

"ڈر لگتا ہے بابا تجھ سے" شاہ جی نے کہا "تجھے فرش پر بیٹھنے کے لئے کہیں اور تو شکایت کر دے حقوقِ انسانی کے کمیشن والوں کو کہ مجھے بلا کے بے عزت کیا گیا۔"

ملا نے کہا "ہم نے سنا ہے تو نے وکیل کیا ہے۔ پریس کانفرنس کی ہے۔"

نیکے نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "استاد جی۔ یہ غلط ہے۔"

"جو تو نے سنا..... وہ ٹھیک تھا یا نہیں؟" استاد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ میری عرض بھی سن لیں" نیکے نے عاجزی سے کہا۔

"عرض کو چھوڑ۔ ان دونوں نے جو کہا" شاہ جی نے میری طرف اور رئیس کی طرف اشارہ کیا "اس میں کوئی بات ایسی تھی جو تو نے نہیں کی؟"

اس بات کا صاف مطلب یہ تھا کہ نیکا کسی دوسرے کمرے میں پہلے سے موجود تھا اور اس کے کانوں نے رئیس کے اور میرے بیان کا ہر لفظ سنا تھا۔ یقیناً اس کمرے میں کہیں مائکروفون موجود ہوں گے۔

نیکے نے باری باری مجھے اور رئیس کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"تیرا فیصلہ وہی ہے؟" شاہ جی نے کہا۔

نیکے نے کہا "ہاں جی۔"

"ایک بار پھر سوچ لے۔"

"سوچ لیا ہے بہت استاد جی۔ میرے ساتھ زبردستی مت کرو۔ شادی مرضی کا سودا ہوتی ہے' کیا فائدہ کل....."

"کل کس نے دیکھی ہے....." شاہ جی نے کہا اور قالین کے نیچے سے ایک رسی نکال کے میری طرف پھینک دی "اس کے ہاتھ باندھ کر کے پیچھے۔"

نیکا چلانے لگا "یہ آپ کیا کر رہے ہو' آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"

شاہ جی نے گرج کے کہا "نا سر' تو نے سنا نہیں۔"

میں رسی اٹھا کے آگے بڑھا۔ نیکے نے بھاگنے کی کوشش کی مگر جس کے لئے سیدھا چلنا مشکل ہو وہ قالین پر مجھ سے تیز کیسے دوڑ سکتا تھا۔ مجھ سے پہلے ہی رئیس نے ٹانگ اڑا کے اسے گرا دیا۔ میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ بڑی آسانی سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ موڑ کے کمر کے پیچھے کئے اور مضبوطی سے باندھ دیے۔ رسی دس گز سے بھی زیادہ لمبی تھی۔ اس کا ایک سرا جو مشکل سے گز بھر کا ہو گا نیکے کے ہاتھوں کو بے مصرف کرنے کے لئے کافی تھا۔

"باقی رسی کاٹ دے اور اسے بٹھا دے کرسی پر" شاہ جی نے میری طرف ایک چاقو پھینکا۔ میں نے چھ انچ پھل والے چاقو کو کھولا تو اس کی کمانی سے کٹ کٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ نیکے کا رنگ پہلے ہی اڑ گیا تھا۔

وہ چیخنے لگا "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ مجھے مارو گے تو سب پھنس جاؤ گے۔ سب کو پھانسی ہو جائے گی' میں بتا رہا ہوں....."

شاہ جی نے چھت کی طرف دیکھا "باقی رسی اوپر باندھ دے۔"

چھت میں دو کنڈے تھے۔ ایک سے جھولا لٹکا ہوا تھا۔ دوسرا فانوس یا لائٹ کے لئے ہو گا مگر فانوس اب محرابی دروازے میں آویزاں تھے۔ اتنی اونچائی تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ رئیس نے مجھے گھوڑی بننے کا اشارہ کیا اور میری کمر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اب بھی کنڈے سے دور تھا۔ شاہ جی کے اشارے پر میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور رئیس نے میرے کندھوں پر قدم جما دیے۔ اس کے ہاتھوں نے بڑی مہارت سے رسی کو کنڈے میں پھندا ڈال کے کھینچا۔ پھر وہ اسی رسی پر سے پھسلتا ہوا نیچے آگیا۔ یہ رسی کی مضبوطی کا ٹیسٹ تھا۔

ملا ٹھیکے دار کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا مگر شاہ جی

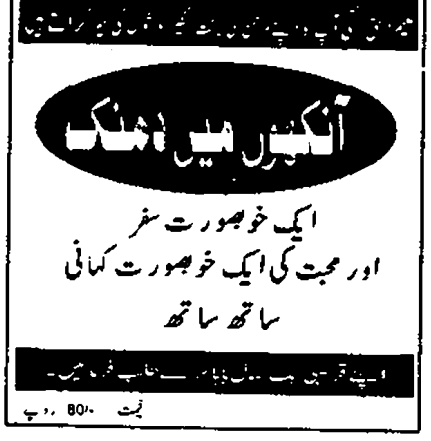

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ڈرامے باز فطرت کو میں سمجھتا تھا۔ فیکے پر دباؤ ڈالنے کے لئے شاہ جی نے پہلے رئیس کو بھیجا' پھر پولیس کو استعمال کیا اور یہ معلوم کرنے کے لئے مجھے بھیجا کہ پولیس کی کارکردگی کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے فیکے کو الگ کمرے میں ٹھاکے باری باری میرا اور رئیس کا بیان بھی سنوایا اور پھر اس سے اعتراف بھی کرالیا کہ ہم نے کوئی بات غلط نہیں کہی۔ اس کا اعتراف جرم حاصل کرنے کے بعد سزا ہی باقی رہ جاتی تھی۔ اس کے لئے شاہ جی نے پھانسی دینے کے انتظامات کا حکم دے کر فیکے کو یاد کرانے کی کوشش کی کہ اس نے انکار اب بھی اقرار میں نہ بدلا تو اسے سزائے موت لازمی ہے۔

تاہم یہ ڈراما دہشت کا تاثر پیدا کرنے کے مقصد کو حاصل نہ کرسکا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ شاہ جی بے وقوف نہیں ہے اور ان حالات میں فیکے کو قتل کرکے اپنی گردن قانونی مشکلات کے شکنجے میں نہیں پھنسائے گا۔ فیکے کا وکیل اور ہیومن رائٹس والے دہشت گردوں کے اس واقعے میں شاہ جی کے ساتھ ملاّ ٹھیکے دار کو براہِ راست ملوث کرنے اور ایک قتل کا معاملہ عدالت میں جانے سے دوسرے بہت سے معاملات بھی مشتہر ازبام ہوسکتے تھے۔ مثلاً ان کے اور پولیس کے گٹھ جوڑ سے چلنے والی گداگری کی مافیا۔ فقیروں کی خرید و فروخت اور معصوم بچوں کو اغوا کرکے معذور بنانے کی لیبارٹری۔

سارا مسئلہ اس بچے کا تھا جو ملاّ ٹھیکے دار کی بیٹی کے بطن میں پرورش پا رہا تھا۔ فیکا اس کی ولدیت کے جرم سے انکار نہیں کرسکتا تھا اور اس جرم کی کم سے کم سزا شادی ہی ہوسکتی تھی۔ اگر بات صرف دل لگی تک محدود رہتی تو فیکے کو اس کی اتنی بھاری قیمت نہ ادا کرنی پڑتی۔

شاہ جی اور ملاّ ٹھیکے دار سے ٹکر لے کر فیکے نے اپنی زندگی کو خطرے داؤ پر لگا دیا تھا۔ قانون اس کی تمام عمر حفاظت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس شہر یا ملک سے فرار ہو جاتا تب بھی سو فیصد تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی تاہم ابھی اس کی جان کو فوری خطرے سے تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ بات میں بھی سمجھ رہا تھا اور فیکا بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد شاہ جی اسے یقیناً اسی طرح مروا سکتا ہے جیسے پراسرار حالات میں وہ پہلے بھی اپنے دشمنوں اور باغیوں کو قتل کرا چکا تھا مگر ابھی پھانسی دینے کے اس ڈرامے کو ایک انتہا تک لے جانا فیکے کو شادی پر آمادہ کرنے کی آخری کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کے باوجود میرے دل میں بھی ایک مبہم سا خوف تھا کہ کہیں یہ ڈراما ایک حقیقت نہ ہو۔ شاہ جی جیسے شخص کے دل میں کیا ہے' اس بارے میں کوئی بھی پیش گوئی قطعی اور حتمی طور پر نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی خوف نے فیکے کی حالت ویسی ہی کردی تھی جیسی سزائے موت پانے والے کی پھانسی سے قبل ہوسکتی ہے۔

فیکا پوری کوشش کرتا رہا کہ شاہ جی کو منت سماجت اور دلائل سے قائل کرے مگر وہاں تو سننے والے کان ہی جیسے بہرے ہو گئے تھے۔

جب میں اور رئیس ایک طرف کھڑے ہو گئے تو شاہ جی نے کہا' فیکے۔ تو نے جو بھی کہا' سب اس نے بھی سن لیا ہے۔"

شاہ جی کی مراد ملاّ ٹھیکے دار کی لڑکی سے ہوگی۔ جیسے کسی دوسرے کمرے میں فیکے نے رئیس کا اور میرا بیان سنا تھا ایسے ہی اس بدنصیب لڑکی نے بھی سنا ہوگا جس کی محبت کا خواب ایک پُرفریب سازش ثابت ہوا تھا۔ اس کا چاہنے والا جو اسے زندگی کی ہر خوشی سے مالا مال کردینے کے دعوے کرتا تھا' بڑی بے حسی اور بے غیرتی کے ساتھ اس کی چاہت سے انکار کر رہا تھا اور اسے بدنامی کی سزا کاٹنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر بھاگنے پر آمادہ تھا۔

"چل سیدھا کھڑا ہو جا کرسی پر" شاہ جی نے حکم دیا۔

فیکا اپنی جگہ بیٹھا رہا مگر اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔

"چلو تم دونوں پھندا ڈالو اس کے گلے میں اور کھڑا کردو اسے کرسی پر۔" شاہ جی نے مجھے اور رئیس کو حکم دیا۔

فیکے کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کی مزاحمت رائگاں گئی۔ رئیس نے رسی کا پھندا بنا کے اس کے گلے میں ڈالا اور میں نے فیکے کو کھڑا کیا تو رئیس نے رسی کو کھینچا اور ایک کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیا۔ اب فیکا کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔ اس کی ٹانگیں ہی نہیں سارا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بے ربط الفاظ میں شاہ جی اور ملاّ ٹھیکے دار کو خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

شاہ جی نے کہا "دیکھ فیکے۔ ہم نے تجھے ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا۔ اب فیصلہ ہم نہیں کرتے۔ تو نے جس سے محبت کا ناٹک کیا تھا اور شادی کا جھوٹا وعدہ کیا تھا اگر وہ تجھے معاف کردے تو تیری جان بچ جائے گی۔"

شاہ جی کے اشارے پر ملاّ اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی قبول صورت بھی نہیں تھی' وہ سیاہ رو اور دبلی پتلی بیمار نظر آنے والی لڑکی تھی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم نظر آرہی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے فیکے کو دیکھا لیکن خلافِ توقع اس نے کسی شدید نوعیت کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ پھانسی گھاٹ کے اس منظر میں وہ اپنے عاشقِ جانباز کو دیکھتے ہی چیخ مارے گی اور بے ہوش ہو جائے گی یا بے ساختہ اس کی طرف لپکے گی۔ اسے بچانے کی کوشش کرے گی اور اپنے باپ کے ساتھ شاہ جی کو کوسے گی' ان کی منت سماجت کرے گی۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

شاہ جی نے کہا "دیکھ بیٹا۔ یہ فیصلہ اب تیرے ہاتھ میں ہے۔

چاہے تو اسے چھوڑ دے۔ یا لات مار کے کرسی گرا دے۔"

وہ اطمینان سے آگے بڑھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ اس کا یہ سکون سطحی ہے' بالکل مصنوعی۔ اس کے وجود کی گہرائی میں کہیں جذبات کا طوفانی سمندر متلاطم تھا جس میں اس کے خوابوں کا یقین ڈوب رہا تھا۔ محبت کی راہ دکھانے والا روشنی کا مینار ڈوب رہا تھا جو اسے مستقبل پر اعتبار کی راہ دکھاتا تھا۔ اس عورت کے غرور کا سفینہ ڈوب رہا تھا جو سمجھتی تھی کہ اس نے ایک مرد کے دل کو تسخیر کرلیا ہے۔

وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ فیکے کے پاس پہنچے گی تو بند ٹوٹ جائے گا اور وہ اپنے محبوب کے قدموں کو آنسوؤں سے دھوتے ہوئے التجا کرے گی کہ وہ اس کو یوں نہ ٹھکرائے۔ وہ تمام عمر اس کی غلامی کرے گی۔ اس سے کبھی کچھ نہیں مانگے گی' نہ مال و زر نہ ہیرے موتی۔ اس کی محبت کی خیرات پر گزارا کرلے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس رقت انگیز' دردناک تقریر سے فیکے کا پتھر دل پگھل جائے گا۔ اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ سچی محبت کی قدر کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہے گا کہ مجھے معاف کردو جانی' میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے تمہارا دل دکھایا۔۔۔ اور تماشائی سکھ کا سانس لیں گے کہ تمت بالخیر۔ بچھڑے ہوئے مل گئے' محبت کی جیت ہوئی۔ پھر وہ دوگانا جو ہیرو اور ہیروئن نے آغازِ عشق میں گایا تھا اور فلم ختم۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہماری طرح فیکا بھی پُرامید تھا کہ اس ڈرامائی سین کا جذباتی اختتام اس کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ جو لڑکی اس کی محبت میں اتنی دیوانی تھی کہ اسے اپنا سب کچھ دے چکی تھی' وہ اس کی جان کیسے لے سکتی تھی۔ محبت' قانون' ہیومن رائٹس۔

مگر کسی تذبذب کے بغیر' ایک کمزور سی لڑکی نے کرسی کو لات مار کے ثابت کردیا کہ حقائق کتنے سنگین' کتنے بے رحم اور اٹل ہوتے ہیں۔ انہیں خواب شکست نہیں دے سکتے۔ ظلموں کے جذباتی مناظر انہیں تبدیل نہیں کرسکتے۔ رومانی افسانوں اور ناولوں کے تخیلاتی کردار مٹا نہیں سکتے۔

خاموشی بڑی پُراسرار تھی۔ آنے والے لمحے کو بے خبری کے پردے میں چھپا کے رکھنے والی خاموشی۔ دغاباز اور عیار خاموشی جو ہاں اور نہ کے درمیان آدمی کے یقین کو نزع کے کرب میں مبتلا رکھتی ہے۔ ملاّ ٹھیکے دار خاموش تھا' ایک موہوم سی امید کے سہارے کہ شاید اب یا اگلے قدم کے بعد یا اس کے بعد۔۔۔ اچانک سب کچھ بدل جائے گا۔ فیکا مان جائے گا' سمجھ لے گا کہ یہ ڈراما نہیں ہے۔ اس کی جنی کمزور ہے۔ وہ لڑکھڑا کے گر جائے گی۔

شاہ جی خاموش تھا۔ وہ اپنی شکست نہیں چاہتا تھا۔ اسے شکست ہو رہی تھی۔ فیکا ابھی تک نہیں مانا تھا۔ اتنی مار کھا کے بھی نہیں مانا تھا۔ مگر وہ اتنا پاگل کیسے ہوسکتا ہے کہ مرجانا قبول کرلے مگر اس لڑکی سے شادی نہ کرنے پر اڑا رہے۔ جس سے وہ محبت بھرے ڈائیلاگ بولتا رہا تھا' جس کے ساتھ گزارے ہوئے محبت کے پُرکیف لمحات نے اس لڑکی کے وجود میں ایک زندگی کا بیج بو دیا تھا۔ موت سامنے ہو تو آدمی چڑیل اور بھتنی کے ساتھ بھی زندگی گزارنا قبول کرلیتا ہے۔

میں اور رئیس بھی خاموش تھے۔ اعصابی کشیدگی میرے اعصاب کو یوں متاثر کرنے لگی تھی کہ جب فیکے نے چیخ ماری "نہیں۔۔۔" تو میں اچھل پڑا اور میں نے ادھر اُدھر سہارے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ میری ٹانگیں کمزوری سے کانپ رہی تھیں اور میری نظروں کے سامنے وہ کرا گھومنے لگا تھا۔ میں پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گیا۔ رئیس جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا تھا۔ ہماری نظریں پتھرا گئی تھیں۔ ایک منظر تھا جو ہم سب کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ ان گنت لمحوں کے عذاب کی تصویر تھی جو منجمد ہو گئی تھی۔

ایک لڑکی فرش پر پڑی تھی۔ عین اس شخص کے قدموں کے نیچے جو کچھ اوپر ہوا میں لاتیں چلا رہا تھا۔ بے ہنگم طریقے پر اِدھر اُدھر جھول رہا تھا اور حلق سے بھیانک آوازیں نکال رہا تھا۔ زور لگا رہا تھا کہ بندھے ہوئے ہاتھوں کو آزاد کرالے تو اس پھندے کو بھی گردن سے جدا کردے جو ہر سانس کے ساتھ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک رئیس چلایا "استاد جی۔ فیکا مر جائے گا۔"

ملاّ ٹھیکے دار ایک دم اٹھا مگر شاہ جی نے اس کی کلائی پکڑ لی "اب اس کا مرجانا ہی اچھا ہے۔"

ملاّ پھر بیٹھ گیا۔ اور اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگا۔ ایک بن بیاہی ماں نے بیوگی کا تاج اپنے سر پر سجا لیا۔ بلاشبہ وہ اداروں کی بھرپور استقامت رکھتی تھی۔ پل صراط پر سے گزر گئی تھی۔ اس نے جنت کا خواب دیکھنے کے بعد جہنم کو تعبیر کے طور پر قبول کرلیا تھا۔

فیکے کی آخری سانس کی صدا ابھی سکوت میں ڈھل گئی تو پُرہول سفاک اور خوں چکاں خاموشی اور قتل گاہ کے سناٹے میں ایک آواز گونجنے لگی۔ یہ ایک بچے کی آواز تھی۔ جناب صدر' عالمی کمیشن برائے حقوقِ انسانی' جناب چیف جسٹس صاحب' جناب صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ آپ سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑے طاقتور' صاحبِ رسوخ اور بااختیار لوگ ہیں۔ میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا' کیا آپ سب مل کے میری ایک درخواست کو شرفِ قبولیت عطا کرسکتے ہیں؟ مجھے اپنا باپ چاہیے۔ بصورت دیگر احکامات صادر فرمایئے کہ حرامی کا لفظ زبان و بیان اور اظہار کے ہر پیرائے سے خارج سمجھا جائے۔"

"ملاّ سب ٹھیک ہوجائے گا" شاہ جی کی آواز نے خاموشی کا وہ جمود توڑ دیا جس نے چیخوں' آنسوؤں اور آہوں کو اس طرح دبا رکھا تھا جیسے بھاری پتھر کے نیچے خودرو پودے' پھول اور ہوا میں سانس لینے والے کیڑے مکوڑے۔

"اچھا کیا تیری بیٹی نے۔ خود اپنے ہاتھوں سے مار دیا اسے۔ بہادر ہے تیری لڑکی' تو فکر مت کر۔ وہ جی لے گی" شاہ جی نے کہا۔

ملاّ نے اپنے آنسو صاف کرلیے "ہاں۔ مرنہیں سکتی تو جینا ہی پڑے گا اسے۔ ایک حرامی کو پالے گی۔ ساری عمر خود بھی گالیاں کھائے گی۔"

شاہ جی نے اس کو پھر تھپکی دی "جینا سب کی مجبوری ہے ملاّ۔ جیسے مرنا سب کی مجبوری ہے۔"

ملاّ خلا میں دیکھتا رہا "اتنی ہمت تھی حرام زادی میں تو۔۔۔ بھاگ جاتی اس کے ساتھ۔ منہ کی کالک کے ساتھ میرے سامنے جینے کی کون سی مجبوری تھی۔ خود دکھ اٹھاتی' اپنا عذاب خود جھیلتی۔ مجھے کیوں جیتے جی مار دیا۔ میں تو ویسے ہی مر رہا تھا۔ میں بھی تو بے غیرت ہوں' بزدل ہوں۔ خود نہیں مار سکتا تھا بیٹی کو گلا گھونٹ کے۔۔۔"

"ملاّ۔ رونے سے بگڑے کام نہیں بنتے۔"

"میں چاہتا تھا۔۔۔ میرے سامنے اس کا گھر بس جائے۔ شادی کرلے فیکا اس سے۔ ٹائم نہیں تھا میرے پاس۔"

"ابھی بہت وقت ہے۔ سب ہوجائے گا۔"

"کیسے ہوجائے گا شاہ جی۔ کون لے گا اسے اب۔ ایک حرامی بچے کے ساتھ کون قبول کرے گا؟"

"دیکھ۔ میں شاہ جی نہیں' اس کا ماما ہوں۔ بھانجی کی شادی کرانا میری ذمّے داری بھی ہے۔ اللہ نے چاہا تو۔۔۔ وہی ہوگا جو تو چاہتا ہے۔ بھول جا سب کچھ۔ سمجھ لے کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ فیکا کوئی نہیں تھا۔ اگر باپ نہ ہو تو بچہ خدا کی قدرت سے پیدا نہیں ہوتا۔ خود بخود کوئی عورت ماں نہیں بنتی اور نہ ماں ہو نہ باپ تو پھر بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔"

ملاّ اسے پلک جھپکائے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگا۔ شاہ جی نے جو بات گول مول الفاظ میں کہہ دی تھی وہ اس کی سمجھ میں آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ ماں نے خود باپ کا وجود مٹادیا۔ بیٹے کے وجود کو زیادہ آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے اور جس بچے کا وجود ہی نہ ہو اس کے حرامی حلالی ہونے کا سوال۔

ملاّ آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنی بیٹی کے قریب جا کے جھکا۔ فیکے کی جھولتی ہوئی لاش کے پاؤں اس کے سر سے ٹکرائے تو اس نے مشتعل ہو کے اوپر دیکھا۔ یوں جیسے فیکے نے اس کے سر کو جان بوجھ کے ٹھوکر ماری ہو۔ صرف اس کی تذلیل کے لیے کہ ملا' چل اٹھ اور لے جا اپنی اس غلاظت کو سمیٹ کر۔ جس پر میں نے تھوک دیا تھا۔ میری زندگی بہت قیمتی' ارفع اور اعلیٰ تھی۔ اسے میں نے خود ضائع کرنا بہتر سمجھا۔ تیری اس بدصورت' بدبخت' بدکردار بیٹی کو شریکِ زندگی بنانے سے مرجانا اچھا۔

یہ ملاّ کی ذلت کی انتہا تھی مگر اس کے ہاتھ دہری زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ اپنی دکھی بیٹی کو وہ اس سے زیادہ دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور مرتے مرتے اسے مار بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بیٹی کو' اس کے ارمانوں کی ٹھنڈی اکڑی ہوئی لاش کی طرح اٹھایا اور اندر لے گیا۔

شاہ جی نے کہا "رئیس۔ اسے اتار دے۔"

رئیس نے تھوک نگل کے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "جی۔۔۔ جی استاد جی!"

"ناصر۔ گاڑی چلانی آتی ہے نا تجھے؟" اس نے چابی میری طرف پھینک دی۔

میں نے سر ہلایا "آتی ہے۔"

اس نے میرے استاد جی نہ کہنے کو اہمیت نہیں دی۔ "گاڑی باہر کھڑی ہے۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔ باہر جانے سے پہلے آگے پیچھے کا خیال رکھنا۔"

"جی استاد جی!" رئیس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ڈکی میں بڑی جگہ ہے۔" شاہ جی نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میری اور رئیس کی نظریں اس کے باہر جانے تک شاہ جی پر رہیں۔ وہ انتہائی پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ اس کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ خود سب کچھ کرتا یا متفکر ہوتا اور ہمیں تفصیلی ہدایات دیتا۔ اس نے اپنے رویے سے ظاہر کیا تھا کہ یہ معمولی بات ہے اور اسے ہم پر اور ہماری عقل پر بھروسا ہے۔ ہم جو چاہیں کریں۔ لاش کو کہیں جنگل میں لے جا کے گاڑ دیں' پل پر سے دریا میں پھینک دیں یا کسی سڑک پہ ڈال دیں۔ احتیاط اور اپنے آپ کو بچانے کا مسئلہ ہمارا اپنا ہے۔ ہم پکڑے

جاتے ہیں تو اس کی ذمّے داری ہے۔ ایک لاوارث لاش کا ذمّے دار کون ہوگا۔ بالآخر وہ ہمیں چھڑالے گا لیکن جتنا عرصہ بھی ہم پولیس کی تحویل میں رہیں گے' وہی ہماری نالائقی کی سزا ہوگی۔

بالآخر رئیس نے شاہ جی کو ایک گالی دی۔ "کیا سمجھتا ہے آخر یہ خود کو۔ اس کی استادی کی۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

میں نے کہا "اب بھونکنے سے کیا فائدہ' کتے!"

اس نے مجروح نظروں سے مجھے دیکھا "تو بھی مجھے کتا سمجھتا ہے؟"

"ہاں۔ تو اس کا غلام ہے۔ اس کے اشارے پر دُم ہلانے والا کتا۔ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا کتا۔ کیا تو انکار نہیں کرسکتا تھا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔"

"کیوں۔۔۔ وہ کیا کرتا۔۔۔ تجھے ہی مار ڈالتا۔ کتنے قتل ہر روز کرتا ہے وہ؟"

رئیس نے غرا کے کہا "تو بڑا سورما ہے۔ تو نے کیا کیا۔ اور کیا کرسکتا ہے تو۔۔۔ سب کہنے کی بات ہے بیٹا' اندر سے سب۔۔۔ ہوتے ہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "میں قتل کردوں گا شاہ جی کو۔"

"ابے جا۔ تو نے کتنے قتل کیے ہیں۔ یتیم خانے کے کانے دجال کو جان سے مار دیا تو نے؟ یا ناصر کے چچا کو ختم کردیا؟ سالے وزیرِ اعظم' بیٹی خور' بکواسی' گپ باز۔ ایک دن تو بھی ایسے ہی کتے کی موت مارا جائے گا اور میں بھی۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھ رئیس۔ افسوس مجھے بھی ہے۔ دکھ بھی ہے' شرمندگی بھی ہے۔ مگر ہم ابھی اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتے تو کسی اور کے لیے کیا کریں گے۔ مگر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آج کمزور ہیں اور بے بس ہیں' ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ جینا ایسے ہی آتا ہے۔ ایسے ہی تجربات سے سیکھتا ہے ہر شخص۔ جو مایوسی کا شکار ہوجائے' وہ ضرور مارا جاتا ہے۔ چل اندر' یہ کام بھی نمٹالیں۔"

رئیس نے اپنے آنسو پونچھے اور کھڑا ہوگیا۔ ہم نے فیکے کی لاش کو بڑے احترام کے ساتھ نیچے اتارا۔ رئیس تھوڑا تھوڑا رسّی کو ڈھیلا کرتا گیا اور میرے بازوؤں کے حلقے میں رئیس کے مردہ جسم کا بوجھ بڑھتا گیا۔ یہ جسم ابھی تک گرم تھا اور جب بالآخر رئیس نے اس کی گردن سے رسی کا حلقہ جدا کیا تو وہ میرے کندھے پر کسی بے ہوش آدمی کی طرح لٹک گیا۔ اس کے ہاتھ میری پشت کی جانب تھے اور اوپر کا نصف دھڑ بھی پیچھے تھا۔ اس کی ٹانگیں آگے لٹکی ہوئی تھیں۔

گھر کے اندر مکمل سکوت تھا۔ ہم بے آواز قدموں سے قالین پر چلتے ہوئے دروازے تک آئے۔ رئیس نے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے ہاتھ سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکلنے لگا تو نہ جانے کہاں سے وہ لڑکی نمودار ہوگئی جس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی آنکھیں ملیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُرخوف اور ملامت آمیز تجسّس تھا۔ ایک سوال تھا جو کسی جواب کا امیدوار نہ تھا۔

میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس نے خاموشی سے دروازہ بند کردیا۔ گلی میں صرف وہی روشنی تھی جو دونوں جانب بنے ہوئے گھروں کی کھڑکیوں کے شیشوں سے اور بالکونیوں سے نیچے کہیں کہیں آویزاں بلبوں سے پھیل رہی تھی۔ سامنے سے آنے والے ایک عمر رسیدہ شخص نے واجبی سی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر راستہ چھوڑ کے نکل گیا۔ اس نے فرض کرلیا ہوگا کہ میں کسی بیمار کو اٹھائے ہوئے ہوں۔ لاش کا خیال عام آدمی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

رئیس نے گاڑی کی ڈکی کھولی اور میں نے پلک جھپکتے میں فیکے کی لاش کو اس میں پھینک دیا۔ اسے میت کی طرح آہستگی سے اور احترام کے ساتھ لٹانے کا جذباتی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ہر صدمے کی شدت اسی طرح کم ہوتی جاتی ہے جیسے سردیوں میں سرِ فلک پہاڑوں کے وجود کو ڈھک لینے والی برف موسم کی شدت کے ساتھ پگھلنے لگتی ہے اور گھٹتی جاتی ہے پھر خزاں رسیدہ درختوں کی سوکھی ویران شاخوں پر کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اور جب بہار کا پہلا پھول کھلتا ہے تو سب کچھ بدلا ہوا پہلے جیسا نہیں رہتا مگر نہ کسی کو گزری خزاں کی برف کا خیال آتا ہے اور نہ آنے والے موسم کا خوف ستاتا ہے۔

گاڑی کو میں نے راوی کے پل پر ذرا سی دیر کے لیے روکا اور اس کا بونٹ اٹھا کے انجن میں کسی غیر موجود خرابی کو تلاش کرنے لگا۔ رئیس نے ڈکی کھول دی اور فولادی جنگلے سے نیچے بہتے ٹیالے گدلے پانی پر محیط اندھیرے کو گھورنے لگا۔ دیوہیکل ستونوں پر قائم آہنی شہتیروں پر بچھی ہوئی سڑک اس سرد شفاف پانی سے بہت اوپر تھی۔ دونوں جانب سے آنے جانے والی گاڑیاں اس پر ایک تسلسل کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ میں نے پیچھے جا کے کسی مناسب وقفے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انتظار کیا اور پھر ایک لمحے میں لاش کو پل کے جنگلے پر سے نیچے اچھال دیا۔ اس وقت میرے دل میں دکھ' افسوس یا ندامت کے جذبات دور دور تک نہ تھے۔ مجھے صرف اپنی سلامتی کی فکر تھی۔ صرف یہ خوف تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ خیال تھا تو احتیاط کا۔ میرے لیے نیکا غیر اہم ہو گیا تھا۔ اس کی لاش ایک ناپسندیدہ بوجھ بن گئی تھی۔ جیسے چوری کا مال جسے پولیس کے ڈر سے پھینکنا ضروری ہو یا وہ بچہ جس کے وجود کا معاشرتی جواز نہ ہو یا کوڑا کچرا جو کوئی اپنے دروازے کے سامنے سے ہٹا کے کسی اور کے گھر کے سامنے یا سڑک پر پھینک دے۔

میں نے اس کو تیزی سے نشیب کے اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ راوی کا دھارا اسے اپنی آغوش میں لیتا' رئیس نے انجن کا بونٹ نیچے کیا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میرے کان ٹرنک کے سارے شور سے الگ ایک اجنبی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ وہ آواز جو پانی میں ٹیکے کے مردہ جسم کے گرنے سے پیدا ہوئی ہو گی۔ ساکت پانی میں کنکری بھی گرے تو صدا آتی ہے۔ مگر یہ میرے خیال کا پاگل پن تھا۔ اتنی گہرائی سے وہ آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے بسوں' ٹرکوں' گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی گھن گرج میں وہ آواز سنی۔ میرے تصور میں وہ چھپاکا ہوا۔ لاش پانی میں گری اور پانی کی لہروں میں ذرا سی دیر کے لیے تموج پیدا ہوا۔ پھر دریا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرف اور آگے جہاں راوی کا پانی چناب اور جہلم کے پانی سے ملتا ہے یا شاید سو دو سو گز کے بعد دریائے لاش کو کنارے لگا دیا۔ کسی جھاڑی میں' کسی درخت کی دریا تک پہنچنے والی جڑ میں یا دریائی سرکنڈوں میں الجھا دیا۔ جہاں وہ رات بھر ایسے ہی ٹھنڈے پانی میں پڑی پھولتی رہے گی۔ صبح اسے لاوارث لاشوں میں شامل کر دیا جائے گا۔

رئیس نے کہا "اللہ معاف کرے۔ ویسے ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

میں چونک پڑا "ہاں۔"

"نیکے کو اس کے کیے کی سزا ملی۔"

"ہاں۔"

"اچھا ہوا کسی نے دیکھا نہیں۔ شاہ جی کو بتا دیں گے۔ یہی آسان تھا۔"

"ہاں۔ اور چپ کر کے بیٹھ نہیں تو میں تجھے بھی راوی کے پل سے نیچے پھینک دوں گا" میں نے مشتعل ہو کے کہا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں شدید اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوں۔ میں گاڑی بھی ایسے چلا رہا تھا جیسے میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ یہ میرے غیر شعوری احساسِ جرم کا خوف تھا۔ اس طرح حادثہ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ میں کوئی پرانا تجربہ کار ڈرائیور نہیں تھا۔

پل کراس کرنے کے بعد میں نے ایک لمبی گہری سانس لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا "رئیس۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں آیا تھا شادو کے لیے اس لیے نہیں کہ شاہ جی مجھ سے ایسے کام کرائے۔"

"کہاں جائے گا تو۔ تو کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ شادو۔۔۔"

"میں شادو کو بتا دوں گا۔ صاف بتا دوں گا اسے کہ میں واپس بھی جا سکتا ہوں لیکن اس راستے پر چلنا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"تو اسے سب بتا دے گا۔۔۔ جو آج ہوا۔۔۔"

"ہاں۔ نفرت ہونے لگی ہے مجھے اپنے آپ سے۔ میں اس سے زیادہ نہیں گر سکتا۔" میں نے کہا "کسی دن میں لیے چکر میں پھنس جاؤں گا۔۔۔ اور یہی بات میں تیرے لیے بھی کہتا ہوں کہ چل میرے ساتھ۔ چھوڑ دے اس نحوست کے دھندے کو اور اس جگہ کو۔ یہاں تیری زندگی کس کے کام آ رہی ہے؟ کوئی مقصد ہے تیرے جینے کا؟ کس کے لیے جی رہا ہے تو آخر؟"

"اتنے مشکل سوال مت پوچھ یار!"

میں نے کہا "دیکھ نیکا ضائع ہو گیا۔ کس کا نقصان ہوا؟ کسی کا بھی نہیں۔ بس ایک لڑکی ہے جو اسے کچھ دن یاد کر کے روئے گی۔ وہ بھی اس کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذلت اور شکست پر۔ اپنی غلطی پر اور ناکامی پر۔"

"اپنے لیے بھی کون ہے رونے والا۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔"

"ابے یہ سارے رشتے ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ آدمی جس کو چاہے اپنا بنا لے۔ صرف اپنے لیے نہ جیے تو ساری دنیا اپنی۔ اصل رشتہ ہوتا ہے جذبات کا اور احساس کا۔ ورنہ میں نے دیکھے ہیں ماں باپ جو بڑھاپے میں اکیلے کسمپرسی کی حالت میں مر گئے۔ اولاد بیٹھی ہے امریکا' کینیڈا' سعودی عرب اور جرمنی میں۔ ایک نہیں ہزاروں ہیں ایسے۔ اور بھائی بہن اپنے اپنے گھر کے ہو گئے تو بس اتنا تعلق رہ گیا کہ کبھی فون کر لیا یا سال کے سال عید کارڈ بھیج دیا۔ بات تو تب ہے بیٹے کہ اکیلا آدمی مرے تو رونے والے لاکھوں ہوں۔ سارا شہر ہو' سارا ملک ہو یا سارا جہان ہو۔"

"ہم میں وہ بات کہاں؟" اس نے ایک آہ بھری۔

"دیکھ میں نے ایسے ہی بات نہیں کی۔ تجھ میں صلاحیت ہے۔ میں جو چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ رہے۔ آخر کیوں چاہتا ہوں ایسا؟ شاہ جی کو بھروسا ہے تجھ پر۔ شادو تجھ پر اعتبار کرتی ہے۔ میں تجھے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ اتنی زندگی یتیم خانے میں گزر گئی۔ اس کے بعد بھی بہت لوگ ملے' ایک تو ہی تھا جس کو میں نے اپنا سمجھا۔ ایک رشتہ قائم ہو گیا نا' اسے قائم رہنا چاہیے۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا' سامنے دیکھتا رہا۔ میں نے گاڑی شاہ جی کے ڈیرے پر اندر لے جا کے روکی تو آواز پر شاہ جی نمودار ہوا۔ میں نے اسے اوپر جا کے گاڑی کی چابیاں دیں۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں بنا؟"

میں نے کہا "نہیں استاد جی!"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

میں نے پھر وہی جواب دیا۔ شاہ جی نے سر ہلایا اور واپس لوٹ گیا۔ میں اور رئیس خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ شاہ جی کے رویے پر میں نے بڑی ہلکی محسوس کی تھی۔ میں نے اسے ایک سو ایک گالیاں دیں۔

"آخر کیا سمجھتا ہے یہ خود کو۔ ہم زر خرید غلام ہیں اس کے؟ سؤر کے بچے نے ہمارے ہاتھوں سے نیکے کو پھانسی چڑھوا دیا۔ پھر حکم دے دیا کہ جاؤ اس کی لاش پھینک آؤ۔ اور ہم آئے ہیں آدھی رات کو اتنا خطرناک کام کر کے تو۔"

"تو کیا؟ وہ ہمارا شکریہ ادا کرے؟ میڈل دے ہمیں بہادری کا؟ یا ایک لاکھ دے انعام میں؟" رئیس تلخی سے بولا۔

"یار' شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سالا فرعون بنا رہتا ہے۔ گردن اکڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شکریہ نہ ادا کرے' نرمی سے بات کرے۔ شاباش دے۔ کسی کو دس ہزار معاوضہ دیتا تب بھی یہ کام نہ کرتا' جو ہم نے کر دیا۔ اس نے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ کھانا کھایا؟ بس چابی لی اور دروازہ بند۔ میرا کوئی چھوٹا سا کام بھی کرے اور ایسے رات کے وقت کوئی بھی میرے دروازے پر آئے تو میں اس سے بیٹھنے کو کہوں گا۔ چائے کے لیے پوچھوں گا۔"

رئیس ہنس پڑا "ابے تیرا دماغ خراب ہے۔ تو خود کو اس کے برابر سمجھتا ہے؟"

میں نے کہا "کیوں' وہ کیا ہے؟ میرا مالک اور آقا ہے؟ میرا باپ ہے یا کوئی احسان کیا ہے اس نے مجھ پر؟ کیا میں اس کا دیا کھاتا ہوں؟ الٹا وہ ہمارے دیے پر عیش کرتا ہے۔ بھیک مانگنے والوں کی خیرات پر شاہ جی بنا ہوا ہے۔ بس بدمعاشی کی طاقت ہے اس کے پاس۔ کسی بدمعاش کو میں اپنے مقابلے میں بڑا سمجھوں' قابلِ عزت سمجھوں' لعنت ہے مجھ پر۔"

"یار' ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا دوپہر سے۔ چائے تک نہیں پی۔ چل دیکھتے ہیں کہیں کچھ مل جائے۔" رئیس نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

"نہیں یار۔ میرا بالکل موڈ نہیں۔ تُو جا۔"

رئیس کے جانے کے بعد میں سونے کی نیت سے اندر گیا مگر مجھے اس غلیظ اور بدبودار لوگوں سے بھرے ہوئے کمرے میں وحشت سی محسوس ہونے لگی۔ آخری کونے میں ایک فقیر گھٹنوں کو سینے سے لگائے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بولتا بھی کم تھا اور سب سے الگ بیٹھا اسی طرح سگریٹ پھونکتا رہتا تھا۔ خلا میں گھورتا رہتا تھا اور کھانستا رہتا تھا۔

میں نے اس کے پاس جا کے کہا "ایک سگریٹ دو گے؟"

اس نے سر ہلایا۔ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اس کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کے جلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے پھر سر ہلایا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں پھر باہر آ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں سگریٹ پینے کا خیال مجھے کیوں آیا؟ اس سے پہلے میں نے شوقیہ ایک دو کش ضرور لیے تھے مگر میں سگریٹ پیتا نہیں تھا۔ شاید میرے ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ پریشانی یا اعصابی کشیدگی میں چائے' سگریٹ اور شراب کا سہارا لینے سے سکون ملتا ہے۔

میرا پیٹ خالی تھا۔ سگریٹ کے پہلے کش سے ہی مجھے چکر سا آ گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں کھانسنے پر مجبور ہو گیا۔ شاید دوسرا کش لینے سے پہلے ہی میں سگریٹ کو پھینک دیتا مگر میری بدقسمتی کہ اس سے پہلے شادو نازل ہو گئی۔

"تو۔۔۔ سگریٹ پی رہا ہے؟" اس نے میرے سر پر آ کے سخت برہمی سے کہا۔

میں نے ضد میں دوسرا کش لیا "ہاں۔ آج سگریٹ پی رہا ہوں۔ کل شراب بھی پیوں گا۔ چرس اور ہیروئن سب پیوں گا۔"

اس نے طیش میں کہا "زہر کیوں نہیں پی لیتا تاکہ قصہ ہی ختم ہو۔"

"وہ بھی پیوں گا۔" میں نے تیسرا لمبا کش لے کر دھواں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے منہ پر چھوڑ دیا "یہاں رہوں گا نا... تو یہ سب ہوگا۔"

"میں دیکھتی ہوں کیسے ہوگا" وہ دانت پیس کے بولی۔

"ڈراتا نہیں ہوں میں کسی کے باپ سے۔"

اس نے جھپٹ کے ہاتھ مارا اور سگریٹ نیچے گرا کے اپنے پاؤں سے مسل دیا۔ "باپ کی بات کرتا ہے کمینے۔ پہلے مجھ سے تو نمٹ لے۔ جان سے ماردوں گی تجھے میں۔"

یہ اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ میرا بھرپور ہاتھ اس کے چہرے پر لگا اور وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہوئی۔ اندھیرے میں کچھ دیکھنا مشکل تھا مگر یقیناً اس کے رخساروں پر میری انگلیوں کے نشان پڑ گئے ہوں گے۔ "الو کی پٹھی۔ جو میرا جی چاہے گا کروں گا۔ تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی۔"

ایک لمحے کے لیے وہ صدمے سے ساکت اور منجمد ہوگئی تھی۔ دوسرے لمحے اس کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ "میں بتاؤں' میں کون ہوتی ہوں۔ پہلے تو بتا... تو ضحم ہے میرا۔ دے مجھے گالیاں اور مار۔ لیکن میں ایسے ماننے والی نہیں ہوں۔ میں تجھے بھی مار ڈالوں گی اور خود بھی مرجاؤں گی مگر تجھے اپنے سامنے بربادی کے راستے پر چلتا دیکھوں گی تو خاموش نہیں رہوں گی۔"

میرا ایک ہاتھ اپنے گال پر جم کے رہ گیا تھا اور میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں آتش فشاں بنی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے سینہ تانے میرے سامنے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ اور میں دیکھ سکتا تھا' محسوس کرسکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ یہ محبت کا تیقن ہے۔ لازوال اور اٹل' عشق کا عزم ہے۔ ناقابل شکست اور لافانی۔ اور میں نے اس پیکرِ حسن وناز کے مقابل خود کو بہت چھوٹا' کمزور اور بے بس محسوس کیا۔ جیسے فرہاد نے تیشہ مار کے کہا تھا کہ اے پتھر کے پہاڑ' تیری کیا طاقت کہ تو مجھے شیریں کے لیے جوئے شیر نکالنے سے روک سکے۔ اور جیسے میاندادنے شارجہ کپ کی آخری بال سے کہا تھا کہ تیری کیا مجال کہ تو مجھے اپنے وطن کے لیے ایک چھکا مار کے فتح حاصل کرنے سے روک سکے۔ ایسے ہی شادو نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مار کے کہا تھا کہ تیری مردانگی کے غرور اور تیرے زورِ بازو اور تیرے دماغ کے خناس کی تو ایسی تیسی۔ میں دیکھتی ہوں تو من مانی کیسے کرتا ہے۔

اور جیسے پتھر کے پہاڑ نے ہار مان لی تھی اور بھارت نے ہار مان لی تھی' ایسے ہی میں نے بھی ہار مان لی۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور پھر اپنے ہونٹوں سے اس کی آنکھوں کے سب آنسو پی لیے۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور دیوار کے سہارے بٹھا کے اس کے نازک پاؤں کی ایڑی کو چوما جہاں جلتے سگریٹ کو مسلنے سے آبلہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ جب آتی تھی' لنگڑے پاؤں آتی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے میرے کندھے سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "تو خفا نہیں ہے مجھ سے؟"

میں نے کہا "خفگی کس بات کی؟"

"اچھا پھر سگریٹ نکال' میں بھی پیوں گی" وہ مسکرائی۔

میں نے شرمندگی سے کہا "پاگل۔ میں سگریٹ کہاں پیتا ہوں؟"

"پھر آج یہ کیا سوجھ گئی تھی؟"

میں نے کہا "میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ درست کردیا تو نے۔"

اس نے سر جھکا لیا "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"بالکل ٹھیک کیا تو نے۔ جب عورت روتی ہے اور منت سماجت کرتی ہے' ہاتھ جوڑتی ہے اور پاؤں پکڑتی ہے تو مرد کے اندر کا سرکش اور منہ زور حیوان زیادہ طاقتور محسوس کرکے خوش ہوتا ہے۔ تو ہمت والی لڑکی ہے۔"

"مگر میں ایسی عورتوں میں سے نہیں ہوں ناصر۔ جو ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ وہ مرد سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اس پر حکم چلا سکتی ہیں اور اسے غلام بنا کے رکھ سکتی ہیں۔ میں تو بہت کمزور اور بے وقعت ہوں۔ اسی لیے میں نے تجھ سے مدد کے لیے کہا۔ تجھ پر بھروسا کیا۔ تیرے سہارے پر میری ذات کا یقین قائم ہے۔ میں آسانی سے جان دے سکتی ہوں' مجھے دشمنوں سے بچانے کے لیے مگر تو خود اپنے ساتھ دشمنی کرے' یہ میں برداشت نہیں کرسکتی۔"

"چل شادو۔ ہم نکل جائیں یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ میرا انجام بھی وہی ہو جو فیکے کا ہوا' تجھے معلوم ہے؟"

"کیا؟"

"شاہ جی نے پھانسی پر لٹکا دیا اسے۔ اس نے کہا' میں نے شاہ جی کے حکم پر اس کے گلے میں پھندا ڈالا۔ میں نے اور رئیس نے۔ اور ملا ٹھیکے دار کی لڑکی نے خود اس کی جان لے لی۔ ہم نے بہت سمجھایا تھا اسے مگر وہ کسی طرح نہیں مانا۔ اس نے شادی سے بھی صاف انکار کردیا۔ حالانکہ وہی باپ تھا مگر اس نے کہا کہ بچہ میرا نہیں ہے۔ بھول گیا ساری محبت۔"

"پھر تو ٹھیک ہی کیا ملا کی بیٹی نے۔"

"کیا پتا۔ وہ بعد میں مان جاتا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اسے آخری وقت تک یقین تھا کہ وہ لڑکی ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ بڑی بے وقوف اور مظلوم سی لڑکی تھی وہ۔ مگر اس نے خود اپنے کانوں سے سب کچھ سن لیا تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی رہے گی یا نہیں... وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔"

"اب کیا فرق پڑتا ہے کسی کو کسی کا خدا ہے۔"

میں نے کہا "وہ منظر یاد کرکے میرے جسم پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ فیکا گلے میں پھندا ڈالے کرسی پر کھڑا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے بڑی کمزوری دکھائی۔ میں نے شاہ جی کا حکم ایسے مانا... جیسے میں غلام ہوں۔ زر خرید ہوں۔ ایسا ہی سلوک کرتا ہے وہ میرے ساتھ اور رئیس کے ساتھ۔ مجھے چاہیے تھا کہ انکار کردیتا۔ کہہ دیتا کہ میں کسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا کیوں ڈالوں؟ میرا کیا تعلق کسی کے معاملات سے۔ کون مجرم ہے اور کون خطاکار' یہ فیصلہ کرنے والا میں کون۔ فیکا مجرم ہے تو اسے سزائے موت دینے کا اختیار مجھے یا شاہ جی کو کیسے حاصل ہوگیا۔ میں خود ایک قتل میں شریکِ جرم بن گیا۔ اور ملا کی لڑکی نے وہی کام کیا جو جیل میں جلاد کرتا ہے۔ جب وہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے مجرم کو موت کے کنوئیں میں گرا دینے والا لیور کھینچتا ہے۔ بے شک قاتل وہ ہے مگر ہم سب اس قتل میں اس کے معاون بنے۔ پھر میں نے اور رئیس نے شاہ جی کے کہنے پر اس کی لاش دریا میں پھینک دی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے بڑی بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ میں شاہ جی کو انکار نہ کرسکا۔ آخر کیوں ڈرتا ہوں میں اتنا اس سے؟ اس کے حکم پر اپنے ضمیر کے خلاف میں ہر کام کرسکتا ہوں۔ نہیں شادو' کبھی سوچ سوچ کے میرا دماغ خراب ہوتا ہے۔"

"کیا فیکا مجرم نہیں تھا؟ اس کا انکار جائز تھا؟ اور شاہ جی کی جگہ تو ہوتا' وہ ملا ٹھیکے دار کی نہیں' تیری بیٹی ہوتی۔ پھر تو کیا کرتا؟ تو تھانے جا کے رپورٹ لکھواتا کہ فیکا میری بیٹی سے محبت کرتا تھا اور اب اس سے شادی نہیں کررہا ہے۔ عدالت میں جاتا اسے سزا دلوانے کے لیے؟ وہاں ثابت کرنا پڑتا کہ بچہ کس کا نہیں' یہ وکیلوں کے دلائل کی جنگ سالوں چلتی اور جیت کر ملا کی بیٹی کو کیا ملتا؟ کوئی عدالت زبردستی اس کی شادی نہیں کرا سکتی تھی۔ عدالت اسے کہتی ہرجانہ ادا کرے۔ جرمانہ دے' جیل کاٹے۔ حق مہر نان خرچہ۔ کیا ان سے تلافی ہوجاتی ہے؟ ایک عورت کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ محبت کے نام پر گنوا دیتی ہے؟"

"سزا اب بھی ملا کی بیٹی ہی کاٹے گی۔" میں نے کہا۔

"مگر کیا تیرے نزدیک ایسے مرد کسی سزا کے مستحق نہیں؟ عورت کی عزت لوٹنے والے درندے کو معاف کردینا چاہیے؟ صرف چند ماہ جیل کی سزا کافی ہے۔ ایسے سفاک لٹیروں کے لیے جو ایک عورت کی زندگی کو..... جہنم بنا دیتے ہیں۔"

"نہیں... سزائے موت ملنی چاہیے انہیں... سرعام۔"

"لیکن اس قانون میں ایسا نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ شاہ جی نے جو کیا... وہ غلط تھا... یا جرم تھا۔"

"دیکھ شادو۔ میں تیری بات سے اتفاق ضرور کرتا ہوں لیکن میں شاہ جی جیسے کسی شخص کا آلۂ کار بن کے نہیں رہ سکتا۔ میں جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہونے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں کسی بدمعاش کے ڈر سے یا پیسے کے لیے نہیں' تیرے لیے یہاں رک گیا تھا۔ مگر اب اتنا ہوگئی ہے۔ محبت میں یہ ذلت میں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔"

"آخر تو کیا چاہتا ہے؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے تو؟" میں بھڑک اٹھا "میں چاہتا ہوں تجھے۔ تو نے میرے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں تو میری توہین برداشت کا اور امتحان نہ لے' چل میرے ساتھ... ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ورنہ میں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں چلا جائے گا؟ مجھے چھوڑ کے...؟"

"کہیں بھی... اور چھوڑنے کی بات مت کر۔ فیصلہ تجھے کرنا ہے یا مجھے چھوڑ دے یا یہ گھر چھوڑ دے۔"

"اتنی جلدی مت کر۔"

"تین دن" میں نے تین انگلیاں اٹھا کے کہا "تین دن بعد میں تجھے لے جاؤں گا۔ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔ باقی سب میں کرلوں گا۔"

"حرامی!" اچانک ایک ہاتھ نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا "کیا کرے گا آخر تو... بول!" یہ آواز شاہ جی کی تھی۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ میری گردن اس کے بازو اور کہنی کے شکنجے میں بری طرح پھنسی ہوئی تھی اور وہ مجھے گھسیٹ کر نہ جانے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میرے منہ پر تھا۔ شاہ جی نے بے خبری میں حملہ کیا تھا۔ میں اس کی طاقت ور گرفت میں ایسے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے عقاب کے پنجوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہو تو۔

شاہ جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اس نے میری آواز ایسے بند کردی تھی کہ ساتھ ہی میری سانس بھی بند ہونے لگی تھی۔ خود اس نے اپنی آواز کو غصے کے باوجود قابو میں رکھتے ہوئے چیخنے دھاڑنے سے گریز کیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ شاد کو موقع ملتے ہی جائے واردات سے فرار ہوجائے گی۔ خلاف توقع اس نے چیخ بھی نہیں ماری اور اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی تو شاہ جی نے غرا کے اسے کہا "چل دفع ہوجا یہاں سے۔"

میں خود کو چھڑانے کے لیے لاتیں چلا رہا تھا اور اپنے ہاتھوں کی کہنیاں شاہ جی کے پیٹ میں مار رہا تھا مگر وہ کسی بلڈوزر سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا۔ وہ مجھے ایسے گھسیٹتا رہا تھا جیسے شکار کرنے کے بعد شیر کسی ہرن کو کھینچ کر اپنے ٹھکانے تک لے جاتا ہے۔

میرے کانوں نے شاد کی آواز بھی سنی "اسے چھوڑ دے ابا۔" مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ شاہ جی مجھے پچھلے حصے کی طرف لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ آسانی سے مجھے قتل بھی کرسکتا تھا۔ اور وفا بھی سکتا تھا۔

اچانک میرے ہاتھ میں شاہ جی کے بال آگئے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے بال کھینچے تو اس کا چہرہ تھوڑا سا آگے جھک کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ اس نے مجھے ایک اور فحش گالی دی مگر اس کے ساتھ ہی میں آزاد ہوگیا۔ اس کے بازو کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور پھر پلٹ کے مرکھنے بیل کی طرح شاہ جی میں گھس گیا۔ اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا میں ایک منڈیر سے ٹھوکر کھا کے زمین پر گرا۔ شاہ جی ایک سیکنڈ کے لیے بے حرکت ہوا تو میں خود کو چھڑا کے ادھر بھاگا جدھر شاد کھڑی ہوئی تھی۔ مگر شاد اب وہاں نہیں تھی۔

شاہ جی اتنی دیر میں پھر اٹھ گیا تھا اور اب اس پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ یہ میری سنی ہوئی دھمکیاں تھیں لیکن ان کو مجذوب کی بڑ یا شرابی کی بکواس سمجھ کے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جن عزائم کا اعلان کررہا تھا' ان پر عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ملاں کی لڑکی کا معاملہ صرف اپنی بڑائی اور طاقت کو مسلمہ ثابت کرنے کا مسئلہ تھا کیونکہ اس کے ایک دشمن نے' جسے موت شکست دے چکی تھی' اس کے سامنے اپنی کمتری کا اعتراف کرلیا تھا اور اس کی طرف دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

شاد کا معاملہ براہِ راست اس کی عزت پر حملہ تھا اور حریف اس کا مدمقابل بھی نہیں' ایک حقیر فقیر' لاوارث اور بے سرا۔ مرتبے اور حیثیت میں ماتحت سے بھی کم' معمولی غلام کا درجہ رکھنے والا اس سے آدھی عمر کا لڑکا تھا۔ یہ معاملہ اس کی اپنی بیٹی کا تھا چنانچہ اس کے جذبات کی شدت بھی کہیں زیادہ تھی۔ اگر میں اس کے ہاتھ آجاتا تو میرا انجام فیکے سے بدتر ہونا لازمی تھا۔

میں نے چلا کے کہا "شاد!" اور اوپر کی طرف زینے کے آخر میں کھلے دروازے کو دیکھا۔ اندر کی روشنی آدھی سیڑھیوں تک پہنچ رہی تھی۔ دروازے سے اس کمرے کی دیوار کا ایک کونا نظر آرہا تھا جو شاد کی خواب گاہ تھی مگر مجھے کہیں اس کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دی۔

شاہ جی نے ادھر ادھر سے اٹھا کے دو پتھر پھینکے۔ پتھر نشانہ خطا ہوجانے والے تیروں کی طرح میرے دائیں بائیں سے گزرے۔ وہ میرے پیچھے آرہا تھا۔ چند سیکنڈ میں وہ مجھے پھر پکڑ لیتا۔ میں اس کی آواز سے بھی دہشت زدہ ہورہا تھا۔ اس نے جب مجھے اور شاد کو دیکھا ہوگا تو غصے کی طوفانی لہر نے اسے مغلوب کرلیا ہوگا۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض بھی تھا۔ اس کے لیے ٹھنڈے دل سے سوچنا ممکن ہوتا تو وہ پلٹ کے جاتا اور اپنا ریوالور ساتھ لاتا۔ ہم اپنے جذبات کی دنیا میں گردوپیش سے اتنے بے خبر ہوگئے تھے کہ وہ میرے پیچھے آگیا اور مجھے آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔

اب اس نے آدھے ادھورے لان اور باغ کی منڈیر سے ایک اینٹ اکھاڑلی تھی۔ یہ اینٹ وہ میرے قریب آکے میرے سر میں مارنا چاہتا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کے ساتھ کف نکل رہا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ جب اس نے چند قدم کے فاصلے سے ہاتھ میں اینٹ اٹھائی تو میں نے آگے بھاگنے کے بجائے پلٹ کے... گھوما اور اس کے پیروں میں اگڑوں بیٹھ گیا۔ اینٹ میرے اوپر سے گزر گئی۔ پھر وہ خود کو بریک نہ لگا سکا اور میں اس کی ٹانگوں میں سے گزر گیا۔ وہ منہ کے بل کنکروں کے بیم پختہ فرش پر گرا۔

اسی وقت ساری لائٹس آف ہوگئیں۔ میں نے اٹھ کے دوڑ لگائی مگر دروازے کی طرف نہیں' میرا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں ادھر ہی بھاگا اور دیوار کے آخری حصے پر چڑھ کے باہر کود چکا تھا جب لائٹس پھر آن ہوگئیں۔ کوئی چیز تیز آواز کے ساتھ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر گری۔

ایک کشکول تھا۔ اس میں سے نکل کے جو چیز سڑک پر اچھل کی تھی' وہ دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی تھی۔

میں نے گڈی اٹھا کے پیچھے دیکھا مگر شاد مجھے اوپر کسی بالکونی' کھلی کھڑکی یا چھت کی منڈیر پر نظر نہیں آئی۔ شک کی اس میں کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہ مالی امداد اس نے مجھے مشکل وقت کا سامنا کرنے کے لیے فراہم کی تھی۔ یہ وہی دس ہزار تھے جو میں نے شاد کو اس کا قرض چکانے کے لیے واپس کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے تھانے سے چھڑانے کے لیے اس نے رئیس کو دس ہزار دیے تھے۔ مگر اسے قرض سمجھ کے واپس لینے پر تیار نہ تھی۔ میرے اصرار پر اس نے یہ رقم رکھ لی تھی کہ ضرورت پڑے گی تو میں اس سے لے لوں گا۔

اب اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ وہ باپ کے غیظ و غضب کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے اسلحہ فراہم نہیں کرسکتی تھی کہ لو اس سے اپنے دشمن کا خاتمہ کردو ورنہ اسے معلوم ہوگا کہ ریوالور تکیے کے نیچے موجود ہے۔ تاہم اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب میرا ٹھکانا اس گھر میں تو کیا' اس شہر میں بھی کوئی نہیں ہوگا اور مجھے روپوشی کے لیے بڑے جتن کرنے ہوں گے۔ ایسے وقت میں دس ہزار کی رقم ہی میرا سب سے بڑا سہارا بن سکتی تھی۔

لائٹ واپس آتے ہی شاہ جی کو میں نے گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اسے یقین ہوگا کہ میں اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گیٹ سے نکل کے فرار ہوگیا ہوں مگر باہر سڑک کی ویرانی میں کہیں میرا سایہ تک نہ تھا۔ دس ہزار کے نوٹ اٹھانے کے ساتھ ہی میں نے کشکول بھی اٹھالیا تھا اور ساتھ والی کوٹھی کی قدِ آدم فصیل جیسی سرسبز جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔

شاہ جی نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سیدھا میری طرف آیا۔ دائیں طرف سے میں دیوار پھاند کے نہ سڑک پر آسکتا تھا اور نہ ساتھ والی کوٹھی میں اتر سکتا تھا۔ دیوار کے اوپر سے چھلانگ مار کے فرار ہونے کا راستہ صرف بائیں طرف تھا۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ میں نے زنجیر سے بندھے ہوئے کشکول کو گھما کے اس کے سر پر مارا۔ یہ بڑی کاری ضرب تھی۔ اس کا سر اندر سے بھی ہل گیا ہوگا۔ اس نے حلق سے بھینسے کی ڈکار جیسی آواز نکالی۔ پھر مجھے اندھوں کی طرح دبوچنے کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا اور وہ میرے اوپر آگرا۔

اسے اپنے اوپر سے ہٹا کے جھاڑیوں سے نکلنا بہت مشکل کام تھا۔ اس میں میرے کپڑے پھٹ گئے اور ہاتھوں پر اور چہرے پر پتلی پتلی خشک ٹہنیوں کی رگڑ سے خونی خراشیں پڑ گئیں جن کا مجھے اس وقت احساس بھی نہیں ہوا۔ میں بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور یہ جانتا تھا کہ میری ہار کا مطلب میری موت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں جھاڑیوں میں اور اندر دب گیا تھا اور میرے لیے سڑک پر آنے سے زیادہ آسان اندر کی جانب راستہ بنانا تھا۔

اپنے ہاتھوں پیروں سے گھنی شاخوں اور پتیوں کے جال کو توڑتے ہوئے میں اس لان میں گر گیا جس کو تین طرف سے چھ فٹ اونچی نفاست سے ہموار تراشی ہوئی باڑھ نے گھیر رکھا تھا۔ چوتھی سمت میں دوسری کوٹھی کا گیٹ تھا اور ادھر سے کوٹھی میں رہنے والے لان پر آتے ہوں گے۔ اس وقت وہاں صرف ایک زچہ بلی اپنے چھ عدد نومولود بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے غرانے لگی۔ بلی کی مامتا نے بچوں کے لیے خطرہ محسوس کیا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے وہ آدمی جیسے چالاک اور سفاک حیوان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ میں اس سے دور رہتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تیسری کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہنچا مگر وہاں میرے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

سیاہ راتوں کے بھیدوں کا تعاقب' جس نے سنگدلوں خبیث قوتیں چلا رہی تھیں۔
دوجیہ سحر
قیمت 100 روپے
راکھ
خوفناک آسیب کا' سین روحانیت سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
گھنشیام کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں' بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
اپنے بک سیلر سے اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز
بکسٹال علی بکسٹال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ جی کے شور سے چند فقیر بیدار ہو گئے تھے اور اس کے پیچھے باہر نکل آئے تھے۔ وہ سب میرے پیچھے دوڑتے تو ان سب سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ میں ان کے ہاتھ شاید نہ آتا مگر ایک غولِ بیابانی بد روحوں کی طرح پیچھا چلاتا۔ میرے تعاقب میں رواں رہتا تو آگے بہت سے گھروں کے چوکیدار یا گشت کرنے والے پولیس مین اور اکا دکا راہ گیر بھی متوجہ ہوتے اور فرار کے راستوں کی ناکا بندی کر دیتے۔

مجبوراً میں کوٹھی کی پانچ فٹ اونچی دیوار پر چڑھا۔ اندر سے ایک کتا فوراً مستعد ہو گیا اور بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں نے دیوار سے دو فٹ دور تک آنے والی درخت کی ایک شاخ پر قدم رکھا اور ذرا اوپر غلیل جیسے دو شاخے پر قدم جما کے بندر کی طرح بیٹھ گیا۔ کتا اس سرکاری ملازم کی طرح نااہل، کاہل اور بے وقوف تھا جس کو اوپر کی آمدنی نہ ہو۔ بھونکنے کی رسمی کارروائی پوری کر کے وہ لوٹ گیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ اگر وہ درخت کے قریب رہ کے منہ اوپر اٹھائے بھونکتا رہتا تو اس کے شور سے ڈسٹرب ہو کے باہر آنے والا مالک مجھے ضرور دیکھ لیتا۔

شاہ جی کے حکم کے غلام اس جگہ تک پہنچے جہاں شاہ جی جھاڑیوں میں ناپڑا کراہ رہا تھا۔ معلوم نہیں ان کے درمیان کیا سوال و جواب ہوئے۔ شاہ جی پر سرکی چوٹ کا اثر عارضی تھا۔ دو فقیروں نے اسے سہارا دے کے چلانے کی کوشش کی تو اس نے دونوں کا ہاتھ جھٹک دیا اور پھر سڑک پر آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ شاید اس نے اصل حقائق کی پردہ پوشی کے لیے سرکاری پریس نوٹ جیسا کوئی بیان جاری کر دیا ہو گا اور میرے جرم کی سنگینی ثابت کرنے کے لیے کوئی بہت بڑا جھوٹ بھی بولا ہو گا۔ مثلاً یہ کہ ناصر نظف نا تحقیق، میرے ہی گھر میں ڈاکا ڈالنے کی نیت سے داخل ہوا اور الماری سے ایک لاکھ کے زیور یا بونڈ نکال کر لے جا رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس کے پیچھے اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تو اس نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مار دیا۔ جو چیز میں نے اس کے سر پر ماری تھی وہ ساتھ والی کوٹھی کے لان پر پڑی ہوئی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔

شاہ جی کے دو چیلے اپنی تابعداری ثابت کرنے کے لیے دائیں طرف اور دو بائیں طرف دوڑتے ہوئے گئے۔ اندازہ انہیں بھی ہو گا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے اور مذکورہ مجرم اب تک کئی گلیاں اور سڑکیں عبور کر کے نہ جانے کہاں پہنچ گیا ہو گا۔ پھر سوتے سے اٹھ کے آدھی رات کو دوڑنا بھی مشکل کام تھا۔ میں نے اپنی محفوظ اور بلند پناہ گاہ سے ان کو دس منٹ بعد ہی ناکام لوٹتے دیکھا۔

یہ مضحکہ خیز صورتِ حال دنیا کی کسی بھی لوا سٹوری میں پیدا ہو تی تو وہ سالِ رواں کی بہترین کامیڈی فلم قرار پاتی۔ ہیرو ایک درخت پر ننگا بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے ہیروئن کے روایتی ٹانگ اڑانے والے ظالم باپ کو سٹکول مار کے لمبا لٹا دیا ہے۔ وہ خود بھی فقیر ہے اور اس کی جان کے دشمن بھی اتنے ہی خراب حال فقیر ہیں۔ درخت کے نیچے ایک طرف صرف بھونکنے والا کتا ہے تو دوسری طرف ایک زچہ بلی اور چھ نوزائدہ بچے۔ یہ تمام صورتِ حال جتنی خطرناک تھی اتنی ہی مزاحیہ بھی اور فل آف ایکشن بھی۔

شاہو نے سٹکول اس لیے پھینکا تھا کہ وہ نوٹوں کی گڈی اچھالتی تو شاید وہ اتنی دور نہ پہنچتی۔ نوٹ پھڑپھڑاتے اور کاغذی نوٹ درمیان میں ہی گر جاتے۔ سٹکول کا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ شاہو اتنی دور نہ پھینک پاتی۔ ہنگامی حالات میں بھی اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔

درخت سے اتر کے میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہوا اچانک ہو گیا مگر میرے لیے یہ سانحہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ہماری ملاقاتیں کب تک چوری چھپے جاری رہ سکتی تھیں۔ عشق کے راز کو افشا ہونے سے کون بچا سکتا ہے۔ اسی لیے میں وہاں قیام کو طول دینے کے خلاف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اور شاہو پکڑے جانے سے پہلے فرار ہو جائیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے تین دن کی مہلت دی تھی مگر تین منٹ بعد میری ساری خاندانی منصوبہ بندی دھری رہ گئی۔

میں شاہو کی طرف سے سخت فکر مند تھا۔ اگر وہ چاہتی تو میرے ساتھ فرار ہو سکتی تھی لیکن اسے بھی اندازہ ہو گا کہ میں اکیلا شاید سب کو جل دے کر نکل جاؤں گا مگر وہ ساتھ ہو گی تو اسے بچاتے بچاتے میں خود بھی پکڑا جاؤں گا چنانچہ اس نے اپنی سزا کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا اور کم سے کم وقت میں فیصلہ کر لیا کہ میرے لیے کچھ کرے تاکہ بعد میں موقع ملے تو میں اس کے لیے کچھ کر سکوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شاہو کو سخت ترین سزا سے بچانا میرے لیے فی الحال ممکن نہیں تھا۔ میں دل گرفتہ اور خوف زدہ آہستہ آہستہ سڑک پر چلنا گیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ میرا ہر قدم مجھے شاہو سے دور لے جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیا میں پھر اس سے مل سکوں گا؟ اس کا باپ اسے قتل تو کرنے سے رہا۔ وہ شاہو کو مارے گا۔ بید سے یا بنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ دے

گا۔ اسے کمرے میں بند کر دے گا۔ بھوکا پیاسا رکھے گا۔ یہ سب جسمانی سزائیں وہ برداشت کر سکتی ہے مگر شاہ جی نے آئندہ کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے شاہو کو کہیں دور بھیج دیا، اسی شہر میں یا شہر سے باہر۔ فوراً اس کی شادی کر دی، پھر میں اسے دیکھ بھی نہیں پاؤں گا۔

باقی رات گزارنے کے لیے میرے پاس دس ہزار روپے تھے مگر کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے آج تک رئیس جیسے دوست کے گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ گھر تھا یا صرف شب بسری کا ٹھکانا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں سیدھا اس کے پاس چلا جاتا۔ میرا حلیہ اور میرے کپڑے ایسے تھے کہ میں کسی ہوٹل میں جا کے کمرا حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو مجھے دھکے دے کر نکال دیا جاتا اور میں نوٹ دکھاتا تو شاید مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔

ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ اور داتا صاحب کے آس پاس کا علاقہ بے گھر لوگوں کو عارضی پناہ فراہم کر دیتا ہے۔ داتا صاحب کے مزار کے قریب سونے والوں میں حاجت مندوں سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں اور ان کے درمیان میری پوزیشن اتنی ہی غیر محفوظ ہوتی جتنی اس درباری کی جو شاہ سے بغاوت کرے اور پھر اس کے لشکر میں پناہ کے لیے گم ہو جائے۔

ریلوے اسٹیشن پر پولیس سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ بلاوجہ بھی کسی مفرور مجرم کو تلاش کرنے کے بہانے وہاں پنچ کے جیسے چاہیں لات مار کے سوتے سے جگا سکتے ہیں اور تفتیش کے لیے تھانے لے جا سکتے ہیں۔ میں تھانے جا کے فراخ دلی سے دس ہزار پیش کر دیتا پھر بھی مجھے جان چھڑانا مشکل ہوتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہو جاتا کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی۔ چوری (یعنی) کا اعتراف کرانے میں ناکام ہونے تک وہ مجھے کوٹ کوٹ کے پاپڑ بنا دیتے۔ اب کوئی شاہو میری ضمانت پر رہائی کرانے والی نہیں تھی۔

میری احتیاط پسندی نے میری جان بچالی۔ میں نے راولپنڈی جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ آخری گاڑی خیبر میل بہت پہلے گزر چکی تھی۔ میں ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ وہاں چند قلی لمبی تانے سو رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میرے جیسے بھی تھے جن کے حلیے سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ صبح کی کسی گاڑی سے جانے والے تیسرے درجے کے مسافر ہیں یا بے گھر اور لاوارث۔ ان کا جرم مفلسی تھی جس کا اعتراف ان کی صورتوں پر تحریر تھا۔ رات کے آخری حصے میں جب میں سر جھکائے اونگھنے اور مستقبل کے بارے میں اچھے بھلے خواب دیکھنے میں مصروف تھا، ایک سنتری بادشاہ نے قانون کی سخت زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اس وقت ٹکٹ میرے کام آیا۔ میں نے کہا کہ مسافر ہوں اور صبح کا انتظار کر رہا ہوں۔ دستاویزی ثبوت کے طور پر ٹکٹ ملاحظہ فرما کے وہ آگے بڑھ گئے۔

صبح تک میں نے بہت سوچا۔ یہ بھی کہ میں لوٹ کر شاہ جی کے پاس جاؤں اور اس کے سامنے دست بستہ عرض کروں کہ میں آپ کا مجرم ہوں لیکن میں شاہو سے محبت کرتا ہوں اور محبت کے بارے میں عرض کرتا ہے فلمی شاعر کہ۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی۔ اور یہ کہ۔ محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں۔ آپ اس ناچیز کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے اور شاہو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمائیے۔

ظاہر ہے شاہ جی ناچیز کو ناپید کر دیتا کہ تیری تو محبت کی دُم میں نمدا۔ بالشت بھر کا لونڈا۔ تنقیلِ اعظم کی اولاد۔ شاہو کو انار کلی سمجھتا ہے۔ ڈائیلاگ بولتا ہے میرے سامنے۔

پھر میں نے سوچا کہ اس کیس میں ڈاکٹر مشہود سے مدد لی جائے۔ انہیں اول تا آخر اپنے عشق کی الف لیلہ سنا دی جائے اور پھر درخواست تھما دی جائے کہ اب تم میرے خوابوں کی شاہزادی کو اس کے ظالم دیو جیسے باپ کی قید سے آزاد کرانے میں حاتم طائی کا رول ادا کیجئے۔ مگر یہ بھی ناممکن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے کہ اچھا، ایک فقیرنی سے عشق فرماتے ہیں آپ۔ بہت خوب۔ ذرا اپنی عمر اور اپنی اوقات ملاحظہ فرمائیے۔ پھر وہ ایک لات مار کے مجھے گیٹ آؤٹ کر دیتے کہ نالی کے کیڑے۔ ہم نے غلطی کی تھی جو تمہیں انٹرکنڈیشنڈ بیڈ روم میں اپنا بنا کے رکھا تھا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

تیسرا خیال وہ تھا جو قابلِ عمل ثابت ہوا۔ صبح میں نے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے کپڑے خریدے۔ ایک فقیر کسی فیشن شاپ میں جا کے اپنے لیے جینز اور شرٹ خریدتا تو بے حد مشکوک ہو جاتا۔ میں نے پہلے معمولی قیمت کے شلوار قمیص خرید کر پہنے پھر انار کلی گیا اور وہاں سے اسی معیار کے کپڑے لیے جیسے مجھے بیگم صاحبہ نے دلوائے تھے۔ جوگر پہننے کے بعد میں نے اچھی قسم کے سن گلاسز بھی لگائے اور زیرو سے ہیرو بننے کی خوشی اور اعتماد کی بحالی کو محسوس کیا۔ اچانک میرا خوف ختم ہو گیا اور شاہ جی مجھے ایک تھرڈ کلاس آدمی نظر آنے لگا جو صرف فقیروں کو دہشت زدہ کر سکتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا نامی گرامی بدمعاش بھی نہیں تھا جس کے نام سے شہر کا ہر شریف آدمی تھر تھر کانپتا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوپہر سے کچھ پہلے میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے لان میں داخل ہوا تو بیگم صاحبہ ناشتے کے برتن میز پر رکھے اخبار دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ ان کے بال کھلے ہوئے اور گیلے تھے۔ وہ نہانے کے بعد باتھ گاؤن پہن کر باہر آ بیٹھی تھیں۔ ان کی صورت پر خفگی سے زیادہ حیرانی اور خوشی کے جذبات دیکھ کر میں مسکرا تا ہوا ان کے قریب پہنچا اور انہیں سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دیے بغیر صرف سرہلا کے میری صورت دیکھتی رہیں "تم۔۔۔ غالباً ناصر ہو؟"

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اپنا سر جھکا دیا "اگر آپ ناراض ہیں تو میرا سر حاضر ہے۔ اتاریئے اپنے نازک پاؤں سے یہ حسین جوتی۔۔۔"

میری اداکاری کا اثر الٹا ہوا۔ انہوں نے برہمی سے کہا۔ "ڈرامامت کرو میرے سامنے۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں خفیف ہو کے کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے معلوم تھا۔۔۔"

"تمہیں سب معلوم تھا۔ بس ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے جھوٹے اور فریبی ہو۔ تمہاری معصومیت اور مظلومیت سب اداکاری تھی۔ تم ایک خود غرض، احسان فراموش اور کمینے شخص ہو۔ اس قابل نہیں ہو کہ تم پر بھروسا کیا جائے۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

میں نے کہا "آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ آپ گالیاں بھی دیں گی تو میں خاموش رہوں گا۔ لیکن سب کچھ کہنے اور سارا غصہ نکالنے کے بعد یہ سوال بھی پوچھ لیں بیگم صاحبہ کہ اتنا عرصہ میں اپنی مرضی سے غائب رہا یا میں مجبور تھا؟"

"سوچ کے آئے ہو کوئی کہانی۔ چلو سناؤ" انہوں نے طنز اور تلخی سے کہا "کیا ہوا تھا آخر تمہارے ساتھ؟ اغوا کر کے لے جانے والوں نے تمہیں علاقہ غیر پہنچا دیا تھا جہاں تم قیدی تھے۔ کسی سے رابطہ بھی نہیں کر سکتے تھے اور آج بڑی بہادری سے جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے یا کسی سردار کی بیٹی تم پر فریفتہ ہو گئی اور اس نے مدد کی تمہاری۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے فلموں میں۔ لیکن حقیقت اتنی دلچسپ نہیں ہوتی۔ سنانے کو میں اس سے بہتر کہانی سنا دوں مگر آپ سے جھوٹ بول کے مجھے کیا ملے گا۔ اگر پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے تو بتایئے۔"

ان کا رویہ کچھ نرم ہوا "تم کہہ کے گئے تھے کہ میں ابھی آتا ہوں اور اس کے بعد آج شکل دکھائی ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہم کتنے پریشان رہے۔ کہاں کہاں نہیں پوچھا۔ بالآخر پولیس کو رپورٹ لکھوائی۔"

"رپورٹ لکھوا دی آپ نے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"اور کیا کرتے۔ خاموش بیٹھے رہتے ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ تمہاری کوئی تصویر نہیں تھی ہمارے پاس ورنہ اخبار میں بھی شائع کرا دیتے۔ ایک مصیبت یہ کہ تمہارا نام تو معلوم تھا مگر تمہارے والد کا نام بھی پوچھا پولیس نے۔ مجبوراً یہ لکھوایا کہ ناصر ہمارے پاس ملازم تھا۔ تھانے دار کہنے لگا کہ آپ جیسے پڑھے لکھے اور رتبے دار لوگ بھی گھر میں ملازم رکھ لیتے ہیں اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیے بغیر۔ اسے سمجھایا کہ وہ یتیم خانے سے آیا تھا اور ہم اسے اپنے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ کئی سال سے ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے باوجود تھانے دار مصر تھا کہ رپورٹ لکھوانے سے پہلے گھر میں اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ نہ ہو گھل آ کے کہیں کہ لاکھوں کا زیور نہیں مل رہا ہے اور یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے۔ یہ گھر کے بھیدی اسی طرح اعتبار قائم کر کے واردات کرتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے ان کا رویہ۔"

"وہ تو رپورٹ لکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہانہ بنا لیا کہ ایک دو دن اور دیکھ لو۔ یتیم خانے سے اس کی ولدیت بھی پوچھ لو۔ ڈاکٹر صاحب نے بحث نہیں کی۔ واپس آ کے یتیم خانے والوں سے تمہارے والد کا نام پوچھا۔ پھر اپنے ایک دوست ایس پی کو فون کیا تو شام کو وہی تھانے دار گھر آ گیا رپورٹ لکھنے کے لیے مگر رپورٹ سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم اسپتالوں میں دیکھ لیں۔ خاص طور پر مردہ خانوں میں۔ اگر وہ حادثے میں زخمی ہوتا تو دو سرے دن یا ایک ہفتے بعد فون ضرور کرتا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آپ لوگ۔۔۔ مردہ خانوں میں بھی دیکھتے رہے۔"

"نہ دیکھتے تو کیا کرتے۔ تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں تھی۔ عام آدمی کے لیے یہ بھی مشکل ہوتا مگر ڈاکٹر صاحب نے خود سارے شہر کے اسپتالوں کا چکر لگایا اور لاوارث لاشوں میں تلاش کرتے رہے۔"

"آئی ایم سوری بیگم صاحبہ!"

"بس۔ تم نے سوری کہہ دیا اور بات ختم ہو گئی۔ آخر کہاں تھے تم؟ ایسی کون سی جگہ تھی جہاں سے تم فون کر کے اطلاع تک نہیں دے سکتے تھے کہ میں زندہ ہوں۔ کسی مصیبت میں پڑ گئے تھے تو بتا سکتے تھے۔ ہم تمہاری مدد کرتے"

ان کا پارا چڑھ گیا۔

میں نے کہا "مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوئی۔ آپ کی ناراضی برحق ہے۔ میں اس رات نکلا تھا۔۔۔ آپ کے لیے کچھ لانے کے لیے۔۔۔"

"میرے لیے؟ کیا لانے کی سوجھ گئی تھی اچانک؟"

"بس ایسے ہی میں نے سوچا کہ آپ کے لیے کوئی گفٹ لاؤں۔ اور سچ بتاؤں، میں نے ایک جگہ ٹاپس دیکھے تھے۔ مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے کانوں میں بہت اچھے لگیں گے، تھے تو بہت معمولی۔ آرٹی فیشل جیولری۔ مگر بہت خوب صورت اور بالکل نیا ڈیزائن۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ ان کے جذبات کی برف پگھل رہی ہے اور ان کے دل میں میری بات نے اس چنگاری کو پھر روشن کر دیا ہے جو حالات کی راکھ میں دب گئی تھی۔

انہوں نے ہنس کے کہا "یہ بھی دیکھتے پھرتے ہو تم؟"

میں نے کچھ جھینپ کر کہا "جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی ان ٹاپس کی۔ اگر خدا نے توفیق دی بیگم صاحبہ!"

"تو۔ تو کیا کرو گے؟" انہوں نے کچھ اشتیاق کچھ تجسس اور کچھ دلربائی کے انداز میں مسکرا کے کہا۔

"میں ہیروں کے ٹاپس کا سیٹ نذر کروں گا۔ بات قیمت کی نہیں ہوتی بیگم صاحبہ، جذبات کی ہوتی ہے۔"

"کیا جذباتی ہو گئے تھے آپ؟"

"آپ کچھ بھی سمجھ لیں لیکن یہ حقیقت ہے۔۔۔ وہ ٹاپس آپ کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ کسی اور کے کانوں میں شاید وہ اتنے اچھے نہ لگتے یا یہ بات وہی ہے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ ہر گل دان میں ہر پھول اچھا نہیں لگتا۔ آج جب میں آ رہا تھا ادھر تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔۔۔ وہ ٹاپس وہاں نہیں تھے۔ لے گیا تھا کوئی، ظاہر ہے وہ فروخت کے لیے تھے۔ سیکڑوں، ہزاروں ڈیزائن ہیں۔ کسی کو وہی پسند آیا۔۔۔"

میں نے پھر محسوس کیا کہ عورت پر خوشامد اور تعریف کے الفاظ کا جادو کتنی جلدی اثر کرتا ہے۔ وہ جذبات عشق کے اولین تجربے سے روشناس ہونے والی گاؤں کی الزمیار ہو، شہر کے کالج کی فیشن ایبل سوسائٹی میں نظر آنے والی لڑکی یا بدصورت بھکارن۔ کوئی چالیس سال کی بے ہنگم بھینس جیسی کالی اور سات بچوں کی ماں ہو یا یونیورسٹی میں فلاسفی پڑھانے والی۔ اور اس کے حسن کی قصیدہ خوانی کرنے والا کوئی شاعر، نکمیں بیاں ہو، جاہل اجڈ یا میرے جیسا عیار فریب کار۔ عورت کا دل تعریف و توصیف کے الفاظ کو خراج تحسین کے سچ کی طرح قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ اس سے جھوٹ نہیں بولا جا رہا ہے۔ عقل کی مزاحمت بھی رفتہ رفتہ کمزور پڑ جاتی ہے اور جذبات کسی غدار میر جعفر کی طرح ذات کے حصار کی حفاظتی فصیل کا کوئی در خاموشی سے کھول دیتے ہیں اور نہیم کو شبخون مارنا مشکل نہیں رہتا۔

مجھے اپنے آپ سے شرم بھی آئی کہ میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے کتنی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہوں اور کتنی خود غرضانہ بے حسی سے ایک عورت کو بے وقوف بنانے کے لیے اس کے جذبات سے کھیل رہا ہوں۔ میں مجبوری حالات کا بہانہ ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھ میں سچ کی بدصورتی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی ورنہ میں انہیں شاور کے بارے میں صاف بتا دیتا تو کون سی قیامت آ جاتی۔ ڈاکٹر صاحب مجھ پر فخا ہوتے۔ چیختے چلاتے کہ میں اپنا مستقبل خراب کر رہا ہوں۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے کہ میں ان چکروں میں پڑوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے بعد میں شاہ جی کے شر سے محفوظ ہو جاتا۔ اگر میں جانا چاہتا تو ڈاکٹر صاحب مجھے زبردستی نہیں روک سکتے تھے لیکن میں یہ سب کچھ ایسے کرنا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ نہ بیگم صاحب کو جذباتی صدمہ ہو۔ نہ ڈاکٹر صاحب خفا یا مایوس ہوں۔ مجھ پر کوئی الزام نہ آئے اور نہ مجھے اپنی محبت یا حماقت پر شرمندگی سے بچنے کے لیے کوئی جواز دینا پڑے۔ میری عزت بھی بنی رہے۔ مجھ پر احسان فراموشی یا نالی کا کیڑا ہونے کا الزام بھی نہ آئے اور بات بن جائے۔ یہ زمانہ سازی تھی۔ میری دور اندیشی، معاملہ فہمی یا مصلحت کوشی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مجھے جینے اور کامیاب ہونے کا سلیقہ یا ہنر آ گیا ہے۔

تاہم فوری طور پر میں نے ایک حماقت کا ارتکاب فرمایا۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ احساس نہیں رہا کہ میری نظر کہاں ہے۔ میں ٹاپس کی بات کر رہا تھا چنانچہ میری نگاہ بیگم صاحب کے کانوں پر ٹھہر گئی تھی جہاں ہیروں کے ستارے جیسے نگینوں والے سونے کے جھلمل کرتے بندے جھول رہے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کہا "کب تک کھوئے رہو گے اپنے تصورات کی دنیا میں۔ وہ ٹاپس نہیں ہیں میرے کانوں میں۔"

میں بری طرح جھینپ کے چونکا "جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ ہوتے تو کیسے لگتے۔"

"اب چھوڑو" ان کا چہرہ پھر خوابناک جذبات کی روشنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دھکنے لگا تھا "یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں سے آرہی ہے سواری؟ اور آخر کہاں نکل گئے تھے تم؟ کیا ٹاپس کی تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھانتے پھر رہے تھے؟"

میں نے کہا "ایک خواہ مخواہ کے جھگڑے میں ملوث ہوگیا تھا میں۔"

"کس کا جھگڑا؟"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ جھگڑا کیا ہے۔ میں تو بس ایسے ہی رک گیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے صرف ادھر سے گزرنے کی غلطی کی تھی۔ میں تو صلح صفائی کرانے والوں اور لڑنے والوں کو الگ کرانے والوں میں بھی شامل نہیں تھا۔ ہنگامہ بہت پہلے سے چل رہا تھا اور کوئی پولیس کو بھی طلب کرچکا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا یا میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی وہاں اس وقت پہنچا جب پولیس کی گاڑی پہنچی اور انہوں نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو آٹھ دس افراد کے ساتھ مجھے بھی اٹھا کے گاڑی میں ڈال لیا اور تھانے لے گئے۔"

"یعنی زبردستی۔۔۔ بلاوجہ؟ راہ چلتے کسی کو بھی پکڑ لیا۔ یہی اندھیر نگری بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ اندھیر نگری بھی ہے اور چوپٹ راج بھی ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔ پولیس ایسے ہی کرتی ہے۔ جتنے ہاتھ آئیں انہیں دھر لیتی ہے۔ اصل مجرم تو اکثر آؤٹ جاتے ہیں۔ پولیس ہمیشہ دیر سے پہنچتی ہے اور اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ہنگامہ کرنے والوں کو گرفتار کرتی ہے۔ پھر مسئلہ گنہگار یا بے گناہ کا نہیں ہوتا۔ آؤ ٹک مکا کرو، بندے لے جاؤ۔ جو سودا نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی الزام میں زیرِ تفتیش رہتا ہے۔ ظاہر ہے جس کو چھڑانے کے لیے کوئی نہ پہنچے اور رہائی کی قیمت ادا کرنے والا کوئی نہ ہو بالآخر وہی ملزم قرار پاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اتنا عرصہ تھانے میں بند رہے؟"

میں نے کچھ ندامت کا اظہار کرتے ہوئے سر جھکا لیا "جی۔"

"تم نے بتایا نہیں انہیں کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو؟ کسی نے ڈاکٹر صاحب کا حوالہ نہیں دیا" انہوں نے ناراضی سے کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ وہ دراصل معاملہ ہی ایسا تھا۔۔۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہوا، حوالات میں پہنچ جانے کے بعد میں نے دوسرے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تین مہینے پہلے جب لڑکی اغوا ہوگئی تھی۔ اس کو اغوا کرنے والا وہی تھا جو مجھ سے چاہتا تھا" میں نے سوچ کے ایک کہانی کا تانا بانا تیار کرلیا۔

"لڑکی اسے نہیں چاہتی تھی؟"

"یہی تو کمال ہے۔ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی اور اغوا کا ڈراما انہوں نے شادی کرنے کے لیے رچایا تھا" میں نے کہا۔

اب بیگم صاحبہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انہوں نے خادم کو، جو ناشتے کے برتن اٹھانے کے بعد مجھے بڑی طنزیہ مسکراہٹ اور ناپسندیدہ نظروں سے گھور رہا تھا، میرے لیے چائے لانے کو کہا "کچھ کھانے کو بھی" بیگم صاحبہ نے اسے جاتے جاتے کہا۔

میں نے کہا "وہ لڑکا اور لڑکی آپس میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن وہی پرانا مسئلہ، لڑکی کا رشتہ بھی بچپن میں طے کردیا گیا تھا اور لڑکے کا بھی۔ دونوں کے خاندان اڑ گئے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ لڑکی کالج میں پڑھتی تھی۔ اسے گھر میں نظربند کرکے شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ اس کی اطلاع لڑکے کو مل گئی اور اس نے لڑکی کے مشورے پر اغوا کا پروگرام بنالیا۔ وہ ایک رات اپنے چند دوستوں کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچا، لڑکی کے گھر والوں کو باتھ روم میں بند کیا اور وہ لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔"

"زبردستی خاک ہوئی؟"

"دیکھا تو سب نے بھی۔ سارے محلے میں شور ہوگیا۔ جب تک محلے والوں نے لڑکی کے ماں باپ کو آزاد کیا، اغوا کرنے والے غائب ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لڑکے کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرادی گئی مگر وہ گرفتار نہیں ہوا۔ اس کے اپنے گھر والے سخت پریشان تھے اور انہوں نے کہا کہ ہم خود شادی کی تاریخ مقرر کرچکے تھے۔ اب لڑکی والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ پولیس نے ان کے گھر کی تلاشی لی۔ دوستوں کے نام پتے پوچھے۔ قریبی رشتے داروں کے بارے میں معلوم کیا جو شہر میں رہتے تھے۔ پھر شہر سے باہر کے عزیز و اقارب کے پتے لیے۔ لڑکے والے بھی اثر رسوخ والے لوگ تھے اور لڑکی والے بھی۔ پیسہ دونوں نے خرچ کیا مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ لڑکے اور لڑکی نے ایک ماہ بعد شادی کرلی۔"

"ایک ماہ بعد کیوں؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

"کورٹ میرج کے لیے اخبار میں اشتہار دینا پڑتا ہے کہ میں ولد فلاں شادی کررہا ہوں فلاں دختر فلاں سے۔ کسی کو اعتراض ہو تو ایک مہینے میں عدالت کے سامنے پیش کرے۔ دونوں بالغ تھے چنانچہ قانونی طور پر۔۔۔ اور شرعاً بھی۔ یہ نکاح جائز تھا۔ اخباروں میں "اطلاعِ عام" قسم کے اشتہار کون

پڑھتا ہے۔ جب ان کی شادی ہوگئی تو انہوں نے سب کو بتادیا اور پولیس اسٹیشن جاکے اپنے خلاف درج کرائی جانے والی اغوا کی رپورٹ کو بھی میرج سرٹیفکیٹ دکھا کے جھوٹا ثابت کردیا۔ خود لڑکی نے کہا کہ اغوا کیسا، میں اپنی مرضی سے گئی تھی۔ پھر بھی پولیس نے انہیں گرفتار کیا اور عدالت میں ان کا بیان ہوا۔ ظاہر ہے عدالت نے انہیں آزادانہ زندگی گزارنے کی اجازت دی۔ لیکن لڑکی کے گھر والوں کے لیے یہ خاندان کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ ان کی اپنی بیٹی نے ان کے خلاف بیان دے کر انہیں کسی کو منہ دکھانے کے ..... قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ویسے تو لڑکے کے گھر والے بھی سخت مشتعل تھے اور انہوں نے اخبار میں "عاق نامہ" شائع کرادیا تھا مگر اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔"

"تمہیں پتا ہے قانون کا؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"دنیا میں رہ کے قانون سے واسطہ تو پڑتا ہی ہے جی!" میں نے کہا "دیکھ کے اور سن کے یا اخباروں میں پڑھ کے پتا چل جاتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ یہاں عزت کا معاملہ یک طرفہ ہے۔ معاشرے میں رسوائی صرف لڑکی والوں کے لیے رہ جاتی ہے۔ اول تو لڑکی کو عاق کرنے کے اعلان کا کوئی تصور نہیں اور کوئی ویسے ہی لاتعلقی کا اعلان کرتا پھرے تو اس سے پرانی عزت بحال نہیں ہوتی۔ ایک لڑکی لاکھ حوالے دے قانون اور شرع کے۔۔۔ کہ بالغ مرد عورت اپنی مرضی سے شادی کرسکتے ہیں۔ اثر پورے خاندان پر پڑتا ہے۔ اس کی بہنیں ہوں تو وہ بھی بدکردار قرار دے دی جاتی ہیں۔ لڑکی والوں نے کچھ عرصے بعد اپنی لڑکی کو اٹھوالیا اور اسے زبردستی گھر میں بند کرکے مجبور کیا کہ وہ اپنے پہلے بیان کی نفی کرتے ہوئے یہ کہے کہ وہ مجبور تھی۔ اس نے اپنی اور والدین کی جان کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر عدالت میں ایسا بیان دیا تھا۔"

"اور لڑکی نے ایسا ہی کیا؟" بیگم صاحبہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"جی نہیں۔ وہ اڑ گئی کہ چاہے تم سب مل کے مجھے مار ڈالو۔ میں جس کی ہوں اسی کی رہوں گی۔ ادھر لڑکے نے جیسے بے جا کا کیس کردیا اپنے سسرال والوں پر۔ لڑکی والوں کو معلوم تھا کہ یہ ہوگا۔ شوہر سے اس کی بیوی کو چھینا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے لڑکے کے خلاف رپورٹ لکھوادی کہ خود اس نے اپنی بیوی کو کہیں غائب کردیا ہے یا قتل کردیا ہے۔ اور ان کے خلاف یہ جھوٹا الزام ہے۔ پولیس نے لڑکی والوں کے گھر چھاپا مارا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی پھر انہوں نے لڑکے کو تفتیش کے لیے روک لیا۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی ضمانت کرالی۔ اس دوران لڑکے کو کہیں سے اطلاع ملی کہ اس کی بیوی کو خالہ کے گھر میں رکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کے گھر والوں میں سے کسی نے اس دشمنی اور قانونی جنگ کو غلط اور بے مقصد سمجھتے ہوئے مخبری کی۔ لڑکے نے چالاکی سے کام لیا۔ وہ خود تھانے گیا رپورٹ لکھوانے کہ سسرال والے اس کی جان کے درپے ہیں اور انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ جو غالباً کرائے کے غنڈے بدمعاش تھے، اسے جان سے مارنے کے لیے اس کے گھر پر حملہ کیا تھا مگر عین اسی وقت لڑکے کے کچھ دوست ایک سوزوکی پک اَپ میں بھر کے لڑکی کی خالہ کے گھر پہنچے اور وہاں سے اپنی بھابی کو نکال لائے۔ یہ وہی وقت تھا جب میں اُدھر سے گزرا۔ سوزوکی پک اَپ اس وقت تک موجود تھی۔ لڑکی آگے بیٹھی تھی۔ وہ پولیس کو دیکھتے ہی اتر کے بھاگ گئی اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئی۔ جو اسے لینے آئے تھے سب پکڑے گئے۔ خالہ کے گھر میں گھسنے والے سب نوجوان تھے۔ ان میں سے دو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ چار پکڑے گئے۔ پانچواں میں ان کے ہاتھ آگیا اور چھٹا میری طرح ایک بدقسمت گرفتار ہوا۔ اس وقت خالہ کے گھر والوں کو کسی کی صورت دیکھنے کا ہوش کہاں تھا۔ انہوں نے کہا کہ چھ لڑکے تھے۔ پولیس نے چھ کی گنتی پوری کی اور ہمیں تھانے لے گئی۔ دو لڑکے جو فرار ہوگئے تھے انہوں نے یہ خبر لڑکے کو دی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اور ایک وکیل کو ساتھ لے کر تھانے پہنچے۔ لڑکی نے کہا کہ سب جھوٹ۔ خالہ نے مجھے واپس ماں باپ کے گھر بھیج دیا تھا اور میں وہاں سے نکل آئی۔ اس کے باوجود گرفتار ہونے والوں پر ہنگامہ آرائی اور نقضِ امن کا کیس بنتا تھا۔ جو دوست باہر تھے انہوں نے دوڑ دھوپ کی اور پولیس کو تفتیش سے روک دیا۔ وہاں میری کون سنتا کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں یا یہ کہ میں بے گناہ ہوں اور میں تو کسی کو جانتا بھی نہیں۔ پولیس تو سب کو شریکِ جرم بنانے پر آمادہ تھی۔ زبردستی کسی کے گھر میں گھسنا ہی ایک سنگین جرم ہے خواہ آپ کی نیت جرم کی نہ ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ وہاں کیا لینے گئے تھے؟ ہم پر اقدام قتل، بلوا، ہراساں کرنے، مجرمانہ نیت، سب کچھ ثابت کیا جاسکتا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا نام لیتا تو کیا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی بدنامی ہوتی۔ گواہ بہت تھے جنہوں نے سوزوکی میں چھ لڑکوں کو وہاں آتے دیکھا تھا۔ صورت آشنا نہ ہونے کے باوجود مجھے بہت سے چشم دید گواہوں نے شناخت کرلیا تھا۔ مجھے اصل مجرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...س عاشق جانباز نے بھی بہت تسلی دی اور بہت معذرت ...میں خواہ مخواہ پکڑا گیا۔ بس اس کے بعد صلح صفائی ...نے کا سلسلہ شروع ہوا اور پولیس نے بھی سب کو بلا کے ...ختم کرو جھگڑا۔ کچھ وکیل آئے' کچھ خاندان کے سمجھ ...گ۔ انہوں نے کہا کہ شادی تو ہوگئی اور لڑکی واپس ...والی نہیں ہے۔ کیوں اس تھانہ کچہری میں منہ کالا ...تے ہو۔ سارے بند ہو جائیں گے اور سب جوتے کھائیں ...ور جیل جائیں گے۔ بس اسی میں اتنے دن گزر گئے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "مگر تم فون کر سکتے تھے۔ کسی اور کو نہ مجھے بتا سکتے تھے۔ یہ پیغام دے سکتے تھے کہ تم ٹھیک ہو ...میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے کوشش کی تھی لیکن ہم سب مجرم تھانے سے ...قل کر دیے گئے۔"

"جیل۔۔۔ تم جیل میں تھے؟" بیگم صاحبہ نے حیرانی سے

"جی۔۔۔ تھانے میں ہمارے خلاف پرچہ کاٹ دیا گیا تھا۔ ...نے ہمیں پیش کیا' ریمانڈ کے لیے مگر مجسٹریٹ نے ...ل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ یہ سب پہلے سے طے تھا۔ جو ...ت میں بند ہو وہ غیر محفوظ ہوتا ہے۔ پولیس کے تشدد ...انے کے لیے وکیل جو ڈیل ریمانڈ مانگتے ہیں۔"

"تم تو پورے وکیل ہو گئے ہو۔"

...میں نے کہا "تجربہ سب سکھا دیتا ہے بیگم صاحب۔ جیل ...ی آرام کی جگہ نہیں ہوتی مگر ہمارے لیے سارا انتظام ...ں کر لیا گیا تھا۔ لڑکے نے اور اس کے سب دوستوں کے ...والوں نے مل کے سارے اخراجات برداشت کیے۔ ...دالت میں صلح صفائی کے بیانات ہو گئے تو ہماری رہائی ...کامات جاری ہوئے۔"

"مگر تمہارے کپڑے کیسے بدل گئے۔ تم ان کپڑوں میں تو ...ے نہیں گئے تھے؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

...میں نے کہا "جیل جانے والوں کے کپڑے اتروا لیے ...ہیں۔ جیل کے کپڑے دیے جاتے ہیں پہننے کو۔ رہائی ...ر اصولاً سب واپس مل جانا چاہئے' میرے جوتے پڑے ...پسند آ گئے ہوں گے۔ ایک پرانا شلوار قمیص دیا کہ تم ...ہوئے تھے۔ میں کیا انکار کرتا اور کیسے بحث کرتا۔ بس ...ن لیے۔ جن کی وجہ سے بلاوجہ مشکل میں پڑا' انہوں ...ت معافی مانگی اور ہرجانے کے طور پر مجھے دس ہزار ...ی دیے۔ یہ دیکھیں' انہی میں سے میں نے یہ پرزے ...ے۔"

بیگم صاحبہ نے ہنس کے کہا "واہ بھئی' جیل نہیں' کمائی کرنے گئے تھے۔"

"خدا بچائے ایسی کمائی سے بیگم صاحبہ۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہیں مارا تو نہیں پولیس نے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پیسہ خرچ کیا جائے تو آدمی حوالات میں بھی عیش کرتا ہے اور جیل میں بھی۔ وہ جیسے والے لوگ تھے اور اثر رسوخ والے بھی۔ کسی نے انگلی نہیں اٹھائی مگر قید کی خواری کا عذاب تو تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ میری یہ کہانی ڈاکٹر صاحب کو زیادہ قائل نہیں کرے گی۔ وہ اور بہت کچھ جاننا چاہیں گے مثلاً یہ کہ وہ کون لوگ تھے جن کے جھگڑے میں بلاوجہ ملوث ہو کے میں تھانے اور جیل ہو آیا تھا۔ ان کے نام کیا ہیں' وہ کہاں رہتے ہیں۔ تھانہ کون سا تھا۔ تھانے دار کا کیا نام ہے۔ میرے ساتھ پکڑے جانے والے دوسرے لوگ کون تھے۔ کس مجسٹریٹ کے سامنے مجھے ریمانڈ کے لیے پیش کیا گیا تھا اور کس تاریخ کو۔ میں جیل کب گیا اور تھانے سے جیل تک ہر جگہ مجھے تحفظ فراہم کرنے والے بااثر لوگ تھے اور مجھے میری تکلیف کا معاوضہ دس ہزار دے سکتے تھے تو کیا ڈاکٹر صاحب سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے اور انہیں بتا نہیں سکتے تھے کہ نامہ بے قصور پکڑا گیا ہے' آپ مطمئن رہیں۔ ہم اس کا خیال رکھ رہے ہیں۔ چند دن میں وہ خیر و عافیت کے ساتھ گھر لوٹ آئے گا۔ وہ خود نہ آتے' ڈاکٹر صاحب کو فون پر بتا سکتے تھے۔

میں نے بیگم صاحبہ سے کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی بدنامی کا خیال تھا اس لئے میں نے ان سے اپنے تعلق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر صاحب تو کہیں گے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ میری بدنامی کا اس میں کون سا پہلو ہے جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ بہرحال محال تم ان لڑکوں میں شامل ہوتے تب بھی میں تھانے جا کے خود تمہیں چھڑا لاتا۔ ایک فون کروا دیتا کسی سے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا تو بدنامی کا کیا سوال؟ ان سے مجھے یہی ڈر تھا کہ میں ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولوں گا لیکن وہ ہر جھوٹ کا پوسٹ مارٹم کر کے مجھے جھوٹا ثابت کر دیں گے اور ظاہر ہے اس کے بعد میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ اگر میں نے انہیں سچ بتایا تب بھی اور نہ بتایا تب بھی۔ بیگم صاحبہ کو سخت رنج ہوگا کہ میں نے ان سے اتنا بڑا جھوٹ بولا اور انہیں بے وقوف بناتا رہا۔ میں ایک فقیرنی کے عشق میں دیوانہ تھا اور استحصال ان کے جذبات کا کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب تو نوٹس دے دیں گے کہ اب اٹھاؤ

اپنا بوریا بستر اور جا کے ڈیرا ڈالو کوئے جاناں میں ورجاناں پڑا جاؤ جہنم میں۔ اب تم سدھر نہیں سکتے۔ تمہارا مستقبل تاریک ہے اور ہم اپنے گھر میں تمہارے قیام کی ذمے داری کا رسک نہیں لے سکتے کیونکہ تمہارا سایہ بھی ہمارے بچوں پر پڑا تو وہ بھی برباد ہو جائیں گے۔

خلاف توقع ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے تو جذباتی ہو کے فوراً انہیں فون پر مطلع کر دیا تھا کہ خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آئے ہیں۔ وہ دوپہر کے بعد لنچ کے لیے آئے تو انہوں نے سرسری انداز میں میری اسٹوری سنی اور کھانا کھاتے ہوئے کبھی کبھی بولتے بھی رہے کہ "اچھا! ویری بیڈ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ اوہ بات اتنی بڑھ گئی۔۔۔ جیل یاترا بھی ہو گئی خیر سے۔۔۔ بڑی بے وقوفی کی تم نے کہ ہمیں نہیں بتایا۔" لیکن صاف ظاہر تھا کہ ان کا ذہن کسی اور بات میں الجھا ہوا ہے۔ انہوں نے میری بات کچھ سنی اور کچھ نہیں سنی یا سنی تو پوری توجہ سے نہیں سنی۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر دوستوں سے بیک وقت نمٹ رہے تھے۔ ایک ان کا اپنا مسئلہ تھا۔ دوسری میری بچی اور دکھ بھری آپ بیتی تھی۔ انہیں میری واپسی کی خوشی تھی اور وہ میری بات سننے پر مجبور تھے۔ وہ بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابھی میں تمہاری بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس سے ان کی بیگم کو بھی صدمہ ہوتا جو میری داستانِ الم پر دردناک تبصرے کر رہی تھیں اور ان سب کے خلاف گرمجوشی ریمارکس دے رہی تھیں جن کی وجہ سے میں مشکل کا شکار ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو حقائق کا تجزیہ کرنے اور جھوٹ پکڑنے کے لیے میری بات کا پوسٹ مارٹم کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی چنانچہ انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے کان میری بات پر رکھے مگر ذہن اپنے مسئلے کی طرف رکھا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور آدھے گھنٹے بعد مجھے تھکی زدے کر چلے گئے کہ چلو عیش کرو اب۔ جیب میں دس ہزار۔ بعض ایسے حادثات بھی پیش آتے ہیں زندگی میں کہ گیسوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

وہ چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ خطرہ اب بھی تھا کہ بعد میں جب انہیں ذہنی فراغت میسر آئے گی تو وہ پوری توجہ اور زیادہ تفصیل کے ساتھ مجھ سے پھر سب کچھ سننا چاہیں گے اور اس وقت کسی ہوشیار وکیل کی طرح جو اپنی جرح سے جھوٹے گواہ کے بیان کے بخیے ادھیڑ دے' وہ میری کہانی کو سفید ترین جھوٹ کا بدترین پلندہ قرار دینے کے بعد مناسب کارروائی بھی ضرور کریں گے لیکن مجھے یہ امید بھی تھی کہ شاید بات پرانی ہو جانے کے بعد ان کے لیے اتنی اہم نہ رہے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اس دن ڈاکٹر صاحب ایک میڈیکو لیگل کیس میں پھنس گئے تھے۔ ایک مریض کی موت کا ذمے دار ان کی غفلت' کوتاہی اور نااہلی کو ٹھہرایا جا رہا تھا اور مرنے والے کے لواحقین ایسے لوگ تھے جو قانونی راستے سے زیادہ غیر قانونی طریقے سے ڈاکٹر صاحب کو اس کی سزا دینا چاہتے تھے۔ نااہلی کا الزام تو سراسر لغو تھا۔ وہ بہت بڑے اور تجربہ کار اسپیشلسٹ تھے۔ کوتاہی کسی بھی انسان سے ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر بھی فرشتہ نہیں ہوتے۔ غفلت کا الزام ہر اسپتال میں ڈاکٹروں پر عائد ہوتا رہتا ہے۔ مرنے والے کے لواحقین صدمے کی جذباتی کیفیت میں اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں کہ زندگی اور موت منجانب اللہ ہے اور موت کا ایک دن اور وقت متعین ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ وقتی صدمے کی اشتعال آمیز جذباتی لہر گزر جاتی ہے تو وہ خود ہی سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں یا سمجھانے والے سمجھا دیتے ہیں کہ ڈاکٹر کے خلاف کبھی کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا جو خود کو قانون سے بالاتر طاقت سمجھتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر

مشتاق احمد قریشی کے سحر کار قلم سے نیا ناول
فطرت کے باغی شخص کا
عبرت ناک انجام
پاتال
قیمت جلد اول: ۱۷۵/-
قیمت جلد دوم: ۱۷۵/-
۳۰ روپے
ایک ہیجان انگیز داستان کی انوکھی داستان وہ انسانی ذات کی پاتال کے نئے زاویے بے نقاب کرنے چلا تھا
دلکش منظر دلچسپ موضوع کی جگہ اداسی اور مایوسی سے بھرپور ناول
ہر صفحہ تجسس سے بھرپور ناول
اسے ضرور پڑھیے
الشرف علی میاں پبلیکیشنز
علی اکیڈمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو معاف کردیتے ہیں۔

اس رات ڈاکٹر صاحب دیر سے آئے۔ وہ اپنے وکیل سے مشورہ کرنے گئے تھے اور کچھ ایسے لوگوں سے رابطہ کررہے تھے جو مشتعل لواحقین کے سامنے ان کے عذرِ گناہی کی وکالت کرسکیں۔

میرا ذہنی اور جذباتی مسئلہ سب سے الگ تھا۔ ابھی تک میری نظر میں گزشتہ رات کے واقعات کی HORROR فلم چل رہی تھی۔ شاہ جی کے اچانک نازل ہونے کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ اسے یاد کرکے میری رگوں میں خون کی روانی سرد پڑنے لگتی تھی۔ رہ رہ کے مجھے شاہد کا خیال آتا تھا۔ معلوم نہیں بعد میں شاہ جی نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ وہ ضدی، سرکش اور حوصلہ مند لڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مار برداشت کرلے گی۔ ممکن ہے وہ باپ کے سامنے ڈٹ جائے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اعترافِ جرم کرلے اور باپ اس عیار حسینہ عرف باغی محبوبہ کو تشدد کے ذریعے راہِ محبت سے ہٹانے کا خیال چھوڑ دے۔ اس کا کچھ اور بندوبست کرے۔ اسے میرے خیال کی پہنچ سے بھی دور نچاوے یا راتوں رات اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں تھما کے کہے کہ چاندنی جناب تیرے حوالے۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ باپ کو میرے بارے میں سچ بھی نہیں بتائے گی۔ اسے میرا فون نمبر یا پتا ہرگز نہیں دے گی لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ موقع ملتے ہی وہ مجھ سے فون پر رابطہ کرے یا فرار ہوکے ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر پہنچ جائے۔ شاہ جی کو کیا معلوم کہ میرا ایسا معزز ٹھکانا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رئیس سے پوچھنے اور پوچھنے کے لیے پولیس کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر رئیس کے پاس نہ میرا فون نمبر ہے اور نہ پتا۔ ہوتا تب بھی وہ شاہ جی کو کچھ بتانے والا نہیں تھا۔

میں نے سارا دن شدید اضطراب میں گزارا۔ میں آرام کرنے کے بہانے اپنے پرانے بیڈ روم میں سرتک کمبل اوڑھے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شاہد سے ملنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں اسے فون بھی نہیں کرسکتا تھا۔ فی الحال شاہ جی اپنی بیٹی کو سخت حراست میں رکھے گا۔ شاید خود ریوالور لے بیٹھا رہے کہ میں شہید محبت کہلانے کے شوق میں ادھر کا رخ کروں تو میری یہ خواہش پوری کرے۔ شام سے پہلے رئیس سے رابطہ مشکل تھا اور اس سے ملنے میں بھی خطرہ تھا کہ شاہ جی کے مخبر رئیس کے پیچھے ہوں گے تو میں ایسے پکڑا جاؤں گا جیسے بے وان میں داخل ہونے والا چوہا پکڑا جاتا ہے۔

میں سونا چاہتا تھا۔ گزشتہ رات میں نے ریلوے پلیٹ فارم پر سخت ذہنی اور جسمانی اذیت میں جاگتے گزاری تھی۔ لیکن نیند اب بھی میری آنکھوں سے دور تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شاہد کا فون نہ آجائے۔ کہیں وہ خود نہ پہنچ جائے۔ میرے اندازے غلط نہ ہوجائیں۔ شاہ جی کے دباؤ میں شاہد نے یا رئیس نے میرے بارے میں کچھ بتادیا تو شاہ جی اپنے خاص آدمی مجھے اٹھوانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے باہر تعینات کردے گا۔ شام کے بعد میری آنکھ لگ گئی اور میں پھر جاگا تو رات ہوگئی تھی۔ کوٹھی میں بھی سکوت تھا۔ اندر نہ ٹی وی بول رہا تھا اور نہ گھر والے باتیں کررہے تھے۔ میں نے لائٹ جلائی اور وقت دیکھ کے حیران رہ گیا۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں منطبق ہونے والی تھی۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چھ سات گھنٹے سوتا رہا تھا۔

دروازہ کھول کے میں باہر آیا تو ڈاکٹر صاحب کے بیڈ روم میں دروازے کے نیچے سے روشنی کی لکیر نظر آرہی تھی۔ ابھی وہ جاگ رہے تھے لیکن بچے سوچکے تھے۔ نوکر سرونٹ کوارٹر میں سوتا تھا۔ کچن اور لاؤنج کی ساری لائٹس آف تھیں لیکن باہر پورچ میں جلنے والی روشنی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن کر اندر بھی پہنچ رہی تھی۔

اب مجھے بھوک محسوس ہورہی تھی۔ میں نے فریج کھول کے دیکھا تو اس میں میرے کھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ آدھا پائن ایپل کیک تھا۔ پھل تھے اور مٹھائی تھی۔ پھر مجھے ایک کتے کا ڈبا نظر آیا۔ اس میں تقریباً ایک چوتھائی پیزا تھا۔ شاید ڈاکٹر صاحب یہ رات کو واپسی میں لائے تھے یا پھر وہ باہر کھانا کھانے گئے تھے۔ یہ چوتھائی پیس میرے لیے ہی بچایا گیا تھا۔ انہوں نے اس خیال سے مجھے نہیں جگایا ہوگا کہ "تھانے اور جیل" کی پریشانی اور بے آرامی کے بعد مجھے کھانے سے زیادہ پُرسکون نیند کی ضرورت ہے۔

میں نے ٹھنڈے پیزا کے ساتھ ایک پیپسی کی بوتل نکالی اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اب میں بہت پُرسکون تھا اور خوف جو میرے اعصاب پر سوار تھا، پس منظر میں چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ دانتوں سے پیزا کاٹ کر کھاتے ہوئے اور پیپسی کے گھونٹ لیتے ہوئے میں نے اس صورتِ حال کا پھر جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں لوٹ کر آنے کے لیے گیا تھا؟ کیا اب میں شاہد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں کروں گا؟ میں بزدلوں کی طرح یہاں چھپا بیٹھا رہوں گا خواہ وہاں شاہد پر قیامت گزر جائے؟

میری واپسی کی امید میں راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں پتھرا جائیں۔ اس کے دل میں محبت کے سارے چراغ بے نور ہوجائیں اور سارے خواب دم توڑ دیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ شاہد نے ایک پورا دن انتظار کے کرب میں گزار دیا ہے اور میں یہاں بیٹھا پیزا کھا رہا ہوں اور پیپسی پی رہا ہوں۔ اس نے تو ایک منٹ ضائع کیے بغیر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے میری جان بچائی تھی۔ لائٹس بند کرکے اس نے میرے فرار کی راہیں کھول دی تھیں اور پھر مجھے دس ہزار فراہم کردیے تھے تاکہ جدوجہد کے وسائل سے محرومی کا احساس میرے ارادوں کی کمزوری کا سبب نہ بنے۔

چوبیس گھنٹے بعد وہ کہاں ہوگی؟ کیا کررہی ہوگی اور کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس کے آنسوؤں سے بھری، سوجی ہوئی آنکھیں۔ اس کے رخساروں پر خشک ہوجانے والی اشکوں کی لکیریں۔ اس کا اجڑا ہوا ویران چہرہ۔ درد کی زبان میں فریاد کرتا بدن۔ تنہائی اور بے بسی کی لمبی رات میں انتظار کا کرب۔ ناامیدی کا عذاب۔ یہ سب کس لیے تھا اور کس کے لیے تھا؟ وہ کسی مقفل دروازے کے پیچھے فرش پر پڑی ہوئی یا دست بستہ اپنے کمرے کی تاریکی میں مرجھانے کا سوچ رہی ہوگی۔

شاہد کے تصور نے میرے لیے فیصلے کو آسان کردیا۔ میں نے پیزا کا آخری ٹکڑا پیپسی کے آخری گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیڈ روم کے دروازے کے نیچے اب روشنی کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ باتھ روم سے تولیا اٹھا کے میں ڈرائنگ روم کی طرف پورچ میں آگیا۔ اپنے پیچھے میں نے ہر دروازہ بند کردیا تھا تاکہ آہٹ پر کسی کو شک ہو اور کوئی باہر نکل کے دیکھے تو اسے سب ٹھیک نظر آئے۔

زینے کے اوپر پہنچ کے میں دبے پاؤں چلتا ہوا واٹر ٹینک تک گیا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں ایسی ہی کوٹھیاں تھیں لیکن ان کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ کسی کو ٹھی کی چھت دوسری کوٹھی کی چھت سے نہیں ملتی تھی۔ اندھیرے میں مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بلا تکلف و تردد اپنے سارے کپڑے اتارے اور واٹر ٹینک پر چڑھ گیا۔ اس کا ڈھکنا لوہے کا تھا۔ اسے میں نے پوری احتیاط سے کوئی آواز کیے بغیر اوپر اٹھالیا۔ پھر میں گھپ اندھیرے میں اتر گیا۔

اندر تین فٹ سے زیادہ پانی تھا۔ میں نے پیروں کی مدد سے فرش کو قدم قدم کھنگالنا شروع کیا۔ اس سے یقیناً میں بیٹھی ہوئی مٹی کا غبار اٹھا ہوگا اور اس نے پانی کو گدلا کردیا ہوگا مگر میں یہ سب دیکھ نہیں سکتا تھا۔ چار چھ گھنٹے میں یہ غبار بیٹھ جائے گا اور صبح تک کسی نل کے پانی میں کوئی گدلاہٹ باقی نہیں رہے گی۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں مجھے وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے جھک کے وہ پیکٹ ہاتھ میں اٹھالیا اور کھلے حصے تک پہنچ کے اوپر رکھ دیا۔ پھر میں خود باہر نکلا۔ لوہے کا ڈھکن اسی طرح اپنی جگہ پر رکھا اور تولیے سے بدن صاف کرکے پھر وہی کپڑے پہن لیے۔ میں نے پلاسٹک کے پیکٹ کو بھی تولیے سے پونچھا۔ تہ در تہ واٹر پروف پلاسٹک میں لپٹا ہوا ریوالور بالکل محفوظ تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے وہ پیکٹ کھولا جو باہر سے خشک ہوگیا تھا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میرے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ یہ خیال بڑا ڈرانے والا تھا کہ اس مشین سے انگلی کے ایک اشارے پر موت نکلتی ہے اور شاہ جی جیسے اپنے آپ کو ناقابلِ شکست سمجھنے والے فرعون صفت بدمعاش کے سر میں ایک گولی گھس جائے تو ذرا سی دیر میں وہ ایک بے ضرر لاش میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جو طاقت گینڈے جیسے جسم، دولت مندی یا اثر رسوخ سے حاصل ہوتی ہے وہ ایک چھوٹے سے ریوالور کی چھوٹی سی گولی کے مقابلے میں صفر ہوجاتی ہے۔

ریوالور کو میں نے اپنی الماری کی کتابوں کے پیچھے رکھ دیا۔ طاقت میرے ہاتھ میں آگئی تھی مگر میں اس کو استعمال کرنا نہیں جانتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ایک مہلک ہتھیار کو اپنے دفاع میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ شاہ جی کی صورت دیکھتے ہی اس پر گولی چلادوں، میں نے طے کیا تھا کہ ریوالور کو صرف اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔ میں صرف شاہد کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ شاہ جی یقیناً میری راہ میں حائل ہوکے میرا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے خبردار کروں گا کہ وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔ یہ ریوالور بالکل اصلی ہے اور ضرورت پڑنے پر میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا۔ اگر اس کے باوجود شاہ جی نے چالاکی یا بہادری دکھائی تو پھر میں کوشش کروں گا کہ اس کے سر کا یا سینے کو نشانہ نہ بناؤں۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ پندرہ بیس فٹ دور سے بھی گولی کہیں تو لگے گی۔ چھ فٹ اونچے اور دو فٹ چوڑے یعنی بارہ اسکوائر فٹ کے ہدف میں ایک گولی سے کہیں بھی ... راخ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردینا مشکل کام نہیں ہو سکتا اور بفرض محال شاہ جی بچ گیا تب بھی پہلے فائر کے بعد وہ ہوش میں آجائے گا یا بے ہوش ہو جائے گا۔ پھر اسے میرے احکامات کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ میں اسے باتھ روم میں بند کر سکتا ہوں اور باہر سے کنڈی لگا سکتا ہوں۔ مگر باتھ روم میں کنڈی کہاں ہے؟ باتھ روم لاک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خیر' اسے کمرے میں باندھ کے ڈالا جا سکتا ہے۔ باتھ کمر کے پیچھے باندھ کے اور منہ پر ٹیپ لگا کے یا کپڑا ٹھونس کے۔ اس کارِ خیر میں شاد ہی میری مددگار ہوگی۔ میں ریوالور لیے کھڑا رہوں گا اور وہ اپنے والد ماجد کو حکم دے گی' منہ دیوار کی طرف کرلو' ہاتھ پیچھے کرلو یا وہ ریوالور پکڑے گی اور باقی سارے کام میں کروں گا۔ ورنہ شاہ جی کا کیا بھروسا' وہ ایک دم پلٹ کے شاد کو ڈھال بنالے اور پھر دلن اسٹائل کا تقصہ مار کے کہے کہ "اب چلاؤ گولی۔" میں شاہ جی کی جسمانی طاقت کا مقابلہ بھی کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے دبوچ کے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتا۔ خطرہ اس میں صرف یہ ہے کہ شاد میری اور شاہ جی کی فائٹ میں ریفری بن کے نہیں کھڑی رہے گی۔ کہیں اس نے میری مدد کے لیے گولی چلادی اور گولی لگ گئی مجھے تو ہو گیا کام تمام۔ اس کا نشانہ کون سا اچھا ہوگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے ہوں گے بلکہ وہ خود پوری کی پوری لرزہ براندام ہوگی۔ اس سے بھی نشانہ خطا ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ میں اور شاہ جی مصروفِ جنگ اور مسلسل حرکت میں اوپر نیچے درمیان میں ہوں گے۔ ایسے میں شاہ جی کے بجائے میرے خود اپنی محبوبہ دلنواز کے دستِ حنائی سے فوت ہو جانے کے امکانات قطعی ہوں گے۔ یہ ایک البتہ رومانی داستان کا بالکل اچھوتا اور نیا انجام ہوگا جس میں مجنوں کی جان خود لیلیٰ کے ہاتھوں جائے گی۔ شیریں کے ہاتھوں فرہاد کا قتل۔ دیوی بیڈ۔ لڑکیوں کا ویسے بھی پتہ بھروسا نہیں۔ اسے اپنے محبوب اور والد صاحب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہو جائے گا اور فیصلہ ناس کرنے سے بھی نہ ہوا تو وہ خود کو گولی مار لے گی۔ بقول فلمی شاعر، ہمارے دم سے ہے ہر غم' نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا۔ یا وہ بے ہوش ہو کے پرے سے گر جانے کو ترجیح دے گی۔ نو۔۔۔ یہ رسک نہیں لیا جا سکتا۔ ریوالور میں اپنے ہاتھ میں رکھوں گا اور ظالم سماج کے نمائندے باپ کو بے دست و پا کرے گی خود شاد۔ ایک مضبوط رسی اور منہ میں ٹھونسا جانے والا تین انچ چوڑا ٹیپ اس وقت کہاں ملے گا؟

اس سوال نے میرے خیالات کی بلند پروازی روک دی۔ میں نے سوچا کہ کیا میرا وہاں آدھی رات کے بعد جانا ضروری ہے؟ ایک لحاظ سے یہی وقت مناسب تھا۔ میں اچانک سامنے پہنچ کے شاہ جی کو حیران اور پریشان کر سکتا ہوں۔ وہ دستک پر دروازہ کھولے گا اور مجھے سامنے دیکھ کے اور ریوالور کی نال کا رخ اپنی طرف دیکھ کے دہشت سے منجمد ہو جائے گا۔ یا وہ دو قدم پیچھے ہٹ کے کہے گا کہ "ناصر۔ گولی مت چلانا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم شاد سے اتنی محبت کرتے ہو۔ آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔ میں تمہیں اپنی فرزندی میں قبول کرتا ہوں۔ آج سے میں تمہارا فادر اِن لا ہوں" لیکن صورتِ حال برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ "چلاؤ گولی۔ میری لاش پر سے گزر کے ہی تم شاد کو لے جا سکتے ہو۔" پھر اسے لاش بنانا ناگزیر ہو جائے گا۔ شادی سے پہلے ہونے والے فادر اِن لا کا مرڈر۔ اس کے سوئم اور چہلم سے پہلے شاد ہرگز شادی پر رضامند نہیں ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ پہلی برسی کے بعد مانے۔ وہ بھی ایسی صورت میں کہ قانون کے لمبے ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ پائیں ورنہ اس کی اگلی برسی تک تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ شاد کے جذبات بھی ایک دم بدل سکتے ہیں۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے شادی کروں؟ ناممکن۔ محبوبہ کے اغوا کا یہ جان لیوا مشن ناکام ہونے کے دیگر اسباب بھی قابلِ غور ہیں۔ شاہ جی اگر لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلانے لگا تو نیچے سے چیختے چلاتے فقیروں کا غول بیابان ایسے اٹھ کے آجائے گا جیسے صورِ اسرافیل پر مردے اٹھ اٹھ کے عرصۂ محشر کی جانب دوڑیں گے۔ وہ سب مجھ سے چمٹ گئے تو ایک ریوالور کی چھ گولیوں سے میں کتنے محبت کے دشمنوں کو راستے سے ہٹا سکتا ہوں۔

اب مجھے یہ خیال آیا کہ میں اپنی ساری ذہنی توانائی ایک مقصد پر صرف کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ شاد' ہزار بار خدانخواستہ' اب اس دنیا میں ہی نہ ہو۔ ایک ظالم باپ نے اسے اپنی جھوٹی انا پر قربان کر دیا ہو اور اس کی لاش بھی دریائے راوی میں چند میل کے فرق سے نیلے کی لاش کے پیچھے رواں ہو یا اس نے خود ہی فرطِ یاس و الم میں اپنی جان لے لی ہو۔ ایک دردناک خط اپنے محبوب اور ظالم سماج کے نام لکھنے کے بعد۔ خود اپنے خون سے لکھی ہوئی اس تحریر پر جگہ جگہ آنسو ٹپکے ہوں۔ اور یہ خط پڑھ کے اپنی غلطی کا احساس میرے (نہ ہونے والے) فادر اِن لا کو صدمے سے دیوانہ کر دے۔ وہ خاکِ بسر ہر ایک سے کہہ رہا ہو کہ لوگو' میں اپنی بیٹی کا قاتل ہوں۔

میرے تصور میں آنے والی ہر سچویشن افسانوی یا فلمی تھی۔ عملی زندگی میں اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار

ہونے کا تجربہ مجھے کیسے ہو سکتا تھا۔ شاید کسی بھی ہیرو کو نہیں ہوتا۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے اور ابھی تک محبت کرنے والے دو دلوں کی مواصلاتی اور ٹیلی پیتھی کا رابطہ ایسے منقطع تھا جیسے فنی خرابی کے باعث نہ تصویر آرہی ہو نہ آواز مگر ون ڈے کرکٹ کے نشے کے عادی ٹی وی کے خالی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے ہوں۔ مجھے نہ شاد نے فون کیا تھا نہ رئیس نے۔ رئیس چاہتا تو شاد سے میرا نمبر لے سکتا تھا اور شاد خود نہیں کر سکتی تو رئیس سے فون کرا سکتی تھی۔ کیا خود میں نے کوشش کی؟ میں نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ کیا ہوتا اگر میں اس کا نمبر ملانے کی کوشش کرتا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نغمۂ بلبل کی جگہ شیر کی دھاڑ سنائی دیتی۔ شاد کے بجائے اس کا باپ بولتا۔ وہ فون پر تو گولی نہیں مار سکتا تھا۔ میں کچھ نہ بولتا تو وہ خود ہی ریسیور رکھ دیتا۔ ففٹی ففٹی نہ سہی دس فی صد یا ایک فیصد چانس تھا کہ خود شاد ریسیور اٹھائے۔ خیر' جو دن گزرا وہ دنیائے عشق میں ایٹم بم گرنے کے بعد پہلا دن تھا۔ دوسرے دن میں کوشش کر سکتا ہوں۔ ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ شاہ جی سمجھے گا کہ وہ نجومی کی اولاد۔ بغل میں جوتیاں دبا کے ایسا بھاگا کہ مڑ کے نہ دیکھا اور پلٹ کے لیلیٰ کا نام نہ لیا۔ یہ کل کے لونڈے' سالے خاک عشق کریں گے جو چوبیس سے زیادہ بزدل ہیں۔ نہ جان دینے کا حوصلہ نہ جان لینے کا۔ اچھی قسمت تھی کہ بچ کر نکل گیا۔ لونڈیا نے خود بھگا دیا۔ ہاتھ آجاتا تو قیمے کے شامی کباب تل کے کتوں کو کھلا دیتا۔ پھر دکھائی دیا کیسں تو۔۔۔

صبح تک میں سوچتا رہا اور سلگتا رہا۔ سلگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آہستہ آہستہ میری حکمتِ عملی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ آج دن میں کسی وقت میں چیک کروں گا کہ شاد ہے تو کہاں ہے؟ اس دنیا میں ہے تو کہاں اور جائے واردات پر موجود ہے تو آزاد ہے یا شاہ جی کی قید میں۔ اگر اس نے فون پر بات کی تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بات نہ ہوئی تو پھر سر ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے جانا پڑے گا۔ دن میں شاہ جی اکیلا ہی مقابلے پر آئے گا۔ وہ ارواحِ خبیثہ کی فوج نہیں ہوگی جو رات کو میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ اگر شاہ جی گیٹ پر ہی توپ نصب کیے گولا ڈالے نظر آیا تو باعزت طور پر واپسی' پھر کچھ اور سوچا جائے گا۔ شام کو رئیس سے ملاقات کے بعد مستقبل کا لائحۂ عمل بنے گا اور شاہ جی نے دستک پر دروازہ کھولا تو ڈراما "ہینڈز اپ" سے شروع۔ اسے پتا چل جائے گا کہ ناصر کیسا زبردست عاشق جانباز ہے اور وہ چوہے کی طرح دم دبا کے بل میں گھسنے کے لیے نہیں بھاگا تھا۔ ہمایوں بھی ایران بھاگ گیا تھا مگر پھر تازہ کمک اور فوج کے ساتھ لوٹا تو ہندوستان کی حکومت حاصل کر لی تھی۔

میں نے پوری رات پھر جاگ کے گزار دی تھی۔ صبح دم ڈاکٹر صاحب دستک دیے بغیر نازل ہوئے اور انہوں نے دریافت کیا کہ میں خزاں رسیدہ شاخ پر اداس الو کی طرح کیوں بیٹھا ہوں؟

میں نے کہا "بس ابھی اٹھا تھا۔"

انہوں نے ٹیسٹرا کے خالی ڈبے اور پیپسی کی بوتل کو دیکھا "رات تم نے بہت دیر سے ڈنر کیا ہوگا۔ ہم نے جگایا نہیں تھا اس خیال سے کہ ڈنر کا کیا ہے' صبح بھی کیا جا سکتا ہے۔ خیر' یہ بتاؤ مزاج کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی دعا ہے سر!"

"دوا کی ضرورت تو نہیں۔ مزاج درست کرنے کے لئے۔ کل تو کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ ہم نے بھی رختِ سفر باندھ لیا تھا جیل یاترا کے لئے۔ ہم نے کہا کہ تمہارے بعد ہم بھی دیکھ آئیں ذرا بڑے گھر کو" وہ ہنسے "بس اللہ نے خیر کی۔ معاملہ ٹل گیا' تم بتاؤ پارٹی کب دے رہے ہو؟"

"پارٹی۔۔۔ کس بات کی سر؟"

"بھئی تم تھانے اور جیل جا کے خیر و عافیت سے لوٹ آئے۔ اور ماشاء اللہ سے دس ہزار کمالائے۔ کسی فلم میں دیکھا تھا ہم نے۔ کوئی تھا چور' ڈاکو یا شاید منشیات فروش۔ وہ خوب پیسہ لاتا تھا گھر میں اور جب اندر جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ سال چھ مہینے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ خیر' اس کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

میں چونکا "کس کے بارے میں؟"

وہ پھر ہنسے "بھئی میں اس نرس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں جو ہاتھ جھاڑ کے یا شاید دھو کے تمہارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ امتحان کی بات کر رہا تھا میں۔ رول نمبر آگیا ہے تمہارا۔ اور خوب نمبر ہے یار' نو دو گیارہ۔"

"میرا ایڈمٹ کارڈ۔۔۔ ڈاک سے آیا ہوگا۔"

"نہیں بھئی۔ پرسنل خود دینے آیا تھا!" وہ ایک کرسی پر بیٹھ کے اپنا پائپ بھرنے لگے "یہ شوق میں نے ایک بہت حسین خاتون مریض کی خواہش پر شروع کیا ہے۔ اپنی آنٹی کو مت بتانا۔ ان کا کہنا تھا کہ آدمی کی پرسنالٹی بہت گریس فل ہو جاتی ہے آگ سے۔ ان کے دل کا آپریشن تھا۔ ممکن ہوتا تو ان کے دل میں اپنی محبت ڈال دیتا میں مگر وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کا شوہر کل تک مجھے قتل کرنے پر کمربستہ تھا۔"

میں نے کہا "اب نہیں ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پائپ جلایا "میں نے کہا کہ تمہارے نقصان کی تلافی کر دیتا ہوں میں۔ اس جیسی اچھی بیوی ہے میری۔ وہ لے لو' کرکٹ میچ میں اننگ کے دوران میں بال کھو جائے تو نئی بال نہیں ملتی۔ ویسی ہی دوسری لی جاسکتی ہے۔ اس کو وہ رقم سمجھا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ خود ڈاکٹر صاحب اچھے موڈ میں تھے اور ایسے موڈ میں وہ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ میں نے خود کو اپنے ذہنی تفکرات کے بوجھ سے آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کیا "کیا یہ دوسری بات آنٹی کو بتادوں۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں' خود میں نے بتادیا تھا کہ ہم تو ہو گئے سٹھیا اور بوڑھے۔ وہ تھا ہینڈسم ہیرو اور مالدار بھی۔ سب کا بھلا تھا اس میں اگر وہ مان جاتا۔ خیر تو اب امتحان کا کیا ہوگا" وہ ایک دم سیریس ہو گئے "ڈیٹ شیٹ بھی آگئی ہے اور پرسوں پہلا پرچہ ہوگا تمہارا۔ تیاری کیسی ہے؟ اتنا وقت جو تم نے تھانے اور جیل میں سیر و تفریح کرتے گزار دیا۔"

میں نے ہمت کر کے کہا "جی۔ تیاری تو بالکل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سال امتحان نہ دوں۔"

"واٹ نان سنس۔ آخر سارا سال تم پڑھتے رہے ہو۔ کیا سب بخارات بن کے اڑ گیا؟ ایک سال ضائع کرو گے اپنا" وہ غصے میں بولے۔

میں نے کہا "تھرڈ ڈویژن لے کر پاس ہو سکتا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا۔ تم تو پرائیویٹ امتحان دے رہے ہو نا۔ ظاہر ہے سائنس کا مضمون نہیں ہوگا۔ میں ایسے ہی سوچ رہا تھا کہ اچھے نمبر آئیں گے تو بہترین سائنس کالج میں داخلہ دلادوں گا اور تم بن جاؤ گے ڈاکٹر۔ آرٹس میں ڈویژن کیا۔ ایف اے' بی اے سب پرائیویٹ کر سکتے ہو تم" ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

میں نے کہا "ایک اور وجہ بھی ہے سر!"

"کیا شادی کر رہے ہو؟" انہوں نے پائپ کا کش لیا۔

میں مذاق کی بات پر چونک پڑا "جی۔ ہرگز نہیں۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا سر۔ دراصل۔ ملازمت مل گئی ہے مجھے۔ دبئی میں۔"

انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ملازمت۔ دبئی میں؟ اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکے ورک پرمٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ پاسپورٹ ویزا نہیں ملتا۔"

میں نے کہا "وہ سب ہو جائے گا سر!"

"کیسے ہو جائے گا؟" وہ ڈانٹ کر بولے "شناختی کارڈ تو ہے نہیں۔"

"ایک دو روز میں بن جائے گا۔"

"اوہ۔ آئی سی۔ جعلی کام ہوگا گویا؟" انہوں نے طنزیہ تلخ لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے سر۔ کام تو جعلی کرانا ہی پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری عمر یتیم خانے میں کم لکھوادی گئی ہے۔ میں اٹھارہ سال کا اسی لیے لگتا ہوں کہ میری اصل عمر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ سب جھوٹ تھا جو تم نے بتایا۔ تم تھانے یا جیل میں نہیں' اس چکر میں تھے' کسی ایجنٹ سے ملے ہو گے۔"

میں نے ان کے بڑھتے ہوئے غصے کو محسوس کر لیا تھا "بالکل نہیں سر۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

"آدمی اپنے باپ سے بھی جھوٹ بولتا ہے۔ خدا سے جھوٹ بولتا ہے۔"

میں نے کہا "میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"جھوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں لوگ بلکہ جھوٹے ہی قسمیں کھاتے ہیں۔" میری بات نے اچانک میرا اعتبار ختم کر دیا تھا۔

"میں نے کسی ایجنٹ سے بات نہیں کی سر اور نہ کسی کو پیسہ دیا۔ میں جن لوگوں کی وجہ سے قانونی چکر میں پھنس گیا تھا' ان کا دبئی میں بزنس ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا کرتے ہو اور میں نے کہا کہ کچھ نہیں۔"

"پھر باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا کہ نوکری کرو گے دبئی میں۔ تم بھول گئے سب کچھ۔ خوشی سے تمہارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لوگ بڑے جتن کرتے ہیں باہر جا کے ریال' درہم اور ڈالر کمانے کے لئے۔ تمہاری تو لاٹری نکل آئی۔ تعلیم گئی بھاڑ میں۔ کون پوچھتا ہے آج کل بی اے' ایم اے کو۔ شناختی کارڈ بن گیا تو پاسپورٹ بھی بن جائے گا۔ ویزے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ ٹکٹ تم خود اپنے پیسے سے خرید سکتے ہو۔ ویسے بھی جو دس ہزار ایسے پھینک سکتے ہیں' معمولی سی بات پر۔ وہ یقیناً لکھ پتی' کروڑ پتی ہوں گے۔ عام آدمی تو معافی کو کافی سمجھتا۔ وہ تمہارے سفر کے اخراجات بھی ادا کر دیں گے لیکن برخوردار' یہ سمجھ لو کہ وہ منشیات فروش بھی ہو سکتے ہیں اور اسمگلر بھی۔ بزنس کے بارے میں کچھ بتایا انہوں نے؟ نہیں بتایا ہوگا۔ سب امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں۔ بردہ فروش بھی اور اونٹ کی دوڑ کے لیے چھوٹے بچے اغوا کر کے لے

جانے والے بھی۔ خیر' تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیا۔" وہ سخت طیش میں اٹھے اور دروازے تک جا کے رکے "جب شناختی کارڈ بن جائے تو مجھے بتا دینا۔ میں تمہارا اکاؤنٹ تمہارے نام کر دوں گا۔"

صورت حالات ایک دم بے حد کشیدہ ہو گئی تھی لیکن یہ سب ناگزیر تھا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ میں اس گھر میں رہنے کے لیے نہیں صرف عارضی پناہ کے لیے واپس آیا تھا۔ میں میٹرک کا امتحان کیسے دے سکتا تھا جبکہ میرے ذہن اور اعصاب پر شادو کا عشق اور شاہ جی کا خوف سوار تھا۔ میں امتحان کے چکر میں پڑ جاتا تو مہینے بھر انتظار کرتا۔ اس عرصے میں شادو کا نہ جانے کیا ہوتا۔ خود میں امتحان دینے جاتا تو شاہ جی کے بندے مجھے امتحانی مرکز سے اٹھا لیتے۔ ابھی میں اس گھر میں روپوش تھا۔ شادو کے ساتھ بھی مجھے روپوشی کی زندگی گزارنی تھی۔ امتحان میں آئندہ سال بھی دے سکتا تھا۔ ایک سال بعد مجھے میٹرک کا سرٹیفکیٹ ضرور مل جاتا۔ بشرط زندگی مگر شادو ہرگز نہ ملتی۔ عشق کے پہلے ہی امتحان میں فیل ہو جانا میرے لیے موت کو ذلت کے ساتھ قبول کرنے کے مترادف تھا۔

جانے بوجھتے میں ناشتے کی میز پر نہیں گیا۔ آج کسی نے میری غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے مجھے پوچھا بھی نہیں۔ ملازم مجھے بلانے نہیں آیا اور نہ بچوں نے مجھے آوازیں دیں۔ میں نے بچوں کو ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں اسکول جانے سے پہلے ہی کو خدا حافظ کہتے سنا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور چل گئی۔ ڈاکٹر صاحب بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے اسپتال چلے جاتے تھے۔

اگلا مرحلہ بیگم صاحبہ کے سامنے پیشی کا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب نے انہیں بتا دیا ہوگا کہ ناصر صاحب تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جا رہے ہیں دبئی۔ اور اس مقصد کے لیے خیر سے انہوں نے بلوغت کی سند حاصل کرنے کا راستہ بھی خود ہی تلاش کر لیا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا ہو کہ اس کے جھگڑے میں پڑنے' تھانے اور جیل جانے کی کہانی سب جھوٹ ہے۔ یہ دوسرے ہی چکروں میں پڑا ہوا تھا۔ ایسے شخص پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہئے۔ ہم نے غلطی کی جو اسے اپنا سمجھا اور اپنے گھر میں جگہ دی۔

ایسا لگتا تھا کہ اب میرا اس گھر میں مزید چوبیس گھنٹے گزارنا بھی مشکل ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب مہذب آدمی تھے ورنہ کہتے کہ جانا ہے تو پھر اٹھاؤ اپنا بوریا بستر اور چلتے نظر آؤ۔ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے رویے کی غیریت اور بے رخی کے انداز سے بھی واضح کیا جا سکتا تھا کہ بس ہو چکی نماز مصلی اٹھائیے۔

اچانک میں نے اپنے سامنے بیگم صاحبہ کو دیکھا۔

○☆○

اچانک شبنم نے مجھے اپنے سامنے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھول گئی کہ یہ عدالت ہے اور وہاں موجود ہر شخص کی نظر اس پر ہے۔ اس کیس میں مدعی وہ خود تھی۔ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ جسے ایک مشتعل ہجوم نے شاہ عالم سمجھ کے ہلاک کر دیا تھا' شاہ عالم نہیں تھا۔ اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے کورٹ نے دوسرے پوسٹ مارٹم کے لیے میڈیکل بورڈ تشکیل دیا تھا۔

اس میڈیکل بورڈ کے سب ارکان عدالت میں موجود اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ استغاثہ کی پیروی کرنے والے وکیل شبنم کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ سرکاری وکیل' پی جے ایف کے سارے عہدے دار۔ عمر دراز کا ساتھ دینے والے پی جے ایف کے باغی ارکان۔ متعدد سیاسی جماعتوں کے نمائندے۔ وکلا اور اخبار والے سب شبنم کی بات پر چونکے تھے اور شاید انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے ٹھیک سنا تھا۔

"یہ جھوٹ ہے" شبنم نے چلا کے کہا تھا "یور آنر۔ یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہے۔"

شبنم کی نگاہ مجھ پر جم کے رہ گئی تھی۔ مجھے ان آنکھوں میں نفرت اور ملامت' حیرت اور اشتعال۔ جھنجلاہٹ اور اپنی بے چارگی کے جذبات کا پاگل پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ مجھے عدالت میں موجود پاکے ساکت و صامت پتھر کا مجسمہ بن گئی تو اس کی نظروں کے رخ کو دیکھ کر ہر نظر کا زاویہ بدل گیا۔ ایک ساتھ سیکڑوں آنکھوں نے مجھے فوکس کیا اور پھر جیسے بھونچال آگیا۔

سب سے پہلے وہ غیر معروف اور کسی حد تک بدنام صحافی اپنی سیٹ پر اسپرنگ کی طرح اچھلے جنہوں نے میری پریس کانفرنس کی روداد' میری تصاویر کے ساتھ شائع کی تھیں مگر ان کے بیچ کو دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دے کے سارے زمانے کے ساتھ خود ان کی اپنی صحافی برادری نے اتنی لعن طعن کی تھی کہ انہیں اس پیشے میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ ان سب نے چیخ کے کہا "شاہ عالم۔ آگیا شاہ عالم۔"

ایک فرط جذبات میں کرسی پر کھڑا ہو گیا اور سب کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مخاطب کرکے چلانے لگا "دیکھو' دیکھو ہمیں جھوٹا کہنے والو' اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

دوسرا کرسیاں پھلانگتا ہوا میری طرف لپکا "بہت وقت پر آئے آپ شاہ عالم۔"

پی جے ایف کے نائب صدر شمس نے چلّا کے کہا "یہ شاہ عالم نہیں ہے۔"

قریشی صاحب نے زیادہ بلند آواز میں کہا "یہ کوئی جعلساز ہے۔"

جج نے کسی کی نہیں سنی' جو مسلسل میز پر لکڑی کا ہتھوڑا مار مار کے "آرڈر' آرڈر" پکار رہا تھا۔ عدالت کا کمرا سچ مچ مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں بیک وقت مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے والے اور جعلی سمجھنے والے ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر ہر طرف سے راستہ بناتے' ٹھوکریں کھاتے' لڑکھڑاتے میری طرف لپک رہے تھے اور فلیش چمکا کے میری تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ جو اس ہجوم میں بہت پیچھے تھے' وہ کرسیوں پر کھڑے ہوگئے تھے اور ہاتھوں میں کیمرا اوپر اٹھا کے مجھے فوکس کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میں اطمینان سے مسکراتا ہوا اگلی صف تک گیا۔ تیمور نے فوراً میرے لیے کرسی خالی کی اور مجھ سے ہاتھ ملا کے اخباری نمائندوں کی طرف دیکھا جو اس لمحے کو بھی کیمرے کی قلم پر قید کر چکے تھے۔ تیمور کے لیے اشرف نے سیٹ خالی کی اور خود دوسری صف میں چلا گیا۔

اس وقت نہ جانے کس نے صورتِ حال کو زیادہ دلچسپ بنا دیا "او بابا' کیوں فلم ضائع کرتے ہو۔ روح کی تصویر نہیں آتی۔"

جج نے پولیس کی مدد طلب کرلی تھی اور اب وہ بھی مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میرے اصلی' نقلی یا روح ہونے کے بے حد مشکل مقدمے کو قابلِ سماعت قرار دینے یا مسترد کرنے کا فیصلہ بھی اسے فوراً ہی کرنا ہوگا۔ اس ہنگامہ آرائی میں عدالتی کارروائی کو جاری رکھنا ناممکن تھا۔ بالآخر پولیس کچھ سینئر وکلا اور صحافی حضرات نے چیخ چیخ کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ پولیس کے لیے عدالت کے اندر لاٹھی چارج کرنا یا آنسو گیس کے گولے پھینکنا ممکن ہوتا تو وہ سارا شور شرابا دو منٹ میں ختم کرا دیتے مگر یہاں ان کے افسران ایک ایک کو پکڑ پکڑ کے بٹھانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

حالات کے معمول پر آنے میں عدالت کے پندرہ منٹ ضائع ہوگئے۔ اب جج نے پھر اپنا لکڑی کا ہتھوڑا میز پر مارنا شروع کیا۔ باتیں کرنے والے پھر بھی بولتے رہے۔

"آرڈر' آرڈر" جج نے چلا کے کہا "میں آخری بار آپ سب کو خبردار کرتا ہوں کہ عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھیں۔ اب میں نے کسی کو عدالتی کارروائی میں رخنہ اندازی کا ارتکاب کرتے دیکھا تو اسے جیل بھجوا دوں گا۔"

اس کے بعد مکمل خاموشی ہوگئی۔

جج نے شبنم کو مخاطب کیا "مس شبنم آغا۔ اس کیس میں آپ مدّعی ہیں۔"

شبنم پھر کھڑی ہوگئی "یس یور آنر!" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"آپ کا یہ مؤقف تھا کہ پہلی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں جس شخص کو شاہ عالم قرار دیا گیا تھا' وہ شاہ عالم نہیں تھا؟" جج نے سخت لہجہ اختیار کرلیا۔

"یس یور آنر!" شبنم نے بڑی مشکل سے کہا۔

"یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ جو ایک میڈیکل بورڈ نے مرتب کی ہے' آپ کے مؤقف کی تائید کرتی ہے۔ وہ واقعی شاہ عالم نہیں تھا۔ اب آپ کو یہ اعتراض کیوں ہے کہ رپورٹ غلط ہے؟"

"یس یور آنر۔" اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اسے کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے۔

"یہ کیا ہر سوال کے جواب میں یس یور آنر کہتی جا رہی ہیں آپ!" جج نے برہمی سے کہا "جب پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ وہ شاہ عالم ہے تب بھی وہ رپورٹ غلط تھی اب ایک میڈیکل بورڈ کے مطابق وہ شاہ عالم نہیں تھا' اب بھی آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ پھر صحیح کیا ہے؟"

"مجھے... مجھے نہیں معلوم۔ آئی ایم سوری' یور آنر!" شبنم نے امداد طلب نظروں سے اپنے وکیل کی طرف دیکھا اور پھر ایسے اپنی سیٹ پر گر گئی جیسے اسے چکر آگیا ہو۔

اس کے وکیل نے فوراً کہا "جنابِ والا۔ میری مؤکلہ ناسازیٔ طبع کی بنا پر اس صورتِ حال کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔"

جج نے کہا "پھر انہیں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ انہیں اندازہ نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہیں' عدالتِ عالیہ کے روبرو کہہ رہی ہیں۔"

"میں نے عرض کیا کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔"

پیچھے سے کسی نے کہا "دماغ تو پہلے ہی خراب تھا۔"

کچھ لوگ ہنسے۔ جج نے پھر آرڈر آرڈر پکارا۔

"مس شبنم کی طرف سے آپ وکیلِ استغاثہ ہیں۔" جج نے کہا "ایسی صورت میں ان کا عدالت میں موجود ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔"

وکیل نے کہا "میں عدالت سے التوا کی درخواست کرتا ہوں۔"

جج نے اس کی استدعا مسترد کردی "کوئی وجہ نہیں کہ سماعت ملتوی کی جائے۔ عدالت ڈاکٹر صفدر کی رپورٹ پر مزید کارروائی جاری رکھے گی۔"

ڈاکٹر صفدر نے عدالت میں تفصیلی بیان دیا اور بتایا کہ اس رپورٹ کو مرتب کرتے ہوئے بورڈ کے اراکین نے کیا لائحہ عمل اختیار کیا۔ انہوں نے پہلی رپورٹ کو کن بنیادوں پر مسترد کیا۔ کون سی نئی شہادتوں کی بنیاد پر وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا' وہ شاہ عالم کی نہیں تھی۔ اس دوران میں عدالت میں مکمل خاموشی رہی۔ میڈیکل بورڈ کے بقیہ ارکان عدالت میں موجود نہیں تھے مگر وہ ہوتے تب بھی ڈاکٹر صفدر کی رپورٹ کو جھٹلا نہیں سکتے تھے کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر خود ان کے دستخط تھے۔

اس بیان نے صورتِ حال کو ڈرامائی طور پر بدل دیا تھا۔ کل تک شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کو شہید تسلیم کیا جا رہا تھا۔ اس کی پارٹی میں نئے چیئرمین کے انتخاب کی رسّاکشی شروع ہو چکی تھی اور موقع پرست گروپ اس کے مزار کی تعمیر کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے انتہائی سرگرم تھا۔ اچانک ان سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

وہ مظلوم صحافی جن کی پریس کانفرنس کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا جا رہا تھا' خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ اچانک ان کی خبر اتنی ہی اہم ہوگئی تھی جتنی پہلے ایٹمی دھماکے کی خبر تھی۔ وہ معتبر اور ان کو زرد صحافت کا علمبردار کہنے والے غیر معتبر ہوگئے تھے۔ ان کا صحافتی مستقبل انتہائی روشن ہوگیا تھا۔ ان کا ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور وہ اپنے بڑے نام والے سکہ بند اور جغادری صحافیوں کو بڑی حقارت اور ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اب بتاؤ' وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا اور دوسرا زیادہ بڑا اور طاقتور صحافیوں کا گروپ پشیمان سے زیادہ پریشان تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے اور جو بھی ہوا وہ کیوں اور کیسے ہوا تھا۔

بیرسٹر محمود اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ تیمور اس کی جگہ چلا گیا۔ "آپ نے بڑی پریشانی سے بچا لیا ہے۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے میرے کان میں بولا۔

"کیا آپ کو فیس نہیں ملی؟" میں نے کہا۔

"فیس کی بات نہیں۔ مجھے آپ کا وکیلِ صفائی مقرر کیا گیا تھا۔ عمر دراز کے قتل کے الزام میں۔ لیکن جب آپ فوت ہوگئے۔"

"مگر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ میں فوت نہیں ہوا تھا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ کیس اب چلے گا' آپ فکر نہ کریں۔"

جج نے ہمیں گھور کے کہا "آرڈر اِن دی کورٹ۔"

ہائی کورٹ کے باہر شاہ عالم کے زندہ ہونے اور عدالت میں حاضر ہونے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جوشیلے کارکن زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اندر عمر دراز گروپ کے ارکان مایوسی کا شکار تھے اور ڈاکٹر صفدر کا بیان ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ایک ایک کرکے غائب ہوگئے۔ انہوں نے پچھلی طرف سے نکل جانا بہتر سمجھا ہوگا ورنہ وہ پی جے ایف کے ارکان کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جاتے۔

بہت سے صحافی بھی بھاگ گئے تھے۔ غالباً وہ اپنے اپنے اخباروں کو آج کے دن کی سب سے بڑی خبر کی فراہمی میں تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہر اخبار کو یہ اطلاع پبلک تک پہنچانے کے لیے خصوصی ضمیمہ شائع کرنا تھا اور اس میں پہل کرنے کا مقابلہ بہت سخت تھا۔ شبنم ابھی تک اپنی جگہ پر موجود تھی اور گم صم بیٹھی خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بظاہر نہ اس کے کان ڈاکٹر صفدر کے دلائل سن رہے تھے' نہ نعرے بازی کی آوازیں۔ نہ وکیلوں کی گفتگو اور نہ اس کی حالت پر دوست دشمن کے تبصرے۔

ڈاکٹر صفدر کو چیلنج کرنے والا یا اس کے مؤقف پر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وکیلِ سرکار' وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی سب نے اس کی FINDING کو تسلیم کرلیا تھا اور جرح کے حق سے دستبردار ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے اس کے بعد عدالت کو فیصلہ سنانا تھا۔ قانون نے مجھے شاہ عالم تسلیم کرلیا تھا یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرنے والا شاہ عالم نہ رہا تو میرے لیے قانون سے خود کو شاہ عالم تسلیم کرانے کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہوگیا جتنا خود اصل شاہ عالم کے لیے ہوتا۔

میرے وکیل بیرسٹر محمود نے اٹھ کے کہا "جنابِ والا۔ میرے مؤکل شاہ عالم اس وقت خود عدالت میں موجود ہیں۔ انہیں عدالتِ عالیہ میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی اجازت دی جائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جج نے کہا "اس کے لیے آپ درخواست دے سکتے ہیں۔ فی الحال عدالت کے سامنے صرف میڈیکل بورڈ کی دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ کا معاملہ ہے۔"

وکیل نے کہا "یور آنر۔ میرے مؤکل کا بیان بھی اسی پوسٹ مارٹم کے حوالے سے ہوگا اور یہ معاملہ اپنی اہمیت کے پیش نظر عدالت کی فوری توجہ کا طالب ہے۔ مسٹر شاہ عالم کچھ ایسے حقائق عدالت عالیہ کے روبرو رکھنا چاہتے ہیں جن کے بغیر ایک مکمل فیصلہ ممکن نہیں اور نامکمل فیصلے سے میرے مؤکل کے لیے پریشان کن قانونی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ نامکمل فیصلے سے وہ مقاصد بھی پورے نہیں ہوں گے جن کے لیے اس معزز عدالت نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کیے تھے اور فاضل ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا تھا۔"

جج نے کہا "آپ اس نکتے کی وضاحت کریں۔"

"جناب والا!" بیرسٹر محمود نے کہا "اگر زید کے بارے میں بدنیتی کے باعث یہ مشہور کر دیا جائے کہ وہ فوت ہو چکا ہے۔ خواہ اس کا مقصد زید کی جائداد پر قبضہ ہو۔ کسی مزار یا درگاہ کا سجادہ نشین بننا یا سیاسی جانشینی حاصل کرنا۔ تو بعد میں صرف یہ فیصلہ کر دینا کافی نہیں ہو سکتا کہ مرنے والا زید نہیں تھا۔ یہ بھی لازمی ہوگا کہ زید کو زندہ اور اصل زید قرار دیا جائے تاکہ وہ اپنی جائداد اور اثاثوں پر اپنا قبضہ قانونی طور پر حاصل کر سکے۔ ایک مزار کے متولی اور کسی سیاسی جماعت کے سربراہ کی نیک نامی اور ساکھ بھی اثاثوں میں شمار ہوگی۔ پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ بدنیتی کے مرتکب افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور ان اسباب کا تعین کیا جائے جن کی بنیاد پر زید کی نیک نامی اور ساکھ کو نقصان پہنچایا گیا۔ ذمے دار افراد کے خلاف تحقیقات کا حکم دیا جائے اور اگر ان پر جرم ثابت ہو تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی زید کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے والوں کو حکم دیا جائے۔"

جج نے مسکرا کے کہا "آپ زید کی جگہ اپنے مؤکل کا نام بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"تھینکس یور آنر! بے شک یہ تمام معاملات ابھی اور اسی وقت طے نہیں کیے جا سکتے۔ دیگر تمام معاملات متعلقہ عدالتوں میں اٹھائے جائیں گے لیکن مسٹر شاہ عالم کے کیس میں چند نکات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ نمبر ایک، جب وہ ملک سے باہر تھے تو ان کے خلاف ایک سیاسی قتل کا جھوٹا مقدمہ درج کرایا گیا۔ نمبر دو، ان کے پاکستان واپس آتے ہی ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا لیکن سراغ اور شہادت کو مٹانے کے لیے قاتلانہ حملے کے مجرم کو اسی طرح ختم کر دیا گیا جیسے شہید ملت لیاقت علی خان کے قاتل سید اکبر کو جائے واردات پر مار دیا گیا تھا۔ نمبر تین، شاہ عالم کے زندہ ہونے کے باوجود کسی نامعلوم شخص کو شاہ عالم قرار دے کر جلسے، جلوس اور ہنگامہ آرائی کے حالات پیدا کیے گئے یہاں تک کہ مسٹر شاہ عالم کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھانے والوں نے ان کا شاندار مزار بنانے کے لیے ایک کمیشن بھی قائم کر دیا۔ مسٹر شاہ عالم اس وقت عدالت عالیہ میں موجود ہیں۔ انہیں اجازت دی جائے کہ وہ سازشی حالات کے تانے بانے اصل حقائق سے پردہ اٹھائیں اور قانون سے وہ ریلیف اور تحفظ طلب کریں جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔"

بیرسٹر محمود کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور خطابت نے مجھے متاثر کیا اور جس خاموشی سے اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سنی گئی اس سے بھی یہی پتا چلتا تھا کہ اس نے سب کو متاثر کیا ہے۔ اس کا خطاب مختصر مگر مربوط، جامع اور مدلل تھا۔

جج نے مجھے اجازت دی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سر جھکا کے جج کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی میں نے عدالتِ عالیہ میں موجود لوگوں کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ کہانی کا انجام بدلتے ہی شمس اور قریشی کا رویہ ہی بدل گیا تھا۔ انہوں نے جوش و خروش سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا۔ وی فار وکٹری، حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی لوگ اپنی فتح مندی کے غرور میں شاہ عالم کو داستانِ ماضی اور قصۂ پارینہ سمجھتے۔ پارٹی کے عہدوں پر قبضے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سیاسی کامیابیوں کے افق پر ان کی خیالی پرواز بلندی افلاک سے سارے عالم کو یوں دیکھ رہی تھی کہ۔

سماست کہ دریاست نہ بال و پر ماست

جب میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا تو مجھے بہت عجیب لگا۔ آج میں ناصر عظیم نہیں رہا تھا۔ تبدیلی ذات کا یہ جان لیوا اور ناگزیر عمل فنا و بقا کی جنگ کے مختلف مراحل سے گزر کے آج مکمل ہو گیا تھا۔ اصل اور واحد اور غیر متبادل۔ طویل جدوجہد، شاطرانہ داؤ پیچ اور اپنے عزم و استقلال سے میں نے اس موت کو شکست دے دی تھی جو شاہ عالم مجھ پر مسلط کرنا چاہتا تھا۔ قضا کے تیر کا نشانہ اس کو بننا تھا۔ قضا اس کی آئی تھی، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے مٹا دیتا۔ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں تھا میں۔ وہ وقت گزر گیا تھا جب حقیقت کو جاننے اور سمجھنے والے اس جھوٹ کو تسلیم کرنے سے انکار

کر سکتے تھے۔ میں نے اس وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ آج تیمور بھی مجبور تھا۔ رخشندہ بھی بے بس تھی۔ شمس اور قریشی، تیمور اور ڈاکٹر صفدر اور بست سے لوگ اب کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے دستور کے مطابق حلف بھی اٹھایا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جھوٹا حلف اٹھانا یقیناً گناہ ہے مگر ایک تو خود خدا نے بندے کو تھوڑی بہت رعایت دی ہے کہ جہاں سوال اس کی بقا کا ہو اور جان بچانے کا سوال ہو، وہاں حرام کو حلال سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید برآں میں اپنی اس توضیح کو عذرِ گناہ بدتر از گناہ سمجھتا تھا اور خود ہر گز اس اہلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا جہاں میں کسی بھی مسئلے پر شرعی فتوے کا جواز پیش کر سکوں۔ چنانچہ میں نے اپنی مجبوری کے باوجود صدقِ دل کے ساتھ خدا سے معافی بھی مانگی اور جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ بھی ادا کیا۔ میری زندگی خدا کی امانت تھی اور اس کی حفاظت مجھ پر فرض۔ اللہ جانتا ہے کہ نہ میری نیت کسی شاہ عالم کی جگہ لینے کی تھی اور نہ میں کسی ذاتی مفاد کی خاطر دانستہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کی جنگ لڑی۔ شاہ عالم نے مجھے دیوار سے لگا دیا تھا اور میرے لیے فرار کے راستے تک مسدود ہو گئے تھے۔ ان حالات میں جو کچھ میں نے کیا، ناگزیر تھا مگر شاہ عالم کو قتل میں نے نہیں کیا۔ اس معاملے میں میرا ضمیر بالکل صاف تھا۔

گواہوں کے کٹہرے سے میں نے مجمعِ عام کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ ان کا تاثر پرانی شکستہ قبروں جیسا تھا جن پر کوئی لوحِ تک نہ ہو۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جذبات اور احساس کے ہر عکس سے بے نیاز۔ خراب پڑے ہوئے ٹی وی کے اسکرین کی طرح۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ نہیں سن رہی تھی اور آوازوں کے درمیان بے آواز ہو گئی تھی۔ ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی جس میں ہزاروں، لاکھوں لاجواب سوال شرم سے منہ چھپانے کے لیے روپوش ہو گئے تھے۔ وہ یقین اور بے یقینی کے عالمِ برزخ میں تھی۔

آخری حصے میں کرنل خان اور چندا کو دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں اب میرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ چندا کے لبوں پر جو مسکراہٹ تھی اس کا مطلب میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کی خاموشی بھی مجھ پر خندہ زن تھی۔ آخر ہو نا تم مداری، مجمع لگا لیا۔ اب شروع کرو اپنا کھیل۔ بجاؤ ڈگڈگی۔

"تو صاحبان، مہربان، قدردان! تماشے تو بہت دیکھے ہوں

اندھیر نگری — محی الدین نواب — چار حصے — قیمت فی حصہ 150 روپے

سنہری جونک — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

مقدس عہد — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

مقدس نشان — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

راکھشس — ایک پراسرار اور خوفناک ناول — ساحر جمیل سید — قیمت 125 روپے

راکھ — ایک خوفناک ناول — وجیہہ سحر — قیمت 100 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز — ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور — 7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال — نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...ے آپ نے ہتھیلی پر سرسوں جماتے بھی دیکھا ...گا' آپ نے وہ مداری بھی دیکھے ہوں گے جو ریت سے ...رگوش نکالتے ہیں۔ تھیلے سے بلی برآمد کرتے ہیں۔ اونٹ کو ...ئی کے ناکے سے گزار دیتے ہیں۔ آپ نے ان کے کمال ...ی دیکھے ہوں گے دوستو' جو بڑے بڑے مجمع لگاتے ہیں۔ کبھی ...ہور کے موچی باغ میں تو کبھی کراچی کے نشتر پارک میں۔ وہ ...ت بڑے مداری ہیں میرے عزیز' میرے بھائی! میرے ...رگ! وہ چٹکی بجا کے جھمرلو پھیرتے ہیں اور سب کی نظروں ...کے سامنے ایک سے دو ملک بنا دیتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں ...ی خزانے کو ایسے نگل لیتے ہیں جیسے چھوٹا مداری لوہے کا ...لولا نگلتا ہے۔ ایسے مداری بھی ہوتے ہیں مہربان' قدردان! ...مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ کے سونے کا پہاڑ بناتے ہیں مگر یہ نیا ...ماشا ہے۔ ایسا کھیل آپ نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا دوستو' ...یکھیے۔ ادھر دیکھئے' غور سے دیکھئے' اس چہرے کو آپ سب ...جانتے ہیں' پی جے ایف کے چیئرمین شاہ عالم کو آپ سب ...انتے ہیں۔ جلسوں میں' اخباروں میں اور ٹی وی پر۔ آپ یہ ...رہ ہزار بار دیکھ چکے ہیں۔ دیکھئے' نظر جما کے دیکھئے۔ پھر نہ کہنا ...میں خبر نہ ہوئی' پھر مت کہنا یہ جادو ہے۔ نظربندی ہے۔ ہاتھ ...ں صفائی ہے۔ یہ تو مداری کا کھیل ہے دوستو' اب میں اس پر ...یہ رومال ڈالتا ہوں۔ چہرہ چھپ گیا مگر کیا شاہ عالم غائب ہو گیا؟ ...ہیں۔۔۔ وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد ...صاحبان' مہربان' قدردان! مداری کا کمال دیکھئے' میں یہ جھمرلو ...پھیرتا ہوں۔۔۔ اور اب رومال ہٹاتا ہوں۔ ہائیں! یہ کون ...ہے؟ یہ کس کا چہرہ ہے؟ بچہ لوگ تالی بجائیں۔ یہ ناصر عظیم ...ہے۔ جس کا دل چاہے اس سے پوچھ لے۔ جو سوال چاہے ...کرے۔ مداری جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ ناصر عظیم ہے۔ لیکن ...میرے عزیزو! کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی نظروں ...کے سامنے مداری ایک اور تماشا کرے گا۔ دیکھئے' دیکھتے ...رہئے' کوئی دھوکا نہیں' کوئی فریب نہیں۔ ہاتھ کی صفائی ...نہیں۔ آپ کے سامنے میں پھر اس کے چہرے پر رومال ڈالتا ...ہوں۔ یہ ہے میرا جھمرلو' چل مداری' دکھا دے اپنا کمال۔ لیجئے ...صاحبان' رومال ہٹ گیا۔ ہائیں؟ یہ کیا۔۔۔ یہ تو وہی شاہ عالم ...ہے۔ بچہ لوگ تالیاں بجائیں۔ جس کو شک ہو سامنے آئے۔ ...چھو کر دیکھ لے۔ جو آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ عقل کی کسوٹی پر ...پرکھ لے۔ عقل کے اندھے کو سب برابر ہے۔ ایک آدمی دو ...چہرے۔ کیا دو چہروں والے آدمی نہیں ہوتے؟ کیا کہتا ہے ...شاعر کہ۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ اور نام ...میں کیا رکھا ہے۔ یہ شیخ پیرنے چار سو سال پہلے کہا تھا۔ آج

بھی سچ ہے۔ مداری کے نام سے کیا' مداری بدل جاتے ہیں' بدل دیے جاتے ہیں' کھیل وہی رہتا ہے۔"

چندا نے پھر نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ اب بھی وقت ہے۔ انسان کے بچے بن جاؤ' چھوڑ دو یہ ہیرا پھیری۔

جج نے مجھے مخاطب کیا "مسٹر شاہ عالم! آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟"

میں نے چونک کے عدالت میں موجود سارے چہروں کو دیکھا جو میری طویل خاموشی کو ذہنی اور جذباتی خلفشار کی شدت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے میری طرف نظریں اٹھائے گوش بر آواز تھے۔ غالباً ان کے نزدیک یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔

میں نے کہا "یور آنر! یہ اپنی نوعیت کی منفرد صورتِ حال ہے۔ اگر میں اس کا تفصیلی جائزہ لوں تو شاید سیاسی لیڈروں کے طویل خطابات سننے والی یہ قوم اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت بھی میرا بیان اسی طرح سن رہی ہوگی اور اصل حقائق سے پھر بھی بے خبر ہوگی۔"

کچھ لوگ اس بات پر ہنسے۔ چندا نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تاہم میں بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے کوشش کروں گا کہ آج ہی عدالت کا وقت ختم ہونے سے پہلے ان تمام سوالات کا جواب دے دوں جو ایک خاص مقصد کے تحت اٹھائے گئے۔ پہلا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا میں شاہ عالم ہوں؟ جناب والا میں شاہ عالم تھا۔ میں شاہ عالم ہوں اور شاہ عالم رہوں گا۔ مگر میرا یہ نام ہی میری شناخت نہیں ہے۔ میں اپنا نام بدل بھی سکتا ہوں مگر میں۔۔۔۔ میں ہوں' ہزاروں نہیں' لاکھوں لوگ مجھے جانتے ہیں مگر ان میں سے چند یہاں بھی موجود ہیں۔ میری پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی کے سینئر نائب صدر یہ گواہی دیں گے کہ میں شاہ عالم ہوں کیونکہ وہ میری سیاسی زندگی کے سفر میں ہر لمحہ میرے ساتھ اسی طرح رہے ہیں کہ میں انہیں شریکِ حیات سمجھ سکتا ہوں۔ اسے آپ لغوی معنوں تک محدود رکھئے۔ شرعی حوالے سے میری شریکِ حیات وہ عورت ہے جو پہلے رخشندہ تھی اور نکاح کے بعد مسز شاہ عالم ہو گئی۔ اس کے ساتھ بھی میری رفاقت کا دور برسوں پر محیط ہے اور وہ ہر سانس کے ساتھ میرے وجود کی شناخت کی گواہی دے سکتی تھی لیکن کیا کسی نے اس کی گواہی کی ضرورت محسوس کی؟ کیا اس نے کسی کے سامنے تسلیم کیا کہ جو بے جان جسم اس کے گھر لایا گیا تھا' وہ اس کے شوہر شاہ عالم کا تھا؟"

جج نے کہا "مگر انہوں نے تردید بھی نہیں کی تھی۔"

"میں مانتا ہوں یور آنر کہ اسے موقع ملتا اور وہ اس

نامعلوم شخص کو اپنا شوہر شاہ عالم ماننے سے انکار کر دیتی تو شاید اتنی غلط فہمی اور قانونی مسائل پیدا ہی نہ ہوتے مگر وہ اس خبر کے صدمے سے ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جعلی شاہ عالم کا چہرہ بقائمی ہوش و حواس نہیں دیکھا تھا۔ وہ ابتدائی صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی اور پھر اسپتال میں اسی ذہنی اور جذباتی صدمے کے باعث سکتے کی سی کیفیت میں پڑی رہی۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر سب سے اس کے ملنے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی۔ اگر اسے جذبات پر کنٹرول ہوتا اور وہ غور سے دیکھتی تو کوئی وجہ نہیں تھی جناب والا کہ وہ جعلسازی کا پردہ چاک نہ کرتی۔ اس شخص کی صورت میں جسے شاہ عالم بنایا گیا تھا' مجھ سے مشابہت حیران کن تھی اور میری بیوی نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ وہ پہلے ہی اعصابی کشیدگی اور نفسیاتی خوف کے دباؤ کا شکار تھی۔ یہ ہر عوامی سیاست داں کی بیوی کا مسئلہ ہے۔ ان کے شوہر انہیں توجہ نہیں دے پاتے۔ بیوی ہونے کے باوجود وہ تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں اور شوہر کی سیاست کو اپنی سوکن کی طرح سمجھ لیتی ہیں جس نے ان سے شوہر کو چھین لیا ہو۔ ان پر یہ خوف بھی سوار رہتا ہے کہ شوہر کے سیاسی حریف اور سازشی عناصر جو اس کی مقبولیت سے حسد رکھتے ہیں' اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ہر سیاست داں کے جتنے دوست ہوتے ہیں' اس سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔ ان پر قاتلانہ حملے عام بات ہیں۔ قائدِاعظمؒ سے آج تک ہر سیاست داں کی زندگی ایسے ہی خطرات سے دوچار رہی۔ جو خوش قسمت تھے ان کے دشمن انہیں اپنی راہ سے ہٹانے میں ناکام رہے مگر اپنی قوم کی نصف صدی کی تاریخ پر نظر ڈالیے جناب والا تو آپ آسانی سے میری بیوی کے نفسیاتی خوف کے جواز کو تسلیم کر لیں گے۔ وہ ڈرتی تھی کہ میرا قتل کہیں بھی' کسی بھی وقت' کسی کے بھی ہاتھوں ہو سکتا ہے اور جب اسے بتایا گیا کہ شاہ عالم کو مار دیا گیا ہے تو عام عورت کی طرح اس نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ نہیں یور آنر! اس کے ذہن نے فوراً مان لیا کہ جس بات کا اسے ڈر تھا وہ بالآخر ہو گئی۔ اب آپ اسے عدالت میں بلوائیے' وہ اس صدمے کے ذہنی صدمے سے سنبھل چکی ہے۔ وہ ان سب لوگوں کے سامنے جو یہاں موجود ہیں' مجھے شاہ عالم تسلیم کرے گی۔ اس سے بڑی گواہی کس کی ہو سکتی ہے۔"

جج نے مجھے ٹوکا "مسٹر شاہ عالم۔ اس وقت کسی گواہ کو طلب نہیں کیا جا سکتا اور نہ عدالت کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ آپ کی مانے یا ان کی جو آپ کو شاہ عالم نہیں مانتے۔ ابھی تک کسی نے آپ کے دعوے کی تردید نہیں کی ہے اور آپ کے مؤقف کو چیلنج نہیں کیا ہے۔"

بیرسٹر محمود نے کہا "یور آنر۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ یہ عدالت میرے مؤکل کو شاہ عالم تسلیم کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے یہ عدالت اور یہاں موجود تمام لوگ بیرسٹر محمود غزنوی تسلیم کرتے ہیں۔ اور میں آپ کو جسٹس سلامت علی گردیزی تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے لیے دعوے ثبوت یا گواہ کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں وکیل' صحافی' پی جے ایف کے عہدے دار اور دوسرے سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں جو میرے مؤکل کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں۔ میں ان سب کی گواہی کے لیے سوال کر سکتا ہوں کہ عدالت کے کٹہرے میں موجود میرے مؤکل کے اس دعوے سے کہ وہ شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف ہے' کسی کو اختلاف ہے؟"

بیرسٹر محمود نے کھچا کھچ بھرے ہوئے عدالت کے کمرے میں موجود تمام افراد سے مخاطب ہو کے سوال کیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے عدالت میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس کے باوجود ایک موہوم سے اندیشے کی خلش میرے اور وہاں موجود ہر شخص کے یقین اور اعتماد کی مضبوط دیوار میں شک کی دراڑ ڈال دی۔

مجسم اعتماد کے ساتھ کھڑی ہو گئی "یس یور آنر۔ مجھے اختلاف ہے۔ میں اس شخص کو شاہ عالم تسلیم نہیں کر سکتی۔"

ایک بار پھر عدالت میں شور سے افراتفری پھیل گئی۔ مختلف سمتوں سے مختلف لوگ چلانے لگے۔

"دماغ چل گیا ہے اس کا؟"

"کیا ہو گیا ہے آخر شبنم کو؟ یہ نشے میں ہے کیا؟"

"یار' اسے ہوش نہیں ہے اپنا۔۔۔"

پیچھے سے کسی نے شعر پڑھا۔ "بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔"

"ٹھکرائی ہوئی عورت عرف ناگن کا انتقام۔۔۔" وکیلِ سرکار بولا۔

جج نے برہمی سے کہا "آرڈر۔ آرڈر۔ مسٹر ایڈووکیٹ جنرل' میں آپ کو تنبیہہ کرتا ہوں۔"

سرکاری وکیل نے فوراً معافی مانگ لی "آئی ایم سوری یور آنر!"

بیرسٹر محمود نے کہا "پوسٹ مارٹم کی دوسری رپورٹ آپ کے مؤقف کی تائید کرتی ہے۔ اس کے باوجود۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم نے سپاٹ لہجے میں کہا "یور آنر۔ اگر دلائل سے یہ ت ہوجائے کہ ایک کالے رنگ کا اڑنے والا اور کائیں ں کرنے والا پرندہ کوا نہیں ہے تو اس سے خود بخود یہ ت نہیں ہوجاتا کہ وہ کوا ہی ہے۔"

عدالت میں بہت سے لوگ ہنسنے لگے "ویری گڈ ...!"

کسی نے کہا "آف کورس' وہ شیر بھی ہوسکتا ہے۔"

ایک وکیل مسکرانے لگا "گائے بھی کائیں کائیں کرتی ۔ کالی ہوتی ہے اور اڑ سکتی ہے۔"

جج نے اس وکیل کو عدالت سے باہر نکال دیا "مس شبنم ان سب کی گواہی کو غلط قرار دے کر نظرانداز نہیں کیا ...جن کا حوالہ مسٹر شاہ عالم نے دیا ہے۔"

شبنم نے کہا "یور آنر۔ آپ بیرسٹر محمود کے مؤکل کو شاہ عالم کہہ سکتے ہیں جبکہ یہ فیصلہ ہونا باقی ہے۔ ابھی ت میں کسی نے گواہی نہیں دی کہ یہ شاہ عالم ہیں' یہ ان کا دعویٰ ہے۔"

اب شبنم کا وکیل اٹھ کھڑا ہوا "جناب والا' میری مؤکلہ اعتراض کو نوٹ کیا جائے۔ جب تک میری مؤکلہ کا تفصیل سے نہیں سنا جاتا اور جرح کے حق کو تسلیم ئے ہوئے مجھے موقع نہیں دیا جاتا کہ میں اس شخص کے ے کو غلط ثابت کرسکوں' یہ عدالت بھی بیرسٹر محمود کے شاہ عالم کہنے کی مجاز نہیں۔"

جج نے کچھ سوچ کے ساعت آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی اور سب کو اپنے چیمبر میں طلب کرلیا۔ میرے علاوہ محمود' شبنم اور اس کا وکیل وہاں موجود تھے۔ جب جج ور کو بلایا تو میں نے اس سے ایک فون کال کی اجازت ی "یور آنر۔ میں رخشندہ کو بلانا چاہتا ہوں۔"

جج نے کہا "کیا یہ ضروری ہے؟"

میں نے کہا "آپ چیمبر میں ان سے بھی بات کرسکتے ۔"

شبنم کے وکیل نے احتجاج کیا "جناب والا۔ کیا عدالتی ائی چیمبر میں ہوگی؟"

جج نے ناپسندیدگی سے کہا "میں عدالتی طریقِ کار کے ں ساعت کا فیصلہ بعد میں کروں گا۔"

میں نے کمرے کے ایک گوشے میں جاکے اپنا موبائل الا اور اس طرح بات کی کہ دوسرے لوگ بھی سن سکیں ں۔ ہاں بالکل خیریت ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"عدالت میں جج صاحب کے چیمبر سے۔ کیا تم فوراً یہاں آسکتی ہو؟ دس پندرہ منٹ میں؟"

"کیوں؟"

"بھئی وہ ایک خاتون صحافی ہیں' ہاں وہی مس شبنم آغا' انہوں نے ایک اعتراض کردیا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

رخشی نے کہا "اعتراض کیا' یہ حقیقت ہے۔"

"اب ایک تو تیمور صاحب ہیں' وہ بتادیں گے کہ میں شاہ عالم ہوں۔ دوسری گواہی تم دے سکتی ہو۔"

"ہاں۔ مگر میں نہ دینا چاہوں پھر؟"

میں نے کہا "یہ بس ایک رسمی سی کارروائی ہوگی۔"

"فرض کرو' میں نے جج کے سامنے انکار کردیا تمہیں شاہ عالم تسلیم کرنے سے؟" وہ کچھ شرارت یا بغاوت پر آمادہ لگتی تھی۔

میں نے کہا "ویسے تو دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ عدالت نے تسلیم کرلی ہے کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔"

"اچھا! پھر کیسے تسلیم کرلی؟"

میں نے کہا "حقائق کی بنیاد پر۔ بہت نامور ڈاکٹر تھے بورڈ میں۔"

"نامور ڈاکٹر اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے" وہ بولی۔

"صاف کہو نا کہ تم نے دھن' دھاندلی اور دھونس سے یہ رپورٹ حاصل کرلی۔"

"یو آر رائٹ' پھر تم آرہی ہو نا؟"

"میرا خیال ہے کہ اب آنا ہی پڑے گا مجھے۔"

"ذرا احتیاط کرنا" میں نے کہا "بے احتیاطی سے کوئی حادثہ یا کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوجائے۔"

"تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟"

"ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی" میں نے کہا اور فون بند کردیا

"آئی ایم سوری۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ خود گاڑی چلا کے آرہی ہے اس لیے میں نے کہا کہ احتیاط کرنا۔" میں نے جج سے مخاطب ہوکے کہا۔

جج نے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تیمور سے پوچھا۔

"آپ مس شبنم آغا کے اعتراض سے کس حد تک متفق ہیں؟"

تیمور نے میری طرف دیکھا اور پھر شبنم کی طرف "بالکل بھی نہیں یور آنر۔ ان کا کیا ہے' یہ مجھے تیمور ماننے سے انکار کردیں۔"

"آپ اتنا ہی بتائیے جتنا پوچھا جائے" جج نے کہا "آپ

سو فیصد یقین کے ساتھ عدالت میں بیانِ حلفی بھی داخل کرسکتے ہیں کہ یہ وہی شاہ عالم ہیں جو پی جے ایف کے چیئرمین تھے۔"

تیمور نے قدرے تذبذب سے کام لیا "یس یور آنر۔ مگر کیا اس کی ضرورت ہے؟"

"آپ کے خیال میں وہ شخص کون تھا جس کے بارے میں صورت کی مشابہت نے شناخت کی غلط فہمی پیدا کی تھی؟" جج نے پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتا جناب عالی!"

"آپ نے اسے دیکھا بھی نہیں؟"

"دیکھا تھا یور آنر۔ لیکن مسٹر شاہ عالم میری معلومات کے مطابق بانگ کانگ میں تھے۔"

"پھر آپ نے اسے شاہ عالم کیوں مان لیا تھا؟" جج نے کہا۔

"سب نے مان لیا تھا یور آنر۔ پھر میں کیسے نہ مانتا۔ صحیح صورتِ حال بعد میں واضح ہوئی۔ اس وقت تک پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی مرنے والے کو شاہ عالم ثابت کیا جاچکا تھا" تیمور نے کہا "کسی اور سے پہلے خود مس شبنم آغا نے اسے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کردیا۔ اب یہ دوسری رپورٹ کو بھی غلط کہہ رہی ہیں۔"

جج نے مجھ سے سوال کیا "آپ کا کہنا ہے کہ یہ ایک سازش تھی۔ پارٹی پر قبضہ کرنے کی۔ کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟"

"ابھی میں کسی عہدے دار کا نام نہیں لوں گا یور آنر۔ مگر ان میں مسٹر تیمور میرے سینئر نائب صدر بہرحال نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

شبنم اور اس کے وکیل نے درمیان میں مداخلت کرنے کی ناکام کوشش کی اور یہ بھی کہا کہ وہ مسٹر تیمور سے اور رخشندہ سے چند سوالات کریں گے مگر جج نے ان کی درخواست مسترد کردی "یہاں صرف میں سوالات کروں گا۔ جس سے جو پوچھا جائے گا اتنا ہی بتائے گا۔ پھر میں اپنی معلومات کے مطابق فیصلہ صادر کروں گا۔"

صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جب رخشی جج کے چیمبر میں داخل ہوئی اور میرے دائیں جانب اس کرسی پر بیٹھ گئی جو بیرسٹر محمود نے اس کے لیے خالی کردی تھی۔

جج نے کہا "آپ مسز شاہ عالم ہیں؟"

"یس یور آنر۔" رخشی نے چہرے پر بکھرے بال سمیٹے۔

"دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جس شخص کو شاہ عالم سمجھ لیا گیا تھا' وہ شاہ عالم نہیں تھا" جج نے کہا۔

"اگر یہ رپورٹ آپ نے دیکھی ہے اور تسلیم کرلی ہے جناب والا تو میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتی" رخشی نے کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ مسٹر شاہ عالم ہیں؟" جج نے میری طرف اشارہ کیا۔

رخشی نے چند سیکنڈ کے لیے توقف کیا۔ میرے لیے یہ وقفہ زندگی اور موت کے درمیان حائل ایک سانس کے وقفے کی طرح تھا۔ شبنم کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ فیصلہ اس وقت عدالت عالیہ کے جج سے زیادہ رخشی کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دل نے دھڑکنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

رخشی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کے ہزاروں مطلب نکالے جاسکتے تھے۔ اس مسکراہٹ نے شبنم کا چہرہ بھی امید سے روشن کردیا تھا اور مجھے بھی وہ ہنکا فراہم کردیا جس کا سارا ڈوبنے والا تلاش کرتا ہے۔

پھر رخشی نے کہا "شک کس کو ہے؟"

شبنم نے زہر آلود خنجر کی کاٹ رکھنے والے لہجے میں کہا۔ "مجھے۔"

شبنم کے اسی لہجے نے رخشی کو مشتعل کردیا "کیا تمہاری شادی ہوگئی ہے؟"

شبنم بھڑک اٹھی "اس احمقانہ سوال کا کیا جواز ہے؟"

"اگر تم سے پوچھا جاتا کہ کیا تم اپنے شوہر کو پہچانتی ہو۔۔۔ تو یہی سوال تم مجھ سے کرتیں مس شبنم آغا۔۔۔ اگر میری جگہ ہوتیں۔"

جج اٹھ کھڑا ہوا "تھینک یو۔ آپ لوگ جاسکتے ہیں۔"

دوبارہ ساعت کا آغاز ہوتے ہی جج نے اپنا مختصر فیصلہ سنادیا اور تفصیلی فیصلہ بعد میں جاری کرنے کا اعلان کیا۔

"دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حتمی ہے اور یہ عدالت معزز ڈاکٹروں کے فیصلے کو قبول کرتی ہے۔ متوفی شاہ عالم چیئرمین پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی نہیں تھا۔ وہ کون تھا؟ اس بارے میں وکیل سرکار کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پولیس کو دوبارہ تفتیش کے لیے کہیں اور ضرورت داخلہ سے ہدایات لیں۔ اس کیس میں دوسرا اہم نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ کیا چیئرمین پی جے ایف شاہ عالم زندہ ہیں اور کیا اس عدالت میں پیش ہونے والے بیرسٹر محمود کے مؤکل کو شاہ عالم قرار دیا جائے؟ بادی النظر میں جب یہ ثابت ہوگیا کہ مسٹر شاہ عالم کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قال ہی نہیں ہوا تھا تو پھر ان کے زندہ ہونے کے بارے میں
الی فیصلہ غیر ضروری تھا تاہم چند قابل غور نکات کے پیش
رعدالت تمام موجود شہادتوں' مسز شاہ عالم اور مسٹر تیمور
ئر نائب صدر پی جے ایف کی گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے
رعدالت میں حاضر پارٹی کے تمام عہدے داران' وکلا اور
مائندوں کی موجودگی میں دیے گئے مسز شاہ عالم کے بیان کو
ست تسلیم کرتے ہوئے اس اعتراض کو مسترد کرتی ہے جو
س شبنم آغا اور ان کے وکیل نے اٹھایا تھا۔ مسز شاہ عالم
ے دیگر معاملات سے موجودہ فیصلے کا کوئی تعلق نہیں اور وہ
نوفی چارہ جوئی کے لیے متعلقہ عدالت سے رجوع کرنے کے
ے آزاد ہیں۔"

جب یہ فیصلہ سنایا جا رہا تھا تو میری نظریں شبنم پر تھیں۔
ں کا چہرہ شرمندگی' اشتعال اور احساس ذلت سے سرخ
رہا تھا۔ جب اس کی اور میری نظریں ملی تو مجھے اس کی آنکھوں
ں اس کے عزائم کی تحریر صاف نظر آئی۔ اس نے ابھی ہار
یں مانی تھی۔ اس کی نگاہوں کا پیغام بھی بہت واضح تھا کہ
وئے گواہ اور جھوٹے ثبوت پیش کر کے عدالت سے خود کو
اہ عالم منوالینا میری ہار کیسے ہو سکتی ہے؟ میں جانتی ہوں کہ
شاہ عالم نہیں ہو۔ اگر سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی تمہارے
ق میں ہو جائے تو اس سے میرا یقین نہیں بدلے گا۔ میں
یں کبھی شاہ عالم نہیں مانوں گی اور اس وقت تک
مارے لیے چیلنج بنی رہوں گی جب تک ساری دنیا کے
امنے تمہارے چہرے سے بھوٹ کی نقاب نوچ کے نہ
پھینک دوں اور سب کو تمہارا اصل چہرہ نہ دکھادوں۔

میں نے اسے ایک ہاتھ کی مٹھی بند کر کے اور انگوٹھا
ہرا کر کے دکھایا۔ جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں
تا کہ میں نے تمہارا چیلنج قبول کیا۔ تم بھی ہو ہم بھی ہیں آمنے
امنے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

اشرف نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اور تیمور
کے مشورے سے تمام حفاظتی انتظامات بڑی سرعت کے
ساتھ مکمل کر لیے تھے۔ میں نے عدالت کے دائیں اور بائیں
نب والے دروازوں پر "ایف ایس ایف" یعنی فاتح عالم
رس کے نوجوانوں کو مستعد دیکھا۔ وہ عدالت کے اندر پہنچنے
کے لیے بالکل تیار کھڑے ہوئے تھے تاکہ مجھے پارٹی ورکرز اور
عدے داروں کی یلغار سے بچا سکیں۔ اشرف اس وقت بھی
یلوے اسٹیشن پر موجود تھا جب مجھے ریسیو کرنے کے لیے
نے والے پُرجوش کارکنوں میں ایک قاتل بھی شامل ہو گیا
ا اور اس نے عدالت میں وہی سین دہرائے جانے کے
امکانات کو نظرانداز کرنے کا رسک نہیں لیا تھا۔

میں نے شمس صاحب اور قریشی صاحب کے اترے
ہوئے مایوس چہروں پر نظر آنے والی بے بسی بھی دیکھی تھی'
ان کی امیدوں کے سہانے خواب کسی تعبیر کی منزل تک پہنچنے
سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے۔ مجھے ان دونوں کے سازشی ذہن کا
کچھ اندازہ ضرور ہو چکا تھا لیکن فی الحال میں ان کے ساتھ
اپنے رویے میں تبدیلی سے شکوک پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔
انہیں یہ موقع بھی فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ انتشار
پھیلانے کے لیے پارٹی ورکرز کو بدظن کریں اور پھر اپنا شمس
گروپ یا قریشی گروپ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ایک
محرور از گروپ پہلے ہی تھا جو اب یوسف بے کارواں کے
برعکس بے رہبر کارواں ہو گیا تھا۔ میں تو انہیں بھی پارٹی میں
واپس لانا چاہتا تھا کیونکہ میرے نزدیک وہی اصل لوگ تھے جو
پارٹی کے اغراض و مقاصد سے مخلص ہونے کے جرم میں
پارٹی سے نکال دیے گئے تھے یا جو پارٹی میں لالچی' خودغرض
اور موقع پرست عناصر کی قیادت سے بددل ہو کے پارٹی چھوڑ
گئے تھے۔ مجھے پارٹی کی تنظیم نو کرنی تھی مگر سب کچھ دیکھنے اور
سمجھنے کے بعد' اپنے اقتدار اور اختیار کو مستحکم کرنے کے بعد
مجھے ایک ایک سے باری باری نمٹنا تھا۔

جج کے اٹھتے ہی عدالت میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب سے
پہلے اگلی صف میں تشریف فرما لوگ مجھے مبارک باد دینے اور
مجھ سے گلے ملنے کے لیے دوڑے۔ ان میں قریشی صاحب اور
شمس صاحب پیش پیش تھے۔ ان کے پیچھے وہ تمام معروف اور
جفادری قسم کے صحافی تھے جنہوں نے میری پریس کانفرنس کی
رپورٹ کو جھوٹ کا بدترین پلندہ قرار دیا تھا۔ اچانک نامور
اور معتبر ہو جانے والے وہ صحافی جنہوں نے یہ رپورٹ چھاپی
تھی' آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اپنے ہم پیشہ بڑے نام
والے صحافیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور مجھ تک
پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سب کے ساتھ آنے والے
فوٹو گرافر ہر سمت سے فلیش چمکا رہے تھے اور کیمرے اٹھائے
میرے ہر پوز کی تصویر بنانے میں مصروف تھے۔ وہ کرسیوں
اور بینچوں کو پھلانگ رہے تھے اور گرتے اٹھتے آگے بڑھ
رہے تھے۔

میرے گرد ایف ایس ایف کے جوانوں نے دہرا حلقہ
قائم کر لیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کے ایک
مضبوط حصار بنا لیا تھا۔ اس کے باہر دوسرا حصار تھا چنانچہ
سب آگے بڑھنے والے ایک خاص فاصلے پر روک دیے گئے
تھے۔ میری نگاہوں نے شبنم کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر

وہ اس ہجوم میں کہیں پیچھے رہ گئی تھی یا موقع سے فائدہ
اٹھاتے ہوئے روپوش ہو گئی تھی۔ میرے دونوں نائب صدور
اس سلوک سے سخت ناخوش نظر آتے تھے۔ تاہم انہیں
اشرف نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ شاہ صاحب یہاں سے
سیدھے پارٹی سیکریٹریٹ جائیں گے اور وہاں آپ سے
ملاقات کے بعد پریس کے نمائندے بھی مل سکیں گے۔

امیر تیمور میرے ساتھ رہا اور ہم سائیڈ کے ایک
دروازے سے نکل آئے۔ اشرف نے صورت حال کو
دیکھتے ہوئے ٹیلی فون پر ہی احکامات جاری کیے تھے اور
سارے انتظامات بڑی عمدگی سے کر لیے تھے۔ اس نے اخبار
والوں کی یلغار کو بھی روک دیا تھا اور انہیں بعد دوپہر ایک
پریس کانفرنس کے لیے پارٹی سیکریٹریٹ طلب کر لیا تھا۔ میری
طرف سے مایوس ہو کے اخبار والوں نے شمس اور قریشی کو
گھیر لیا تھا۔

ہم پچھلی طرف سے باہر آئے تو ایک گاڑی مجھے لے
جانے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ یہ شاہ عالم کی ذاتی لینڈ
کروزر تھی جس پر پارٹی کا پرچم بھی لہرا رہا تھا۔ گاڑی کے پیچھے
والی سیٹ پر رخشی پہلے سے موجود تھی۔ میں اس کے ساتھ
بیٹھ گیا تو آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک مسلح محافظ نے جگہ
سنبھالی۔ وہ چھ فٹ لمبا تنومند جسم اور بڑی بڑی مونچھوں والا
سابق فوجی نظر آتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ڈرائیور نمودار ہوا۔ وہ
بھی میرے باڈی گارڈ کی طرح لمبا تڑنگا سابق فوجی ہی تھا۔
اس نے بھی مجھے خالص فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

رخشی کے لیے ڈرائیور بھی اجنبی تھا۔ محافظ کو دیکھ کر وہ
کچھ نہیں بولی تھی مگر اب اس نے کہا "تمہیں کس نے کہا
ہے ڈرائیونگ کے لیے؟"

اس نے پلٹ کے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا "اشرف
صاحب کے حکم سے بیگم صاحب' میرا نام حمید ہے۔"

"ہمارا ڈرائیور کہاں گیا' جو مجھے یہاں لایا تھا۔"

حمید نے گاڑی اسٹارٹ کی "مجھے نہیں معلوم بیگم
صاحب۔"

رخشی نے ناگواری سے میری طرف دیکھا "کیا اب
ہمارے ذاتی ملازم بھی پارٹی کے سیکریٹری صاحب کی پسند کے
ہوں گے؟"

میں نے کہا "اشرف نے کچھ سوچ کے ہی یہ فیصلہ کیا
ہو گا۔"

گاڑی باہر آئی تو گیٹ پر موجود ایک کار خود بخود آگے
ہو گئی۔ اس میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ خود اشرف
تھا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد میرے لیے اجنبی تھے۔ میں
نے فرض کیا کہ وہ بھی بیکیوریٹی والے ہوں گے۔ ایک گاڑی
ہمارے پیچھے تھی۔ اس میں تیمور تھا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" رخشی نے کہا۔

"جہاں بھی تقدیر لے جائے" میں نے کہا اور شکر
گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے رومینٹک
ہوئے بغیر میں نے رخشی کا ہاتھ تھام لیا "تم میری تقدیر ہو اس
لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ تم جہاں چاہو گی' لے جاؤ گی۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "یہ مت بھولو کہ تم شاہ عالم
ضرور بن گئے ہو' میرے شوہر نہیں بنے ہو۔"

"شاید عدالت اس بیان کو تسلیم نہ کرے لیکن میں کرتا
ہوں۔ دنیاداری کے تقاضے نباہنے کے لیے۔"

اس نے خاموش نظروں سے مجھے خبردار کیا کہ ڈرائیور
اور باڈی گارڈ اجنبی اور ہمارے ملازم ہیں۔ ان کے سامنے
مجھے محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی بات غلط نہیں
تھی' میں باہر دیکھنے لگا۔ باہر کی دنیا وہی تھی۔ زندگی کے
سارے نظارے وہی تھے اور زمین و آسمان کے درمیان سب
ویسا ہی تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈرائیور اور باڈی
گارڈ کی طرح ہر چیز اجنبی اور ناآشنا ہے۔ جیسے میں ایک اجنبی
شہر میں ہوں۔

حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ اس شہر کے لیے اور
باہر کی پرانی دنیا کے سب نظاروں کے لیے میں اجنبی تھا۔ ہر
چیز مجھے ناآشنا نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوال کرتی تھی کہ
آخر تم کون ہو؟ کیا تم ناصر عظیم نہیں ہو' پھر تم شاہ عالم کیسے
ہو گئے؟

میں نے ایک بازی جیت لی تھی۔ میں نے شاہ عالم کے
عزائم کو ناکام کر دیا تھا۔ فاویقا کی اس جنگ میں شاہ عالم کا
نصیب ایک بے نشاں مدفن ہوا تھا اور تقدیر نے کامیابی کا
تاج میرے سر پر سجا دیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ڈبل کے طور پر
استعمال کرنے کی منصوبہ بندی بڑی عیاری سے کی تھی۔ جو چیز
استعمال ہو وہ ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ اگر میں بھی ہو جاتا تو شاہ
عالم کو فرق نہ پڑتا۔ بس اسی سے اندازے کی تھوڑی سی غلطی
ہو گئی۔ اس نے صرف اپنی اور میری صورت کی ناقابل یقین
مشابہت پر غور کیا اور یہ سوچا کہ مجھے کب اور کہاں ڈپلی کیٹ
کے طور پر روانے کے لیے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسے
اپنے شاطر ذہن کی فطانت پر غرور تھا اور اسی غرور نے اسے
مروا دیا۔ وہ بھول گیا کہ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ہے اور سیر کے لیے سوا سیر۔ یہ اپنے دفاع کی جنگ تھی
میں تقدیر نے مجھے سُرخرو کیا۔ اس سے پہلے کہ دنیا کو شاہ
کے کسی ڈبل کا پتا بھی چلتا' وہ خود غائب ہو گیا۔ دنیا میں
ہی شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف باقی رہا۔

شاہ عالم اب میں تھا لیکن اس کا یقین میرے لیے جتنی
رت اور طمانیت لایا تھا' اس میں ایک انجانے اور مبہم
دکھ کے احساس کی خلش بھی شامل تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے
نے کچھ پایا ہے تو کچھ گنوایا بھی ہے۔ میں نے ناصر عظیم کو
ادیا تھا۔ جو اٹھائیس سال تک میرے ساتھ رہا تھا۔ میں
جب سے ہوش سنبھالا تھا ناصر عظیم تھا۔ زندگی کے
ت وحوادث کے ہر طوفان کا مقابلہ ناصر عظیم نے کیا تھا۔
حالات کے سب جان لیوا مرحلے ناصر عظیم نے طے کیے
راو حیات کے تمام نشیب و فراز ناصر عظیم کے ماضی کا
ر تھے۔ وہ ایک لامحدود تلخ ترش اور شیریں یادوں سے
ور ماضی تھا جو میرا تھا مگر میں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔
وہ میرا ماضی نہیں رہا تھا کیونکہ میں شاہ عالم بن گیا تھا۔
مجھے ایک اجنبی مستقبل کے ساتھ جینا تھا۔

میری ساری زندگی ٹھکانے بدلتے گزری تھی۔ یتیم
نے کے بعد ڈاکٹر مشہود کے گھر میں پھر شاد کے ساتھ اور
ں کے بعد بھی گردشِ حالات نے مجھے کہیں سکھ چین سے
نہیں دیا تھا۔ میری تقدیر کے ستارے مداری کے کھیل
اتے رہے اور میری زندگی کا پانسا پلٹتا رہا۔ میں ایک گوٹ
طرح سانپ سیڑھی کے بورڈ پر اوپر نیچے' درمیان خانہ
پھرتا رہا یہاں تک کہ ایک اتفاق نے مجھے کرنل خان کی
فقت پناہ میں پہنچا دیا۔ وہاں چند ابھی تھی۔ سیکھی وہیں
ے دل کا فرنے بندگی۔ وہاں میں نے جینے کا ہنر سیکھا۔
گی کا قرینہ سیکھا اور محبت کا سلیقہ سیکھا۔ انسانیت کے
اس سے آشنائی سیکھی۔ رشتوں کی تقدیس کو سمجھا اور
ب خود آگاہی کو جانا۔ بیس سال تک زمانے کی ٹھوکروں
درماندہ و شکستہ ناصر عظیم کو اماں ملی تو کہاں ملی۔ اس نے
گھر بدلے' کتنے ٹھکانے چھوڑے۔ کتنے رشتے گنوائے
اپنی تنہائی کے ساتھ کتنے بن باس لیے۔ تب کہیں جا کے
س دروازے سے گزر کے اس گھر میں داخل ہوا تھا جہاں
ب تھا جو اس نے کہیں نہ پایا تھا۔ کہیں نہ دیکھا تھا اور
ں نہ سوچا تھا۔

آج آٹھ سال بعد ناصر عظیم خود کو پھر یتیم اور لاوارث
س کرتا تھا کیونکہ اس کا وہ گھر نہیں رہا تھا جہاں کرنل
نے اس کی تربیت کی تھی جو تعلیم سے بالکل الگ تھی۔

انہوں نے مجھے میری قدر سے آشنا کیا۔ میری خود اعتمادی کے
جوہر کو نکھارا۔ میری حیوانی جبلت کو انسانی فطرت کے سانچے
میں ڈھالا۔ مجھے شرفِ انسانیت کی پہچان بتائی اور یوں مجھے
خود اپنی نگاہ میں معتبر کیا۔

آج میں نے وہ سب بھلا دیا تھا۔ چندا نے مجھ سے کتنا
کہا۔ اور کتنی بار کہا کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ مگر میں شاہ
عالم بن گیا۔ اور میں آٹھ سال پہلے جس دروازے سے جس
گھر میں داخل ہوا تھا اس سے بھی نکل آیا کیونکہ اب میں
شاہ عالم ہاؤس کا کیس ہو گیا تھا۔ میں شاہ عالم کی بیوی کا شوہر
کہلانے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا
جیسے آٹھ سال کے روز و شب کے ہر لمحے میں چندا کے ساتھ
رہ کے اسے اپنی رگِ جاں سے قریب تر محسوس کرنے والا
ناصر عظیم اپنے ہی خوابوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ہے۔
کون کہتا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے' کوئی باب کی قبر پر پھول
چڑھانے جائے تو کیا لوحِ مزار پر کسی اور کا نام دیکھ کر سب کچھ
نہیں بدل جاتا؟ اس کے جذبات اور اس کی عقیدت اور اس
کے تصورات۔

بے شک میں اپنے دعوے میں حق بجانب ہوتا اگر میں
کہتا کہ میرا نام ہی تو بدلا ہے۔ مگر کیا شاہ عالم کے لیے یہ ممکن
تھا کہ وہ چندا کے ساتھ اس کے قریب اسی طرح رہے جیسے
ناصر عظیم رہتا تھا۔ اسے اتنی ہی بے تکلفی کے ساتھ الو کی
پٹھی کہہ سکے۔ اس سے چھیڑ چھاڑ کر سکے۔ موقع بے موقع
اسے شعر سنا سکے' اسے مار سکے اور اس سے مار کھا سکے۔ کسی
جھجک اور تکلف کے بغیر۔ دن رات کے کسی بھی لمحے کی پروا
کیے بغیر اس کے سامنے جا کے کچھ بھی کہہ سکے اور سن سکے۔
نہیں' یہ سب ناممکن تو نہیں مگر محدود ہو گیا تھا۔ میرے اور
چندا کے درمیان ایک مصلحت کی اور دنیا داری کی دیوار
حائل ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنے پاس بُلا کے اپنی سیکریٹری
بنا کے شاہ عالم ہاؤس میں رکھ سکتا تھا۔ میں کرنل خان کو بھی
اپنا چیف سیکیورٹی آفیسر بننے پر مجبور کر سکتا تھا مگر وہ سب پھر
بھی ناممکن ہو گا جو اس پرانے گھر میں ممکن تھا۔ چندا سے ناصر
عظیم بن کر ملنے کے لیے مجھے اپنے دن رات کے چوبیس
گھنٹوں کی مصروفیت میں سے کچھ فرصت کے لمحے چرانے
پڑیں گے۔ اسے کوئی بے تکا شعر سنانے یا اسے الو کی پٹھی
کہنے سے پہلے مجھے دیکھنا پڑے گا کہ کوئی دیکھنے اور سننے والا تو
نہیں ہے۔ میں اس سے ملوں گا تو ساری دنیا سے چھپ کر۔
کیونکہ ساری دنیا کے لیے میں شاہ عالم ہوں۔ رخشی کا شوہر
ہوں اور پی جے ایف کا چیئرمین ہوں۔

گاڑی پورچ میں رکی تو میں نے رخشی کو دیکھا۔ وہ مجھے
عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہو گیا ہے اچانک
تمہیں؟"

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے؟ سینگ نکل آئے ہیں میرے
سر پر؟"

"تمہارا چہرہ خوشی سے ہزار واٹ کے بلب کی طرح
چمک رہا تھا۔ اچانک بلب فیوز کیسے ہو گیا؟" رخشی نے اترتے
ہوئے کہا۔

"جب آدمی اندھا ہو جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے سورج
بھی روشن نہیں رہا" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ اس
کے لیے یہ ٹالنے والی بات تھی۔ میرے نزدیک اعترافِ
حقیقت۔ میرے اندر کی روشنی بجھ رہی تھی۔

آگے چلنے والی گاڑی گیٹ سے اندر نہیں آئی تھی۔ لینڈ
کروزر بھی مجھے اتار کے آگے بڑھ گئی۔ پیچھے والی گاڑی نے
تیمور کو اترنے کا موقع دیا۔ پھر وہ بھی پارکنگ ایریا کی طرف
چلی گئی۔ اشرف کے حکم پر گیٹ بند کر دیے گئے اور وہ خود
میرے تعاقب میں آنے والوں سے نمٹنے کے لیے باہر کھڑا
ہو گیا۔ کچھ جوشیلے صحافی اور فوٹو گرافر تو اس کے سمجھانے
سے مایوس ہو کے لوٹ گئے مگر انہی کے ساتھ پہنچنے والے
میری پارٹی کے نائب صدور جناب شمس الزماں اور وکیل
قریشی نے اسے اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔

رخشی اندر چلی گئی تھی۔ میں اور تیمور چند سیکنڈ کے لیے
برآمدے میں رکے۔ اشرف سب کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔
"سوری ایم سوری۔"

"آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟" شمس صاحب نے برہمی
سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ آپ بزرگ ہیں اور میرے لیے محترم۔"

"تم ایک نائب صدر کے حکم کو اہمیت نہیں دیتے؟"
وکیل قریشی نے کہا۔

"مجھے چیئرمین کا حکم ہے کہ فی الحال کسی کو بھی اندر نہ
آنے دیا جائے" اشرف نے کہا۔

"ہم اس سے پہلے بھی یہاں آتے تھے۔ آج تک شاہ جی
نے کبھی ایسا نہیں کیا ہمارے ساتھ" شمس چلانے لگا "ہم
آدھی رات کے وقت آئے تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔"

"اب کیا غیر ہو گئے ہیں ہم یا ہماری حیثیت عام آدمی
کے برابر بھی نہیں رہی" وکیل قریشی بولا۔

اشرف نے کہا "آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ آپ پر ان
کا اعتماد نہ ہوتا تو آپ نائب صدر کیسے ہوتے۔ وہ یقیناً آپ کی
بہت قدر کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ انہیں تھوڑی سی
مہلت دیں۔ وہ کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں' آپ
اچھی طرح جانتے ہیں" اشرف کے ضبط کا حوصلہ جواب دے
گیا۔

میں نے تیمور کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تھینک یو تیمور
صاحب۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم مل کر حالات پر قابو پا لیں
گے۔ سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ہونا چاہیے۔ میں
صرف نام کا چیئرمین ہوں۔ رہنمائی میں آپ سے حاصل
کروں گا۔"

تیمور نے سر ہلایا "میں آپ کے حق میں صرف دعائے
خیر کر سکتا ہوں شاہ جی۔ جو دلدل میں غلطی سے گر جائے اسے
نکالا جا سکتا ہے مگر اپنی مرضی سے دلدل میں اترنے والے کی
کیا رہنمائی کی جا سکتی ہے اور میں تو خود آپ کے ساتھ اسی
دلدل میں ہوں۔ بلکہ پہلے سے ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "چلیں' یہ دلدل ہی سہی۔ آپ
مجھے خوش آمدید تو کہہ سکتے ہیں۔ ایک سے دو بھلے۔ اب آپ
کسی طرح ان دو نائب صدور کی اور اشرف کی بحث ختم
کرائیں۔"

تیمور نے کہا "شاہ جی۔ آپ ان سے مل لیں۔ ورنہ
انہیں شکایت بلکہ تکلیف رہے گی کہ میرے ساتھ ترجیحی
سلوک سے ان کی توہین ہو گئی ہے۔"

مجھے تیمور کی بات معقول لگی۔ تیمور نے آزمائش کے
ایک سازشی دور میں میرا ساتھ دیا تھا۔ یہ اس کی وفاداری
نہیں تھی' مجبوری تھی۔ دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے لیکن
اس کی مجبوری کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ شمس اور وکیل
قریشی نے میری "موت" سے پیدا ہونے والے عارضی بحران
کو حصولِ اقتدار کا بہانہ بنایا تھا اور اس عرصے میں جوڑ توڑ کی
سیاست کے داؤ پیچ آزمانے میں لگے رہے تھے۔ یہی احساسِ
جرم اب چور کی داڑھی کا تنکا بن گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ
جوش و خروش کے ساتھ اپنی وفاداری اور جانثاری کے
جذبات کا مظاہرہ کر کے میرے شکوک رفع کرنا چاہتے تھے۔

میں واپس گیٹ تک گیا اور میں نے اشرف کو ڈانٹا۔
"بھئی یہ کیا ہے اشرف۔ تم نے شمس صاحب کو بھی روک
دیا۔ اور قریشی صاحب کو بھی۔"

شمس نے فریاد کی "اجی شاہ صاحب' ہمارا جنرل سیکریٹری
تو ہو گیا ہے خدائی فوجدار۔ ایس ایچ او بنا دیں اسے آپ اور
آفس کو تھانہ۔"

قریشی بولا "میں اس کے خلاف پریس کے اجلاس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احتجاج کروں گا۔"

اشرف نے بے بسی سے مجھے دیکھا "سر۔" اس نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر گیٹ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

شمس اور قریشی کے ساتھ دو ڈھیٹ قسم کے رپورٹر بھی اندر گھس آئے اور چند جوشیلے کارکن بھی۔ وہ سب گلے مل کے مجھے مبارک باد دینا چاہتے تھے۔ باہر ایک ہجوم تھا۔ کم سے کم دو سو افراد وہاں موجود تھے اور میں سب سے ملتا تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا کیونکہ جیسے جیسے شاہ جی کی واپسی کی خبر پھیل رہی تھی' شاہ عالم ہاؤس کا رخ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

شمس نے سخت جذباتی لہجے میں کہا "رب دی سوں شاہ جی۔ ہم تو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا کہ اب کیا رہ گیا ہے پارٹی میں۔ سر ہی نہ رہے تو دھڑ بے کار۔"

قریشی نے سر ہلایا "کیا غضب کی مثال دی ہے تم نے شمس۔ شاہ جی ہیں تو پارٹی ہے ورنہ کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "ایسا نہیں ہے قریشی صاحب۔ آپ سب میرے دست و بازو ہو' پارٹی آپ سب کے دم سے ہے۔ ایک اجتماعی قوت ہے اور رہے گی۔"

"انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔" شمس نے بہ آوازِ بلند کہا "ہم تو جناب گڈی چڑھا دیں گے ان سب کو۔ ہمارے خلاف سازش کرنے والوں کو۔"

"گڈی کیوں۔ منہ کالا کر کے کھوتے پر بٹھا کے جلوس نکال دیں گے ان کا" قریشی نے کہا "آؤ جی تیور صاحب۔ ہم چلتے ہیں کچھ صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ شاہ جی کو آرام کرنے دو۔"

شمس نے فوراً اس کی تائید کی "ہاں۔ شاہ جی بھی پارٹی آفس ہی آئیں گے نا۔ ہم پہلے سارے معاملات ٹھیک ٹھاک کر لیں۔"

وہ اشرف کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے مگر میں نے کہا کہ مجھے ابھی اس کو پریس کانفرنس سے پہلے کچھ ہدایات دینی ہیں۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اشرف سے کہا کہ اب کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو وہ پولیس فورس طلب کرے۔ لیکن صورتِ حال خراب نہ ہونے دے۔

اشرف دیکھنے میں کچھ بے وقوف اور گھبرایا ہوا لگتا تھا مگر وہ اچھا اور تیز رفتار منتظم تھا۔ اس نے ڈرائیور اور باڈی گارڈ بدل دیے تھے۔ گیٹ پر نظر آنے والے محافظوں کے چہرے بھی مجھے نا آشنا لگے۔ "آپ فکر ہی نہ کریں سر' میں سب سنبھال لوں گا۔ پریس کانفرنس کے لیے کیا ٹائم دوں اخبار والوں کو؟"

میں نے سوچ کے کہا "چار بجے ٹھیک رہے گا لیکن دیکھو۔۔۔ ایک خاتون صحافی ہیں مس شبنم آغا۔ ان سے بات کرو' کیا وہ مجھ سے پہلے ملنا پسند کریں گی۔ اگر وہ ساڑھے تین بجے یہاں آ جائیں' تم میری طرف سے درخواست کرو اس طرح کہ وہ مان جائے۔ اور کسی طرح یہ بھی سمجھا دو اسے کہ یہاں جو بات ہوگی آف دی ریکارڈ ہوگی۔ اگر وہ آئے تو اس کی اچھی طرح تلاشی لینا ضروری ہوگا۔"

"میں چنبیلی کو بریف کر دوں گا سر کہ تلاشی میں کیا دیکھنا ہے؟"

"کیا گلاب اور چنبیلی واپس آ گئے ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں نے واپس بلوا لیا ہے سر۔ لیکن ماں جی نے واپس آنے سے انکار کر دیا" اشرف بولا۔

میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ "ماں جی نہیں آئیں؟"

"نہیں سر۔ وہ یہاں اکیلے رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ کہتی ہیں کہ بس اب جتنی زندگی کے دن ہیں وہ یہیں گزر جائیں گے۔ چنبیلی بتا رہی تھی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے اشرف۔ انہیں میں رجا کے لے آؤں گا۔"

صبح سے اب تک نہ چندا نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ خان اعظم نے۔ میرا خیال تھا کہ وہ عدالتی کارروائی کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش کریں گے ..... اس ہجوم میں سب غیر تھے جن کا مجھ سے سیاسی یا کاروباری مفادات کا تعلق تھا۔ وہ سب غیر حاضر تھے جن سے میرے رشتوں کی بنیاد خلوص محبت اور اپنائیت کے احساس پر تھی۔

میں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا جہاں رخشی کی مداخلت کا امکان کم تھا مگر پھر اپنے اسٹڈی روم کو ترجیح دی۔ وہاں شاہ عالم کا آفس بھی تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور خان اعظم کا نمبر ملایا تو یہ سب مجھے بہت عجیب سا لگا۔ آج میں خان اعظم سے چوری چھپے بات کرنے پر مجبور تھا کیونکہ میں شاہ عالم تھا' ناصر عظیم نہیں۔

چندا نے فون اٹھایا اور بولی "یس۔"

میں نے کہا "یس۔۔۔ واٹ یس' یس سر کہو۔ ہم تمہارے باس شاہ عالم بول رہے ہیں مس خان۔ تم سیکریٹری

ہو ہماری۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "سوری۔ رانگ نمبر" اور فون بند کر دیا۔

میں نے پھر نمبر ڈائل کیا "کیا بات ہے' دماغ خراب کیوں ہو رہا ہے تمہارا؟ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا۔"

"دیکھئے' آپ نے کہاں ڈائل کیا ہے' کون ہیں آپ۔؟"

"چندا۔ پلیز میری بات سنو۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

"میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتی۔"

"اوکے' اوکے۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"اچھا بولو۔"

"تم خفا ہو مجھ سے؟" میں نے کہا۔

"بے وقوفی کے سوالات کا جواب میں کیا دوں۔ خفا تم بھی ہوتے ہو مگر کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" چندا نے کہا۔

"پھر یہ غیریت کیسی۔۔۔ تم کورٹ میں بھی نہیں ملیں۔ کورٹ نے مجھے شاہ عالم تسلیم کر لیا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟ تمہیں مبارک باد دوں کہ جھوٹ کا بول بالا ہوا اور سچ کا منہ کالا ہوا۔ تم واقعی بڑے مداری ہو۔"

"اب ایسی جلی کٹی باتیں کرنے سے فائدہ؟" میں نے برہمی سے کہا "مداری کے کھیل میں تم بھی ساتھ تھیں۔"

"بالکل تھی۔۔۔ مگر اب نہیں ہوں۔"

"کیوں۔۔۔ اب کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے ضمیر صاحب ملامت کر رہے ہیں؟ سوتے سوتے اچانک جاگ اٹھا تمہارا ضمیر۔؟"

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ میں جذباتی ہو کے تمہارا ساتھ نبھا رہی تھی یا پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس راستے پر اتنا آگے چلے جاؤ گے۔ جہاں سے تمہارے لیے واپسی بھی ناممکن ہو جائے گی۔ تم مشکل میں پڑ گئے تھے اور اکیلے تھے۔ اس وقت تمہارا ساتھ دیا میں نے۔"

"اور اب۔۔۔" میں نے کوشش کی کہ مایوسی کا احساس میرے لہجے سے عیاں نہ ہو "تم سمجھتی ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی؟"

"ہاں۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ تم بازی جیت گئے ہو اور تمہاری مشکلات ختم ہو گئی ہیں۔ تمہارا ساتھ دینے والے سیکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ہیں" چندا خفا نہیں' دل شکستہ تھی۔

میں نے کہا "چندا' یہ غلط ہے۔ میں آج بھی اکیلا ہوں۔"

"اکیلے تم اس وقت تھے جب خان جی کے ساتھ آئے تھے۔ بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ اس وقت تم ناصر عظیم تھے۔"

"تمہارے لیے میں آج بھی ناصر عظیم ہوں۔"

"ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کہ جسے ساری دنیا شاہ عالم سمجھتی ہو' جسے قانون نے شاہ عالم تسلیم کر لیا ہو' وہ خود کو ناصر عظیم کہہ سکے۔ سب سے چھپ کے بھی تم ایسا کہتے ہوئے ڈرو گے۔ ایک چندا کے یا خان جی کے جاننے اور ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ تم رخشی کے شوہر ہو۔ میاں جی تمہارے والد ہیں۔ تمہارے لیے یہ ڈبل رول نبھانا ناممکن ہو گا۔ وقت کے ساتھ زیادہ ناممکن ہوتا جائے گا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں شاید چند سیکنڈ کے لیے بھی تم کو چوری چھپے ناصر عظیم بننے کا موقع نہ ملے۔ اور ملے بھی تو مجھے کیا ضرورت ہے اس چور وقت میں کسی شاہ عالم سے ملنے کی جو سب کی نظر بچا کے ناصر عظیم کی نقاب چہرے پر ڈالے میرے پاس آئے تو اس خوف میں مبتلا ہو کہ کہیں اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کی دہری شخصیت کا راز فاش نہ ہو جائے۔ کوئی اسکینڈل نہ بن جائے۔ جس سے اس کا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے۔"

"چندا۔ تم ایسی باتیں کرو گی تو میں یہ سب چھوڑ دوں گا۔"

وہ تلخی سے ہنسی "کیا چھوڑ دو گے؟ اور کیسے چھوڑ دو گے۔ وہ سب جو تم نے جھوٹ اور مکر و فریب' ہیرا پھیری' جوڑ توڑ' سازش اور بلیک میلنگ سے حاصل کیا ہے۔ اب تم کمبل کو چھوڑنا بھی چاہو گے تو کمبل تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں مجبور تھا۔"

"تھے۔۔۔ اب نہیں ہو۔ اس وقت ہم بھی مجبور تھے کہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑیں مگر اب تمہاری مشکلات کا دور ختم ہو گیا ہے۔ تمہارا راستہ بہت آسان ہے۔ یہ راستہ تمہیں سیدھا پرائم منسٹر ہاؤس تک لے جائے گا۔ یہی تمہارا خواب تھا۔"

"میرا خواب تم ہو چندا!"

"فار گیٹ چندا۔ بھول جاؤ اس بے وقوف لڑکی کو جو یہ سمجھتی تھی کہ ناصر عظیم ایک دن اس کی خاطر ضرور انسان کا بچہ بن جائے گا۔ اب تم شاہ عالم ہو۔ بہت بڑے مداری۔ تم انسان کے بچے تو کیا کبھی ناصر عظیم بھی نہیں بن سکتے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح دیوار کو دیکھتا رہا۔ آخر کیوں میری آنکھیں نوشتۂ دیوار دیکھنے سے قاصر ہیں؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ گنوانا بھی پڑتا ہے مگر میں نے تو سب کچھ گنوا دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چندا کے رویے سے مجھے دکھ ضرور ہوا تھا مگر میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اب بھی یقین تھا کہ میں خان اعظم سے ضد کرکے اپنی ہر بات منوا سکتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی چندا کی طرح ایک دلیل کی دھار سے رشتوں کی ڈور کاٹ دیں کہ جھوٹے تو ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ تو ناصر عظیم نہیں ہے۔ کسی مداری شاہ عالم سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

چندا واقعی غصے میں تھی یا صرف مجھے پریشان کرنا چاہتی تھی۔ اس کے مذاق کا اور سنجیدہ ہونے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر وہ موڈی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر اس کا موڈ آف تھا کہ چندا نے اعلانِ لاتعلقی کردیا۔ اس کی تو ایسی تیسی۔ آخر وہ سمجھتی کیا ہے خود کو۔ میں وہ بھوت ہوں کہ ایک بار چمٹ گیا تو ساری دنیا کے عامل جادوگر مجھے اتار نہیں سکتے۔

میں نے موبائل جیب میں رکھا اور باہر آیا تو اشرف میرے انتظار میں تھا "میں نے مس شبنم آغا کے لیے پیغام چھوڑ دیا ہے سر۔"

"کہاں فون کیا تھا تم نے؟"

"پہلے آفس۔ وہاں سے انہوں نے فلیٹ کا نمبر دیا۔ وہ فلیٹ پر بھی نہیں تھیں۔ پھر میں نے آفس میں کہہ دیا کہ اگر ان سے رابطہ ہو تو مجھ سے بات کرلیں۔"

"کہاں بات کرلیں؟"

"پارٹی آفس میں۔ اب میں وہیں جا رہا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "ابھی ڈھائی بجے ہیں۔ میں ٹھیک چار بجے آؤں گا۔"

"آپ دوسری گاڑی میں آئیں گے اور اکیلے نہیں' یہ دونوں گارڈ بہت دیکھ بھال کے رکھے ہیں میں نے۔ ایک ڈرائیونگ بھی کرے گا۔"

میں نے کہا "اشرف۔ اس سیکیورٹی کے چکر میں مت پڑو۔ آدمی کو باڈی گارڈ نہیں' اس کی تقدیر بچاتی ہے۔ جب وقت آتا ہے تو امریکی صدر کینیڈی کی طرح کسی بھی نامعلوم سمت سے آنے والی ایک ہی گولی کافی ثابت ہوتی ہے۔ بلٹ پروف بلیکٹ پہن کے بلٹ پروف کار میں سفر کرنے والے کیا موت سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کئی مثالیں دے سکتے ہیں سر۔ لیکن اس کے باوجود احتیاطی اور حفاظتی تدابیر کو خلافِ عقل قرار نہیں دے سکتے۔ ابھی کچھ دن پہلے یہ دیکھ لیا ہے آپ نے کہ۔"

میں نے اس کی دلیل کو مسترد کردیا "نہیں اشرف۔ میں صرف خدا پر بھروسا رکھوں گا۔ کوئی بندہ میری زندگی یا موت کا فیصلہ کار نہیں ہو سکتا۔ اگر قضا آئی ہوگی تو میرے دشمن کیا دوست بھی فرشتۂ اجل بن کر سامنے آجائیں گے ورنہ دشمن میری مونچھ کا ایک بال تک نہیں اکھاڑ سکتے۔"

"اس لیے کہ مونچھیں ہی نہیں ہیں آپ کی" وہ مسکرایا۔

جب وہ چلا گیا تو میں رخشی کے بیڈ روم میں گیا۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس وقت میرے آنے سے وہ ڈسٹرب ہوئی ہے۔ شاید وہ ٹیلی فون پر کسی سے پرائیویٹ نوعیت کی گفتگو کر رہی تھی۔ ابھی میں نے واپسی کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس نے مسکرا کے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور بیٹھنے کو کہا۔ میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی اپنی چیئر پر بیٹھ کے ایک زنانہ رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ رسالے کا مواد کیسا بھی ہو' رسالہ قابلِ دید یقیناً تھا۔ ایسی تصاویر مردانہ رسالے میں شائع ہوں تو بے پردگی ہوتی ہے۔ خواتین کا آپس میں کیسا پردہ۔

رخشی نے فون رکھنے کے بعد کہا "فراغت مل گئی آپ کو اپنے پرستاروں سے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ سب عقل کے اندھے ہوتے ہیں جو سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور ان کے لیے نعرے لگاتے ہیں۔"

"اچھا؟ اور اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اب اندازہ ہوا کہ یہ آنکھوں کے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ مگر ایک انہی پر کیا منحصر۔ سارے وکیل صحافی اور عدالت میں موجود سب لوگوں کی عقل پر ہی نہیں' آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا تھا۔"

میں نے کہا "ممکن ہے صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ ساری دنیا کو بھلا کون غلط کہہ سکتا ہے۔ تمہارے نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کہہ رہی ہے کہ دن ہے تو پھر دن ہے۔"

"کیا میں تمہیں مبارک باد پیش کروں کہ تم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے۔"

"کیا مجھے تمہارے لیے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے کہ تم نے میرے جھوٹ کا بھرم رکھا" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ اس خوشی میں تمہاری بھوک بھی اڑ گئی ہے" وہ اپنے لہجے کی شوخی اور چہرے کی بشاشت سے ایک بالکل مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تھا' اُداس اور افسردہ' بیزار اور مایوس۔

آنسو بہاتے' کڑوی کسیلی باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔

عدالت میں رخشی کسی بیوی کی طرح نہیں' مسز شاہ عالم بن کے پوری تیاری کے ساتھ پیش ہوئی تھی۔ اس کے حسن کی آب و تاب میں آرائشِ حسن کی جلوہ گری کا انداز بڑا ہوشربا تھا۔ شاہ عالم نے رخشی کے عشق میں مبتلا ہو کے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ حسین چیزوں کا شیدائی اور خریدار تھا۔ رخشی اس کی خواہشات اور ضروریات کے معیار پر پوری اترنے والی شریکِ حیات تھی جو اس کی شخصیت اور سوشل اسٹیٹس دونوں سے میچ کرتی تھی۔

جتنی دیر میں لوگوں سے ملتا رہا اور پھر چندا سے باتیں کرتا رہا' رخشی نے اپنا لباس بھی بدل لیا تھا اور میک اپ بھی حالانکہ گھر کے اندر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ شاید وہ دن میں تین بار کپڑے بدلنے کی عادی تھی۔ اب وہ ایک بیوی بھی نہیں رہی تھی کہ اسے کسی کی انگشت نمائی کا ڈر ہوتا۔ وہ میرے ساتھ اس گھر میں میری شریکِ حیات تھی۔ حقیقت اس کے برعکس سہی مگر دنیا داری کے لیے یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ ہم وہی ہیں۔ ہمارا رشتہ اور ہمارے جذبات اور ہمارا رویہ سب پہلے جیسا ہی نظر آنا چاہیے۔

چنبیلی اور گلاب کھانے کے کمرے میں ہمارے منتظر تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھ کے خوش ہوں گے اور خوش آمدید کہیں گے یا مبارک باد دیں گے مگر وہ مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً چنبیلی اپنے شوہر کی اوٹ سے مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میں زندہ انسان نہیں' کوئی بھوت ہوں۔ ان کا خوف زدہ نظر آنا جائز بھی تھا کیونکہ انہوں نے شاہ عالم کی موت سے اس کی تدفین تک سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے میاں جی اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کے صدمے سے چل بسے تھے اور وہ ساں جی کے ساتھ ان کی لاش لے کر گاؤں تک گئے تھے۔ ان کے لیے یہ انتہائی الرناک' تلخ اور ناقابلِ یقین حقیقت تھی کہ شاہ عالم زندہ ہے۔

اس سے پہلے کہ میں گلاب یا چنبیلی سے کوئی بات کرتا' میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور نکال کے کان کیا اور کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے کسی نے کہا "میں ٹائیگر بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اچھا' کون سا ٹائیگر۔ رائل بنگال ٹائیگر یا چڑیا گھر کا مظلوم اور رفاقہ زدہ ٹائیگر؟"

وہ ہنسا "ٹائیگر اصلی یا نقلی نہیں ہوتے شاہ عالم کی طرح۔ ٹائیگر ایک ہی ہے شاہ جی!"

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق دنیا میں آج پانچ ہزار ٹائیگر ہیں؟"

میں نے فون بند کردیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ رانگ نمبر ہے مگر جب اس نے میرا نام لیا تو میں سمجھ گیا کہ کسی نے مجھے پریشان کرنے کے لیے مذاق فرمایا ہوگا۔ ایسے سیکڑوں ہوں گے جو ایسے ہی دل کی بھڑاس نکالیں گے۔ ان میں وہ بھی ہوں گے جو شاہ عالم کی موت پر مٹھائیاں تقسیم کر چکے ہوں گے اور اس کے زندہ سلامت پائے جانے کی اطلاع نے انہیں مایوسی سے زیادہ جھنجلاہٹ اور خفت کی برہمی میں مبتلا کردیا ہوگا۔ شاہ عالم کے دشمن بھی کم نہ تھے۔

گھنٹی پھر بجی۔ میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے لیے چین سے کھانا بھی مشکل کردیں گے لوگ۔"

رخشی ہنسی "آگے آگے دیکھیے' ہوتا ہے کیا۔"

"ہوگا کیا" میں نے کہا "میں گھنٹی ہی آف کردیتا ہوں۔ یہ موبائل فون بھی آسیب سے کم نہیں ہوتا۔"

ابھی میں کھانے کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے باہر سے گلاب کو پکارنا شروع کیا۔ گلاب گیا اور لوٹ آیا۔

"صاحب جی!" اس نے میرے قریب آ کے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ٹائیگر آ گیا ہے گھر میں؟ تمہاری صورت سے تو ایسی لگتا ہے؟"

"نہیں صاحب! پولیس۔۔۔ پولیس آئی ہے۔"

"پولیس؟ کوئی ضروری کام ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ صاحب جی! کہتے ہیں آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ آپ خود ہی بات کرلیں۔" گلاب نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں ڈرائنگ روم میں گیا تو ایک ڈی ایس پی کے ساتھ دو سب انسپکٹر میرے منتظر تھے "آئی ایم سوری سر۔ مگر میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟"

"کس جرم میں؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔

"آپ پر عمر دراز کے قتل کا الزام ہے" وہ بولا۔

"لیکن۔۔۔ میں نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلی تھی" میں نے کہا۔

"آپ کراچی کی بات کر رہے ہیں' یہ لاہور ہے" وہ بولا۔ "اور وہ ضمانت بھی عبوری تھی۔ صرف تین دن کے لیے۔ آج چوتھا دن ہے۔"

ڈی ایس پی مجھے اتنی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ میں ایک فون کرکے اشرف کو مطلع کرسکوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "ڈی ایس پی صاحب۔ کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب۔ ہمارا آپ کا ساتھ تو ساس بہو جیسا ہے۔ ایک مرے تو دوسرے کی جان چھوٹے۔"

میں نے کہا "لیکن مرتا کوئی نہیں۔"

"کہاں جی! حکومت کو اپوزیشن کے خلاف پولیس کا ہتھیار چاہیے۔ پھر وہی اپوزیشن آجاتی ہے حکومت میں تو ہم انہیں بھی سلام کرتے ہیں اور جو پہلے حکومت میں تھے' ان کے خلاف چارج بنانا شروع کردیتے ہیں۔ آج ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ کل آپ حکم کرو گے کہ چلو اب ان کی باری ہے۔"

میں نے کہا "تم آدمی سمجھ دار ہو۔ ترقی کرو گے لیکن ڈی ایس پی صاحب' شاید تمہیں معلوم ہوگا۔"

"بالکل معلوم ہے جی۔ آپ کے خلاف قتل کا کیس جھوٹا ہے مگر ہے تو سہی۔ جھوٹے ہی ہوتے ہیں ایسے کیس۔ یہ بھی پتا ہے مجھے کہ کل آپ ضمانت کرالو گے۔ کل تو خیر جمعہ ہے' میرا مطلب تھا دو چار دن میں۔۔۔ ہم تو آپ کو مہمان بنا کے لے جارہے ہیں۔"

"خدا محفوظ رکھے سب کو تمہاری مہمانی سے" میں نے کہا "کیا تم مجھے اتنی مہلت دو گے کہ میں کھانا کھالوں' میں نیبل پر تھا۔"

"اوجی' چلو کھانا ہم کھلائیں گے آپ کو" ڈی ایس پی ٹس سے مس نہیں ہوا۔

میں نے چند سیکنڈ تک سوچا "اچھا ڈی ایس پی صاحب' یہ تو ہوسکتا ہے نا کہ تم میری ایک بات سن لو۔ ذرا علیحدگی میں۔ خوب یاد آیا اس وقت' تم غلام محمد ہو۔ ویسے تو تمہارا نام بھی وردی پر ہونا چاہیے۔"

اس نے ساتھ آنے والے ماتحتوں کی طرف دیکھا جن کے سینوں پر ان کے نام لکھے ہوئے صاف پڑھے جاسکتے تھے "جی۔۔۔ وہ دراصل نام کی پٹی توڑ دی تھی بچے نے۔ مگر آپ نے ٹھیک پہچانا۔"

میں نے کہا "آپ غالباً شبنم کے رشتے دار ہیں۔ مس شبنم آغا' مشہور صحافی ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ رشتے داری ہے ذرا دور کی۔"

"اچھا۔ وہ تو بڑی بے تکلفی سے تم کو گلو چاچا کہتی ہے۔" میں نے کہا۔

ڈی ایس پی نے بُرا سا منہ بنایا "چاچا کدھر سے ہوگیا میں۔ میری کزن ہوتی ہے وہ۔ چاچے کی بیٹی۔ چاچا بھی سگا نہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہوسکتا ہے مجھے غلط یاد رہا ہو۔ تم بھی اسے شبّو کہتے ہو۔"

ڈی ایس پی غلام محمد اور شبنم کی گفتگو میں نے اس رات سنی تھی جب میں خود اپنے یعنی شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے مراسم خاصے کشیدہ ہیں۔

غلام محمد نے ناگواری سے کہا "میں اس وقت اپنے ذاتی رشتوں پر بات کرنے نہیں آیا تھا۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں' یہ بھی اپنے ہی بندے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں اپنے پرائے برابر ہوجاتے ہیں۔ رازداری زیادہ اہم ہوتی ہے۔"

اس نے کندھے ہلائے "اوکے جی۔ فرمائیں آپ۔"

میں اسے ساتھ والے کھانے کے کمرے میں لے آیا جہاں دروازے کے پردے سے لگی رخشی ہماری سب باتیں سن رہی تھی۔

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "کیا بات ہے جی! کھانا چھوڑ کے اٹھ گئے آپ؟"

میں نے کہا "بھئی' یہ آئے ہیں مجھے گرفتار کرنے۔"

"کس جرم میں؟" رخشی نے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ میں نے عمر دراز کو قتل کیا تھا۔"

رخشی نے برہمی سے کہا "آپ نے بتایا نہیں کہ ہائی کورٹ نے کیا فیصلہ دیا ہے؟ ڈی ایس پی صاحب! آپ کو سب معلوم تو ہے۔ شاہ عالم نہیں' کوئی اور تھا۔ ان کا ہم شکل۔"

"آپ نے ٹھیک فرمایا۔۔۔ لیکن یہ کیس دوسری عدالت کا ہے۔"

"کون سی دوسری عدالت؟ سیشن کورٹ کیا ہائی کورٹ سے اوپر ہے۔ جب ہائی کورٹ نے تسلیم کرلیا کہ قتل کرنے والا کوئی اور تھا اور جس دن قتل ہوا' اس دن یہ ہانگ کانگ میں تھے۔ پھر کیا سیشن جج اس فیصلے کو نہیں مانے گا؟"

"بالکل مانے گا بیگم صاحبہ!" ڈی ایس پی نے کہا "مگر ہائی کورٹ کا فیصلہ دیکھنے کے بعد۔"

"فیصلہ کیا تم نے نہیں دیکھا' ضمیمہ چھپ چکا ہے ہر اخبار کا۔"

"ضمیمہ چھاپنے والے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ قانونی اہمیت ہے عدالت عالیہ کے فیصلے کی اصل کاپی کی۔ یہ نقل

پہنچ جائے گی سیشن کورٹ میں تو شاہ جی کے خلاف مقدمہ خارج ہوجائے گا خود بخود۔"

رخشی نے تیز لہجے میں کہا "اور تم اس درمیانی وقت کو کیش کرانا چاہتے ہو۔ نقل پہنچے گی کل صبح' بیرسٹر محمود خود پہنچا دیں گے۔ تم آج رات انہیں ضرور تھانے میں رکھنا چاہتے ہو؟"

میں نے مظلوم بن کے کہا "یہ تو مصر ہیں کہ میں فوراً ان کے ساتھ چلوں' کھانے کی مہلت تک دینے کو تیار نہیں۔"

رخشی نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے میز کی طرف کھینچ لیا "آئیں جی' آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ ڈی ایس پی صاحب' آپ کو ڈر ہے کہ ملزم فرار ہوجائے گا تو ریوالور لے کر سر پر کھڑے ہوجائیں ورنہ آپ بھی تشریف رکھیں۔ کھانے کا وقت ہے۔"

ڈی ایس پی نے بے بسی سے کہا "کھانا تو کھالیا میں نے۔۔۔ لیکن میں بیٹھ جاتا ہوں چند منٹ کے لیے۔"

"اچھا آپ چائے پی لیں" رخشی نے کہا۔

"تھینک یو۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔" غلام محمد بولا۔

"ویری گڈ۔ کیا مستعدی' فرض شناسی اور ایمانداری کا نمونہ ہے یہ ڈی ایس پی۔" رخشی نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوکے کہا "عدالت سے سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگ گیا۔ اب یہ آپ کی گرفتاری ظاہر کرے گا۔ اس کا اندراج کرکے ثابت کرے گا کہ یہ کتنا مستعد اور فرض شناس ہے۔ صبح جج کے سامنے پیش کرے گا کہ سر ہم نے عمر دراز کے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے اور جب جج کہے گا کہ "نہیں' ہائی کورٹ کا فیصلہ آگیا ہے۔ یہ قاتل نہیں ہیں" تو بڑی معصومیت سے کہے گا کہ "اچھا جی! آپ کا حکم ہے تو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔"

ڈی ایس پی کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی "بیگم صاحبہ' آپ کو کیا معلوم۔۔۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ مگر یہ بات میں تمہارے ماتحتوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ بھی کم سمجھ دار نہیں۔ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ علیحدگی میں ہم کیا بات کریں گے۔ پھر بھی ظاہر کا پردہ رہے تو کیا حرج ہے۔"

"آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا "اپنی قیمت بتاؤ ڈی ایس پی' تم نے گرفتاری کے لیے چھاپا مارنے میں دیر نہیں کی۔ تمہاری کارکردگی ثابت ہوگئی۔ لیکن مبینہ قاتل یعنی کہ یہ خاکسار آپ کے ہاتھ نہیں آیا۔"

اس نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "ہاتھ کیسے نہیں آیا؟"

"یعنی' وہ یہاں نہیں تھا۔"

"مگر آپ عدالت سے جلوس کی صورت میں گھر آئے تھے۔"

میں نے کہا "فرض کرو آیا تھا لیکن تمہاری تشریف آوری سے پہلے فرار ہوگیا۔"

"آپ کیسے فرار ہوسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اگر تم مجھے موقع دو تو میں اس کا عملی مظاہرہ کروں؟ میں کئی بار ایسا کرچکا ہوں۔"

اس نے طنز سے کہا "جانتے بوجھتے موقع دوں؟"

"ہاں۔ اب کی نا تم نے کام کی بات۔ آج ایک موقع تمہیں ملا ہے۔ یہ موقع تم مجھے فراہم کرسکتے ہو اور اس کا معاوضہ سکہ رائج الوقت میں وصول کرسکتے ہو۔ تم ماشاءاللہ تجربہ کار اور سیانے بندے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ موقع بار بار نہیں آتا اور جو موقع سے فائدہ نہ اٹھائے' وہ ہوتا ہے بے وقوف۔" میں نے اطمینان سے کھانا جاری رکھا "مجھے ایک رات تھانے میں رکھنے سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ میرے پیچھے پیچھے پارٹی کے عہدے دار اور کارکن' اخبار والے اور وکیل سب آجائیں گے۔ تمہیں تفتیش کون کرنے دے گا؟ فائدہ تو ہوتا ہے تفتیش سے۔۔۔ کیا میں نے غلط کہا؟"

ڈی ایس پی غلام محمد نے محسوس کیا کہ اب فرض شناسی اور ایمان داری کی ایکٹنگ بالکل غیر ضروری ہے۔ "وہ جی۔۔۔ سر۔۔۔ میں اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا "آف کورس۔۔۔ میں نے بھی صرف تمہاری قیمت نہیں پوچھی تھی۔ ظاہر ہے اس میں حصے دار یہ بھی ہوں گے' تمہارے ماتحت۔"

"آپ بار بار میری قیمت کہہ کے مجھے ذلیل کررہے ہیں" ڈی ایس پی کھسیانا نظر آنے لگا۔

رخشی نے کہا "چور کی داڑھی میں تنکا۔"

میں نے اسے گھور کے کہا "خاتون۔ آپ ان مردانہ معاملات میں دخل اندازی نہ فرمائیں تو اچھا ہے۔ چائے نہیں آئی ابھی تک۔"

"یہ جب ڈیوٹی پر ہوں تو چائے وغیرہ پر نہیں ملتے' نقد کی بات کرتے ہیں" رخشی نے رکھائی سے کہا۔

"آخر یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

"ہمارے مہمان کچھ لے کر نہیں جاتے۔ کچھ لے کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں" رخشی نے جیسے تہیہ کرلیا تھا کہ اب وہ ڈی ایس پی
یک کپ چائے نہیں پیش کرے گی۔
میں نے کہا "یہ بھی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے
۔ خیر ڈی ایس پی صاحب' بات ختم کرو۔ میرے پاس بھی
کم ہے۔"
"میں کیا بات کروں' اتنی باتیں سننے کے بعد" وہ تلخی
ولا۔
میں نے گھڑی دیکھی "مجھے ایک پریس کانفرنس میں جانا
یہ نہیں بتاؤں گا کہ کہاں۔ تم مجھ کو کہ پریس کلب'
سے پہلے تمہاری بھتیجی۔ سوری' کزن شبنم آتا یہاں
والی ہے۔"
"شبنم۔۔۔ یہاں آنے والی ہے؟"
"اس میں حیرانی یا پریشانی کی کون سی بات ہے؟" میں
۔
"جہاں تک مجھے علم ہے۔ اس نے آپ کو شاہ عالم ہی
نہیں کیا تھا اور آپ کو ایک جعلساز ثابت کرنے کے
س نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔"
"ایڑی کا پتا نہیں" میں نے کہا۔ "چوٹی وہ باندھتی
۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ حسینہ بال کھلے رکھتی ہے۔"
"سر بھی کھلا رکھتی ہے۔ گریبان بھی کھلا رکھتی ہے۔ دل
لا رکھتی ہے۔ زبان بھی بڑی کھلی ہے اس کی" رخشی نے
حسد کے جذبات کی تلخی سے ہما۔
میں نے مسکرا کے کہا "سچ کہا تم نے۔ ابھی تک شتر بے
ی پھر رہی ہے۔ سارے سگنلوں ہزاروں پھر رہے ہیں
کے پیچھے مگر کسی کے قابو نہیں آئی ابھی تک۔ کسی کو
ں ہی نہیں دیتی۔"
"سوائے شاہ عالم کے۔ اس کے سامنے تو وہ خود گھاس
اس کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ شاہ
وڑا بن کے اسے چرلے۔" رخشی نے جلے کٹے لہجے میں

لاب ڈرتے ڈرتے اندر آیا "صاحب جی!"
میں نے کہا "کیا بات ہے' آخر تم زرد گلاب کیوں بنے
ہو۔ کیا ابھی تک تمہارا وہم دور نہیں ہوا کہ میں قبر
ھ کے نہیں آیا ہوں۔"
اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی "ایک خاتون
ں آپ سے ملنے۔ گیٹ پر کھڑی ہیں۔ اپنا نام شبنم بتاتی
ن صاحب' جھوٹ بولتی ہے وہ۔ ہم کیا پہچانتے نہیں
۔ اس کی ہر فلم دیکھی ہے ہم نے۔"

میں نے کہا "تم یوں کرو' اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے
اس سے یہ سوال پوچھو۔ وہ تمہیں صحیح جواب دے گی۔"
وہ سر کھجاتا ہوا غائب ہوگیا تو ڈی ایس پی نے کہا "وہاں
دو بے وقوف قسم کے انسپکٹر بھی بیٹھے ہیں اور وہ لڑکی ہے
آفت کی پرکالہ۔ پتا نہیں ان سے کیا اگلوالے یہ"
میں نے کہا "تمہاری بات سے بات نکلتی ہے۔ پہلی یہ
کہ وہ اتنے ہی بے وقوف ہیں جتنا تم انہیں سمجھتے ہو۔ تو پھر وہ
پولیس میں انسپکٹر کیسے بن گئے؟"
رخشی نے میری بات کاٹ دی "اپنے غلام محمد صاحب
ڈی ایس پی بن گئے۔ کسی دن ایس پی ہو جائیں گے۔ یہ محکمے
کی پالیسی ہوگی کہ صرف بے وقوف ہی افسر بنیں۔"
میں نے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ رخشی موقع محل دیکھے
بغیر سچ بول جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم بھی تو تفتیش
میں سچ اگلواتے ہو۔ یہ اجازت صحافیوں کو بھی حاصل ہے تو
پریشانی کیسی۔"
رخشی نے کہا "پریشانی یہ کہ وہ اپنا کھایا ہوا اگلیں گے
اور پبلک کو معلوم ہو جائے گا۔"
"آپ حد سے بڑھ رہی ہیں خاتون!" ڈی ایس پی غصے
میں کھڑا ہوگیا۔ "اب میں شاہ جی کو ساتھ ہی لے کر جاؤں
گا۔"
رخشی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
اس نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں سے چیک بک اور
قلم نکال کے ایک چیک پر کچھ لکھا اور دستخط کر کے چیک ڈی
ایس پی کو تھمادیا "یہ لو۔ اس پر کسی کا نام نہیں ہے۔ اب
خاموشی سے رخصت ہو جاؤ ڈی ایس پی صاحب۔ یہ عزت
تمہیں راس نہیں آئی جو آج تمہیں شاہ عالم نے دی کہ اپنے
ساتھ کھانے کی میز پر بٹھا کے اتنی دیر تک باتوں میں وقت
ضائع کیا۔"
ڈی ایس پی غلام محمد سیدھا کھڑا رہا۔ اس نے چیک کی
طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا "غلطی میں نے کی جو انہیں مہلت
دی۔"
رخشی کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا "چیک نہ لے کر تم دوسری
غلطی کر رہے ہو۔ شاہ عالم کو تم سے تمہاری اوقات کے
مطابق سلوک کرنا چاہیے تھا جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ عالی' ذرا
دینا مجھے موبائل۔ میں بات کرتی ہوں ڈی آئی جی سے۔"
میں نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھادیا۔ رخشی
کے رویے نے مجھے کچھ حیران کیا تھا مگر شاید میرا رویہ بھی اس
کے لیے حیران کن رہا تھا۔ شاہ عالم پولیس سے ایسے بات

نہیں کرتا تھا جیسے میں کر رہا تھا۔ رخشی نے دیکھا ہوگا کہ پولیس
کے اہلکار شاہ عالم جیسا مغرور' چالاک اور مکار سیاست داں
کے سامنے کیسے زر خرید غلاموں کی طرح دست بستہ کھڑے
رہتے تھے۔
رخشی نے فرض شناسی اور ایمانداری کی قوتِ خرید
رکھنے والے کاغذ کے اس پرزے کو میز پر ڈال دیا اور بڑی
رعونت آمیز تمکنت کے ساتھ کوئی نمبر ملانے لگی۔ اس کے
انداز کی بے رخی میں اعتبار تھا۔ ڈی ایس پی کی ساری اکڑفوں
غبارے کی ہوا کی طرح نکل گئی۔ اس نے مجھ سے نظر ملائے
بغیر چیک اٹھایا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ صرف اسے سنانے
کے لیے رخشی زور سے ہنسی اور فون بند کردیا۔
میں نے کہا "تم نے تو کمال کردیا۔ اچھا بلف کیا اسے۔"
"بلف کیسا۔ میں ڈی آئی جی کا نمبر ملا چکی تھی۔ کسی نے
ہیلو کہا بھی تھا۔ اگر وہ رکتا تو مشکل میں پڑ جاتا۔"
میں نے حیرانی سے کہا "کیا کہتیں تم ڈی آئی جی سے' اگر
وہ لائن پر آجاتا؟"
"وہی جو تم کو کہنا چاہیے تھا کہ ایک ڈی ایس پی آیا
ہے مجھے گرفتار کرنے۔ کیا دماغ خراب ہے اس کا۔ ہائی۔
کورٹ کا فیصلہ نہیں مانتا۔"
میں نے کہا "ڈی آئی جی کا نمبر تمہیں زبانی یاد تھا اور کیا
وہ تمہاری بات مانتا؟"
اس نے افسوس سے سر ہلایا "آخر تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔
میں شاہ عالم کی سیاست کا مہرہ نہیں تھی مگر اس کی بیوی
بہرحال تھی۔ جس حد تک بھی تھی' میری ایک آفیشل حیثیت
تھی۔ آج نواز شریف وزیرِ اعظم نہیں ہے تو کیا۔ کل پھر
ہو سکتا ہے۔ اس کی بیوی فون کردے کسی ڈی آئی جی کو تو اس
کی مجال ہے کہ انکار کرے۔ اور پھر ایسے معاملے میں جو
سو فیصد قانونی ہو۔"
میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔"
"اس ڈی ایس پی کی ہمت کیسے ہوئی تم سے اس لہجے
میں بات کرنے کی۔ صرف تمہارے شریفانہ رویے کی وجہ
سے۔ شاہ عالم اسے دو منٹ میں رخصت کردیتا۔ زیادہ بے
عزتی کے ساتھ۔ وہ کہتا تھا کہ کتے کو کیا چاہیے' ہڈی۔۔۔
غرانے لگے تو ہڈی ڈالو اور لات مار کے بھگادو۔"
میں نے کہا "غالباً مجھے ایک سیاسی لیڈر کے کردار پر
تربیت کی ضرورت ہے۔ نظریاتی یا عملی مسائل میں بڑا فرق
ہوتا ہے۔"
"کس سے لوگے ٹریننگ؟ سیاست سکھانے والا کوئی
ادارہ ہے تمہاری نظر میں جو کسی کو سند دے کے سیاست داں
بنادے؟"
میں نے کہا "تجربہ سب سے بڑی درس گاہ ہوتی ہے۔"
"تجربہ حاصل کرتے کرتے تم اپنی حماقتوں سے اس ساکھ
کا بیڑا غرق کرلوگے جو تمہیں ورثے میں ملی ہے' بنی بنائی۔ اس
دیہاتی کی طرح جو ٹرین کے بارے میں پوچھتا رہے کہ یہ کیا
ہوتی ہے' کیسے چلتی ہے' کہاں جاتی ہے۔ اس کا ٹائم کرایہ اور
ٹکٹ لینے کے طریقۂ کار کو سمجھتا رہے اور ٹرین نکل جائے۔
تم بھی شاہ عالم کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش میں صرف یہ
ثابت کرسکتے ہو کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"
"شاید تم نے ٹھیک کہا۔"
"شاید! اب بھی تم کہتے ہو شاید" رخشی کے لہجے میں طنز
سے زیادہ تمسخر کی کاٹ تھی "ایک درزی اگر موچی کے اوزار
لے کر بیٹھ جائے اور جوتا بنانے کی کوشش کرے تو کیا ثابت
ہوگا؟ کیا دیکھنے والے مان لیں گے کہ وہ موچی ہے۔ تم نے
کبھی سیاست نہیں کی۔ جو کچھ تم نے آج تک کیا اس کا نام
سیاست نہیں تھا۔"
میں نے تسلیم کیا "ہاں۔ وہ بقا کی جنگ تھی۔ اس میں
ایک کے لیے بقا تھی اور دوسرے کے لیے فنا۔"
"یہ قسمت کی بات ہے کہ شاہ عالم مارا گیا اور تم شاہ عالم
بن کے زندہ ہو مگر جو کچھ وہ کرتا تھا' تم کیسے کروگے؟ تمہیں کیا
معلوم کہ وہ کیا کرتا تھا اور کیا نہیں کرتا تھا۔ اس کی پبلک
لائف شاید صرف پچیس فیصد تھی یا پچاس فیصد۔ باقی پچاس
فیصد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ وہ پانچ فیصد بزنس مین
تھا۔ دس فیصد اسمگلر تھا۔ پانچ فیصد انڈر گراؤنڈ ورلڈ کے
لوگوں میں شامل تھا۔ وہ بیک وقت کئی کاروبار کرتا تھا۔ کچھ
جائز کچھ ناجائز۔ وہ بے شمار ایسے لوگوں سے ملتا تھا جن کے
بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ وہ شرابی تھا اور عیاش تھا۔
ہانگ کانگ اور سنگاپور سے لندن تک اس کی زندگی کے روز و
شب کہاں اور کس کے ساتھ بسر ہوتے تھے' یہ مجھے نہیں
معلوم جو اس کی شریکِ حیات کہلاتی تھی۔ نصف بہتر۔ مائی
فٹ' پھر بھی مجھے دوسروں سے زیادہ معلوم ہے۔ ایک بیوی
اپنے شاہ عالم جیسے شوہر کی پرائیویٹ اور کاروباری زندگی کے
بارے میں کچھ نہیں جان سکتی لیکن وہ جاننا چاہے' اس کے
لیے کوشش کرے' عقل اور وسائل رکھتی ہو تو جان سکتی
ہے۔"
"تم اس کی جاسوسی کراتی تھیں؟"
"ہاں۔ مجھے اس کے بارے میں پوری رپورٹ ملتی رہتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے فائدہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں شاہ عالم سے
ے سب معلوم ہے کیونکہ میں نے معلوم کرالیا
۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔
ل کرارتا تمہیں؟"
س کے لیے ضروری ہو جاتا۔ میں تمہیں بتا چکی
شریفانہ طریقے سے میری اس سے علیحدگی ناممکن
ے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا
امیاب اور نیک نام سیاست داں کی ازدواجی
امیاب ہی نظر آنی چاہیے۔ ناکامی کا مطلب ہوتا
اسکینڈل اور مستقبل کا رسک۔ کیا پتا کل کون
ے خلاف استعمال کرے۔ میں خود سیاست میں نہ
گھسیٹ لیا جائے جیسے راجیو گاندھی کی بیوہ سونیا کو
شش کی جا رہی ہے۔ میں اس کی ہر کمزوری سے
۔ وہ مجھے کیسے اجازت دے سکتا تھا کہ انہی
سے فائدہ اٹھا کے میں اس کے سیاسی مستقبل کے
ں جاؤں۔ چنانچہ اس نے مجھے واضح اور دو ٹوک
ا دیا تھا کہ میرے ساتھ حادثہ ہو سکتا ہے۔ میرا
و سکتا ہے مگر طلاق یا علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ میں
ے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ یہ ناممکن
میرا کوئی جاسوس پکڑا جاتا۔ کوئی مجھے دغا دیتا یا
اس کو پتا چل جاتا کہ میرے آدمی اس کا ہر جگہ
ہیں۔"
؟" میں بھونچکا رہ گیا۔
نے بڑے غور سے کہا "ہیں... ہر جگہ۔ مجھے اس
ے ایک ایک لمحے کی رپورٹ ملتی تھی۔ وہ کہاں
ے ساتھ ہے' کیا کر رہا ہے؟ میرے آدمی انتہائی
ہیں۔"
ے کتنے آدمی اس پر نظر رکھتے تھے؟"
ب تین... اور وہ تینوں ایک دوسرے کو نہیں

ت خطرناک عورت ہو۔ تمہارے بارے میں
ے اندازے بالکل غلط ہو گئے" میں نے کہا۔
ں ہوتا ہے شاہ جی دنیا میں۔ ہیں کواکب کچھ نظر
ہ۔ وقت آگیا ہے کہ یہ سب تمہیں بتا دیا جائے
غلط فہمی دور ہو جائے۔ تم یہ سمجھتے رہے کہ تم نے
ں کر لیا۔ مجھ پر قابو پا لیا۔ اپنی چالاکی اور ذہانت
ت استعمال کر کے مجھے بے بس کر دیا۔ نہیں'
ں تھی شاہ جی۔ میں جب چاہتی جہاں چاہتی

تمہیں پکڑوا سکتی تھی۔ تمہارا یہ مداری کا کھیل کسی بھی اسٹیج پر ختم ہو جاتا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟"

"اس لیے... کہ میں شاہ عالم سے نجات چاہتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اچانک تم سامنے آگئے اور میں نے بہت سوچا پھر یہ طے کیا کہ تمہیں موقع دوں۔ تم میری جان شاہ عالم سے چھڑا سکتے تھے۔ میں نے ظاہر بھی کیا کہ میں مجبور ہوں اس لیے تمہاری مدد کر رہی ہوں۔ یہ سب میں ایسے نہیں چاہتی تھی' جیسے ہوا؟"

"تم کیا کرتیں؟ کیا تھا تمہارا پلان؟"

"میں اسے قتل نہ ہونے دیتی۔"

"کیا تمہیں اس کے بارے میں علم تھا۔ جب وہ کراچی ایئرپورٹ پر اترا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اطلاع مل چکی تھی۔ میرے آدمی اس کے ساتھ تھے۔ اسی جہاز میں لیکن وہاں جو بازی میرے ہاتھ میں تھی' وہ تمہارے ہاتھ میں چلی گئی۔ تم نے سوچ اور کیا اور شاہ عالم بن کر نمودار ہو گئے۔ اسے تم نے ایئرپورٹ پر ہی غائب کر دیا اور یہ اطلاع مجھے نہیں ملی۔ میرا جو آدمی اسی فلائٹ سے آیا تھا' وہ مجھے ایئرپورٹ پر موجود پا کے رخصت ہو گیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ فی الحال اس کا کام ختم ہوا۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کو مارنے کا پروگرام میرا بھی نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ ایک حادثہ تھا۔"

میں نے کہا "تم اس کے ساتھ کیا کرتیں؟"

"میں اس سے اپنی آزادی کا سودا کرتی۔ اسے بتا دیتی کہ اس کا سیاسی مستقبل ہی نہیں' اس کی زندگی یا موت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جگہ لینے والا شاہ عالم موجود ہے جو میرا شوہر نہیں ہوگا۔ وہ مجھے اپنا زر خرید بھی نہیں سمجھے گا۔ میری عزت نفس کو پامال بھی نہیں کرے گا۔ اب یا تو اپنے آدمے اٹھائے مجھے منتقل کرو اور مجھے لیگل پیپر پر طلاق لکھ دو ورنہ تم جیسے آدمی کا حشر وہی ہونا چاہیے جو دوسرا شاہ عالم کرے۔ میں اس کو بتا سکتی تھی کہ میرا کچھ نہیں۔ میں آزاد ہو کے کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ تم مر گئے تو چار ماہ دس دن بعد دوسری شادی کر لوں گی۔ یہی ممکن ہے کہ دوسرا شاہ عالم مجھے اپنا پارٹنر بنا لے۔ بزنس یا لائف میں۔ اس وقت تک مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ کیا کرو گے۔ تاہم مجھے امید تھی کہ میرے تعاون کے بدلے میں تم میری کسی خواہش کو رد نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "میں تم کو لائف پارٹنر نہیں بنا سکتا تھا۔"

"مگر تم مجھے میری آزادی ضرور دے سکتے تھے۔ تم لالچی اور بے ضمیر بھی نہیں تھے کہ شاہ عالم کے اثاثوں پر قابض ہو کے مجھے خالی ہاتھ رخصت کر دیتے اور میرا یقین غلط نہیں تھا۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "ڈیئر رخشی۔ تم ہو اصل مداری۔ مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میں تو ابھی تک صرف بچہ جمورا تھا۔"

وہ مسکرائی "میں بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا سمجھوں۔ میں تمہارے کردار اور تمہاری صلاحیت کا اعتراف کرتی ہوں۔ کاش شاہ عالم ویسا ہی ہوتا جیسے تم ہو۔ پھر شاید میں آپ کے لیے جان بھی دے سکتی تھی۔ جان لینے کا کیا سوال۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تھینک یو فار دی کمپلی مینٹ۔ شاید تمہارے تعاون کی ضرورت ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

"میری مدد کے بغیر تم شاہ عالم بن کے ایک قدم نہیں چل سکو گے۔ کیونکہ تم صرف باہر کے شاہ عالم کو جانتے ہو' جو سب کے سامنے تھا۔ اس شاہ عالم کو میں جانتی ہوں جو بند دروازے کے پیچھے رہتا تھا۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی۔"

"کس حیثیت میں؟" وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

"ہر حیثیت میں۔ مشیر' دوست' رازداں' سوائے اس ازدواجی حیثیت کے جو شاہ عالم تک محدود تھی۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

"اعتماد اور بھروسا دو طرفہ ہوتا ہے' یہ یاد رکھنا۔"

میں نے کہا "ہم پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ ابھی تو مجھے جانا تھا پریس کانفرنس میں۔ چار بجے کا ٹائم تھا اور ساڑھے تین بج گئے ہیں۔"

اس نے پھر موبائل فون اٹھایا "کیا میں اطلاع دے دوں کہ تم اب کچھ دیر سے پریس کانفرنس سے خطاب فرماؤ گے۔"

میں نے کہا "پلیز۔ ان سے... میرا مطلب ہے اشرف سے کہہ دو کہ وقت آدھا گھنٹا بڑھا دے۔ میں نے شبنم کو بلایا تھا ایک ضروری بات کرنے کے لیے۔ وہ آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہی ہے۔"

رخشی نے بڑے اعتماد سے کہا "پھر میں پانچ بجے کا ٹائم دے دیتی ہوں۔"

صورت حال اچانک یوں بدل گئی تھی کہ خود میری قوت فیصلہ بے اثر ہو گئی تھی۔ رخشی جو دنیا کے سامنے میری بیوی تھی شرعی طور پر نہ سہی عملاً میری شریک حیات بنی بیٹھی تھی۔ یہ میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ میں اپنی زندگی کے فیصلے اس کی مشاورت سے کروں۔ میں اس کی مدد اور راہنمائی کا محتاج ہو گیا تھا۔ اس نے بروقت مجھے احساس دلا دیا تھا کہ شاہ عالم کی شخصیت اور کردار کو اپنانے کے لیے مجھے شاہ عالم کا رویہ بھی اپنانا ہوگا اور وہ سب کرنا ہوگا جو شاہ عالم کرتا تھا مگر جس کا علم صرف رخشی کو تھا۔ وہ تیمور سے زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ شاہ عالم کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو صرف وہ بے نقاب کر سکتی تھی۔ وہی مجھے بتا سکتی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے جس سے میرا شاہ عالم ہونا ثابت ہو اور کیا نہیں کرنا چاہیے جس سے میری شناخت مشتبہ ہو جائے۔

بے شک اب وہ آزاد تھی مگر اس کی مجبوریاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ مجبوریوں کا یہ سلسلہ میری مجبوری سے ایسے ملتا تھا جیسے دشمن ملکوں کی سرحدوں پر زمین ملتی ہے۔ جسے دیوار اٹھا کے یا خاردار برقی رو والے تاروں کی باڑھ لگا کے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ اصل محتاجی میری ہے۔ اس کا کیا ہے' اگر میں اس کے تعاون کا یہ صلہ دیتا ہوں کہ شاہ عالم کے سارے اثاثے اس کے نام کر دیتا ہوں اور پھر رسم دنیا نبھانے کے لیے اسے طلاق دے کر شاہ عالم ہاؤس سے باعزت طور پر رخصت کرتا ہوں۔ وہ چلی جائے گی اور آگے اس کی زندگی جیسی بھی گزرنی گزر جائے گی مگر وہ نہ ہوگی تو مجھے کون بتائے گا کہ شاہ عالم کیا تھا اور کیسا تھا؟ وہ میری بیوی نہیں تھی مگر میں ایک شوہر کی طرح اپنی زندگی کے سارے معاملات میں اس پر انحصار کیے بغیر گزارا نہیں کر سکتا تھا۔

جس عورت نے اپنے شوہر شاہ عالم سے ہار نہیں مانی تھی اور اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی منصوبہ بندی بڑی ذہانت' جرأت اور عیاری کے ساتھ کی تھی' وہ میرے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میرے اس کے درمیان نہ دشمنی کا رشتہ تھا اور نہ دوستی کا۔ میں نے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا اور اس نے مجھے۔ یہ ضرورت کا رشتہ ختم ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس کا تسلسل اتنا ہی لازمی اور ناگزیر تھا جیسے آئین کی عدم موجودگی میں مارشل لا کا یا مارشل لا نہ ہونے کی صورت میں آئین کا۔ کوئی حکومت آئینی خلا میں قائم نہیں رہ سکتی۔ جیسے ملک کی سب سے بڑی عدالت نے جنرل یحییٰ خان کے مارشل لا کی حکومت کو غاصبانہ قرار دیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی میرا شاہ عالم کی زندگی پر قبضہ غاصبانہ تھا جس کی تائید
ضرورت سے ہو سکتی تھی۔ قانون یا اخلاقی طور پر

جب میں شبنم کے سامنے پہنچا تو میرا اعتماد زلزلے کے
جھٹکے سے متاثر ہو چکا تھا۔ شاید زلزلے سے زیادہ یہ
ک شاک تھا جو دماغ درست کرنے کے لیے دیا جاتا
یہ شاک مجھے رخشی نے دیا تھا۔ یہ احساس دلا کر کہ
ے لیے شاہ عالم کے نام سے ایک نئی زندگی کا آغاز اتنا
ن اور خوش گوار بھی نہیں ہوگا جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔
ویسے دیکھا جائے تو یہ دوسرا جھٹکا تھا۔ پہلا جھٹکا مجھے
نے یہ بتا کے دیا تھا کہ اس نے میرا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ
ہے۔

شبنم کو آئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر
رہ نے اچانک ایک بات نہ چھیڑی ہوتی تو مجھے اتنی دیر نہ
بات اس نے خود نہیں چھیڑی تھی' اس نے ڈی ایس
ام محمد کے ساتھ میرے غیر ضروری حد تک شریفانہ
ے پر مداخلت کی تھی اور ایک کاغذ کے پرزے سے میری
آسان کر دی تھی۔ مسئلے کا یہ حل میرے ذہن میں
تھا مگر میرا انداز قطعی غیر "شاہ عالمانہ" تھا۔ جب رخشی
جھے اس کا احساس دلایا تو بات سے بات نکلتی گئی اور
ے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ میں اس کی بات سنجیدگی سے نہ
اور ادھوری چھوڑ کے اٹھ جاؤں۔

بہت سی باتیں پھر بھی رہ گئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ
میں پوچھا تھا کہ چیک پر لکھی جانے والی رقم کیا تھی۔
س ہزار روپیہ ہیں ہزار۔ مجھے فرق نہیں پڑتا تھا مگر رخشی
منٹ میں یہ جتا دیا تھا کہ شاہ عالم جیسے سیاست داں کو
ں کے ساتھ کیسے ڈیل کرنا چاہیے۔ اب مجھے یہ طے کرنا
آئندہ رخشی کا میری زندگی میں کیا کردار ہوگا۔ ممکن ہے
یٹری سے زیادہ تسلط حاصل کرنا چاہے۔ مجھے بہت سوچ
کے اس کی حدود کا تعین کرنا ہوگا اور اس بات کو یقینی بنانا
نہ وہ اس حد سے آگے جانے کا سوچے اور نہ یہ سمجھے
کبھی مجھے اس حد کو عبور کرنے کے لیے ترغیب کے جال
پھانس سکے گی۔ عام طور پر سیکریٹری لڑکی یا عورت ہو اور
باس مرد تو پھر ذمے داریوں کی سرحد کا سلسلہ دراز
جذبات کی فتنہ سامانی سے جا ملتا ہے۔ سرحدوں کی
ت جان جوکھوں کا کام ہے۔

مجھے رخشی کے معاملے میں اپنی پالیسی کی بنیاد دو اصولوں
ی ہوگی۔ ایک یہ کہ میں اسے عورت مرد کے تعلقات

کے معاملے میں اپنی اخلاقی قدروں کے ناقابل شکست ہونے کا یقین دلاؤں اور دوسرے اس پر آہستہ آہستہ اپنا انحصار کم کرنے کا خاموش عمل جاری رکھوں یہاں تک کہ ایک دن میں اسے کہہ سکوں کہ اب مجھے اس کے تعاون کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے تسلط سے آزاد ہیں اور اپنی اپنی زندگی جی سکتے ہیں۔

شبنم کا اتنی دیر تک صبر و سکون کے ساتھ بیٹھے رہنا بھی مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ نام اس کا شبنم ضرور تھا مگر فطرت اور مزاج میں وہ شعلہ تھی۔ وہ احتجاج کر سکتی تھی کہ اسے میں نے بلوایا تھا تو یہ میرا فرض تھا کہ اس کے وقت کا خیال رکھوں۔ اپنی مصروفیت کو عذر بنا کے اسے انتظار کرانا ایک توہین آمیز رویہ بھی سمجھا جا سکتا ہے شبنم کے دل میں میرے لیے پہلے ہی ایسے محاسبانہ جذبات تھے کہ مجھے اپنی دعوت پر اس کے آنے کی امید بھی کم تھی۔ تاہم وہ ایک مہم جو صحافی تھی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید اب بھی حقیقت کا سراغ لگانا ممکن ہو' اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور عدالت عالیہ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے ملنا قبول کر لیا تھا۔ عدالت نے شہادت کی بنا پر غلط فیصلہ اس لیے دیا تھا کہ شہادت ہی غلط تھی۔ خود اس کا دل مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کر چکا تھا۔ وہ دو ایک جیسے قائل کرنے والے مضبوط فیصلوں کی رسّا کشی میں رسّا بن گئی تھی۔ ایک قانونی فیصلہ تھا ایک جذباتی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اکیلے میں دل کی بھڑاس نکالے گی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے صبر و ضبط کا وہ آتش فشاں پھٹ جائے گا جس پر اس نے عدالت میں قابو پا لیا تھا۔ وہ کہے گی کہ یہاں میں اس لیے نہیں آئی ہوں کہ تم بڑے توپ سیاست داں ہو۔ تم سے بڑی توپ میں ہوں اور میں تمہارے جھوٹ کے اس قلعے کو مسمار کر کے چھوڑوں گی جس میں اب تم خود کو محفوظ سمجھ رہے ہو۔ میں تم کو شاہ عالم ماننے سے انکار کرتی ہوں اور انکار کرتی رہوں گی۔ اس وقت تک جب تک میں تمہاری شخصیت پر پڑا ہوا جھوٹ کا پردہ تار تار نہیں کر دیتی۔ یہ میرا چیلنج ہے۔

میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اس کا چیلنج قبول کروں گا مگر اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ ایک ناممکن مقصد کی خاطر خود کو تماشا نہ بنائے۔ اپنی توانائیاں ایک ایسے کام میں ضائع نہ کرے جس سے کچھ حاصل نہیں۔ میں اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اسے سمجھاؤں گا کہ شاہ عالم بننا میری مجبوری بن گیا تھا۔ ایک ایسی مجبوری جس نے مجھ سے انتخاب کا حق ہی چھین لیا تھا۔ اگر میں شاہ عالم کی جگہ نہ لیتا تو آج اس کی جگہ ایک گمنام اور بے نشاں مدفن میں پڑا ہوتا۔ اب یوم حشر سے پہلے اس کا سراغ ملنا اتنا ہی بعید از امکان ہے جتنا میرا اپنی اصل شخصیت کی جانب لوٹنا۔ اگر اس نے میری مجبوری کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی ذہنی مفاہمت کا اشارہ دیا تو میں اسے وہ سچ بھی بتا دوں گا جو جھوٹ بن گیا تھا لیکن یہی جھوٹ اب سچ تسلیم کر لیا گیا تھا تو اس کو تسلیم کر لینے کے سوا چارہ نہیں۔ میں اس کی صلاحیت کی قدر کرتا ہوں اور اس کے جذبات کی عزت۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ عالم کی موت کو حقیقت پسندانہ انداز میں تسلیم کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہوگا مگر میں اپنی صفائی اعتراف حقیقت کے ساتھ اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکوں۔ یہ سب خود شاہ عالم نے شروع کیا تھا' میں نے نہیں۔ اب میں نیک نیتی کے ساتھ اس کے سامنے یہ بھی قبول کروں گا کہ اپنے اپنے دفاع کی جنگ لڑتے ہوئے اگر میں بچ گیا اور شاہ عالم مارا گیا تو یہ ناگزیر تھا۔ اس کے باوجود میں معافی مانگ سکتا ہوں اور ذاتی طور پر مجھے اس سے پوری ہمدردی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اس وقت میرے ذہن میں تھا' اب میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا مگر مجھے کچھ افسوس ہوا جب میں نے اسے شکست خوردہ اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کئے دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں اور تصورات کی دنیا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت پر عداوت کے جذبات کی شعلہ سامانی نہیں تھی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ اس کا ہمیشہ شگفتہ اور شاداب' کشش حسن کی روشنی سے دمکتا ہوا اور پُرعزم چہرہ بجھا ہوا تھا۔ یہ میں نے عدالت میں بھی محسوس کیا تھا مگر اب اسے قریب سے دیکھا تو وہ مجھے بیمار نظر آئی۔ اس کے بال جو ریشم ..... کی طرح لہراتے' پھسلتے' بکھرتے اور سمٹتے تھے' کبھی اس کے چہرے پر سایہ فگن ہوتے تھے تو کبھی اس کے شانوں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا لباس بھی بے اعتنائی کا شکوہ کرتا محسوس ہوتا تھا۔ میلا اور بے ترتیب ہونے کے علاوہ اس میں سادگی کا وہ قاتل انداز نہیں تھا جو پُرکاری سے زیادہ تباہ کن سمجھا جاتا تھا۔

تشنج کی وارفتگی میں عقل سے محروم ہو کے سب کچھ کھو دینے والی لڑکی۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

قریب جا کے میں آہستہ سے کھنکھارا مگر شبنم کے ساکت جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔

میں نے کہا "ہیلو۔ مس شبنم' پلیز آنکھیں کھولیے۔"

شبنم کی آنکھیں بند رہیں۔ اس کا سر اسی طرح پشت سے ٹکا رہا۔

میں نے اسے ہلا جلا کے جگانے کا سوچا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ اس کا بُرا نہ مانے میں نے رخشی کو آواز دی۔ وہ شاید میری اور شبنم کی اس ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال "سننا" چاہتی تھی اور دروازے سے لگی کھڑی تھی کہ فوراً اندر آ گئی۔

میں نے کہا "ذرا اسے جگاؤ۔"

"بے چاری!" رخشی نے پھر ترحم سے زیادہ پُرتمسخر لہجے میں کہا "نہ جانے کتنی بے خواب راتوں کے عذاب سے گزری ہے۔ تم ہی جگاؤ نا ذرا پیار سے۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں اس کے خلاف کتنے حاسدانہ اور "سوکنانہ" جذبات ہیں۔ مگر یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

رخشی نے اسے شانے سے ہلایا "مس شبنم۔ اٹھئے' یہ آپ کے شاہ عالم کی خواب گاہ نہیں ہے۔"

میں نے پھر اسے ٹوکا "رخشی' تمہیں ہمدردی ہونی چاہیے اس کے ساتھ۔"

"تم کافی ہو ہمدردی کے لیے اور بھی بہت ہیں۔ مجھ سے ہمدردی رکھنے والا کون تھا؟" اس نے تلخی سے کہا۔

"اچھا پھر تم جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔

رخشی نے غور سے شبنم کو دیکھا "یہ نیند میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب!" میں نے تشویش سے کہا۔

"یہ بے ہوش ہے" رخشی نے اعلان کیا۔

"بے ہوش ہے؟ او مائی گاڈ! جاؤ تم پانی لے کر آؤ" میں نے اس کو صوفے پر سیدھا لٹا کے اس کی کلائی تھام لی "آخر کیوں بے ہوش ہے یہ؟"

رخشی مسکرائی "خطرے کی کوئی بات نہیں؟"

میں نے کہا "تم کیا ڈاکٹر ہو؟ جا کے فون کرو کسی ڈاکٹر کو۔ ویسے نبض تو ٹھیک چل رہی ہے۔ رفتار کچھ سست ہے۔ دیکھو رخشی! میں تمہارے جذبات کو بھی سمجھتا ہوں لیکن جیسے تم نے مجھے معاف کر دیا' ایسے ہی اسے بھی معاف کر دو یا تم اب انتقام لینے کا سوچ رہی ہو؟"

اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے "ایسی نہ جانے کتنی تھیں جو اس کے پیچھے دُم ہلاتی پھرتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...تی کی نوک پر نہیں رکھا۔"

...رقابت اور حسد کے جذبات میں ایک عورت کسی طرح ...دوسری سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ وہ تعلیم یافتہ ہو یا اَن ...گاؤں کی ہو یا شہر کی۔ ولایتی ہو یا دیسی۔ جب تک شاہ ...زندہ تھا رخشی بے بس تھی۔ شبنم اس کی بے شمار سوکنوں ...سب سے زیادہ مستقل مزاج' خطرناک اور قریبی سوکن ...خود شاہ عالم اپنی پبلک لائف کو زبانِ خلق کی ہرزہ سرائی ...محفوظ رکھنا چاہتا تھا مگر شبنم نے بدنامی کو سندِ عشق جانا ...س کا اعتراف بے خوف و خطر کیا۔ اگر اس کے بس میں ...تو شاید وہ شاہ عالم کی دوسری بیوی بن کے گھر میں بھی بیٹھ ...مگر خود شاہ عالم پاؤں کی ایک ہی زنجیر سے نالاں تھا۔ وہ ...ی کیسے قبول کرتا۔

رخشی بڑبڑاتی ہوئی گئی تھی اور بڑبڑاتی واپس آئی "اس ...ت کو بھی اس وقت یہاں نازل ہونا تھا۔"

میں نے کہا "مصیبت کے نازل ہونے کا کوئی وقت نہیں ...یہ بتاؤ ڈاکٹر کون ہے؟"

"وہ تو ہے نہیں جسے تم بلانا پسند کرتے۔ لیڈی ...نفیسہ ابراہیم۔ تمہاری دوست' رازداں اور مشکل ..."

میں نے کہا "اس نے کب میری مشکل آسان کی؟ ایک ...ڈاکٹر نے..."

وہ ہنسی "مشکل میں تم نہیں پڑتے تھے۔ تمہاری کوئی ...پڑتی تھی۔ کیا اب یہ بھی بتادوں کہ مشکل کیسی ہوتی ..."

"نہیں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ دوسروں ...شکل میں ڈالتا تھا' خود محفوظ رہتا تھا۔ میرا معاملہ الٹا ...خیر تم فکر مت کرو۔ میں بلاتا ہوں اپنے ایک جاننے ...کو۔" میں نے کہا اور موبائل فون پر ڈاکٹر کمال فاروقی ...ملایا۔

وہ دوبارہ کلینک جانے سے پہلے کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ ...نے کہا "سر۔ معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا قیلولہ خراب ..."

اس نے کہا "تو ہے کہاں سؤر کے بچے!"

میں نے کہا "مجبور ہوں کہ مناسب القاب و آداب ...ال نہیں کر سکتا آپ کے لیے۔ میں شاہ عالم بول رہا ...شاہ عالم ہاؤس سے۔"

وہ سمجھ گیا اور قہقہہ مار کے ہنسا "اب میں جتنی گالیاں ...دے سکتا ہوں۔ تو چوں بھی نہیں کر سکتا۔"

"چوں" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھا میں چوں کر سکتا ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ساڑھے گیارہ منٹ میں آپ ایک خاص مریض کی خاص بیماری کا خاص علاج' خاص رازداری کے ساتھ کرنے کے لیے پہنچ جائیں۔"

"اتنی خاص بات ہے تو میں آتا ہوں۔ کیا وہاں کوئی اور بھی ہے؟"

"ایک تو میری نصف بہتر ہے۔ حساب کی رو سے میں نصف بد تر ہوا۔ دوسری یہ خاص مریض ہے۔"

"دوسری۔! دیری گڈ بیٹے۔ اچھے جا رہے ہو۔ کیا چندا بھی ہے تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "اس کا یہاں کیا کام۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتا بھی نہیں۔ جیسے میں آپ کو نہیں جانتا۔"

کمال فاروقی نے دیر نہیں لگائی۔ وہ واقعی ساڑھے گیارہ منٹ میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا۔ گیٹ پر ہدایات پہلے ہی دی جا چکی تھیں۔ میں اسے سیدھا اندر لے آیا۔

"الو کے پٹھے! خبردار جو مجھے بلیک میل کیا۔ یہاں میں ناصر عظیم نہیں ہوں" میں نے آہستہ سے کہا "تو بھی کمال فاروقی نہیں ہے۔"

"پھر میں کیا ہوں؟"

"سوچ لے کوئی اچھا سا نام یا پھر مجھ پر چھوڑ دے" میں نے کہا۔

رخشی نے ڈاکٹر کمال فاروقی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا "یہ بھی آپ کے پرانے دوست معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے تیمور نے ملوایا تھا۔ یہ ڈاکٹر شمیم ہیں۔"

کمال نے سر ہلایا "ڈاکٹر شمیم' آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔"

رخشی ہنس پڑی "ڈاکٹر شمیم آپ ہیں۔ میں تو وہی ہوں جو انہوں نے فون پر کہا تھا۔"

میں نے دل ہی دل میں فاروقی کو گالیاں دیں۔ بے وقوف کا بچہ۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ میں اس کا تعارف اپنی بیوی سے کروا رہا ہوں۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر ہوتی یہاں تو میں اسے کیوں بلاتا۔ اس نے خفت اور شرمندگی کے ساتھ اپنی بتیسی دکھائی اور بولا "اوہ۔ میں سمجھا کوئی لیڈی ڈاکٹر مجھ سے پہلے پہنچ گئی۔ آپ لگتی ہی ہیں صورت سے ڈاکٹر۔ میرا نام تو ڈاکٹر رحمان شاہ ہے۔"

"چلیں جی' نام میں کیا رکھا ہے۔ مریض کو دیکھیں۔"

فاروقی نے پھر حماقت کی "مریض؟ مجھے تو بتایا گیا تھا کہ کوئی خاتون ہیں۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "مگر امر کی غلطی ہو گئی۔ رخشی کو سوئٹ کا سیفٹہ مریضہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔"

رخشی سمجھ گئی تھی کہ جانتے بوجھتے اسے ڈاکٹر کے اصلی نام سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب فاروقی صوفے پر لیٹی ہوئی شبنم کو معنی خیز اور خباثت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ رخشی نے دوسرے کمرے میں جا کے انٹر کام پر گیٹ کا نمبر ملایا اور سیکیورٹی گارڈ سے پوچھا کہ جو ڈاکٹر صاحب ابھی آئے ہیں ان کی گاڑی کا نمبر کیا ہے۔ اس کی آواز مجھ تک صاف پہنچ رہی تھی۔ "کیا۔ ایمبولینس ہے۔ اچھا' سوزوکی ہائی روف۔ سفید رنگ کی۔ اسپتال کا نام کیا ہے؟۔ اچھا ٹھیک ہے۔"

فاروقی نے بیگ کھول کے دل کی دھڑکن سننے اور بلڈ پریشر دیکھنے کے آلات برآمد کیے "تیری اس نام نہاد بیوی نے تیرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔"

میں نے اسے ایک گالی دی اور اس کے بارے میں ایک ناقابلِ اشاعت تبصرہ کیا "غلطی میری ہے کہ میں نے تجھے بلایا اور بلایا تھا تو ڈرنے کی کون سی بات تھی۔"

"شریف شوہر سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے جھنّا کے کہا "نہ میں شریف ہوں اور نہ شوہر۔ شبنم کو کیا ہوا ہے؟"

"شبنم! یہ نام سنا ہوا لگتا ہے" اس نے شبنم کی پلکیں اٹھا کے آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے کہا "یہ ایک مشہور صحافی ہے۔ آپ نے نام سنا ہو گا اس شبنم کا جو پچیس سال سے پاکستانی فلموں میں بیس سال کی لڑکی کا رول کر رہی ہے۔"

کمال نے بی پی دیکھنے کے لیے شبنم کے بازو پر پٹی لپیٹی اور نلکی سے سسلک ربر کے غبارے کو دبا کے ہوا بھرنے لگا۔ "یہ تشویش ناک بات ہے۔"

"کیا؟ شبنم کا صحافی ہونا یا...؟"

"اس نے خواب آور گولیاں کھائی ہیں" کمال نے اپنی نظر بی پی کے آلے میں اترتے چڑھتے پارے کی چمکیلی لائن پر رکھی۔

میری سٹی گم ہو گئی "کتنی؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ جب یہ ہوش میں آجائے تو پوچھ لینا۔ ویسے خاصی مقدار ہے" کمال نے کہا۔

"اس کے فوت ہونے کا فوری خطرہ تو نہیں؟"

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس کا معدہ واش کرنا پڑے گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اسے گولیاں کھاتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ورنہ۔۔۔ خیر۔"

میں نے کہا "یار' پون گھنٹے سے یہ یہاں بیٹھی تھی۔ گولیاں اس نے کب کھائی ہوں گی؟"

کمال نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اگر یہ پون گھنٹے سے یہاں موجود تھی تو پھر گولیاں بھی اس نے یہیں کھائی ہیں۔"

"یہاں آ کے؟" میرا دماغ گھومنے لگا "یہ خودکشی کرنے کے لیے یہاں آئی تھی۔"

"اگر یہ مرجاتی تو شاید خودکشی کا کیس نہ بنتا۔ یہ قتل سمجھا جاتا" ڈاکٹر فاروقی نے تمام آلات کو پھر اپنے بیگ میں ڈال کے بند کر دیا۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اور شک براہِ راست مجھ پر کیا جاتا۔ اس وقت میری سب سے خطرناک دشمن یہی عجمی جاتی ہے۔ اسی نے میری شناخت کو چیلنج کیا تھا اور مزید بدقسمتی یہ کہ خود میں نے اسے بلایا تھا۔ ایک پرائیویٹ بات کرنے کے لیے۔"

"ایمبولینس میں اسٹریچر ہے۔ کسی کو بلا کے اسے شفٹ کرا دیں تاکہ میں جاؤں۔ یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے" کمال نے کہا۔

رخشی خاموشی سے ساری گفتگو سنتی رہی تھی اور اب ایک زیرِ لب مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے دروازے سے لگی ساری کارروائی بڑی بے نیازانہ انداز تغافل کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ دو سیکیورٹی گارڈ شبنم کو اسٹریچر پر ڈال کے لے گئے۔

میں نے کمال سے کہا "یار' خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے نا۔ ہے تو مجھے صاف بتا دے۔"

"میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" اس نے مجھے تسلی دی "پولیس کیس ہے ویسے تو مگر کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ٹیک اٹ ایزی۔"

"تھینکس یار! بس اتنا خیال رکھنا کہ جب یہ ہوش میں آجائے تو کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرے" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"مثلاً؟ کیا کر سکتی ہے یہ؟"

"یہ ہنگامہ کر سکتی ہے۔ فرار ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ فون کر سکتی ہے کسی کو" میں نے کہا "اگر اسے لاک لگا کے یا زنجیر سے باندھ کے بھی رکھنا پڑے۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں کنٹرول کر لوں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں رات کو آؤں گا۔"

"میں آٹھ بجے کلینک بند کرتا ہوں" کمال دروازے کی طرف بڑھا۔

"مجھے دیر ہو جائے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔"

"سوری۔ میں اکیلا رہتا ہوں" فاروقی نے کہا "اور شریف سمجھا جاتا ہوں۔"

"یار' تیری شرافت کو بٹا نہیں لگے گا۔" میں نے باہر آ کے کہا "ضرورت پڑے تو کوئن سے کہنا' قمر کو بلا لینا۔ خان جی' چندا اتنے لوگ ہیں پھر مسئلہ کیا ہے۔ تم سب مل کے ایک لڑکی کو ہینڈل نہیں کر سکتے۔"

"یہ کوئی عام لڑکی ہے؟ بقول آپ کے ایک مشہور جرنلسٹ ہے۔ ہم سب مشکل میں نہ پڑ جائیں۔" وہ ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

"میں آٹھ بجے سے پہلے ہی کلینک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

ایمبولینس روانہ ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت دروازے پر نہ کوئی اخباری نمائندہ تھا' نہ فوٹو گرافر نہ پارٹی ورکر۔ وہ سب پارٹی آفس میں میرے منتظر تھے۔ شبنم نے مجھے نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا اور اب میں پچھتا رہا تھا کہ اسے آف دی ریکارڈ گفتگو کے لیے شاہ عالم ہاؤس کیوں بلایا تھا؟ میں اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا گواہ اشرف بھی تھا۔ اس نے شبنم کے لیے اس کے اخبار کے دفتر میں بھی پیغام چھوڑا تھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شبنم نے ایسا کیوں کیا؟ اگر اسے مرنا ہی ہوتا تو اس کے لیے جگہ اور مواقع کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایسے شدید ڈپریشن کا شکار تھی کہ اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اس نے شاہ عالم ہاؤس پہنچ کے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟ کیا یہ بھی میرے خلاف ایک انتقامی کارروائی تھی؟ مرتے مرتے مجھے سزا دینے کی خواہش کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر شبنم لیٹی ہوئی تھی اس کے سامنے والی سینٹر ٹیبل پر پانی کا آدھا بھرا ہوا گلاس موجود تھا۔ کیا پانی کے آدھے گلاس سے اس نے خواب آور گولیاں نگلی تھیں؟ میں نے سوچا اور اس کے صوفے پر ہی رہ جانے والا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔

"اس میں کچھ بھی نہیں ہے" رخشی نے کہا "میں دیکھ چکی ہوں۔"

میں چونک کے پلٹا "کیا دیکھ چکی ہو؟"

"جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ خواب آور گولیوں کی خالی شیشی یا اسٹرپ۔"

"تمہیں کیا ضرورت تھی تلاشی لینے کی؟" میں نے شبنم کا بیگ کھول کے دیکھا۔ اس کی ہر پاکٹ کی زپ الگ تھی مگر کسی پاکٹ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ مختصر سا سفری سامانِ آرائش۔ نہ نوٹ بک اور پنسل۔ نہ کوئی ٹیلی فون ڈائری نہ اپنی شناخت کی کوئی دستاویز۔ چھوٹا سا پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ تو سب ہی صحافی ساتھ رکھتے ہیں۔ شبنم کے بیگ سے اگر لائسنس والا ریوالور برآمد ہو جاتا تو مجھے حیرانی نہ ہوتی مگر اس کا بیگ بالکل خالی تھا۔ یہ میرے لئے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین بات تھی کہ وہ یہاں آئی تھی تو کندھے پر خالی بیگ لٹکا کے ساتھ لائی تھی۔

میں نے بیگ کو الٹا کر کے ہلایا "رخشندہ۔ کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟ یہ ممکن ہے۔؟"

"نہیں۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا ایسے مسکرانا شکوک کو جنم دیتا ہے۔"

"اوکے۔ میں نہیں مسکراؤں گی۔ مجھے اس کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ کیا ہوتا ہے لیڈیز کے بیگ میں۔ جو میرے پاس نہیں ہے۔"

"ایک جرنلسٹ کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ خیر' شبنم بتا ہی دے گی۔" میں نے کہا "ذرا گلاب چنبیلی کو بلاؤ۔"

رخشی نے انٹر کام پر بات کی "صاحب تم دونوں کو بلا رہے ہیں۔"

وہ کچھ پریشان سے حاضر ہوئے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔

میں نے کہا "ابھی یہاں ایک مہمان خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے لیے پانی کون لایا تھا؟"

"میں لائی تھی جناب!"

"تمہارے سامنے انہوں نے کوئی گولی یا دوا کھائی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں پانی کا گلاس رکھ کے چلی گئی تھی۔"

میں نے چائے کا کپ اٹھا کے دیکھا۔ اس کی تہ میں تھوڑی سی چائے بچی ہوئی تھی۔ میں نے اس چائے کو ایسے سونگھا جیسے شرلاک ہومز کی طرح میں ابھی دو بیچ دو سے چار ثابت کر دوں گا' یہ بتا دوں گا کہ پیالی میں زہر تھا تو کون سا۔ وہ

کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے اور کہاں استعمال ہوتا ہے۔ کون استعمال کر سکتا ہے اور کیوں؟ بس اس کے بعد معاملہ طشت از بام۔

ظاہر ہے چائے میں کوئی بُو نہیں تھی مگر اس سے پہلے کہ میں کپ نیچے رکھتا' میں نے چنبیلی زوجہ گلاب کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی مالکن کو کچھ اشارہ کرتے دیکھ لیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے رخشی کے کسی اشارے کا جواب دیا ہو مگر اس کی چوری پکڑی گئی تو چنبیلی کا رنگ بھی زرد گلاب جیسا ہو گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں سپاٹ چہرے کے ساتھ بیزار کھڑی ہوئی رخشی سے یا گلاب اور چنبیلی سے کوئی سوال کرتا' ٹیلی فون چلانے لگا۔

میں نے جیب سے موبائل نکال لیا "ہیلو!"

دوسری طرف سے اشرف نے کہا "سر۔ میں اشرف بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا "سوری اشرف۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

وہ بدحواس سا لگتا تھا "ٹائم پانچ بجے تک بڑھا دیا تھا مگر پانچ بھی بج گئے ہیں۔"

میں نے کہا "ابھی پانچ منٹ ہیں۔"

"بڑی مشکل ہو جائے گی سر۔ اخبار والوں نے تیور صاحب کو گھیرا تھا۔ پھر قریشی اور شمس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ انہیں آپ ہی مطمئن کر سکتے ہیں" اشرف نے کہا۔

"یار' تم کیسے جنرل سیکریٹری ہو۔ اخبار والوں سے کہو کہ شاہ عالم صاحب کی اسلام آباد سے بات ہو رہی ہے۔ وی آئی پی اور وی وی آئی پی کالز ہیں۔ ان کی خاطر تواضع کرو۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا کہ شمس صاحب یا قریشی صاحب صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھانے پائیں۔ انہیں سختی سے منع کر دو۔ تیور صاحب کو بھی۔ میرے سوا کوئی کسی قسم کا بیان نہیں دے گا۔ ہر سوال کا جواب میں دوں گا۔"

"بس آپ آ جائیں۔" اشرف نے بے بسی سے کہا "ان اخباری نمائندوں کو اپنے اپنے آفس جا کے رپورٹ فائل کرنی ہے۔"

"بھئی ان سے کہہ دو کہ جسے بہت جلدی ہے وہ جائے۔ ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ جس کا جو دل چاہے لکھے۔ پہلے کیا کم لکھا ہے انہوں نے۔ رائی کا پہاڑ اور پہاڑ کی رائی بنانے والوں کو ہم بھی جانتے ہیں اور لوگ بھی۔ انہیں بتا دو کہ میں ابھی معصوف ہوں۔ انتظار فرمائیں" میں نے خفگی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون واپس جیب میں رکھا ہی تھا کہ پھر اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بھی سمجھا کہ شاید اشرف کوئی بات بھول گیا تھا۔ میں نے چلا کے کہا "بات کیا ہے آخر؟"

دوسری طرف کوئی ہنسا "باس بھی یہی جاننا چاہتا ہے کہ آخر بات کیا ہے؟"

میں نے شنبھل کے کہا "باس؟ دیکھو نہ میں کلرک ہوں اور نہ سرکاری افسر۔ نہ میں کسی کا باس ہوں اور نہ میرا کوئی باس ہے۔ تم وہی ہو نا؟"

اس نے کہا "ہاں۔ ٹائیگر کے نام سے تم چڑتے ہو اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ پرنس ٹائم مانگتا ہے' میں اسے کیا جواب دوں؟"

"پرنس! کون پرنس۔ پرنس آف ویلز۔" میں نے دھاڑ کے کہا "اس سے کہو کہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ آئی بات سمجھ میں؟"

"نہیں۔ بات کو تم کیوں نہیں سمجھ رہے ہو آخر۔ بہت وقت ضائع ہو گیا ہے پہلے ہی۔"

اس کے لہجے نے مجھے چوکنا کر دیا۔ آخر وہ کون تھا جو شاہ عالم سے اس لہجے میں بات کر سکتا تھا۔ وہ مذاق ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ فون پر مذاق کرنے والے اتنے سیریس نہیں ہوتے اور انہیں یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ موبائل فون پر ان کا نمبر آ جائے گا۔ پہلی کال پر میں نے نمبر نوٹ نہیں کیا تھا مگر اب میں نے غور سے نمبر کو دیکھا۔

رخشی نے ہاتھ کے اشارے سے گلاب اور چنبیلی کو رخصت کر دیا تھا اور اب میرے قریب ہی ساکت و صامت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

○☆○

پریشانی بیگم صاحبہ کے چہرے سے عیاں تھی مگر مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ان سے پریشانی کا سبب پوچھ سکوں۔ یہ ایسا ہی ہوتا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا چور سوال کرے کہ آخر مجھے کیوں پکڑ رہے ہو۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتی آگے آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔

"کیا وہ سب ٹھیک ہے ناصر۔ جو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا؟"

میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور ایک گہری سانس لی۔ اب ڈر کے جھوٹ کی آڑ میں پناہ لینے کی نہ گنجائش تھی اور نہ ضرورت "اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔"

"یہاں کیا پریشانی تھی تمہیں ایسی۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہئے' یہاں مجھے گھر سے زیادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آرام تھا اور مجھے جتنی محبت اور عزت آپ سب نے دی' وہ شاید اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں دے سکتا۔"

"پھر کیا بات ہو گئی اچانک؟"

"اچانک کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا۔"

"کیوں جانا تھا؟ کیا تم اسے اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے؟" بیگم صاحبہ کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا نا' آپ کے اس احسان کا قرض۔"

"ایسی باتیں غیر ہی کر سکتے ہیں۔ گھر میں رہنے والوں اور گھر کو اپنا سمجھنے والوں کے لیے احسان اور قرض جیسے الفاظ ہی بے معنی ہوتے ہیں۔ کیا میرا بیٹا کل مجھ سے یا اپنے باپ سے کہہ سکتا ہے کہ بڑا احسان ہے آپ کا کہ آپ نے میری پرورش اچھی کی۔ مجھے اچھی تعلیم دلوائی تو یہ آپ کا قرض ہے۔" بیگم صاحبہ نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "حقائق کی بات کیجئے بیگم صاحبہ۔ مفروضات کی نہیں۔"

بیگم صاحبہ نے بحث سے گریز کیا "تم غلطی کر رہے ہو ناصر!"

"ابھی میں خود نہیں جانتا۔ یہ فیصلہ تو نتیجہ سامنے آنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے" میں نے کہا "اور پھر غلطی کے بغیر جینا آتا بھی نہیں۔ بچے اگر اپنے بڑوں کے نقشِ قدم پر چلتے رہتے تو دنیا میں ترقی کیسے ہوتی۔ سب ویسا ہی رہتا جیسا تھا۔ بڑے ہمیشہ یہی کہتے آئے ہیں کہ ہم نے ایک عمر گزاری ہے۔ ہمارا تجربہ ہے' مگر نئی نسل کے لیے وقت کا تجربہ الگ معنی رکھتا ہے اور پرانی نسل ہمیشہ انہیں غلط کہتی ہے۔ یہ بعد میں پتا چلتا ہے کہ جو غلط سمجھ رہے تھے وہی غلطی پر تھے۔ دیکھ لیں جس نے کہا تھا کہ دنیا گول ہے یا ثابت کیا تھا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا' کیا انہیں ساری دنیا نے غلط نہیں کہا تھا۔ پیغمبروں کو بھی غلط کہا گیا۔ آئی ایم سوری۔ میں کچھ زیادہ بول گیا۔"

بیگم صاحبہ کے چہرے کے تاثرات میں ایک خوش گوار تبدیلی آئی "خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ شاید ٹھیک ہی کر رہے ہو تم۔ کیونکہ تم میں حوصلہ ہے۔ تم تجربے کی غلطی یا غلطی کا تجربہ کر سکتے ہو۔"

"مجھے یہ حوصلہ دینے میں آپ کا بھی بہت ہاتھ ہے بیگم صاحبہ۔ آپ نے مجھے اپنے آپ پر اعتماد کرنا سکھا دیا۔ یہ بھی احسان ہے آپ کا۔"

"پھر وہی احسان کی بات۔"

"صبح ڈاکٹر صاحب نے مجھے غصّے میں احسان فراموش کہا تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے میں اپنی نیک نیتی ثابت کر سکتا۔ احسان ہمیشہ رہتا ہے۔ اسے کبھی اتارا نہیں جا سکتا کیونکہ اس کا معاوضہ کسی قاعدے فارمولے سے طے نہیں کیا جا سکتا۔"

"آدمی کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"نہیں بیگم صاحبہ۔ ایک آدمی کسی کو بس یا ٹرین کے نیچے آنے سے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا۔ بس اسے آواز دے کر ہوشیار کر دیتا ہے یا دھکا دے کر دور گرا دیتا ہے۔ بتایئے وہ آدمی جس کی زندگی بچ گئی' اس احسان کا کیا معاوضہ ادا کرے گا اور کیسے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی جان بچانے والے کے ساتھ ایسی ہی صورتِ حال ہو اور اس وقت دوسرا شخص موجود ہو جس پر احسان کیا گیا تھا' اور وہ بھی چلا کے یا دھکا دے کے اس کی زندگی بچا لے۔ پھر تو واقعی احسان برابر ہو گیا۔ ورنہ ایک گیا اپنے راستے' دوسرا گیا اپنے گھر۔ میں آپ کا احسان کیسے بھول سکتا ہوں۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے لیکن کبھی ایسا ہوا۔ پھر آپ کو اندازہ ہو گا کہ ناصر صرف باتیں نہیں کرتا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں اچانک آنسو اُتر آئے "جاؤ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے ناصر۔ لیکن مجھے تمہارا بہت سہارا تھا۔"

"خدا پر بھروسا ہو تو آپ کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ویسے بھی آپ کو خدا نے اس قابل بنایا ہے کہ آپ میرے جیسے کا سہارا بنیں۔ آپ کو کسی کے سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔ خدا نے بن مانگے آپ کو وہ سب دے دیا ہے جس کے لیے کچھ لوگ ساری عمر ناکام جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی ناکامیوں' مایوسیوں اور حسرتوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"تم واقعی وہیں جا رہے ہو؟"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں انہیں سچ بتا دوں پھر میں نے جھوٹ کو ترجیح دی۔ ایک دل آزار سچ سے ایک دلدار جھوٹ یقیناً بہتر تھا "جی ہاں۔ فی الحال وہیں جا رہا ہوں۔"

وہ مسکرانے لگیں "یعنی عزائم اس سے بھی آگے جانے کے ہیں؟"

میں نے کہا "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"محبت مجھے ان جوانوں سے ہے' ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند" وہ ہنس کر بولیں "مگر صرف چاہنے سے کچھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا۔"

"چاہنے سے سب کچھ ہو بھی سکتا ہے جیسے آدمی چاند پر اُتر گیا۔ پہلی شرط ارادے کی ہے۔ عمل کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔"

"اچھا چلو' اب میرے ساتھ ناشتا کرو۔ مجھے بھی بتاؤ کہ کیا چکر چلا رہے تھے تم۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ ڈاکٹر صاحب نے کیا ہوگا؟"

"ہاں۔ تمہاری باتوں کا جادو مجھ پر چل جاتا ہے۔ ان کے سامنے اتنا بولتے نا۔"

میں نے کہا "ان سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ بولتی بند ہو جاتی ہے میری۔"

"اور مجھ سے نہیں ڈرتے تم؟" انہوں نے چلتے چلتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک بات کہوں' بُرا تو نہیں مانیں گی آپ؟"

"تمہاری کوئی بات مجھے بُری نہیں لگتی۔"

"غلط۔ میرا اچانک غائب ہو جانا آپ کو بُرا لگا تھا اور میرا ایسے جانا کب اچھا لگ رہا ہے آپ کو" میں نے انہیں کھانے کی میز پر بٹھاتے "مگر یہ ٹھیک ہے کہ آپ سے مجھے ڈر نہیں لگتا اس لیے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

اس وقت اچانک میں نے اس خبیث نوکر کو اپنے سر پر سوار دیکھا جو ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتا تھا "ناشتا کرو گے؟" وہ بولا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "آدمی جس سے محبت کرتا ہے' اس سے خوف نہیں کھاتا۔ میری محبت ایسی ہی ہے جیسی ہر بچے کو ماں سے ہو سکتی ہے یا ماں کو اپنے سب بچوں سے۔"

بیگم صاحبہ نے نوکر کو ڈانٹا "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"جی جواب کا انتظار" اس نے ظاہری شائستگی سے کہا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" بیگم صاحبہ نے برہمی سے کہا "ناشتا لاؤ۔"

اس نے مزید اثبات میں سر ہلایا "سمجھ گیا جی۔ آپ کے لیے بھی ناشتا لانا ہے۔"

وہ نوکر کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں "کیا یہ اپنے اختیار کی بات ہوتی ہے ناصر۔ کسی سے محبت کرنا اور پھر اسے چھوڑ دینا۔ چھوڑ کے دور چلے جانا۔"

میں نے اس کا جواب سوچ کے احتیاط سے دیا "آدمی کہیں بھی رہے۔ محبت تو اس کے دل میں رہتی ہے۔"

"جھوٹ۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ تم ایک بار گئے تو پھر لوٹ کر آنا کیا۔ تمہیں کسی کی یاد بھی نہیں آئے گی۔"

"کسی کی بات میں نہیں کرتا۔ آپ کی یاد ضرور آئے گی اور یہ میرا وعدہ ہے۔ میں خود بھی آؤں گا۔ رشتہ' ضرورت یا مصلحت کے تقاضوں کا ہو تو ٹوٹ سکتا ہے' جذبات کا نہیں۔"

"یقین نہ ہونے کے باوجود تمہاری بات پر یقین کر سکتی ہوں" وہ اداسی سے مسکرائیں "کب جاؤ گے تم؟"

"ڈاکٹر صاحب کا رویہ تو ایسا تھا کہ مجھے ایک منٹ بھی یہاں رکنا نہیں چاہیے مگر میں جانتا ہوں کہ ان کی خفگی میں بھی نیک نیتی شامل ہے۔ میں ان کی بات کا کیا بُرا مانوں۔ انہوں نے ہمیشہ میری بہتری کے لیے سوچا مگر میں نے ان کو مایوس کیا۔ ماں باپ کے ساتھ بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ وہ بچوں کا مستقبل خود پلان کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ سب اُن پر چھوڑ دینا چاہیے جن کا مستقبل ہے۔ ان کا نہیں جو ماضی میں رہتے ہیں۔"

ناشتے کے دوران میں' میں نے انہیں وہی زیادہ تفصیل سے بتایا جو میں صبح صبح ڈاکٹر صاحب کو بتا چکا تھا۔

"یہ تو ہے کہ تم اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی باتیں کرتے ہو مگر کیا واقعی تمہاری عمر زیادہ تھی یا تم صرف شناختی کارڈ بنوا کے بالغ ہونا چاہتے ہو؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"آدمی یا عقل سے بالغ ہوتا ہے یا جسمانی طور پر۔ شناختی کارڈ نہیں تھا میرے پاس تو کیا میں آپ کا بچہ لگتا تھا؟" میں نے کہا۔

ان کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے سرخ ہوا پھر وہ ہنس پڑیں "وہ نرس تم پر بلاوجہ تو فریفتہ نہیں ہو گئی تھی' مگر تم بھاگ لیے۔"

جو بات ان کی زبان کہہ نہیں سکتی تھی' یہ تھی کہ میں نے بلاوجہ تو تمہارے انتظار میں دروازہ کھلا نہیں رکھا تھا۔ اس رات ڈاکٹر صاحب بھی گھر پر نہیں تھے مگر تم خود بھاگ گئے۔

پھر وہ مجھ سے پوچھتی رہیں کہ مجھے اپنے ساتھ دبئی لے جانے والے کون لوگ ہیں۔ کیا میں ان کی فیملی سے واقف ہوں۔ ان کی کوئی لڑکی ہے؟ ہے تو کیا خوب صورت بھی ہے۔ دبئی جا کے میں کیا کروں گا؟ اس لڑکی سے عشق کرنے کے علاوہ۔

میں بڑی خوب صورتی سے ٹالتا رہا۔ مجھ پر اپنی پریشانیاں سوار تھیں۔ ابھی تک شادو نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ شاہ جی نے اس پر کڑی پابندیاں عائد

کر رکھی ہیں۔ پابندیوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ شادو وہیں ہے یا اسے میری نظروں اور خیالوں کی دسترس سے دور کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے کہاں تلاش کروں گا؟ یہ شہری بہت بڑا ہے اور شاہ جی چاہے تو اسے شہر بدر بھی کر سکتا ہے۔ امید کا آخری تنکا جو مجھے مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبنے سے بچا سکتا تھا' رئیس تھا۔ شاہ جی کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ میں نے بہت جلد یہ اعتماد حاصل کر کے گنوا دیا تھا۔ اب پھر رئیس ہی میرے اور شادو کے درمیان حائل ہو جانے والی خلیج پر پل بن سکتا تھا۔

شاہ جی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ رئیس میرا واحد دوست ہے۔ اگر یہ دوستی بھی جرم بن گئی تو وہ شاہ جی کے اعتماد سے محروم ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے شاہ جی اسے چالاکی سے میرا سراغ لگانے کے لیے استعمال کریں۔ ابھی اسے کچھ نہ کہے۔ اپنے کسی آدمی کو رئیس کے پیچھے لگا دے کہ اس پر نظر رکھو۔ یہ ضرور ناصر سے ملنے جائے گا ورنہ ناصر خود اس سے ملے گا۔

رئیس نے ہی مجھے شناختی کارڈ بنوا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کام میں خود بھی کرا سکتا تھا مگر فوری طور پر میرے لیے ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔ میں رئیس کو تلاش کرنے نکلتا تو شاہ جی کے چیلوں کے ہاتھ پڑ سکتا تھا۔ میں میٹرک کا امتحان دینے کی کوشش کرتا تو شاہ جی کے کارندے مجھے امتحانی مرکز سے اٹھا کے لے جا سکتے تھے۔

اس کے باوجود میرے لیے گھر میں چھپ کے بیٹھ جانا بعید از قیاس تھا۔ میں نے بہت سوچا اور بالآخر ایک لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس میں خطرے کے تناسب اور امکانات کو کم کیا جا سکتا تھا۔ میں دوپہر کے بعد گھر سے نکلا تو اس شان سے کہ بیگم صاحبہ نے مذاق میں دل کی بات کہہ دی کہ بس اب جلدی سے چلے جاؤ ورنہ میری نظر لگ جائے گی تمہیں۔ اس بات کا صاف مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو میں جذبات کی رو میں بہک جاؤں۔ ان کی نظریں تو پہلے ہی بہکی ہوئی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھی بہکا دیں۔

مجھ میں اور شاہ جی کے ڈیرے پر فقیروں کے درمیان پڑے رہنے والے ناصر عظیم کے حلیے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جوگرز اور جینز کے ساتھ میں نے بلیک ٹی شرٹ پہنی تھی اور سرخی کیپ پہنی تھی۔ اس طرح کہ آنکھوں کو دھوپ سے بچانے والا حصہ میری گدی پر آ گیا تھا۔ یہ ٹین ایجرز کے فیشن کا نیا کریز تھا۔ باہر آ کے میں نے دھوپ کا زیبائشی چشمہ بھی لگا لیا جو غیر ضروری ہونے کے باوجود میری شخصیت کے ساتھ اور بھی "رے بین" لگتا تھا۔

اب میں خاصا مطمئن تھا۔ اس حلیے میں فقیر مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ شاہ جی کے جاسوس گلی کوچوں' سڑکوں' بازاروں اور تانگوں' بسوں میں ایک ایک چہرے کو گھور گھور کے دیکھتے پھریں کہ کہیں ناصر کے چہرے کی مشابہت نظر آ جائے۔

احتیاطاً میں نے شادو کو ایک پبلک ٹیلی فون سے کال کی۔ شاہ جی سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس نے اپنا فون آبزرویشن پر لگوا دیا ہو۔

گھنٹی تین بار بجی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا مگر بولا نہیں۔ میں نے ہمت کر کے خود ہی "ہیلو۔!"

دوسری طرف سے شاہ جی نے کہا "کون۔۔۔ناصر۔؟"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور باہر آ گیا۔ جواب میں شادو کی آواز سنائی دینے کی بہت کم امید تھی۔ نہ ہونے کے برابر۔ لیکن شاہ جی کے لہجے نے میرے قدم روک دیے۔ اس نے مجھ سے پھاڑ کھانے والے لہجے میں غرا کے بات نہیں کی تھی۔ اس کی آواز میں دشمنی کی آگ اور نفرت کا زہر نہیں تھا۔ اس نے خاصے شریفانہ بلکہ دوستانہ انداز میں میرا نام لیا تھا۔ یوں جیسے وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے بات کروں۔

میں لوٹ کے گیا اور پھر کارڈ ڈال کے وہی نمبر ڈائل کیا۔ اس بار شاہ جی نے کہا "ہیلو!" تو مجھے اپنا پہلا تاثر ٹھیک لگا۔

میں نے کہا "ہیلو۔"

شاہ جی نے کہا "ناصر۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

میں نے پھر فون بند کر دیا۔ میں آنکھ بند کر کے شاہ جی کی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی بات کرنے سے پہلے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس چالاک اور سفاک شخص کا یہ دوستانہ رویہ ایک دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا ہوگا کہ شادو کے لیے اب میرے جذبات کی شدت اور نوعیت کیا ہے۔ کیا شادو کے نام پر میں کچے دھاگے سے بندھا چلا آؤں گا؟ کیا میں شادو کے لیے بے خطر کسی آتش نمرود میں کودنے کا ارادہ اور حوصلہ رکھتا ہوں۔ کیا وہ مجھے باتوں کا فریب دے کر مجھ سے میرا پتا ٹھکانا معلوم کر سکتا ہے۔

دل تو کچھ اور ہی اسباب جنوں مانگتا تھا مگر میں نے اس وقت عقل کے فیصلے کو قبول کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بچھو پر اعتبار کرنے کے مترادف ہوگا کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ شاہ جی اگر قرآن پر ہاتھ رکھ کے بھی کہے کہ مجھے نہ تم سے شکایت ہے نہ عداوت تو اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ وہ میرے لیے جھوٹے حلفیہ وعدے کا جال بھی پھیلا سکتا ہے کہ تم آجاؤ۔ اگر تم اتنا ہی چاہتے ہو ایک دوسرے کو تو میں تمہاری شادی منظور کرتا ہوں۔ ایک بار میں اس کے جال میں پھنس گیا تو اگلی صبح میری لاش بھی دریائے راوی کے کسی ویران کنارے پر جھاڑیوں میں رکھی نظر آئے گی۔

شام تک میں نقیبوں کے مختلف ٹھکانوں پر رئیس کو تلاش کرتا رہا کہ شاید وہ کہیں مجھے چیکنگ کرتا ہوا نظر آجائے۔ اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے شناختی کارڈ بنوانے کے لیے چار پولرائڈ فوٹو بھی بنوائے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں گھومتا پھرتا شناختی کارڈ کے ایک آفس کے پاس سے گزرا جہاں ایجنٹ خود آگے بڑھ بڑھ کے راہ چلتے لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا انہیں شناختی کارڈ بنوانا ہے یا اس دفتر میں کوئی کام کرانا ہے۔ جو شخص ایک شناختی کارڈ بنوانے کے لیے دفتر سے چھٹی لے کر یا کاروبار چھوڑ کر اس دفتر کے چکر لگاتے لگاتے اور کلرک بادشاہ کے فضول اعتراضات کے جواب دیتے دیتے زندگی سے عاجز آگیا ہو' وہ بالآخر کسی ایجنٹ کو وسیلہ بنا کے گلوخلاصی کراتا ہے۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں' ہوں گے۔ اس جہنم سے بچ کر کوئی بندہ عاجز و گنہگار جائے تو کہاں جائے؟

میں نے ایک ایجنٹ سے خود بات کی تو اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھا "پتر۔ لگدا ایں اٹھارہ دا۔"

میں نے کہا "اگر لگتا ہوں تو کیا یہ کافی نہیں ہے اور جب تم مطمئن ہو تو پھر کسی اور سے مجھے کیا لینا دینا۔"

اس نے کہا "کل ایسہ وی بچ اے سولہ آنے۔"

میں نے کہا "پھر یہ لو تصویریں... اور بھاؤ بتاؤ۔"

"بھاؤ؟" اس نے تصویریں لے کر کہا۔

"ہاں۔ رشوت کا کیا بھاؤ ہے آج" میں نے کہا "بھاؤ تو بدلتا رہتا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "ٹکاں بڑی تیکھی کردے او میری سرکار۔ دوسروں سے سو روپے کم دے دینا۔"

میں نے کہا "اگر پہلے سے ہی سودا ہو جائے تو دوسرے تیسرے سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ اسی لیے میں نے بازار کے بھاؤ کی بات کی تھی۔"

وہ سر کھجانے لگا "چل یار ڈال دے پھر اک ڈگی" اس نے دو انگلیاں ہلا کے کہا۔

میں نے کہا "ساری قیمت ہے وقت کی۔ وقت کم پیسہ زیادہ۔ آج کام ہوگا تو دو کی' کل کا ریٹ تین چوتھائی بارہ بجے تک۔ شام تک آدھا۔"

"جے ایسہ گل اے تے میاں جی سودا پکا۔ ایڈوانس ففٹی پرسنٹ نکال۔ ایک نوٹ سب سے بڑا۔"

میں نے اسے ایک ہزار دیے "کس وقت آجاؤں میں؟"

اس نے لپکائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کی گڈی کو دیکھا "شام چھ بجے۔ وہ سامنے لسی والی دکان ہے' اپنا بندہ ہے پہلوان۔ اس کے پاس ہوگا کارڈ۔ نوٹ اصلی دے کے لے جانا۔"

"کارڈ بھی اصلی ہونا چاہیے" میں نے کہا "دو نمبر نہیں چلے گا۔"

"واہ بھئی واہ۔" اس نے کچھ حیرانی سے کہا "یار تُو آجا میرے نال۔ سو روزے کھرے۔"

میں نے کہا "کبھی بُرا وقت آیا مجھ پر تو سوچوں گا۔"

شام تک رئیس کی جستجو لاحاصل رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے اندیشے درست تھے۔ رئیس بھی شاہ جی کے عتاب کا شکار ہوچکا تھا یا اس ڈر سے روپوش ہوگیا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنے عرصے میں ایک بار بھی میں نے رئیس کی شب بسری کا ٹھکانا نہیں دیکھا اور اس پر اتنا اعتبار نہیں کیا کہ اپنا فون نمبر بھی اسے بتا دیتا۔ آج ضرورت بڑی تو احساس ہوا کہ اسی شہر میں ایک آدمی کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ بھوسے کے پہاڑ میں سوئی تلاش کرنا شاید اتنا مشکل نہیں۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے اس سے ملوا سکتا تھا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ اچانک میں نے اس لڑکے کو دیکھا جس نے ایک بدکردار فقیر کے ہونٹ ناک تعلق کا خاتمہ اس کی شہ رگ کاٹ کے کیا تھا۔ شاہ جی کے حکم پر میں خود اسے تھانہ اکبری منڈی کی حوالات میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہاں وہ حفاظتی تحویل میں رہا تھا۔ وہ اس چوک کے مجمع میں شامل عمران خان اور کو اسکر کی لڑائی دیکھ رہا تھا جہاں میں نے ایک بار رئیس کو شرط ہار کے مار کھانے سے بچایا تھا۔

میں نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑا مگر وہ مرغوں کی معرکہ آرائی میں اتنا محو تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کے چھڑا لیا۔ میں نے اس کی گردن دبوچی تو وہ گھبرا کے پلٹا۔ مجھے دیکھتے

اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔

"آپ جی۔ آپ وہی ہو نا؟"

میں نے سہلا کے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ مجھے کام ہے تم سے۔"

میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے مجھے یاد دلایا "آپ کی آپا جی کے ساتھ غٹرغوں چل رہی تھی نا؟"

میں نے کہا "غٹرغوں کے بچے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ شرط لگائی ہے؟"

"نہیں جی۔ مگر آپ کیا فلموں میں کام کرنے لگے ہو۔ ہیرو بن گئے ہو پورے۔"

میں نے کہا "یہ بتاؤ' تم کو پولیس نے کب چھوڑا؟"

"بس جی۔ چھوڑ دیا ہفتے بعد۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟" میں نے کہا۔

"چھوڑیں جی۔ دنیا ساری ایسی ہے۔ آپ بتاؤ کام کیا ہے؟ آپ نے اس دن بڑی مہربانی کی میرے ساتھ۔ آپا جی کیسی ہیں؟"

میں نے کہا "تم لوٹ کر نہیں گئے وہاں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہاں پھر وہی ہوتا جی جو حوالات تھانے میں بھی ہوتا رہا۔ میں سب کی گردن نہیں کاٹ سکتا" وہ بہت دکھی نظر آنے لگا۔

میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام...! ویسے تو پٹاخہ کہتے تھے وہ..." اس نے ایک گالی دی جو کسی بچے کے منہ سے مجھے اچھی نہیں لگی حالانکہ جن کو گالی دی گئی تھی' وہ یقیناً اس کے مستحق تھے۔ "مگر میں بم ہوں بم!"

میں نے کہا "پھر گالی دی تم نے تو میں تھپڑ ماروں گا۔ دوسروں کو بُرا کہتے ہو پھر خود برائی کیوں کرتے ہو؟"

اس نے سر جھکا کے کہا "عامر ہے جی میرا نام۔"

"آج کل کہاں رہتے ہو؟ گزارا کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"گزارا ہو جاتا ہے جی۔" اس نے آہ بھری "داتا صاحب کی مہربانی میں کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ سونے کے لیے آسمان کی چھت ہے۔"

میں نے کہا "ڈائیلاگ مت مارو۔ صاف کہو کہ کھانا داتا صاحب کے مزار پر جا کے کھاتے ہو اور جہاں جگہ ملے سو جاتے ہو۔ ایسے کب تک چلے گا۔ کسی دن پھر پولیس والے اٹھا کر لے جائیں گے یا شاہ جی کے بندے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا جی۔ سوچتا ہوں اس شہر سے بھاگ جاؤں۔ لیکن آپ بتائیں نا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "آؤ یہاں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔"

وہ ایک ریسٹورنٹ میں میرے سامنے بیٹھ کے مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کے لیے میرا یہ روپ یقیناً انتہائی کشش بھی رکھتا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو عامر۔ میں نے بھی شاہ جی کا ڈیرا چھوڑ دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں وہاں گیا ہی شادو کی خاطر تھا۔ ورنہ میں رہتا ہوں ایک بنگلے میں۔ بہت بڑی کوٹھی ہے۔"

"کار بھی ہوگی ضرور!" وہ منہ کھولے یہ الف لیلہ کی کہانی سنتا رہا۔

"ہاں۔ سب ہے میرے پاس۔ مگر وہ خبیث شاہ جی کہتا ہے کہ تم یہاں رہو فقیر بن کے۔ پھر شادو نے بھی مجھے مجبور کیا۔ مگر ایک دن اس نے ہمیں پکڑ لیا۔"

"غٹرغوں کرتے ہوئے؟"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔ شاہ جی مجھے پکڑ لیتا تو قتل کر دیتا مگر میں بھاگ گیا۔ یہ برسوں کی بات ہے۔ اس کے بعد سے اب تک مجھے شادو کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس کا باپ بڑا جلاد ہے۔ اس نے بہت مارا ہوگا شادو کو۔ قتل شاید نہ کیا ہو۔"

وہ سیریس ہوگیا "اب آپ چاہتے ہو کہ میں شادو آپا جی کی خیر خیریت معلوم کروں؟"

میں نے مسکرا کے کہا "بہت سیانے ہو تم۔ لیکن پہلے میری پوری بات سن لو۔ میں تمہاری شادو آپا جی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم غٹرغوں کرتے ہوئے پکڑے نہ جاتے تو کچھ دن بعد وہ بھی میرے ساتھ ہی نکل آتی۔"

"پھر آپ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے اپنی کوٹھی لے جاتے؟"

"ظاہر ہے۔ مگر پکڑے جانے سے سارا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ خیر' شادی تو ہم کریں گے۔ یہ بتاؤ' تم ہمارے ساتھ رہو گے؟"

وہ اس غیر متوقع سوال پر اُچھل پڑا "میں۔ آپ کے ساتھ۔؟"

"اس کوٹھی میں نہیں۔ کسی چھوٹے سے گھر میں۔ دراصل مجھے بھی اپنا گھر۔ میرا مطلب ہے اپنی کوٹھی' چھوڑنی پڑے گی۔"

اس نے بڑی متانت سے سہلایا "میں سمجھ گیا۔ آپ کے گھر والے بھی اس شادی کے خلاف ہوں گے۔ کہتے ہو،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے کہ ایک فقیرنی ہے وہ۔"

"بالکل یہی بات ہے" میں نے کہا "تو ہم سب سے الگ رہیں گے' کسی کرائے کے مکان میں اور میں کوئی کام کروں گا۔ بہت سے کام آتے ہیں مجھے۔ میں باہر جاؤں گا تو تمہاری شادو آپا جی اکیلی ہوں گی۔"

"میں رہوں گا جی ان کے ساتھ" وہ بڑے جوش سے بولا۔

"دیری گڈ۔ یہی اُمید تھی مجھے تم سے۔ وہ تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح رکھے گی۔ تم جانتے ہو وہ کتنی پڑھی لکھی ہے' وہ تمہیں پڑھا سکتی ہے۔"

عامر کی آنکھوں میں خواب جھلملانے لگے۔ "میں آپ دونوں کو لڑنے نہیں دوں گا جی۔ ماں باپ لڑیں نا۔۔۔ تو بچوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔۔۔ جو میرے ساتھ ہوا۔"

میں نے کہا "تمہارے ماں باپ۔۔۔ لڑتے تھے؟"

اسے احساس ہوا کہ جذبات کی رو میں اس نے اپنا راز فاش کردیا ہے "چھوڑیں جی' مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"دکھ سنانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟"

وہ خلا میں دیکھنے لگا "اپنی اپنی قبر میں۔ جہاں ہونا چاہیے انہیں۔ جہنم میں جائیں گے دونوں تو وہاں بھی لڑیں گے۔ پھر قتل کردیں گے ایک دوسرے کو۔"

میں نے کہا "ایک دوسرے کو؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "ہاں جی۔ جیسے یہاں کیا تھا' پہلے میرے باپ نے میری ماں کو۔ وہ نشے کا عادی ہوگیا تھا۔ ماں سے پیسے مانگتا تھا۔ جب ماں مار کھا کے پیسے دیتی تھی تو اسے اور مارتا تھا کہ یہ پیسے کہاں سے لائی تو؟ وہ کب تک مار کھاتی۔ ایک دن اس نے سوتے میں چھری پھیر دی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے پھیری تھی۔ نئی چمکتی ہوئی چھری لائی تھی وہ بھی۔ اسے پولیس نے پکڑ لیا۔ وہ تھانے میں ہی مر گئی۔ تھانے میں کیسے مرجاتے ہیں جی لوگ؟"

میں بارہ سال کے اس چھوٹے سے لڑکے سے نظر نہ ملا سکا۔ اس کے سامنے لاجواب ہوگیا "میں۔۔۔ مجھے پتا نہیں۔ خیر تم اب یہ آنسو پونچھ لو۔ رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے آستین سے آنسو پونچھ لیے "کیا میں جاؤں جی؟"

میں نے کہا "جانے سے پہلے یہ بتاؤ' تم رئیس کو جانتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ شاہ جی کا بچہ ہے۔"

"تم کو معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی' لیکن کسی نہ کسی کو معلوم ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا۔ تم پوچھ سکتے ہو؟ میں نہیں جاسکتا کسی کے سامنے۔"

اس نے سوچ کے کہا "پھر آپ ادھر آجائیں ایک گھنٹے میں۔"

میں نے کہا "ہم چلتے ہیں ٹیکسی میں۔ پیدل تم کہاں پھرو گے۔ وقت بھی کم ہے۔"

ٹیکسی میں وہ میرے ساتھ چھ سات مختلف ٹھکانوں پر گیا جہاں میں نے اسے کچھ دور اُتار دیا۔ وہ کسی فقیر سے ملا اور مایوس لوٹ آیا۔ چھٹی یا ساتویں جگہ اسے کامیابی ہوئی۔ وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر دو موریہ پل کے اندر کا ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ پتا بظاہر اوٹ پٹانگ اور نامکمل تھا "جوبلی پنکچر شاپ سے آگے الٹے ہاتھ گلی میں ٹیلر ماسٹر بشیر کی دکان کے سامنے شربت فروش رانجھا۔"

"یہ رانجھا صاحب کون ہیں؟"

"یہ رئیس کا مالک مکان ہے۔۔۔ یا تھا" عامر نے بتایا "وہی بتا سکتا ہے۔"

"کیا بتا سکتا ہے؟"

"رئیس کا پتا اور کیا؟" عامر نے کہا۔

آخری کوشش کے کامیاب یا ناکام ہونے کا انحصار ہمارے صحیح پتے پر پہنچ جانے کے بعد ہی بہت سے عوامل پر تھا۔ تاہم آدھی کامیابی کا یہ آسرا بھی بہت تھا۔ میں نے دو موریہ پل کے رانجھا کے پاس جانے سے پہلے شناختی کارڈ لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔

لسی فروش پہلوان بڑے زور شور سے مدانی چلاتے ہوئے اپنے معزز سامعین کو جو اس کے مستقل گاہک بھی تھے' قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ گوجرانوالہ کا ڈنپ پہلوان بڑی بلا ہے۔

"جی میرے مہمان۔ او بندا دے کسے ماں نے جیا ای نئیں جیہڑا او دے اگے اک منٹ لئی کھلو جائے۔" یعنی کرۂ ارض پر وہ شخص ابھی پیدا ہی نہیں ہوا جو اس کے مقابلے پر ایک منٹ بھی ٹھہر سکے۔

میں نے دوبارہ کہا "او جی پہلوان صاحب!"

اس نے پھر مجھے جھڑک دیا "او ٹھیر کاکا بلی۔ اتھے وادی چلن دئی اے" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ باری چلتی ہے تو ضرور چلے مگر مجھے لسی نہیں اپنا شناختی کارڈ چاہیے۔ اس وقت تک وہ فری اسٹائل ریسلنگ اور جارحانہ

فورمین جیسے باکسر تک سب کو ڈنپ پہلوان کے مقابلے میں بکری قرار دینے میں مصروف رہا۔ لسی کی دوسری کھیپ کے لیے دہی دودھ اور چینی ڈالنے کا وقفہ آیا تو میں نے ایک ہزار کا نوٹ لہرا کے اسے متوجہ کیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور اس نے میری بات سنے بغیر نوٹ اُچک لیا۔ پھر میں نے وقت کی کمی کا عذر پیش کیا۔ یہ بتایا کہ میں نے ابھی چائے پی ہے۔ یہ کہا کہ لسی پینے سے میرے گردے فیل ہوجاتے ہیں اور بس ڈوبنے لگتی ہے کیونکہ یہ ایک خاندانی مرض ہے مگر اس کا اصول تھا کہ پہلوان حاجی مولا بخش کی دکان پر آنے والا لسی پیے بغیر واپس نہیں جاتا۔ دنیا سے جاتا ہے تو اس کی مرضی۔

میں اور عامر لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ گئے۔ باری آنے پر ہمیں جو لسی ملی' وہ بھی نمکین تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا یہاں میٹھی لسی نہیں ملتی۔ پہلوان نے جواب میں بتایا کہ کسی نمکین نہ ہو تو لسی نہیں اور نامراد سفید چینی تو زہر آب ہے۔ بعد میں فالتو چینی کیسے خارج ہوتی ہے' اس پر پہلوان کی طبّی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

میں نے زبردستی گلاس خالی کیا۔ عامر کا حوصلہ آدھے میں جواب دے گیا تو پہلوان نے سخت برا مانا۔ "بڑی بے برکتی ہے باؤ" اور ایک تقریر کی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ایک وقت میں رزق کو ٹھکرانے والے پر ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب رزق اسے ٹھکرا دے۔ بقیہ آدھا گلاس اپنے پیٹ کے مٹکے میں انڈیل کر اس نے شناختی کارڈ میرے حوالے کیا مگر لسی کی قیمت لینے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ آج تم مہمان تھے۔ پھر آؤ گے تو گاہک کہلاؤ گے۔

تیسری بار ہم رکشے میں سوار ہوئے۔ رکشا ریلوے اسٹیشن سے گھوم کے دو موریہ پل کے نیچے سے گزرا اور آدھے گھنٹے بعد ہم نے جوبلی پنکچر شاپ تلاش کرلی تو باقی دو حضرات یعنی ٹیلر ماسٹر بشیر اور شربت فروش رانجھا آسانی سے مل گئے۔ مسٹر رانجھا کی شخصیت خاصی غیر روحانی تھی اور میرے سوال پر اس نے مجھے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا "رئیس۔۔۔ وہ نواب دا پتر۔ اس کا کیا ہے۔ کبھی دو دن نہیں آتا کبھی دو ہفتے۔ کرایہ البتہ وقت پر اور پورا دیتا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں رہتا ہے؟"

"اوپر ایک شیڈ بنالیا ہے میں نے اپنے گھر میں۔ صرف سو روپیہ لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

اب جو پتا اس نے مجھے سمجھایا' وہ مجھے آدھا بھی یاد نہ رہا۔ اس کی مدد کے بغیر میرا وہاں پہنچنا ایسی ہی خوش قسمتی کے ساتھ ممکن تھا جیسی مسٹر کولمبس کے ساتھ تھی کہ وہ ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے نکلے اور امریکا دریافت کرلیا۔ میں نے رانجھا سے کہا کہ جانا ہوگا تو میں انہی کے ساتھ چلوں گا۔ فی الحال وہ ایک فون نمبر لکھ لے اور آج یا کل جیسے ہی رئیس آئے اس سے کہے کہ وہ فوراً مجھ سے اس نمبر پر بات کرلے۔

رانجھا نے کہا "میں جاتا ہوں رات بارہ بجے۔"

میں نے کہا "رئیس بھی دیر سے ہی آتا ہوگا۔ میں بارہ بجے آجاؤں گا جب بھی ساتھ جانے کا ارادہ ہوا۔"

اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے عامر سے کہا "چلو اب میں تمہیں شاہ جی کے پاس چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس کی صورت پر مردنی چھا گئی۔ "میں جی۔۔۔ اُدھر نہیں رہوں گا۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ اب شاہ جی کو سب معلوم ہوگیا ہے۔ کوئی تمہیں پریشان کرے تو اسے قتل مت کرنا۔ شاہ جی کو بتادینا۔ وہاں جائے بغیر تم میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ صرف دو چار دن کی بات ہے۔ کوئی تم پر شک نہیں کرسکتا۔ تم شادو آپا جی سے بھی مل سکتے ہو۔ جیسے ہی موقع ملے اسے بتادینا کہ میں اس کے فون کا انتظار کررہا ہوں اور وہ فون نہیں کرسکتی تو حوصلے کے ساتھ میرا انتظار کرے۔ میں جس دن بھی آؤں گا اسے نکال کرلے جاؤں گا۔ وہ تیار رہے۔"

"جوتے کپڑے پہن کے" عامر بولا۔

میں نے ہنس کے کہا "میرا مطلب ہے ذہنی طور پر۔ کوئی بے وقوفی کی حرکت نہ کرے۔ اسے بتادینا کہ شاہ جی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کروں یا نہ کروں۔ اور اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکے کے جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں اس پر آسانی سے اعتبار کرنے والا نہیں ہوں۔"

"اور اگر وہ نہ ملی جناب!"

میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "پھر تم مجھے بتادینا اور وہیں رہ کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا کہ شاہ جی نے اسے کہاں رکھا ہے۔ تم کو اندازہ ہوجائے گا' شاہ جی کے موڈ سے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس نے بندے میرے پیچھے لگا رکھے ہیں یا نہیں۔ مگر دیکھو' ایسے براہِ راست سوال مت شروع کردینا ورنہ اسے شک ہوجائے گا۔ پھر تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے اسے مزید بریف کیا اور شاہ کے ڈیرے سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا۔ "کل صبح میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا" میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا "دس بجے!"

اس نے کہا "آپ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں ابھی ایک گھنٹے میں آ کے بتا دوں گا جی۔"

"کیا بتا دو گے۔ شاہ جی کے سامنے کوئی بات مت کرنا شادو سے۔"

"مگر شادو آپا جی ہیں یا نہیں ہیں' یہ تو پتا چل جائے گا۔"

میں ایک گھنٹے تک سڑک پر ایک محدود فاصلے میں ٹہلتا رہا۔ ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی کہ کوئی مجھ پر شک کرتا۔ اندیشہ صرف یہ تھا کہ کوئی شاہ جی کا چیلا ادھر سے گزرتے ہوئے عادتاً میرے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور مجھے پہچان نہ لے۔ اس کا امکان بہت کم تھا اور میں اتنا خطرہ مول لے سکتا تھا۔

عامر ایک گھنٹے بعد نہیں آیا۔ میں نے انتظار کا وقت پندرہ منٹ بڑھا دیا۔ پھر پندرہ منٹ۔ ڈیڑھ گھنٹا پورا ہوا تو میں نے طے کیا کہ آدھے گھنٹے بعد بھی وہ نہ آیا تو میں چلا جاؤں گا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ میں مایوس لوٹا اور مین روڈ تک پیدل چلتا گیا۔ میں موڑ پر تھا جب شاہ جی کی گاڑی میرے قریب سے گزری۔ جہاں اندھیرا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی مجھ پر نہیں پڑی تھی مگر اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے کی روشنی میں مجھے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی نیم دراز نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ شادو تھی۔

میں پلٹ کے گاڑی کی ٹیل لائٹ کو دیکھتا رہا۔ گاڑی شاہ جی کے ڈیرے میں داخل ہو کے غائب ہو گئی۔ میں اس تذبذب میں مبتلا وہیں کھڑا رہا کہ اب مجھے عامر کا انتظار کرنا چاہیے یا نہیں۔ اگر کوئی بھی گھر میں نہیں تھا تو وہ لوٹ کے آتا اور مجھے یہ بات پتا سکتا تھا۔ دو گھنٹے سے وہ اکیلا بیٹھا کیا ان کی واپسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ خیر' ایک بچے سے بہت زیادہ توقعات بھی وابستہ کرنا غلط تھا۔ جتنا وہ میرے لیے کر رہا تھا' وہی کافی ہمت کی بات تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ایک گھنٹا یہاں رکوں گا۔ دو گھنٹے بعد وہ کیوں آنے لگا۔

میں پھر چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شادو ہی کو دیکھا تھا۔ وہ عام لباس میں تھی اور گاڑی کو خود شاہ جی چلا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی شادو کو کہیں لے گیا تھا۔ شادو جب بھیس بدل کے خصوصی مشن پر جاتی تھی تو اسی وقت لوٹتی تھی مگر گاڑی ایک منحوس صورت والا ڈرائیور چلاتا تھا۔

ایک جھلک میں شادو کے چہرے سے کچھ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کیا ہے۔ کیا وہ بیمار تھی یا زخمی تھی۔ کیا تشدد کے بعد شاہ جی اسے علاج کے لیے کہیں لے گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا یا نہیں؟ میں بائیں طرف تھا۔ وہ بھی گاڑی میں پیچھے بائیں کھڑکی کے قریب تھی لیکن میں اندھیرے میں تھا اور اس کی نگاہیں مجھے تلاش نہیں کر رہی تھیں۔

خوشی اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ شادو لاپتا نہیں ہوئی تھی۔ وہ وہیں میرا انتظار کر رہی تھی۔ بیک وقت جدائی کا صدمہ افشائے راز کی شرمندگی اور باپ کا غیظ و غضب برداشت کر رہی تھی۔ شادو نے فرار میں میری پوری مدد کی تھی لیکن ایسا کرنے سے اس کے جرم کی سنگینی بڑھ گئی تھی۔ خیر' وہ جانتی ہے کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ اس وقت جان بچا کے نکل جانا ہی عقلمندی تھا۔ خالی ہاتھ میں شاہ جی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور میں مارا جاتا تو شادو جی کے کیا کرتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرنا کوئی نہیں کسی کے لیے مگر جینے کے لیے امید کا سہارا تو چاہیے۔

میں پیدل چلتے چلتے بہت دور نکل آیا تھا۔ ایک جگہ فون باکس نصب دیکھ کے میرے قدم خود رک گئے۔ پی سی او سے میں نے شادو کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار پہلی گھنٹی پر ہی کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ جیسے کوئی فون سے لگا بیٹھا تھا اور کال کا بے چینی سے منتظر تھا۔

شادو نے آہستہ سے کہا "ہیلو۔"

میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا "شادو۔ تم کیسی ہو۔ دیکھو میں نے عامر کو بھیجا ہے۔ میں خود بھی آؤں گا۔"

اس نے سرگوشی میں کہا "ناصر۔ ادھر مت آنا۔"

پھر فون بند ہو گیا۔ میں نے کہا "ہیلو۔ ہیلو شادو۔"

مگر ایک بے جان آلہ نہ مجھے کوئی جواب دے سکتا تھا اور نہ تسلی۔ نہ وجہ بتا سکتا تھا کہ شادو نے میرے نام کے ساتھ صرف تین الفاظ بول کے لائن کیوں کاٹ دی تھی۔ ریسیور ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ شادو کے ریسیور رکھ دینے سے لائن نہیں کٹی تھی۔ نمبر میں نے ملایا تھا' میرے ریسیور رکھنے سے پہلے لائن نہیں کٹ سکتی تھی۔ وہ پھر ریسیور اٹھا کے مجھ سے کچھ کہہ سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اچانک شاہ جی کے آ جانے سے وہ بات نہیں کر سکی تھی۔

پھر میرے کانوں میں شاہ جی کی آواز آئی "ہیلو!" اور میں نے ریسیور کو ہک میں لٹکا دیا۔ بے جان آلے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دوسری طرف کیا ہوا تھا۔ گھنٹی بجی تو شادو کو ریسیور اٹھانے کا موقع مل گیا تھا۔ شاہ جی کے آتے ہی ریسیور چھیننے سے پہلے وہ اتنا ہی کہہ سکتی تھی۔ ممکن ہے اس نے شاہ جی سے کہا ہو کہ رانگ نمبر کی کال تھی۔

چند سیکنڈ کی اس گفتگو کے بعد میں زیادہ پر امید ہو گیا۔ میں نے بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا اور جو بات سب سے اہم تھی' وہ کہہ دی تھی کہ عامر میرا نامہ بر ہے۔ اس نے بھی سب سے ضروری بات کہنا کافی سمجھا تھا۔ گلے شکوے' روتے دھوتے ایک دوسرے کا حرفِ تسلی سے مداوائے غم کرنے اور آنے والے وقت کے لیے بزبانِ فیض۔ یہ کہنے کے لیے وقت ہی نہ تھا کہ۔

جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے
یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں
مگر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

آج کا دن میرے لیے اچھا تھا۔ شناختی کارڈ حاصل کر کے میں بے نام و نشاں نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے باپ کا نام محمد عظیم لکھا تھا اور پتا ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا۔ صرف اس خیال سے کہ خدانخواستہ کوئی تصدیق کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا' تو کوئی بات غلط ثابت نہ ہو سکے۔ بعد میں حسبِ ضرورت بدلا جا سکتا تھا۔ اس کارڈ نے مجھے ایک شناخت ہی نہیں دی تھی مجھے خود اپنی نظر میں معتبر کر دیا تھا۔ میرے اعتماد کی بنیادیں اب ہوا میں نہیں تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اچانک میرا قد اتنا بڑھ گیا ہے کہ میں کسی کی نظر میں بچہ یا لڑکا نہیں رہا۔ میں ایک بالغ مرد ہوں۔ اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار۔ اب میں اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ ڈرائیونگ لائسنس سے نکاح نامے تک سب میری دسترس میں آ گیا ہے۔

دوسری اچھی بات عامر کا ملنا تھا۔ اس کو تائیدِ غیب سمجھنا جائز تھا۔ یہ مدد حاصل نہ ہوتی تو میں اس وقت بھی ناصر کی تلاش میں ناامیدی کے ساتھ بھٹک رہا ہوتا۔ مجھے رئیس کا پتا بھی مل گیا تھا اور عامر کو میں نے اس طرح شاہ جی کے گھر میں پہنچا دیا تھا جیسے دشمن ملک میں جاسوس اتارے جاتے ہیں۔ شادو سے بات ہونے کے بعد یہ تصدیق بھی خوش خبری سے کم نہ تھی کہ اب مشن کے کسی ناکامی سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہیں رہا تھا یا ناکامی کے امکانات کامیابی کے مقابلے میں حوصلہ افزا حد تک کم ہو چکا ہے۔

میں گھر پہنچا تو میری صورت دیکھتے ہی بیگم صاحبہ نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ تم کو دعویٰ کا ویزا مل گیا ہے۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل غلط۔ میں خوش ہوں گمودجہ وہ نہیں جو آپ نے بتائی؟"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہو گی۔ بس میں آپ کو دیکھ کے خوش ہوا ہوں۔ جیسے آپ مجھے دیکھ کر خوش ہیں اور میرا خوش نظر آنا آپ کو پسند نہیں تو لیجیے' میں اداس' غمزدہ اور دکھی ہو جاتا ہوں۔ فرمایئے اب کیسا لگ رہا ہے میرا چوکھٹا" میں نے رونی شکل بنائی۔

وہ ہنس پڑیں "بڑے ایکٹر ہو تم۔ اچھا بتاؤ مجھے دیکھ کے خوش ہونے والی کون سی بات ہے؟"

وہ بات میں نے ابھی تک نوٹ نہیں کی تھی مگر انہوں نے پوچھ لیا تو مجھے سوچنا پڑا اور غور سے دیکھا تو مجھے ان کے اندازِ آرائش و زیبائشِ حسن میں شباب کی غارت گری کے سارے اسباب کی نمائش یوں نظر نکی جیسے کسی طاقتور غنیم نے اپنے جارحانہ عزائم کو فتح میں بدلنے کے لیے اپنا سارا سامانِ حرب اور تمام تباہ کن قوت کسی ایک ہی محاذ پر اکٹھی کر دی ہو۔

ان کو دوسری بار دیکھا تو ایک لمحے کے لیے میری نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ بلاشبہ ایسی تیاری کے ساتھ کسی کو مسحور اور تسخیر کر لینا بیگم صاحبہ جیسی کسی بھی عورت کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ میرا جذباتی ردِ عمل ان کے لیے کامیابی کے یقین کی سند سے کم نہ تھا۔ انہوں نے فوراً وہ سوال کر دیا جو اس محاذ پر مقابل حریف کی طرف سے چلائی جانے والی پہلی گولی کی طرح تھا۔ ایک چیلنج کا اعلان تھا۔ ایک للکار تھی کہ ہوشیار۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟" انہوں نے کہا۔

میں فوراً ہوش میں آ گیا "آپ جا رہی ہیں کہیں؟"

انہوں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"وہ آپ کی تیاری دیکھ کے۔"

"اگر میں اچھی لگ رہی ہوں تو صاف کیوں نہیں کہتے۔ اور تیاری کے بعد باہر جانا ضروری ہو تو چلو باہر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "باہر۔ کہاں؟"

"کہیں بھی۔ اب تو خیر سے تم برسرِ روزگار بھی ہو۔ مال بھی ہے جیب میں اور قانونی طور پر بھی بالغ اور خود مختار ہو گئے ہو" انہوں نے بڑی خوشی سے کہا۔

میں نے غیر ارادی طور پر جیب سے شناختی کارڈ نکال کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ ماہرین نفسیات شاید کہہ سکتے ہیں کہ اس بچے کی طرح جو سگریٹ پی کر خود کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے' میں بھی اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوغت کے سرٹیفکیٹ کی نمائش کی لاشعوری خواہش سے
مغلوب تھا۔
میں نے کہا "ان سب باتوں کا باہر جانے سے کیا
علق؟"
"افوہ۔ گھامڑ ہو تم بھی۔ اپنی کیٹس آخر کب
یکھو گے۔ کیا میں خود اپنے منہ سے کہوں کہ مجھے انوائٹ
رو۔ ڈنر پر لے چلو۔ مگر تمہیں یہ سب سکھانا ہی پڑے گا"
نہوں نے افسوس سے سر ہلایا۔
میں نے بوکھلا کے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن
یچے بھی ساتھ ہوں گے۔"
"ظاہر ہے۔ انہیں کیا میں گھر پر چھوڑوں گی کہ بھوکے
یٹھے رہو یا جو نوکر دیں وہ کھالو۔ میں تو جا رہی ہوں تمہارے
اچا کے ساتھ۔"
"اوکے۔ میڈم!" میں نے خوشی سے پھول کے ایک
تھ سینے پر رکھا اور رکوع میں چلا گیا "کیا آپ اس ناچیز کو یہ
شرف عطا کریں گی کہ آج ایک دعوتِ طعام میں ماحضر تناول
رما کے۔"
وہ ہنسنے لگیں "بس بس۔ دعوت نامہ پڑھنا شروع مت
رو۔ چلو' تم تیار ہو جاؤ۔ اتنی دیر میں بچے بھی ریڈی
و جائیں گے۔"
میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی "میں ریڈی بلکہ اوور
یڈی ہوں۔"
"یعنی آپ یہ حلیہ رکھیں گے۔ الٹی ٹوپی' یہ واہیات ٹی
رٹ اور جینز۔ یہ ڈنر کا ڈریس ہے؟"
میں نے کہا "اس کے سوا تو صرف شلوار قمیص ہے۔"
"چلو شرٹ کے ساتھ ٹائی باندھو۔ میرا خیال ہے کہ
اکٹر صاحب کا اور تمہارا ایک ہی سائز ہے۔"
میں نے کہا "میں ان کے کپڑے ہرگز نہیں پہنوں گا۔"
"اگر میں۔ درخواست کروں۔ تب بھی نہیں۔" ان کی
کراہٹ کہنے لگی۔
میں مشکل میں پڑ گیا "اچھا ناراض مت ہوں۔ مجھے پسند
یں مگر آپ کا حکم ہو تو میں انکار نہیں کر سکتا۔"
"کسی بات سے نہیں؟ ہر بات مان سکتے ہو میری؟"
"نہیں۔ ہر بات نہیں۔ آپ مجھے میرے الفاظ کی زنجیر
ے مت باندھیں۔ میرا مطلب تھا کہ ایسی بات جو آپ کی
ں آزاری کا سبب بنے۔"
بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ صبح ان کا رویہ کچھ اور تھا۔
باپ کا موڈ میرے خلاف دیکھ کر اجنبی بن گئے تھے۔ اب
ماں کا موڈ دیکھ کر پھر دوستی ہو گئے' جو تھے۔ انہوں نے غور ہی
نہیں کیا کہ میں نے ان کے پاپا کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ ڈارک
کلر کے سوٹ ڈاکٹر مشہود اکثر پہنتے تھے اور ان کے پاس ملے
جلے رنگوں کے سوٹ بھی بہت تھے۔ ان جیسے صاحبِ حیثیت
لوگ کسی سوٹ کو برسوں نہیں پہنتے۔ شاید ایسے بھی بہت
ہوں گے جو اب وہ مسترد کر چکے ہوں۔۔۔۔ درجنوں سوٹ
ہوں تو ان کے ساتھ کئی درجن ٹائیاں بھی لازمی ہوتی ہیں۔
بچے مجھے دیکھ کے خوش ہو گئے "انکل' آپ وہ لگ رہے
ہیں بالکل۔۔۔ دی سینٹ" عزی بولی۔
"بے وقوف۔ راجر مور نام ہے اس کا۔"
"پھر اسے سینٹ کیوں کہتے ہیں۔"
"تمہاری عقل میں نہیں آئے گا" نوکے نے ایکٹر اور
کیریکٹر کے ناموں میں فرق کی وضاحت کو مشکل اور غیر
ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔
میری جیب میں اس وقت بھی سات ہزار روپے تھے اور
یہ بات میرے لیے باعثِ اطمینان اور افتخار تھی کہ میں آج
برابری کی سطح پر آ کے اپنے صاحبِ خانہ کی فیملی کو ڈنر کے لیے
لے جا رہا ہوں۔ یہ ایک جھوٹا غرور تھا۔ میں کسی طرح بھی
ڈاکٹر مشہود کے پاسنگ۔۔۔ نہ تھا مگر اپنے اعتماد کے لیے ایسے
ہی جہانوں اور مواقع کی تلاش میرا نفسیاتی مسئلہ تھی۔
جب ہم رات گئے لوٹے تو میری جیب میں بارہ سو روپے
کم ہو گئے تھے مگر جو خوشی مجھے سوٹ کی جیب سے ہزاروں کے
نوٹ نکال کے بارہ سو پھینکتے ہوئے اور ویٹر کو ٹپ میں
سینتیس روپے دیتے ہوئے ملی تھی' وہ بارہ سو کیا بارہ ہزار اور
بارہ لاکھ کے سکے رائج الوقت سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔
رات گیارہ بجے بچوں نے مجھے معمول کے مطابق شب
بخیر کہا اور میں سونے کے کپڑے پہن کر لیٹ گیا۔ یہ ایک
انتہائی EXCITING دن تھا۔ میں ایڈونچر اور روسینس۔ خود
اعتمادی اور طاقتِ پرواز کے بھرپور احساس کے ساتھ
خیالات اور تصورات کے افق کو چھو لینا چاہتا تھا۔ حالات کی
ہوا رخ بدل چکی تھی اور میرے عزائم کا ساتھ دے رہی
تھی۔ نیند بہت نیچے زمین میں سکون سے سونے والوں کا مقدر
تھی۔ انتہائے غم اور انتہائے مسرت کے جذبات میں خیال
کی رفتار اور سمت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔
میں لائٹ بجھا کے آنکھیں بند کیے کبھی شاہد کے بارے
میں سوچتا تھا۔ کبھی اس گھر کا تصور قائم کرنے کی کوشش کرتا
تھا جہاں وہ میرے ساتھ ہو گی اور ہمارے درمیان کوئی نہ
ہو گا۔ کیا ہو گا وہ گھر اور کہاں ہو گا؟ ابھی کچھ دن تو سختی حالات

کا مقابلہ کرتے گزر جائیں گے۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں
گا۔ میٹرک' ایف اے' بی اے تو کسی کالج میں داخلے کے بغیر
بھی کیا جا سکتا ہے۔ خوشی اور خوشحالی کی بنیاد کسی ڈگری پر
نہیں' پیسے پر رہتی ہے۔ جب میں ذمے داری کے بوجھ سے
آزاد تھا تب بھی معاشی مسائل کی مجھے کوئی مجبوری نہیں
تھی۔ جب شاہد میری ذمے داری ہو گئی اور صرف شاہد ہی
کیوں۔ شادی کے بعد ذمے داریوں میں اضافہ تو ناگزیر ہے۔
جب بچے ہوتے ہیں تو اخراجات بڑھتے ہیں۔ خیر بچے بھی
سالانہ پیداوار کی طرح نہیں بڑھنے چاہئیں۔ بچے ہونے ضرور
چاہئیں' کتنے ہونے چاہئیں' حد ہو گی۔ یہ فیصلہ کرنے والا میں
کون؟ آخر شاہد کی مرضی بھی تو کچھ ہو گی۔
میرا خیال ہے کہ میں مسکرا رہا تھا۔ میں اپنے بے سود با
اور احمقانہ خیالات کی آنکھ مچولی میں اتنا محو تھا کہ مجھے کچھ پتا
ہی نہیں چلا۔ میں نے کوئی آہٹ نہیں سنی۔ قدموں کی چاپ
نہیں سنی اور اگر دروازے نے سرگوشی میں کچھ کہا تھا تو وہ
بھی نہیں سنا۔
میں ایسے پکڑا گیا جیسے نیند میں چلنے والا آنکھیں کھلی
رکھنے کے باوجود اپنی جانب بڑھتے ہوئے ٹرک کو نہ دیکھ سکے۔
اس کے ہارن یا انجن کی آواز نہ سنے اور ٹرک اس کے اوپر
سے گزر جائے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے اچانک دبوچ لیا۔ ایک
لمحہ پہلے میں آزاد تھا۔ دوسرے لمحے ان کی گرفت میں بے بس
ہو گیا تھا۔ خوف کے احساس سے میرا جسم سن ہو گیا۔ میں
مفلوج اور ناطاقتی سے حرکت کے قابل بھی نہ رہا۔
میری یہ کیفیت چند لمحوں کی قیامت تھی جس نے میرے
احساس کی دنیا میں ایٹم بم سے بڑا دھماکا کیا۔ پھر یہ سب کچھ تہ و
بالا کر دینے والی لہر گزر گئی اور میں ایک دم ہوش میں آ گیا۔
میں نے کانپتی آواز میں کہا "بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ۔۔۔
یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔۔۔ پلیز۔"
"شش۔۔۔" انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی
"آواز مت نکالنا۔ کوئی سن لے گا۔"
میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی
"آپ۔۔۔ جائیں۔۔۔ خدا کے لیے چھوڑ دیں مجھے۔"
ان کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ "چھوڑ کے تم جا ہی رہے
ہو۔"
میں نے کہا "آپ کو شرم آنی چاہیے۔"
"شرم تمہیں نہیں آتی۔ ایک فقیرنی کے پیچھے دیوانے
ہو رہے ہو۔ کیا میں اس سے بھی گئی گزری ہوں۔ پھر میرے
ساتھ کیوں کھیل رہے تھے یہ کھیل؟"
میرا جسم پھر سرد پڑ گیا "آپ۔۔۔ کو معلوم ہے۔؟"
"مجھے سب معلوم ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو کچھ معلوم
نہیں۔ تم انہیں بے وقوف بنا سکتے ہو' مجھے نہیں۔"
"لیکن۔۔۔ آپ کو۔۔۔ کس نے بتایا؟" میں نے اپنی ہار
مان لی۔
"خود اس نے۔۔۔ شاہد نام ہے نا اس کا۔ وہ تمہیں
ڈھونڈتی ہوئی یہاں بھی آئی تھی اور مجھے ٹھگ کرنے گئی
تھی۔"
"میں۔۔۔ میں محبت کرتا ہوں اس سے۔"
"مجھے معلوم ہے کہ تم اب یہاں نہیں رہو گے۔ مجھے
نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتی ہے لیکن وہ فون کرتی رہتی تھی۔
تمہارے بارے میں پوچھتی تھی۔ نرس کی کہانی تم نے مجھے
ٹالنے کے لیے سنائی تھی۔ اس نے تو مجھے سب بتا دیا تھا۔"
"اس نے۔۔۔ آپ کو فون کیا تھا؟"
"فون اس نے تمہیں کیا تھا' میں نے اسے بے عزت کیا
کہ وہ کیوں تمہارے پیچھے پڑی ہے۔ اپنی عمر دیکھے' اپنی
اوقات دیکھے۔"
"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا" میں نے کہا۔
"اسے بھی وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا جو اس نے کہا۔
اس نے مجھے ذلیل کیا کہ پیچھے تم پڑی ہو اس کے۔ وہ میرا ہے
اور میرا ہی رہے گا۔ تم روک سکتی ہو تو روک کے دکھاؤ۔ میرا
باپ کیا کرے گا؟ جوتے مارے گا' عاق کر دے گا۔ گھر سے
نکال دے گا۔ پھر کیا ہوا؟ ہم شادی کر لیں گے لیکن تم سوچو کہ
تمہارے شوہر کو پتا چلے گا' اور اس نے تمہیں گھر سے نکال
دیا' طلاق دے کر گھر بٹھا دیا تو تم کیا کرو گی' کہاں جاؤ گی؟ حرام
زادی' میرے منہ لگتی تھی۔ میں نے کہا کہ نمبر میں دیتی ہوں'
تم فون کرو اور بتاؤ ڈاکٹر صاحب کو' اس کے بعد مجھے بتانا کہ
اس شخص نے کیا کہا جو دنیا کے سامنے اینڈتا پھرتا ہے کہ وہ
بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ میرا شوہر ہے' شوہر۔۔۔ مائی فٹ۔ شوہر
ہوتے ہیں مرد۔ ڈاکٹر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کا ہی نہیں اپنا
بھی علاج کر سکتے ہیں۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ چھپا
بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی تک کوئی دوا کوئی علاج ایسا نہیں جس
سے کینسر کی طرح اس مرد کا علاج ممکن ہو' جو مرد ہی نہ ہو۔
صرف مرد نظر آتا ہو۔ مردوں کی طرح رہتا ہو اور مرد سمجھا
جاتا ہو۔ ایسی بات تھی تو اسے کیا ضرورت تھی شادی کرنے
کی۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک عام عورت بھی شادی
شدہ کہلانے کی تہمت قبول نہیں کر سکتی۔ مگر اس نے میرے
سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ وہ بزدل تھا۔ اس میں اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ت ہی نہیں تھی کہ دنیا کے سامنے قدرت کی اس کوتاہی کو
یم کرسکے۔ پیدائشی اندھے بہرے یا اپاہج بھی تو ہوتے ہیں
۔ وہ جگ ہنسائی سے ڈرتا تھا۔ شادی سے انکار نہیں
سکتا تھا۔ اس نے ایک سمجھوتا کرلیا میرے ساتھ کہ بس
اس کا بھرم رکھوں۔ اس نے مجھے اور میرے ماں باپ کو
خاندان کو سب کو خرید لیا۔ اب تم پوچھوگے کہ کیسے
دا تھا۔ یا سوال کروگے کہ وہ کیوں بک گئے تھے آخر؟"

میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "نہیں۔ میں
ا ہوں کہ آدمی اور اس کے احساس اور جذبات کی
د و فروخت کیوں اور کیسے ہوتی ہے۔"

"نہیں۔ تم نہیں جانتے" بیگم صاحبہ اب مسلسل
لیاں لے رہی تھیں اور ان کے آنسو میرے ایک کندھے
ور بازو کو بھگو چکے تھے "تم نے تو سنا ہوگا یا پڑھا ہوگا' میں
بھگتا ہے۔"

"پلیز بیگم صاحبہ! ۔۔۔ میں نہیں جاننا چاہتا۔" میں نے
کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے "آنسو ضائع مت
ں۔ اب کیا فائدہ' سمجھوتا خود آپ نے کیا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اس وقت میں بے وقوف
یا مجبور تھی۔ ورنہ میں کہتی کہ میں کسی اور کے قرض کو
زندگی سے کیوں چکاؤں؟ بس وقت کی صلیب پر مصلوب
میرا نصیب تھا۔ سو خود میرے اپنوں نے مجھے کہا کہ چلو
صلیب خود اٹھاؤ۔ اور مڑ کے نہ دیکھو ہمارے چہروں کی
۔ کیونکہ ہم سب پتھر کے ہوگئے ہیں۔ ہم کچھ نہیں سنیں
اور کچھ نہیں دیکھیں گے۔ میرا باپ بڑا اچھا اور ایماندار
تھا۔ تمام عمر اس نے محنت اور حلال کے رزق پر یقین
۔ اس نے میری ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کی۔ میری
بہن تھی' اس کا رشتہ ایک بہت اچھی جگہ طے ہوگیا
وہ ایک غیر ملکی ائرلائن میں کیپٹن تھا اور بہت اسمارٹ
تھا۔ وہ بڑا اونچا خاندان تھا ہمارے مقابلے میں۔
ے ایک بھائی نے ایم بی اے کرلیا تھا مگر اسے نوکری نہیں
ہی تھی۔ وہ کینیڈا جانا چاہتا تھا۔ اس کے اخراجات بہت
ور میرے باپ کی استطاعت سے باہر تھے۔ میری بہن کی
بھی اسی لیے رکی ہوئی تھی کہ دھوم دھام سے شادی
شایانِ شان جہیز کے لیے کم سے کم تین چار لاکھ کی رقم
تھی۔ صرف ٹیوشن میں بچوں کی تعلیم کے اخراجات
ے کرنے والا سفید پوش بچت کہاں سے کرتا۔ وہ
منٹ کے وقت ملنے والا زرِ پر انحصار کررہا تھا مگر آخری
میں اسے غبن کے ایک کیس میں پھنسا دیا گیا۔ یہ ان کی
سازش تھی جن کو میرے باپ نے اپنے حرام حلال کے فلسفے
سے بہت نقصان پہنچایا تھا اور بہت ذلیل کیا تھا۔ اس کے
خلاف دس لاکھ کی خُوردبُرد ثابت کردی گئی۔ یہ بات یقینی تھی
کہ مقدمہ درج کرادیا جاتا تو میرے باپ کی زندگی کے آخری
ایام جیل میں چکی پیستے پورے ہوجاتے۔ جو پیسہ اسے ریٹائر
ہونے کے بعد ملنا تھا اور جس پر اس کے مستقبل کا انحصار
تھا' اس نقصان کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ پھر میرا بھائی کینیڈا
کیسے جاتا اور اس کی ایم بی اے کی ڈگری ضائع ہوجاتی۔ اس
رسوائی کے بعد میری بہن کا وہ رشتہ بھی نہ رہتا جو لاٹری کی
طرح تھا۔ بے شک وہ مجھ سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ میں
جانتی ہوں کہ میں تو عام سی لڑکی تھی۔ وہ واقعی حسین تھی اور
بس ایک شادی میں کسی ماں کی جوہر شناس نظر نے اسے اپنے
ہیرے جیسے بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا۔ ہمارے پاس تو اپنی
بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا وکیل کرنے کی فیس
بھی نہیں تھی۔ ایسے مقدمات سالوں چلتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی
بک جاتا اور اس کے باوجود فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوتا۔ وہ
سیٹھ پیسے اور اثر رسوخ والا تھا۔ اس نے میرے باپ سے
صاف کہا کہ اب پانچ لاکھ تمہارے واجبات سے پورے
ہوجائیں گے۔ پانچ لاکھ کا مکان سمجھ لو۔ اس عمر میں تم کو
شیطان نے بہکایا اور تم نے ساری عمر ہمارا نمک کھا کے
ہمارے ساتھ ہی نمک حرامی کی۔ میں رحم کھاتے ہوئے تم کو
پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ بس آئندہ مجھے اپنی
صورت مت دکھانا۔ جانے سے پہلے واجبات کی وصولی کے
کاغذات پر دستخط کرجاؤ اور مکان کی سیل ڈیڈ میرے نام بنادو۔
میں ایک دو مہینے کی مہلت دے دوں گا۔ بس اس وقت جو ہوا
خود ہی ہوگیا۔ کسی کی کوشش سے یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔
معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے جو ٹھیک وقت پر آگے آئے۔
جیسے وہ خنجر تھے کہ کہیں کسی نیلام گھر میں کوئی اپنی مجبوریوں
کی بولی لگانے والے کی راہ دیکھ رہا ہو تو وہ منہ مانگی قیمت پر جو
چاہیں حاصل کرلیں۔ یہ سب ایسے ہی اور اسی طرح ہونا طے
تھا۔ وقت بڑا مداری ہے۔ اس کے کھیل بھی ایسے ہی ہیں جو
نظر آتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ سب نظربندی ہوتی ہے۔ نظر کا
دھوکا' ایک فرشتہ غیب سے نمودار ہوا اور اس نے سیٹھ کا
نقصان پورا کردیا۔ ہمارا مکان بچالیا۔ ہماری عزت بچالی۔
میری بہن کا رشتہ ٹوٹنے سے بچالیا۔ اس نے میرے بھائی کو
کینیڈا بھجوادیا۔ سارے انتظامات اسی نے کیے۔ اس نے
میری بہن کی شادی کے تمام اخراجات اٹھائے اور اس کے
بعد میرے باپ کو پرچون کی ایک دکان کھول دی کہ لو اب

یہاں بیٹھ کے ایمانداری سے رزقِ حلال کماؤ اور کھاؤ۔ کیا یہ
کم قیمت تھی جو اس نے میرے لیے ادا کی تھی؟"

میں انکشافات کے بھاری پتھروں کے نیچے دب کے
سب کچھ بھول گیا تھا اور کسی بیگم صاحبہ کی نہیں' کسی لیڈی
ڈاکٹر کی نہیں۔ صرف ایک مظلوم اور مجبور عورت کی زندگی کا
وہ باب پڑھ رہا تھا جو اس کی داستانِ حیات میں سے سنسر کردیا
گیا تھا۔ میری ساری جذباتی ہمدردیاں اس عورت کے لیے
وقف ہوگئی تھیں۔ میں اس کے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں
کرسکتا تھا اور اپنے کان بند کرکے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ
سب مجھے بتانے سے کیا ہوگا۔ میں نہیں سننا چاہتا کوئی بات
کیونکہ میں نے اپنی کہانی کبھی تمہیں نہیں سنائی جب کہ اتنا
ہی مظلوم اور مجبور میں بھی رہا ہوں۔

میں نے کہا "یہ قیمت کس نے منظور کی تھی؟ خود آپ
نے۔۔۔؟"

"اگر میں راضی نہ ہوتی تو کوئی مجھے بیچ سکتا تھا؟" بیگم
صاحبہ نے خاموش آنسوؤں کے ساتھ کہا "ویسے یہ سودا
کرانے والا میرا اپنا بھائی تھا جو سب سے پہلے کینیڈا چلا گیا
تھا۔ وہ سب جانتا تھا۔ میری شبِ عروسی کی صبح ہوئی تو اس کی
کینیڈا کی فلائٹ کا وقت ہوگیا۔ میرے شوہر نے مجھ سے کچھ
نہیں کہا۔ اس نے مجھے ایک بند لفافہ پکڑا دیا۔ اس میں ایک
بے غیرت بھائی کا خط تھا جس میں اس نے یہ بتایا تھا کہ اس
نے اپنی بہن کی زندگی کا سودا کتنے میں اور کیسے کیا تھا۔ اس
نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے نوشتۂ تقدیر پر
خاموشی سے صبر اختیار نہ کیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔
ٹکٹ اور پاسپورٹ ڈاکٹر مشہود کے پاس تھے۔ اس کے
اختیار میں سب کچھ تھا۔ میرے اختیار میں رونا بھی نہیں
تھا۔ میں روتی تو پھر وہ سب کیسے ہوتا جو بعد میں ڈاکٹر مشہود
نے میرے خاندان کو بچانے کے لیے کیا تھا۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ آپ نے یقیناً بہت بڑی قربانی
دی ہے۔"

"مگر یہ سب کون جانتا ہے۔ کسی کو احساس ہے کہ ہر
روز' دن رات کے ہر لمحے میں میری قربانی جاری ہے۔ بھائی
کا تو مجھے علم نہیں' لیکن یقیناً وہ بہت خوش حال ہوگا۔ اس
وقت کینیڈا میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ خوش و خرم ہوگا اور
کسی کمپنی یا آفس میں اچھی حیثیت کے عہدے پر فائز ہوگا۔
میری بہن کے بھی دو بچے ہیں اور وہ شادمان کے ایک عالی شان
بنگلے میں رہتی ہے۔ وہ ساری دنیا گھوم چکی ہے۔ اس کے
شوہر کو کیپٹن کی حیثیت سے فری ائرٹریول کی سہولت حاصل
ہے۔ وہ باہر سے جو چاہے لے آتی ہے۔ بے شک کمی مجھے بھی
کسی چیز کی نہیں۔ تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ ڈاکٹر مشہود کے پاس
بہت دولت ہے۔ میری بہن کا شوہر عیاش آدمی ہے۔ اس کا
پیشہ ہی ایسا ہے۔ وہ پہلے بھی جہاز لے کر جاتا تھا تو اس کے
مراسم ائرہوسٹسیس کے علاوہ بھی باہر نہ جانے کس کس سے
رہتے تھے۔ صورتِ حال شادی کے بعد کیسے بدل سکتی تھی۔
اسے عادت پڑی ہوئی تھی اور بن مانگے شراب سے شباب
تک سب کچھ مل جاتا تھا لیکن میری بہن یہ سب کچھ ہنسی
خوشی برداشت کرلیتی ہے۔ کیونکہ اسے ایک اطمینان بہرحال
حاصل ہے جو مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے بچے شوہر کے
ہی ہیں۔ یہ دل کے اطمینان کی بات ہے۔ ویسے تو سب ہی
جانتے ہیں کہ میرے بچوں کا باپ ڈاکٹر مشہود ہے۔"

اب اس اعتراف کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی مگر پھر
بھی مجھے ایک جھٹکا سا لگا "پھر۔۔۔ کس کے ہیں؟"

"شادی سے پہلے میرے بھی کچھ خواب تھے۔ سب سے
بڑا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا جس کو تعبیر دینے کے لیے میرے
باپ نے دن رات ایک کردیا۔ آج وہ فخر کے ساتھ نہیں' ندامت اور دکھ کے ساتھ اپنی پرچون کی دکان کھولے بیٹھا
ہے۔ اسے ندامت ہے مجھ سے کہ ڈاکٹر بن کے بھی میں ڈاکٹر
نہیں بنی۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا جیسے کسی بچے کو بالآخر اس
کا من پسند کھلونا مل جائے مگر اسے شوکیس میں رکھ دیا جائے
کہ تم اس سے کھیل نہیں سکتے یا اسے شوق ہو تو سائنکل
دلادی جائے مگر چلانے پر پابندی ہو۔ ڈاکٹری کے آخری سال
میں جب ہر لڑکی سمجھتی ہے کہ اب تو وہ ڈاکٹر بن گئی۔ میں بھی
تصور میں خود کو کسی اسپتال میں گاؤن پہنے اسٹیتھسکوپ گلے
میں لٹکائے دیکھتی تھی۔ کبھی مریضوں کے ہجوم میں' کبھی کسی
وارڈ کا چکر لگاتے۔ پرائیویٹ روم کے مریضوں کو دیکھتے۔
نرسوں کو ان کی کوتاہی پر ڈانٹتے۔ بیماروں کو ہمدردانہ لہجے میں
مسکرا کے امید شفا دیتے۔ میرے خوابوں میں ایک شریکِ سفر
بھی تھا۔ دو سال تک ہم نے جو خواب دیکھے' مل کے دیکھے۔
اب میں تمہیں کیا بتاؤں' یہ سب پہلے میں نے کسی کو نہیں
بتایا۔"

"پھر آج مجھے نہ بتاتیں تو اچھا ہوتا" میں نے کہا۔

"تمہیں اس لیے بتایا کہ جب تم آئے تو مجھے یوں لگا
جیسے میرے خواب جو مجھ سے روٹھ گئے تھے پھر لوٹ آئے
ہیں۔ وہ تم جیسا ہی تھا۔ یہ میری خواہشوں کا سراب نہیں
ہے۔ حسرتوں کا دھوکا نہیں ہے۔ کوئی اور مجھے اس جیسا کبھی
نہیں لگا۔ تمہاری صورت سے زیادہ تمہارے انداز و اطوار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس کی جھلک بہت نمایاں تھی۔ تم اس کی طرح باتیں کرتے تھے اور آج تو میں نے تمہیں سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو قائل کیا کہ یہ خواب ہے' حقیقت نہیں۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتا تو ایسا ہی نظر آتا۔ اس نے مجھ سے بہت سے وعدے بھی کئے تھے اور ہم نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سب کچھ طے بھی کرلیا تھا۔ ہم مل کے ہاؤس جاب کریں گے۔ کوشش ضرور کریں گے کہ ایک ہی اسپتال میں ہوں۔ پھر ایک ہی شفٹ میں ساتھ رہنا مشکل نہیں ہوگا۔ ورنہ ہاؤس جاب کے بعد ہم مل کے کہیں ایک کلینک قائم کریں گے۔ یہ بھی طے تھا کہ شادی ہوگی ہاؤس جاب کی تکمیل کے بعد اور کلینک کھولنے سے پہلے تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع ہی نہ ملے۔ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں تو مریضوں کا اُن پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ اصل مشکل تھی سرمائے کی۔ وہ بھی غریب گھر کا لڑکا تھا۔ ہم کسی پوش علاقے میں شاندار کلینک قائم نہیں کرسکتے تھے۔ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ طاری رہتا ہے۔ اسپیشلسٹ بن کے لمبی چوڑی فیس لینے' ایک ساتھ تین چار اسپتالوں میں ایک ایک' دو دو گھنٹے بیٹھنے اور مریضوں کو اپائنٹمنٹ کے بغیر نہ دیکھنے کا سلسلہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے جب دکھی انسانیت سے زیادہ عیش و عشرت کے اسباب کی خواہش مغلوب کرلیتی ہے۔ ہم نے بھی سوچا تھا کہ بس کسی غریبوں کی بستی میں بہت کم کرائے کی دکان لے کر اس کے دو حصے کردیں گے۔ درمیان میں پردے کی پارٹیشن ہوگی۔ ایک طرف میز ڈال کے میں عورتوں کو دیکھوں گی۔ دوسری طرف وہ مردوں کا علاج کرے گا۔ دونوں ایک ہی کمپونڈر سے کام چلائیں گے۔ اسے سمجھادیں گے کہ بھائی ابھی گزارا کرو۔ اب کلینک جم جائے گا تو تمہاری تنخواہ بھی بڑھاتے جائیں گے۔ مل جائے گا کوئی نہ کوئی شریف اور وفادار آدمی۔ جب امتحانات ختم ہوئے تو رزلٹ آنے تک ایک طویل وقفہ آیا۔ اس کا میرے گھر یا میرا اس کے گھر جاکے ملنا مشکل تھا۔ ہم دونوں کے غریب گھرانے' قدامت پرستی کا شکار تھے اور ان کے پاس ایک شرافت اور عزت ہی تھی جسے کچھ اور نہ ہونے کے سبب وہ اپنی متاعِ بے بہا شمار کرکے خوش ہولیتے تھے۔ ہم نے طے شدہ وقفے سے میڈیکل کالج کے اسپتال میں ملنے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے کہا کہ ہفتے میں ایک بار اسپتال میں حاضری ضروری ہے۔ چند ہفتے وہ باقاعدگی سے آیا۔ پھر ایک بار وہ نہیں پہنچا۔ دوسرے ہفتے میں نہ جاسکی۔ میں بخار میں پڑی تھی۔ تیسرے ہفتے وہ مجھ پر برس پڑا کہ مجھے اس کا خیال نہیں۔ میں بدل گئی ہوں۔ کیا وہ پاگل ہے کہ میرے لیے اکیلا جھک مارتا رہے۔ اسے کیا کمی ہے لڑکیوں کی اور میں اپنے آپ کو آخر کیا سمجھتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں جتنا حیران ہوئی اس سے زیادہ دکھی ہوئی۔ یہ شکایت میں بھی کرسکتی تھی۔ ایک بار وہ نہیں آیا' دوسری بار میں نہیں پہنچی۔ اس کی کوئی بھی وجہ ہوسکتی تھی۔ اس نے تو کہہ دیا تھا کہ مہمان آگئے تھے۔ مجھ سے اس نے پوچھا تک نہیں ورنہ میں بتاتی کہ بیمار نہ ہوتی تو میں ضرور آتی۔ غصے میں بات بگڑ جاتی ہے۔ میں نے بھی اسے جواب میں خوب سنائیں اور وہ شرمندہ ہوا۔ لیکن شیشے میں بال سا آگیا۔ اس کے بعد والے ہفتے میں مجھے اس کا پیغام اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے دیا۔ اس نے معذرت کی تھی کہ بیماری کے باعث وہ نہیں آسکا۔ میں نے پوچھا کہ یہ پیغام کون لایا تھا تو وارڈ بوائے نے بتایا کہ وہ خود مجھے دے گئے تھے اور انہوں نے دس روپے بھی دیے تھے۔ اگر آپ دس روپے دیں تو آپ کو کچھ اور بتاؤں' جو انہوں نے بتانے سے منع کیا تھا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بڑا بدمعاش تھا۔"

"ایسا ہوتا ہے۔ وارڈ بوائے سب کی خدمت کرتے ہیں اور غریب بن کے پیسے بھی اینٹھتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زیادہ وفادار ہوجاتے ہیں۔ جن سے امید ہو کہ بعد میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ وہ لڑکا بھی ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ یہ ہم نے اسے نہیں بتایا تھا مگر ہمیں اندازہ تھا کہ جب بھی ہم نے کلینک قائم کیا' وہ کوالیفائڈ نہ ہونے کے باوجود ڈسپنسر کی ذمے داریاں پوری کرنے آجائے گا۔ میں نے اسے دس روپے دیے تو اس نے بتایا کہ وہ نئی موٹر سائیکل پر آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پرچہ مجھے تھما کے ہنستے ہوئے اسی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ مزید دس روپے لے کر اس نے لڑکی کا نام بھی بتادیا اور یہ بھی کہ وہ اکثر آتے ہیں اور اگر میں چاہوں تو خود بھی دیکھ سکتی ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس نے نئی موٹر سائیکل کا نمبر بھی بتایا اور اپنا خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ غالباً اسی لڑکی نے گفٹ کی ہے۔ سالگرہ پر۔ میں نے کہا کہ سالگرہ تو جون میں پڑتی ہے اس کی۔ وارڈ بوائے نے کہا کہ موٹر سائیکل کے لیے اپریل میں بھی آسکتی ہے مس۔ اس کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہ بہت امیر گھر کی لڑکی تھی جس نے میرے اور اس کے خواب خریدے تھے۔ میں نے بعد میں انہیں چھپ کر اسپتال میں' کیفے ٹیریا میں اور باہر اکٹھے گھومتے پھرتے' ہنستے اور باتیں کرتے دیکھا۔ اور جب اس کو

پتا چل گیا کہ جو بات سارے زمانے سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ مجھے بھی معلوم ہوگئی ہے تو اسے کوئی ڈر نہ رہا۔ میں نے بھی اس سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا۔ کسی کو زبردستی تو اپنایا نہیں جاسکتا۔ جانے والے کو پکڑ کے واپس لانے سے کیا فائدہ۔ وہ پھر بھاگ جائے گا۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کے فیصلے کو اکیلے میں رو دھو کے قبول کرلیا۔ جب رزلٹ آیا تو مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی شادی طے ہوگئی ہے۔ انہوں نے اکٹھے ہاؤس جاب کیا اور اس کے بعد شادی کرلی۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے اس نے طے کیا تھا۔ بس میری جگہ ایک دولت مند لڑکی آگئی جو اتنے وسائل رکھتی تھی کہ کسی پوش علاقے میں اس کے ساتھ شاندار کلینک قائم کرسکے۔"

میں نے کہا "آپ کی پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

ملاقات کیسے نہ ہوتی۔ یہ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے" انہوں نے کہا "اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ہوسکتا تھا۔"

"آپ نے اس سے یا اس نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں۔ جب وہ اجنبی ہوگیا تو میں نے بھی اجنبی بن جانا ہی بہتر سمجھا۔"

میں نے کہا "کیا یہ اتنا ہی آسان ہوتا ہے؟ محبت کرنا اور بھلادینا' ایک پوری دنیا آباد کرنا اور اسے چھوڑ دینا۔"

"خدا کرے کہ ایسا تمہارے ساتھ نہ ہو۔ اس درد کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نہ آنسوؤں کی زبان میں نہ الفاظ میں۔ اسے صرف محسوس اور برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس درد کا برداشت کرنا بھی جسم کا درد برداشت کرنا نہیں ہے نامہ۔ پاگل ہوجاتا ہے جو اسے جھیلتا ہے جیسے میں۔ آج تک میں سمجھ نہیں پائی کہ میں نے وہ سب کیوں نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً میں نے اپنے بھائی کے نام اور اپنے والدین کے نام اور ڈاکٹر مشہود کے والدین کے نام ایک خط لکھ کر میرے ساتھ ہونے والے اس جرم کو مشتہر کیوں نہیں کیا؟ میں سارے زمانے کو بتادیتی اور پھر اپنے آپ کو قتل کردیتی۔ کیونکہ ایک بزدل لڑکی میں جو اپنے دغاباز محبوب سے بے وفائی کا شکوہ تک نہ کرے' اسے قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس بے غیرت بھائی کو یا اپنے شوہر کو قتل کرسکتی۔ میرے مرنے کے بعد ان کی رسوائی ہی ان کی سزا بن جاتی۔ شاید اسی لیے میں وہ سب کررہی ہوں جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میں چھپ چھپ کے اپنی بے بسی کا انتقام لے رہی ہوں یا اپنی قربانی کی قیمت وصول کررہی ہوں۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اور شرافت کی چادر پر داغ نہ آنے پائے۔ اس کے لیے مجھے ساری دنیا کے سامنے ایک شریف زادی کا' ایک مشرقی عورت کا' ایک وفادار اور پاکباز بیوی کا کردار ادا کرنا پڑا۔ ایسے نہ جانے کتنے جھوٹ ہیں جن کی بنیادوں پر ہماری زندگی کی اخلاقی قدروں کا تاج محل کھڑا ہوا ہے۔ جسے سب دیکھتے ہیں تو اس کے حسن پر واہ واہ کراٹھتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا یا جاننا ہی نہیں چاہتا کہ سنگِ مرمر جیسی اجلی دیواروں کے نیچے کیسی بدبو ہے۔ غلاظت ہے اور ارمانوں کی سڑی ہوئی لاشوں کا تعفن ہے۔ شاید تم بھی مجھے بے حیا' آبروباختہ اور بدکردار عورت سمجھو گے۔"

"میں آپ کے باطن کی خوب صورتی کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ قربانی آپ کے جذبات کی جاری ہے۔ اس سے مستفید وہ ہورہے ہیں جنہیں اس کی خبر بھی نہیں۔"

"سوائے ایک شخص کے جو میرا بھائی ہے۔ میرا اپنا سگا بھائی۔ جسے اپنے مستقبل کی کامیابی اور خوش حالی اتنی عزیز تھی کہ اس نے بہن کو بیچتے ہوئے صرف مادی فوائد کا سوچا۔ اخلاقی قدروں کو اور جذبات کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کردیا۔ آج اسے خیال تک نہیں آتا ہوگا میرا۔ اس کو ضمیر کی خلش تک محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے یہ سب لکھ کر بتاسکتی کہ میں کس عذاب کے برزخ میں ہوں۔ میں آج بھی خاندان کی بلکہ اب دو خاندانوں کی عزت و ناموس کی پہرے داری پر مجبور ہوں۔ پابندیاں ہیں مجھ پر کہ میں پیاسی رہوں اور پیاس بجھانے کے لیے چوری کروں۔ اس طرح کہ پکڑی نہ جاؤں۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی' عزتوں کے بھرم کیسے رہیں گے۔ پہلے صرف ماں باپ اور بھائی بہن اس قربانی کے مستحق اور طلب گار تھے آج میرے بچے بھی ہیں۔ وہ ڈاکٹر مشہود کے نہ سہی' میرے تو ہیں۔ ان کے خانہ ولدیت میں بڑا مشہور اور معتبر نام ہے۔ وہ ایک بہت نامور اور کامیاب ڈاکٹر کے بچے کہلاتے ہیں۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ وہ کس کے بچے ہیں۔ ہیں وہ بھی مجھ پر احسان کرنے والے کسی مرد کے بچے' جس نے میری ضرورت کو سمجھا یا نہیں سمجھا مگر وہ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک بہانہ اور ایک جذباتی سہارا دے گیا۔"

"ضرورت اس نے اپنی پوری کی ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ احسان اس کا صرف یہ ہے کہ اس نے میرا استحصال نہیں کیا' جسمانی اور جذباتی طور پر مجھے بلیک میل اور MISUSE نہیں کیا۔ ان میں ایک تو ڈاکٹر صاحب کا اپنا بھائی تھا۔ کیسے کیسے بھائی ہوتے ہیں دنیا میں نامرعزت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچنے والے بھی اور عزت کے خریدار بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری فیملی کراچی میں ہے لیکن ہم کراچی نہیں جاتے۔ صرف ایک بار ہم شادی کے بعد انہی کے ساتھ گئے تھے اور دوسری بار اس وقت جب ان کے والدین ایک حادثے میں زخمی ہوگئے تھے۔ اب ان کے والد وہیل چیئر پر ہیں۔ ان کی دونوں ٹانگیں حادثے کی نذر ہوگئی تھیں۔ والدہ کئی مہینے آئی سی یو میں پڑی رہیں اور کوما کی حالت میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر مشہود وہاں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ ایک ہفتے بعد واپس آگئے تھے۔ پھر ہر جمعرات کی شام کو جہاز سے آتے تھے اور سنیچر کی صبح کی فلائٹ سے لوٹ جاتے تھے۔ مروت اور دنیا داری کے خیال سے انہوں نے مجھے وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ میں ان کی والدہ کی تیمار داری کرنے والوں میں شامل رہوں۔ چار ہفتے بعد جب ڈاکٹر ان کی طرف سے پُرامید نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر مشہود کی والدہ کو آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا۔ وہاں وہ سب فراہم کردیا گیا جو ان کی زندگی کے لیے ضروری تھا۔ سانس کی آمدورفت کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے۔ ان کے جسم سے بہت سی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ آکسیجن کی، گلوکوز کی، بلغم خارج کرنے والی سکشن مشین کی۔ پیشاب کے لیے۔ کوئی ڈاکٹر نہیں بتا سکتا تھا کہ اس طرح وہ کب تک جئیں گی۔ ان کو ہوش آنے میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا اور ایک سال بھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسی بے ہوشی میں کبھی ان کا دل خاموش ہوجائے اور ان کی طبعی موت واقع ہوجائے۔ اس کمرے میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی ایک بیڈ تھا جو مریض کو ہر ایک دو گھنٹے کے بعد کروٹ بدلوا سکے ورنہ کمر اور جسم کے نچلے حصے میں زخم پڑجاتے ہیں۔ BED SORE کہتے ہیں انہیں۔ کمر اور دھڑ کے نچلے حصے پر اینٹی سیپٹک پاؤڈر لگانا اور گلے میں خرخراہٹ سن کے سکشن پمپ آن کرنا۔ بھر جائے تو پیشاب کی تھیلی بدلنے کے لیے کسی کو بلانا اور اس کے علاوہ انتظار کرتے رہنا کہ انہیں ہوش آجائے یا ضرورت پڑے تو انہیں آکسیجن لگانا۔ یہ سب وہاں رہنے والے کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ یہ بڑا مشکل، بیزار کرنے والا اور بے مقصد کام تھا۔ درحقیقت یہ کوئی کام تھا ہی نہیں۔ وہاں سب باری باری رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بہن، ایک بھائی اور میں پھر ایسا اتفاق ہوا کہ بھائی میرا ساتھ دینے کے لیے دیر تک رکنے لگا۔ دن کے علاوہ رات کو بھی آنے لگا اور تم سوچو کہ یہ سب کتنا عجیب، کتنا غیر انسانی، غیر اخلاقی اور ناممکن سا لگتا ہے کہ ایک بیڈ پر ماں زندگی اور موت کے منہ میں معلق ہو، زندہ لاش کی طرح پڑی ہو اور دوسرے بیڈ پر اس کی بہو اور اس کا بیٹا۔ وہ بیٹا نہیں جس کی شادی اس نے بڑے چاؤ سے کی تھی، وہ سرا بیٹا۔ ایک اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ایسے رہتے ہوں جیسے یہ ان کا بیڈ روم ہے۔ شک کون کرسکتا تھا۔ دیور کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ محبت اور لاڈ والا۔ میری ہمدردی میں اور میرا دل بہلانے کے لیے وہ اکثر رات کو رک جاتا تھا۔ بھابی تو میرے بیٹھے بیٹھے سوگئی تھیں۔ پھر میں کیا کرتا، بس بیٹھا رہا۔ صبح چار بجے انہیں تو اس وقت میں کیسے آتا اور کیا کرتا گھر آکے۔ پھر میں سوگیا۔ اگر آج یہ بات دنیا کو بتائی جائے تو سب صدمے سے چیخ اٹھیں گے۔ اوہ ماں مر رہی تھی اور دوسری طرف اسی جگہ، ایک اسپتال میں، دیور بھابی، توبہ توبہ۔ کیسی انسانیت سوز حرکت ہے۔ شیطان کو بھی شرم آجائے۔ مگر میرے اپنے زندگی کے تجربے نے، مجھے یہ سمجھایا کہ ایسا یا اس سے بھی کہیں زیادہ اسی دنیا میں ہوسکتا ہے جو کسی کی نگاہ نہیں دیکھ پاتی۔ عزت اور شرافت کی نہ جانے کتنی اجلی چادروں پر داغ ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ تین مہینے اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک سب ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ ایک رات نہ جانے کس وقت بے ہوشی کے حصار سے نکل کے موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ اس سے پہلے خود ڈاکٹر مشہود نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس زندگی سے کیا حاصل، اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تیمارداروں کی مشکل آسان کرے۔ ان کے بھائی کا تو یہ کہنا تھا کہ ایسے مریضوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا، دہرا عذاب ہے۔ مرنے والے کے عذاب کو طول دینا اور تیمارداروں پر عذاب مسلط کرنا۔ باہر تو ڈاکٹر علاج بند کردیتے ہیں۔ زندگی کو قائم رکھنے والی ہر چیز ہٹا لیتے ہیں۔ مصنوعی سانس کی مشین، گردوں کا کام کرنے والی DYLASIS مشین، آکسیجن اور گلوکوز ٹیوب۔ بعض اوقات مریض کے لواحقین کی درخواست پر، کبھی عدالت کی اجازت سے۔ ایک ڈاکٹر نے تو ایسے لاعلاج مثلاً کینسر کے مریضوں کے لیے خودکشی کی مشین بنائی تھی۔ SUICIDE مشین کہلاتی تھی وہ۔ اس میں ایسا نظام تھا کہ مریض جب چاہے ایک بٹن دبادے اور اس کے جسم میں ایک زہر قاتل اترنے لگتا تھا جو اسے کسی تکلیف کے بغیر موت کی نیند کا سکون عطا کردیتا تھا۔ عدالت نے ڈاکٹر پر مقدمہ بھی چلایا مگر کچھ ہوا نہیں۔ دراصل جذبات کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب زندگی کی مصروفیت میں فرصت کسی کے پاس نہ ہو، اتنا وقت کون نکال سکتا ہے۔

اس ماں کے لیے بھی۔ جو نہ مرتی ہو نہ جیتی ہو۔ یہی چاہتے ہیں سب کہ وہ مرجائے تو اچھا ہے۔ لیکن ہم نہیں چاہتے تھے۔ میں اور ڈاکٹر صاحب کا بھائی۔ بعد میں تو ہم یہی چاہتے تھے کہ سب اسی طرح چلتا رہے۔ اسپتال کا ماہانہ خرچ ہزاروں میں تھا مگر پیسہ ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ جب وہ اچانک مرگئیں تو ہمیں ایسا لگا جیسے ظلم درمیان سے ٹوٹ گئی ہو۔ ہم نے صبح دیکھا، اور معلوم ہے کیا دیکھا۔ ان کی ہمیشہ بند رہنے والی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہی نہیں، ان کا سر سیدھا نہیں تھا۔ ان کے چہرے کا رخ دوسرے بیڈ کی طرف ہوگیا تھا۔ انہیں ہوش آگیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کسی کو پکارا بھی ہو یا ان کی آنکھوں نے عالم ہوش میں آتے ہی کوئی ایسا منظر دیکھا ہو کہ پھر انہوں نے مرجانا ہی بہتر جانا۔ صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ یہ بوجھ میرے ضمیر پر رہا کہ اس عورت کو جو زندگی کے لیے جدوجہد کررہی تھی، ہم نے قتل کیا۔ قتل صرف خنجر یا پستول سے ہی نہیں کیا جاتا، ایک جھوٹ سے بھی ہوسکتا ہے۔ ایک جملے سے بھی ممکن ہے اور ایک نگاہ سے بھی۔ بس اس کے بعد میرا یہ ہنی مون ختم ہوگیا۔ موت کی دلہن پر کھیلا جانے والا محبت کا کھیل ختم ہوگیا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ لوٹ آئی۔ چھ مہینے بعد میں ماں بن گئی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں پوچھا۔"

وہ ہنس پڑیں۔ "وہ کیا پوچھتے اور کیسے پوچھتے، سارا کھیل ہی جھوٹ کے ساتھ شرافت اور عزت کا بھرم رکھنے کا تھا جسے شادی کا نام دے دیا گیا تھا۔ میں ماں بن گئی۔ وہ باپ کہلائے۔ جب مبارک باد سب نے انہیں دی۔ کسی نے طعنہ نہیں دیا۔ انگشت نمائی نہیں کی۔ پھر ان کو بھی یہی SUIT کرتا تھا کہ باوقار، باعزت طریقے سے مسکراتے ہوئے مبارک باد قبول کرتے رہیں اور مٹھائی بھی بانٹ دیں۔ ان کی خاطر میں نے ایسا ظلم خاموشی سے برداشت کیا تو وہ خاموشی سے بے غیرتی کو برداشت کیسے نہ کرتے۔ غیرت ہوتی ان میں تو شادی ہی کیوں کرتے وہ۔ میں نے ان کی شرط پوری کردی تھی۔ ان کی رسوائی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی شرافت اور نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کو شک بھی نہیں ہوا۔ کسی کے نام پر؟"

"اگر ہوا تو انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد ہم کراچی کبھی نہیں گئے۔ ان کی فیملی سال میں ایک بار آجاتی ہے۔ بھائی اور بہن کی شادی ہوگئی ہے۔ سب اپنے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ میری طرح، پتا نہیں کیوں نامراد یہ ایک بیمار ذہن کی سوچ ہے یا کچھ اور۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ نہ

انوار ملیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
◉ سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُرہا کی داستانِ حیرت۔
◉ سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
◉ عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
◉ سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
◉ سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔
قیمت 250 روپے
محصول ڈاک 30 روپے
بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
اپنے قریبی بُک اسٹال پر آرڈر دے کر بھی یہ ناول منگوا سکتے ہیں۔ اس کی قیمت اور ڈاک خرچ روانہ کرکے منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ بھی ارسال کرسکتے ہیں۔
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۴۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے کتنے گھرانے ایسے ہی شاد و آباد ہوں گے۔ ہمارے گھر کی طرح۔ ان کے پاس سب کچھ ہوگا۔ دولت' صحت' اولاد اور کامیاب نظر آنے والی ازدواجی زندگی مگر اندر کیا ہے۔ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر اسی لیے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ میں پریکٹس نہیں کر سکتی۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں میرے کسی سے مراسم ہو جائیں اور میں ان کے ہم پیشہ افراد میں ان کی پول کھول دوں۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت کم لوگوں سے فیملی مراسم ہیں۔ ان کا دوست کوئی نہیں۔ ایسا دوست جو بھروسے کے قابل ہو۔ ان جیسا آدمی کسی پر بھروسا کیسے کر سکتا ہے۔ شاپنگ کے لیے مجھے انہی کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ اب بچے کچھ سیانے ہو گئے ہیں تو مجھے اتنی آزادی ملی ہے کہ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ مجھے تو اس نوکر پر بھی شک ہے کہ اسے ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے ملازم رکھا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں تو کوئی شک نہیں۔ وہ مجھ پر بھی شک کرتا ہے۔"

"کرتا ہے تو کرے۔ اب اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہو سکتی کہ مجھے روک ٹوک سکے۔ جوتے مار کے گھر سے نکال دوں گی۔ اوقات ہی کیا ہے آخر اس کی۔ میں جس دن چاہوں اس پر دست درازی کی تہمت لگا سکتی ہوں۔"

"خود دست درازی کر کے؟"

"ناصر۔ اتنا گھٹیا سمجھتے ہو تم مجھے؟" انہوں نے بُرا مان کے کہا "میں کیا کوئی بازاری عورت ہوں۔ دو دو ٹکے کے ملازموں کے ہاتھوں رسوا ہونے والی؟ میں نے بتایا تھا۔ شرافت اور عزت کی کھوکھلی دیوار میں رخنہ نہیں پڑ سکتا۔ یہی ہے ہمارے درمیان خاموش مفاہمت کی بنیاد۔ میں میکے جاتی ہوں تو ایک رات سے زیادہ نہیں رک سکتی۔ بچے ضرور ساتھ جاتے ہیں۔ میں پہلے زنانہ رسالوں میں کہانیاں لکھتی تھی۔ شادی کے بعد وہ سلسلہ بھی ختم کرنا پڑا مگر ناصر' پرے نیتوں پر نہیں لگائے جا سکتے۔ یہ نوکر ذرا چالاک ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے ایک بے وقوف عورت کو گھر میں رکھ لیا تھا جو گھر کے اندر کا سارا کام کرتی تھی اور اس کا ایک لڑکا تھا جو باہر کے کام سنبھالتا تھا۔ تھا وہ کوئی اٹھارہ بیس سال کا نوجوان مگر اسے لت پڑ گئی تھی ہیروئن کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا علاج کیا اور پھر اپنے ساتھ رکھا تھا کہ دوبارہ اس لت کا شکار نہ ہو مگر لت خود نہیں لگتی' لگائی جاتی ہے۔ جو یہ کام کرتے ہیں وہ خیال رکھتے ہیں کہ زیرِ دام آیا ہوا شکار نکلنے نہ پائے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو مگر منشیات چھڑانے کا دعویٰ کرنے والے بہت سے اسپتال اور رفاہی ادارے خود انہی کی ملکیت ہیں جو یہ دھندا کرتے ہیں اور وہاں جو شفا کے لیے جاتا ہے وہ اگر ٹھیک ہو جائے تو خود یہی کام کرنے لگتا ہے۔ بہت عرصہ وہ زیرِ علاج رہتا ہے اس کو یہی بتایا' سمجھایا اور دکھایا جاتا ہے کہ اس کاروبار میں کتنا پیسہ ہے اور کتنی آسانی سے کتنی جلدی ملتا ہے۔ خیر' اس لڑکے کا بھی یہی ہوا۔ وہ علاج سے ٹھیک تو ہو گیا مگر خود پڑیاں بیچنے لگا اور ایک دن پکڑا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے چھڑانے سے انکار کر دیا۔ خود اس کی ماں نے کہا کہ رہنے دو اسے وہیں' جوتے کھائے گا تو دماغ درست ہو گا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ پکڑوانے والا کون تھے اور چھڑانے کے وہ اس کو کہاں لے گئے۔ وہ تھانے سے غائب ہو گیا اور اس کا پھر کوئی سراغ نہیں ملا۔ چند ماہ بعد جانے کیسے ایک زنانہ رسالے کا ایڈیٹر مجھے تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ وہ کوئی نیا جوشیلا آدمی تھا جس نے اشاعت بڑھانے کے لیے پرانے لکھنے والوں سے بھی رابطہ کیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ رسالے کا مالک ہو گیا تھا اور اس کو نئے انداز سے چلانا چاہتا تھا۔ اس کو میں نے بہت سمجھایا کہ میری مجبوری یہ ہے مگر وہ ایک نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ میں اپنا نام نہ دوں کہانیاں دے دوں۔ وہ کسی قلمی نام سے شائع کرتا رہے گا۔ یہ ترکیب مجھے بھی اچھی لگی۔ میں چوری چھپے کہانیاں لکھنے اور برسوں بعد قلم آزاد ہوا تو اس کی زبان بے عناں ہو گئی خود میں نے جانتے بوجھتے کچھ نہیں لکھا مگر لاشعور کے مدو سے تمام نا آسودگیاں ایسے نکل آئیں جیسے پکے ہوئے پھوڑے سے پیپ پھوٹ کے بہتی ہے۔ وہ ذہین آدمی تھا کہانیاں بہت پسند آئیں مگر اس سے زیادہ کمائی کا پسند آ گئی پھر میں نے کہانیوں کی زبان میں اس سے وہ سب کہہ دیا میں کہنا چاہتی تھی اور اس نے سمجھ بھی لیا۔ بڑھیا خود ہمارے محرمِ راز بن گئی۔ اسے پیسے کا لالچ تھا۔ میری کہانیوں کی شہرت ہوئی مگر میرے اور اس کے تعلقات کی کسی کو ہوا نہ لگی۔ ڈاکٹر صاحب دن میں تو باہر ہی رہتے ہیں۔ کبھی شہر سے باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ مواقع پھر کیسے نہ ملتے۔ اور بات یہ ہے ناصر کہ اس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے لیا تھا کہ اس کی خاطر میں اپنا گھر بھی چھوڑ دوں گی اور بچے کو بھی۔ بتا دوں گی ڈاکٹر صاحب کو کہ یہ آپ کا بھتیجا چاہیں تو پالیں ورنہ داخل کرا دیں کسی یتیم خانے میں۔ اگر میں ایسا کرتی تو مجھے معلوم ہے کہ وہ رسوائی کے ڈر کچھ بھی نہ کرتے۔ وہ سب سے زیادہ افشائے راز کے خ سے ڈرتے ہیں۔ وہ بچے کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح

کرتے۔"

"اور آپ کے بارے میں لوگوں کو کیا بتاتے؟"

"زیادہ سے زیادہ یہ۔ کہ اختلافات کے باعث الگ ہو گئی ہوں۔ اور کچھ عرصے بعد طلاق دینے کا اعلان بھی کر دیتے۔ بڑی روشن خیالی اور فراخ دلی کے ساتھ۔ کہ کیا فائدہ زبردستی کا۔ وہ عورت ساتھ نہیں رہنا چاہتی' اسے قانون کی مدد سے بیوی نہیں بنا کے رکھا جا سکتا۔ سارا الزام مجھ پر آتا کیونکہ ڈاکٹر صاحب تو فرشتہ ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں ان کی عادات کو اور میرے ساتھ ان کے شریفانہ رویے کو۔"

میں نے کہا "پھر آپ گئی کیوں نہیں؟ کیا وہ راضی نہیں ہوا؟"

"یہ بات نہیں۔"

میں نے کہا "اس کا دل بھر گیا ہو گا آپ سے۔ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ رہنا اسے مشکل لگا ہو گا۔"

"یہ تب پتا چلتا' جب اس کی نوبت آتی۔ یعنی میں کہتی کہ مجھے ساتھ لے چلو یا وہ کہتا کہ میرے ساتھ چلو۔ وہ میرے لیے ساری دنیا کو بھولا ہوا تھا اور اس کا انجام وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رسالہ چلانے کے سارے بلند عزائم اس کی محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کاروبار اور کاروبارِ عشق کو ایک ساتھ متوازن رکھتے ہوئے چلانا آسان نہیں ہوتا۔ رسالہ جتنا اس کے باپ کے زمانے میں چھپتا تھا' اس سے بھی کم رہ گیا۔ ایک میری کہانیوں پر تو اشاعت نہیں بڑھ سکتی تھی۔ ایک وقت آیا جب وہ کسی کو ادائیگی کرنے کے قابل نہ رہا۔ نہ لکھنے والوں کو نہ چھاپنے والوں کو۔ رسالہ بند ہوا تو اسے ہوش آیا۔ ڈوبتی کشتی کو کنارے لگانا محال ہی نہیں' ناممکن ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے ہاتھ پیر مارنے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس پر ایک خاندان کی ذمے داریوں کا بوجھ تھا۔ وہ ایک رسالے میں ملازم ہو گیا۔ ایڈیٹر تو وہ باپ کی جگہ بن گیا تھا۔ دوسری جگہ وہ پروف ریڈر تھا اور اسے کل ملا کے ایک ہزار روپے ملتے تھے۔"

"چنانچہ بھول گیا وہ سارا عشق؟"

"یہی سمجھ لو۔ میں نے اس کی مدد کی۔ وہ مالی مدد قبول نہیں کرتا تھا۔ کسی بہانے بھی نہیں۔ قرض کے نام پر بھی نہیں۔ میری قسم پر بھی نہیں۔ اس کے پاس وقت کم تھا مگر وہ پھر بھی مجھے بھولا نہیں تھا۔ میں نے اس کے مالکوں سے بات کی کہ اس کی تنخواہ دگنی کر دیں۔ باقی میں انہیں دیتی رہوں گی۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور ایسا کیوں کر رہی ہوں۔ میں نے کہا کہ میرا اور اس کا ایسا ہی رشتہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کچھ لینے پر راضی نہیں مگر مالی مشکلات کا شکار ہے۔ اس کی مدد میں ایسے ہی کر سکتی ہوں۔ مالکوں نے میری بات مان لی اور میں نے انہیں ایک بار چھ ماہ کے لیے نو ہزار بھیج دیے۔ اسے حیرانی تو ہوئی کیونکہ وہ اسی فیلڈ کا آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پروف ریڈر کو ڈھائی ہزار ماہانہ کوئی نہیں دیتا۔ وہ سمجھا مالک اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمدردی رکھتے ہیں اس سے کیونکہ وہ خود پہلے ایک رسالے کا مالک تھا۔ ایسی وضع داری اب کہاں ہوتی ہے۔ دو مہینے بعد یہ راز کھل گیا کہ کوئی نامعلوم خاتون اس پر مہربان ہیں۔ چیک بھیج کر میں نے غلطی کی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کے مالک نے اکاؤنٹ نمبر دیکھا اور معلوم کر لیا کہ اکاؤنٹ کسی عورت کا ہے۔ میرا نام ٹھیک تھا مگر پتا پرانا تھا۔ اس سے یہ تو پتا نہیں چلا کہ اب میں ڈاکٹر مشہود کی بیوی ہوں مگر وہ غصے میں بھرا ہوا میرے پاس آیا اور مجھ سے بہت لڑا کہ میں نے اسے ذلیل کرا دیا۔ میں کسی عورت کی کمائی کھاتا ہوں۔ اس نے وہ نوکری چھوڑ دی۔"

خاموشی کے ایک وقفے کو سمجھ کے میں نے کہا "اور آپ کو بھی چھوڑ دیا؟"

"وہ پاگل آدمی تھا۔ اس نے میری کوئی وضاحت یا معذرت قبول نہیں کی۔ اس نے دوسری جگہ نوکری کر لی۔ یہ ایک سیلز مین کی جاب تھی۔ اس نے اخبار رسالوں کی دنیا سے ہی قطع تعلق کر لیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کی بربادی کی ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اسے میں نہ ملتی تو شاید وہ اپنے پروگرام کے مطابق رسالے کی اشاعت بڑھاتا۔ کامیاب بھی ہو جاتا۔ اس محبت نے اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔"

میں نے کہا "عشق نے غالب نکما کر دیا' ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

"کتنا سچ کہا تھا غالب نے" وہ بولیں "میں اسی لیے تم کو یہ سب بتا رہی ہوں کہ تم بھی لگتے ہو جاؤ گے۔ برباد ہو جاؤ گے اگر تم نے اس لڑکی شادو کے لیے اپنا راستہ بدلا۔ تمہارے سامنے ساری عمر پڑی ہے۔ تم جیسے ذہین آدمی کے لیے ترقی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں اپنا بُرا بھلا سمجھتا ہوں۔"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم نہیں سنو گے' وقت خود تمہیں سبق دے گا تو سمجھ میں آئے گا۔"

میں نے کہا "اب وہ کہاں ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کینیڈا میں" بیگم صاحبہ نے کہا "جب مجھے احساس ہوا کہ اس کی زندگی کی تباہی کی ذمّے دار صرف میں ہوں تو میں نے اس نقصان کی تلافی کے لیے ایک قربانی دی' اپنی محبت کی۔ وہ کچھ عرصے ناراض رہا تھا لیکن مجھ سے دور رہنا اس کے بس کی بات ہی کہاں تھی۔ وہ لوٹ آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس نے پہلی بار اصرار کیا کہ میں طلاق لے لوں اور اس سے شادی کرلوں۔ مجھے اس کے مالی حالات کا علم تھا۔ وہ اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرپا رہا تھا۔ میرا بوجھ کیسے اٹھاتا اور پھر اس کے گھر میں مجھے کہاں قبول کیا جاتا۔ میں نے بہت سوچا اور پھر اپنے بھائی کو ایک خط لکھا۔ میں نے لکھا کہ تم نے جو سزا مجھے دی تھی' وہ میں کاٹ رہی ہوں۔ اگر تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے اور تم مجھ سے معافی مانگ کے اسے ہلکا کرنا چاہتے ہو تو تلافی کی ایک صورت ہے۔ تم ایک شخص کو کینیڈا بلوا کے سیٹل کرادو۔ بس اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس میں میرا ہاتھ ہے۔ جیسے یہاں کسی کو معلوم نہیں کہ میری بربادی میں تمہارا ہاتھ تھا۔ وہ ڈر گیا یا واقعی اس نے تلافی کی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ وہ بہت مایوس تھا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کیا ہے؟ ایک ڈگری جو ظلم کی جسے کوئی پوچھتا نہیں۔ کینیڈا جانے کے اخراجات بھی میں پورے نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ تم کوشش تو کرو۔ ممکن ہے کوئی ایسی صورت بن جائے کہ ویزا کے ساتھ ٹکٹ بھی مل جائے۔ گرین کارڈ لاٹری میں تو اس کا نام آیا نہیں مگر اس کو کینیڈا سے جاب کی آفر کی گئی۔ پاسپورٹ ویزا کے سارے مراحل ٹریول ایجنسی کی معرفت طے ہوئے اور ایک دن وہ کینیڈا چلا گیا۔ وہ بہت اداس تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ بعد میں جیسے ہی موقع ملے گا' میں اس کے پاس کینیڈا پہنچ جاؤں گا۔ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ کینیڈا کے سوا میں دنیا کے ہر ملک جاسکتی ہوں۔ جب میری کوشش بار آور ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ مجھے خط نہیں لکھ سکتا تھا۔ کینیڈا سے فون کرتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ نمبر بدلوادیں۔ پتا نہیں کون مجھے پریشان کرتا ہے۔ تین دن میں نمبر بدل گیا۔ بس ــــ کئی سال ہوگئے نہ مجھے اس کی خبر ہے نہ اسے میری۔"

میں نے کہا "وہ خود آسکتا تھا۔ سال چھ ماہ بعد۔"

بیگم صاحبہ تلخی سے ہنسیں "سال چھ مہینے بعد؟ سات سمندر پار سے؟"

"یہ عشق ایسا ہی ہوتا ہے ناصر۔ جذبات کی اتنی عمر نہیں ہوتی اور یہ جو عشق کا دائرس ہے۔ یہ وصل کے موسم میں پھلتا پھولتا ہے۔ جدائی میں زیادہ دن نہیں جیتا۔ تم کہتے کہ میں آپ کو اور آپ کے احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ لو میری بات۔ اگر تمہیں یاد رہے گی تو صرف یہ رات۔"

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں ایک تنکا تھا جسے وقت کی ہوا نے اڑا کے جذبات کے بلاخیز طوفان کی سرکش لہر میں پھینک دیا تھا۔ میری مزاحمت بھی بے سود اور لاحاصل تھی کیونکہ میں تو ہوا سے بھی نہیں لڑسکتا تھا۔ میں آنچ دیتی ہوئی لطافتوں کے اور نرم خوشبوؤں کے بھنور سے کیسے بچ سکتا تھا۔ کسی پینا ٹائز ہوجانے والے کی طرح میں بیگم صاحبہ کی آواز کے سحر میں الجھتا چلا گیا اور سنسنی خیزی میرے حواس پر مکڑی کے جالے کی طرح پھیلتی گئی۔ میری مدافعت خود کو کمزور پڑتے لگی یہاں تک کہ کسی سوئے ہوئے آتش فشاں کی طرح جو اپنے وجود میں جلا کے راکھ کردینے والی آگ سیّال کی طاقت رکھتا ہے' میرے خوابیدہ جذبات کا اندر اندر روکھنے والا سارا لاوا ابل کے نکلا تو مجھے بھی خاکستر کرگیا۔

چنانچہ جب صبح ہوئی تو۔ رات کی طرح' وہ بھی بالکل مختلف اندازِ ناآشنائی رکھنے والی صبح تھی۔ میں اس مسافر کی طرح جاگا جو رات کی تاریکی میں بس سنسان بیابان راستوں کے نشیب و فراز پر ستاروں کی چھاؤں میں بھٹکتا اور پھر تھکن سے ٹوٹ کر کسی چٹان کی سرد آغوش میں سو گیا مگر آنکھ کھلی تو پہاڑ کے دوسری طرف اسے روشن آسمان اور سنہرے سورج کی کرنوں سے جگ مگ کرتی وہ زمین نظر آئی جیسے تو ازل سے ایسی ہی تھی مگر اس کی آنکھ نے پہلے کبھی منظر ایسے نہ دیکھا تھا۔ وہ زمین کے ہموار' سپاٹ راستوں کا مسافر تھا جس نے پہلی بار ایک بلند سرکش اور ناقابلِ محسوس ہونے والے پہاڑ کی سرپہ فلک چوٹی کو سر کیا تھا۔ وہ کسی منصور فاتح کی طرح اپنی زمین کو اس بلندی سے دیکھ رہا تھا تو یہ سارا منظر اور کائنات کا سارا حسن اس کی طاقتِ خراجِ تحسین دیتا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے اس خوشبو کو دیکھا جو مجھے پہچانتی تھی۔ یہ کلون اور باڈی اسپرے کی اور نا لکھم پاؤڈر کی احساس آمیز رکھنے والی خوشبو۔ جو مجھ میں بس گئی تھی مگر کچھ شرمائی میرے کمرے میں اترنے والی صبح کی پہلی کرن سے سر میں کچھ کہہ رہی تھی اور صبح کی وہ پہلی کرن شوخی مسکرا رہی تھی۔ آخرِ شب کے خواب ہنوز میری آنکھوں زندہ تھے اور تنہا ہونے کے باوجود ابھی تک میں اکیلا

تھا۔ گزر جانے والی رات کی سانسوں میں بسا ہوا قربت کے لمس کا ریشمی احساس میرے ساتھ تھا۔ طوفان کے تھپیڑوں میں اڑتے پتوں کی کھنک' سنسناتی ہواؤں کی دلنواز سرگوشی اور طرب انگیز خاموشی سے گونجتی رات کا ہر لمحہ میرے خیالوں میں ٹھہر گیا تھا۔ کسی کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر کی طرح جس میں پھولوں کے' تتلیوں کے اور قوس و قزح کے سب رنگ اپنی ساری شوخی اور بھرپور رعنائی کے ساتھ منجمد ہوجاتے ہیں۔

کسی لہراتی' سیاہ چمکیلی لکیر جیسا نظر آنے والا ایک سیاہ بال کا تمغۂ رفاقت تکیے پر اب بھی محوِ خواب تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اپنی انگلی پر لپیٹ لیا۔ پھر ایک کاغذ میں محفوظ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی مگر وجہ تلاش کرنا عبث تھا۔ جواز عقل تلاش کرتی پھرے' جذبات خود اپنا جواز ہوتے ہیں۔ شاعرانہ استعاروں کی زبان پرانی ہوگئی تھی۔ کلی سے پھول بن جانے کی مثال ایک BIOLOGICAL حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ باقی سب تجربات کا تسلسل تھا جو ایک دن پر مرتکز ہوگیا اور ایسا ہوا کہ اس دن ایک سرکاری سند کی رو سے جو عرفِ عام میں شناختی کارڈ کہلاتی تھی۔ تسلیم کیا گیا کہ ناصر عظیم ایک بالغ مرد ہے اور حادثاتی طور پر ایسا ثابت بھی ہوگیا چنانچہ کل اور آج کے درمیان ماضی و حال کی دوری بہت زیادہ لگتی تھی۔ اس احساس میں بڑی طاقت تھی کہ میں کوئی لڑکا نہیں' ایک مرد ہوں۔ بالغ اور خود مختار' چاہنے اور چاہے جانے کے قابل اور اپنی قوتِ تسخیر رکھنے والا۔

گزشتہ شب ڈاکٹر صاحب یقیناً شہر سے باہر مصروف تھے مگر یہ بات اس بار مجھ سے یوں چھپائی گئی تھی جیسے لوگ انعام والے پرائز بونڈ کو چھپاتے ہیں۔ یہ راز افشا ہوجاتا تو شاید میں پھر ضروری کام سے نکل جاتا اور اس دامِ ہم رنگ زمیں میں گرفتار نہ ہوتا جو صرف میرے لیے بڑی خوب صورتی سے پھیلایا گیا تھا۔

میں غسل کرکے نکلا تو میں نے بچوں کے خدا حافظ کہنے کی اور پھر گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنی جو بچوں کو اسکول لے گئی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل میں بال بناتے ہوئے میں نے بیگم صاحبہ کا بھرپور سراپا اپنے پیچھے دروازے کے فریم میں دیکھا۔

ان کے بال جو ہیئر ڈرائر سے سُکھائے جانے کے باوجود پوری طرح خشک نہیں ہوئے تھے' ان کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اپنا پسندیدہ لباس پہن لیا تھا یعنی ڈاکٹر صاحب کی سفید مردانہ شرٹ اور اپنی جینز۔ ہر عورت اپنی اس ادا کو پہچانتی ہے جو سب سے زیادہ معصوم لگے مگر سب سے زیادہ قاتل ہو۔ بیگم صاحبہ کا یہ روپ رات والے اہتمام کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر دن کے اجالے میں یہی اندازِ محبوبی زیادہ نظر نواز لگتا تھا۔ انہوں نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ میں اور عارض کے رنگ میں حیا کا بڑا شوخ انداز تھا۔ انہیں اپنے جذبات کی بے اختیاری پر کوئی ندامت کی خلش نہیں تھی اور اپنے اختیار کی حد سے تجاوز کرکے تسلط حاصل کرلینے پر معذرت بھی نہیں تھی۔ اپنی قوتِ تسخیر کا غرور بھی نہیں تھا اور احساسِ جرم کی ملامت بھی نہیں تھی۔ وہ ویسی ہی تھیں جیسی ہر روز ہوتی تھیں مگر مجھے بدلی بدلی سی لگ رہی تھیں تو یہ قصور تھا میرے خیال کا۔

میں نے پلٹ کے کہا "آپ بہت اسمارٹ لگ رہی ہیں۔ بالکل ایک کالج گرل کی طرح۔"

میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میرے پاس اور کہنے کو کچھ نہیں تھا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ ایسی ہی کوئی بات سننا چاہتی تھیں چنانچہ مجھ پر لازم آتا ہے کہ میں اخلاقاً ان کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کروں۔

وہ ہنسیں "میرا خیال تھا کہ تم دیر سے اٹھو گے۔"

میرا چہرہ کچھ شرم سے تپنے لگا۔ بالواسطہ طور پر انہوں نے بتادیا تھا کہ میں بہت پہلے اٹھ گئی تھی۔ "آپ نے ــــ ناشتا کیا؟"

"ابھی کہاں۔ بچے اسکول گئے ہیں۔ اب سوچا تھا کہ تمہیں بھی جگادوں۔ آؤ' ناشتا کرتے ہیں" انہوں نے کہا "بھوک لگ رہی ہے مجھے تو۔"

میں نے ان کے شانے کے گرد بازو حمائل کردیا...

"بھوک۔ بھوک تو مجھے بھی پھر محسوس ہورہی ہے۔ حالانکہ کل رات ــــ"

انہوں نے بیچ بیچ شرما کے اور اٹھلا کے اور گھبرا کے میرا ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹادیا "کیا کرتے ہو' دیکھ لے گا کوئی۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "رات کو بہت زیادہ کھالیا تھا باہر۔ کیا پھر ڈاکٹر صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

انہوں نے نظر بھر کے مجھے دیکھا اور سر ہلایا "ہاں" اور اس ایک نظر میں وہ سب کہہ دیا جو الفاظ میں کہنا مشکل تھا کہ ایک رات میں نے دروازہ کھلا رکھا تھا مگر تم بھاگ گئے تھے بزدل۔ جب تم نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا پھر میں کیسے نہ آتی'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب تم جانتے ہو کہ میں ہی مجبور تھی۔

ہم ناشتے کی میز پر بیٹھ گئے۔ میں اب احساس کے ردِعمل کا شکار ہو رہا تھا۔ میرا ذہن معاشرے کی اور مذہب کی اخلاقی زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ میں عادی مجرم بھی نہیں تھا کہ ہر واردات کے بعد اپنے اسکور کو دیکھ کر فخر محسوس کرتا۔ میں ندامت محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے میں بھاگ جاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا رویہ کسی اعترافِ جرم کا اشتہار بن جائے۔ مجھ پر محسن کشی اور احسان فراموش ہونے کا الزام ثابت ہو جائے۔ مجھے اب اپنی کمزوری پر شرم آ رہی تھی۔ میرے لیے ایک عورت کی گرفت سے نکل جانا ناممکن نہیں تھا۔ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو خود کو چھڑا کے بھاگ جاتا۔ مگر میں نے وہ وقت خوف کی اسیری میں گزار دیا جب میں جام توڑ سکتا تھا۔ پھر شراب کے نشے نے مجھے اسیر کر لیا۔

آج میں وہ نہیں جو کل تھا۔ نیت کا حال خدا جانتا ہے مگر لذتِ گناہ سے آشنا ہو کے میں نے اپنی معصومیت گنوا دی ہے۔ اب میں شاد ہو سے کیوں کہ میں تمہارا ہوں' صرف تمہارا۔ تو یہ سو فیصد سچ نہیں ہو گا۔ شاید سچ ہی نہیں ہو گا۔ اور اسی جھوٹ کو وہ میرا سچ مانتی رہے گی۔

بیگم صاحبہ نے کہا "کس سوچ میں گم ہو آخر۔ ناشتا کرو۔"

میں نے چونک کے کہا "جی۔ آپ چائے بنائیں۔"

"ناصر۔ ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

میرا لقمہ حلق میں اٹک گیا "پوچھیے۔"

"کیا واقعی تم اس لڑکی سے بہت محبت کرتے ہو جو ایک فقیرنی ہے۔ اتنی کہ اس کی خاطر تم سب کچھ چھوڑ سکتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے اس میں؟ کبھی تم نے سوچا؟"

میں نے کہا "یہ سوچنے کی بات ہی نہیں۔"

"نہ وہ اتنی حسین ہے۔ نہ کسی طرح بھی تم جیسے غیر معمولی شخص کے قابل۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ پہلی لڑکی ہے۔ ہر پہلی چیز آدمی کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کالج میں پہلا دن' پہلی ڈگری' پہلا عشق اور پہلی کار۔ یا پہلا اپنا گھر۔ بعد میں جذبات بدل جاتے ہیں تو بہت سی باتیں جذباتی حماقت لگتی ہیں۔"

"ضروری نہیں کہ سب کے جذباتی تجربات کا حاصل ایک ہو۔"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ مگر ناصر' جتنا میں تمہیں جانتی ہوں' اس سے مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کہیں رک بھی سکتے ہو۔ کسی بھی مقصد کا حصول تمہارے لیے مشکل نہیں ہو گا۔ لیکن وہ مقصد تمہاری منزل نہیں بن سکتا۔ کوئی جذبہ' کوئی عورت' کوئی کامیابی تمہاری پیش قدمی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تم قناعت پسند نہیں ہو۔ تم حد سے زیادہ AMBITIOUS ہو۔"

میں نے کہا "کیا یہ خامی ہے میری؟"

"نہیں۔ بہت بڑی خوبی ہے۔ بس کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور دیکھو' میری نیک خواہشات ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔ کبھی کوئی مشکل ہو' جو میری مدد سے آسان ہو جائے تو مجھے اجنبی مت سمجھنا۔ پھر آ جانا میرے پاس۔"

"میں واپسی کا قائل نہیں ہوں۔ میں آج چلا جاؤں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پھر نہیں ملیں گے۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں ایک بدنصیب عورت ہوں۔ کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے دوبارہ ملنا پسند نہیں کرتا۔"

"ایسا نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ آپ نے مجھے جو حوصلہ و اعتماد دیا' وہ کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔"

"تمہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟ پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "آپ تو جانتی ہیں۔ پونے دو لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔"

پھر ہم ایک بوجھل خاموشی کے حصار میں چائے کے کپ سامنے رکھے بیٹھے رہے۔ اس جمود کو ٹیلی فون کی گھنٹی نے توڑا۔ ملازم نے مجھے فون کا ریسیور تھمایا اور بولا "رئیس ہے کوئی۔ پتا نہیں نام کیا ہے۔"

میں نے ریسیور لے لیا "تم ضرورت سے زیادہ بولتے ہو۔ اب جاتے بھی ہو کہ جاتے جاتے میں تمہاری بتیسی توڑ کے تمہاری ہتھیلی پر رکھ جاؤں۔"

وہ ڈر گیا اور گھبرا کے بھاگ گیا۔ دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ابے یہ کیا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے کہا "یار معاف کرنا' میں تجھ سے نہیں کہہ رہا تھا۔"

"مجھے ابھی ملا ہے تیرا فون نمبر۔ رانجھا رات کو بھول گیا تھا" وہ بولا۔

"یار' تو ہے کہاں؟"

"یہ مت پوچھ پیارے' تیرا عشق ہمیں بہت مہنگا پڑا۔"

"کیوں۔ کیا ہوا۔ تو ٹھیک تو ہے نا؟"

"بس یار۔ زندہ ہوں یہی کافی ہے ورنہ اس سالے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے گولیوں سے بھون کرنے میں۔"

مجھے اس کے لہجے سے اذیت کا احساس ہو رہا تھا "کیا وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"

"ہاں۔ مگر اپن بھی ہو گئے پتھر کہ لو بیٹا' اب جوتے مارو ڈنڈے یا سر پہ لے۔ بت ٹوٹ سکتا ہے بول نہیں سکتا۔"

"یار' مجھے سخت افسوس ہے۔"

وہ زبردستی ہنسا "افسوس کیا پیارے! ایسا تو ایک دن ہونا تھا۔ ہم بھی جانتے تھے' تو بھی جانتا تھا۔"

میں نے اپنے دل میں اضطراب اور بے چینی کو کسی ہشت پا کی طرح پنجے گاڑتے محسوس کیا "رئیس۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو نے؟"

اس نے معمولی سے توقف کے بعد کہا "بتانے کو کیا ہے یار۔ کیا تو خود اندازہ نہیں کر سکتا؟"

میں نے کہا "اچھا میں آتا ہوں۔"

"آجا۔ سب فون پر تو نہیں بتایا جا سکتا۔ میں نے رانجھا کو بتا دیا ہے' وہ تجھے لے آئے گا میرے پاس۔"

میں نے کہا "فکر مت کر رئیس۔ میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔"

اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے تھے۔ انہوں نے بریف کیس ایک کرسی پر رکھا اور دوسری پر خود بیٹھ گئے۔

"بھئی بیگم! ناشتا کرا دو۔ بڑی تھکن ہو رہی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "اب آپ اسپتال جائیں گے۔"

"اور کیا چھٹی لے کے گھر بیٹھ جاؤں۔" انہوں نے ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی تھی "آج اسپتال میں بھی ایمرجنسی ہے۔ کل ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ زخمی لائے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"فرمائیے" انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"مجھے معلوم ہے آپ بہت ناراض ہیں اور مایوس ہیں مجھ سے۔ میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔"

"بھائی غلطی تو ہماری ہوئی نا کہ توقعات وابستہ کر لیں۔ زمانہ ایسا ہے کہ اولاد نہیں سگی ماں باپ کی۔"

ان سے بحث میں مزید تلخی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے بات کو مختصر کیا "میں جا رہا ہوں مگر میں آپ کا بہت احسان مند ہوں۔"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ نہ میں احسان کا قائل ہوں اور نہ احسان کرنے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر بھی تھینک یو ویری مچ۔ شاید کسی دن آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے مجھے معاف کر دیں۔ آپ کی محبت اور شفقت نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ ایک ایسے وقت میں جب میرا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ گھر مل گیا۔ یہ میرا اپنا گھر تھا۔ مجھے یہاں تحفظ حاصل رہا' عزت ملی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی' آئی ایم سوری کہ یہاں سے جانا میرے لیے ناگزیر ہو گیا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتے رہے اور بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے۔ معلوم نہیں انہوں نے میری بات کا کیا مطلب لیا۔ کیا سوچا اور کیا سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دماغ میں ایک ہی خیال آیا ہو گا۔ شاید یہ کہ میں ان کی ازدواجی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کی بیوی کی غیر ضروری توجہ اور حد سے بڑھ جانے والی دلچسپی سے پریشان ہو گیا تھا۔ کمزوری ان کی اپنی تھی جس سے ہمیشہ دوسرے فائدہ اٹھاتے رہے تھے۔ غالباً انہوں نے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھا ہو گا اور یہ تسلیم کر لیا ہو گا کہ میں اس گھر سے اس لیے بھاگنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر محسن کشی کا الزام نہ آئے۔ یہ نہ کہا جائے کہ میں نے جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔

ان کے رویے میں اچانک رونما ہونے والی خوش گوار تبدیلی کو میں اور کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ غالباً انہوں نے فرض کر لیا کہ میں ان کے گھر میں انہی کا نمک کھا کے ان کی عزت اور شرافت کے لیے خطرہ بننے پر تیار نہیں اور میرے لیے یہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت ہے۔ یہی ناگزیر حقیقت ہے جس کا میں کھل کے اظہار نہیں کر سکتا۔

انہوں نے مسکرا کے کہا "ارے' یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو۔ ریلیکس ہو جاؤ۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ اسے جیسے چاہو جیو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم جو بھی کر رہے ہو' غلط نہیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری ثوبت فیصلہ پر پورا اعتماد ہے اور تمہارے مستقبل پر بھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا واقعی آپ ایسا سمجھتے ہیں؟"

"آف کورس۔ اینڈ آئی وش یو دی بیسٹ آف لک۔ جاؤ اور کامیابی کی جدوجہد میں دن رات ایک کر دو۔ یہ دنیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مواقع سے بھری پڑی ہے مگر صرف ان کے لیے جو غیر معمولی ہوں۔ ذہانت اور صلاحیت میں OUTSTANDING ہوں۔ اینڈیو آر اے جینیئس' آئی نو۔"

ڈاکٹر صاحب اسپتال جانے لگے تو میں نے بھی اپنا سامان اٹھالیا۔ بچے اسکول جاچکے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیگم صاحبہ کو الوداع کہنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ ان کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ ملازم نے مجھے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں اور انہوں نے تاکید کی ہے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

مجھے معلوم تھا کہ بند دروازے کے پیچھے وہ بستر پر لیٹی رو رہی ہوں گی۔ ان میں میرا سامنا کرنے کی اور مجھے رخصت کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ آخری وقت کسی غیر متوقع جذباتی بحران سے بچ کے نکل جاؤں۔ میں باہر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کرکے موڑلی تھی "ہاں بھئی چلیں؟ بیگم صاحبہ کو خدا حافظ کہہ دیا۔"

"یس سر۔ وہ ذرا کچن میں مصروف تھیں" میں نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب مجھے سیدھے بینک لے گئے۔ وہاں انہوں نے اکاؤنٹ میرے نام کرنے کی قانونی کارروائی پوری کی۔ میں نے نیا فارم بھرا اور اس کے ساتھ اپنے شناختی کارڈ کی کاپی لگادی۔ ڈاکٹر صاحب نے ضامن کی حیثیت سے دستخط کیے اور پھر مجھے مبارک باد دی۔ انہوں نے بینک منیجر سے بھی کہا کہ اب میرے چیک قبول کیے جائیں اور مجھے دبئی جانے کے لیے حسب ضرورت رقم فراہم کردی جائے۔

بینک سے باہر آکے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اب کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ تم کہو تو میں چھوڑ آؤں؟"

میں نے کہا "تھینک یو سر۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"

"دیکھو ناصر۔ جب تم نے اسے اپنا گھر کہا ہے اور سمجھا ہے... تو جب ضرورت پڑے آجانا۔ اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ دبئی سے فون کرتے رہنا ہمیں۔ گڈ لک بوائے' وی ول مس یو" انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ مار کے کہا۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا ان کی کار کو ٹریفک میں گم ہوتے دیکھتا رہا پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہاں مسٹر ناصر عظیم' تمہاری زندگی کی کتاب کا ایک باب ختم ہوتا ہے لیکن کاتب تقدیر کے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی اور جیسا کہ انگریز کہتے ہیں THE SHOW MUST GO ON۔

میرے سامان میں ایک سوٹ کیس اور بیگ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں رکھنے کے بعد میں نے ڈرائیور کو پتا سمجھایا اور تقریباً آدھے گھنٹے تک ہچکولے' دھواں اور گرد و غبار کھانے کے بعد مسٹر رانجھا کے سامنے جا اترا۔ وہ شربت فروش کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ رنگ برنگی بوتلوں میں شربت کی تمام اقسام نظر آرہی تھیں مثلاً شربتِ بادام' شربتِ انار' شربتِ بنفشہ اور شربتِ شمشوت۔ پھلوں کے خواص پر تحقیق کے بعد انہوں نے بیجوں پر ریسرچ کی تھی اور تربوز سے کریلے تک درجنوں اقسام کے بیج ان کے خزینۂ حکمت میں دستیاب تھے چنانچہ اب وہ تقریباً تمام امراض کا شرطیہ علاج کرسکتے تھے اور مریض کی حالت کے پیش نظر خود ہی طے کرتے تھے کہ اسے کتنے بیجوں کا سفوف کس قسم کے مرکب شربت میں ملا کے دیا جائے۔

میں کچھ دیر اس بینچ پر بیٹھا جس پر ایک سفید ریش بزرگ عصا تھامے اپنے اعضائے رئیسہ کی جملہ شکایات کا دفتر کھولے بیٹھے تھے اور مسٹر رانجھا کسی حکیم حاذق کی طرح ہر شکایت کے لیے کسی نہ کسی مرتبان سے کوئی بیج نکال کے ایک کونڈی میں ڈالتے جارہے تھے۔ ہر بار وہ مریض سے تصدیق کے لیے دہراتے تھے کہ "اچھا بزرگو' گردے میں گدگدی ہوتی ہے۔ لوجی فیر یہ چار عدد مغز اتھاں۔ اور... دل کبھی سچے ہوجاتا ہے کبھی کچھے۔ لیمنٹ رائٹ کرتا ہے۔ دو تولہ شربت شلغم' دو تولہ شربتِ مفرحِ قلب۔"

بالآخر شکایات تمام ہوئیں اور مسٹر رانجھا نے تمام بیج کونڈی میں رگڑ کے اس گلاس میں ڈالے جس میں مختلف شربت جمع ہوگئے تھے۔ اس مکسچر کو انہوں نے کچھ پڑھ کے تین بار دائیں سے بائیں گھمایا۔ پھر کچھ اور دم کرکے تین بار مخالف سمت میں۔ بزرگوار نے اسے حسب ہدایت ہر بار قل ہو اللہ پڑھ کے ایک ایک گھونٹ پیا۔ میں نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا تھا مگر اب مجھے یہ پریشانی لاحق تھی کہ کہیں شربت ختم کرتے ہی بزرگوار کے سامنے فرشتۂ اجل نہ آدھمکے کہ بزرگو' شربتِ اکسیر ہے مگر سوری' یور ٹائم از اوور۔

جب وہ عصا کے سہارے لڑکھڑاتے اور لمبی لمبی ڈکاریں لیتے رخصت ہوگئے تو مسٹر رانجھا نے کہا "ابھی تو نہیں جاسکتا جی میں آپ کے ساتھ۔ شام کو چلیں گے۔ میرا مطلب ہے رات کو۔ یہ ٹائم ہے اپنے دھندے کا۔"

غصے سے میرا بُرا حال ہوگیا "پھر اتنی دیر سے کیوں بٹھا رکھا تھا مجھے؟"

"ہوجی' آپ خود ہی بیٹھ گئے تھے تو میں کیا اٹھاریتا۔ جلدی ہے تو پتا سمجھ لو اچھی طرح۔ اللہ کرے آپ کا بندہ ٹھیک ٹھاں مل جائے۔ سانس چل رہی ہو۔ ویسے امید کم ہے' بڑی چھینی لگائی ہے جی۔"

"کس نے مارا ہے اسے؟"

"اوجی' یار دوست تو ہو نہیں سکتے' دشمن ہی ہوں گے۔"

"اچھا تم پتا سمجھاؤ" میں نے جھنجا کے کہا۔

خلافِ امید پتا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ پہلا ہی شخص جس سے میں نے پتا پوچھا مسٹر رانجھا کی سات پشتوں کے کرتوت بھی جانتا تھا۔ اس نے کہا "وہ پاگل دا پتر جو شربت بیچتے بیچتے حکیم تے ڈاکٹر بن گیا ہے۔ اپنے آپ کو مسٹر رانجھا کہلاتا ہے۔ چلو چنگا اے اس کی ہیر بھی دیکھ لینا۔ بس ذرا مضبوط دل رکھنا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور مجھے ہیر رانجھا کے گھر کا راستہ دکھادیا۔

وہ ایک کچی تنگ اور غلیظ گلی میں کھنڈر جیسا مکان تھا۔ گلی وہاں کے معصوم اور قوم کے نونہالوں کے لیے پلے گراؤنڈ بھی تھی اور دن دہاڑے ایک اوپن ایئر لیٹرین بھی جسے ایک مستقبل کا معمار اس وقت بھی استعمال کررہا تھا۔ قریب ہی دروازے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی پڑوسن کو ایک شرمناک عشق کی واردات کا آنکھوں دیکھا حال مزے لے لے کے سنارہی تھی۔

چند قدم آگے ایک ناقابل یقین حد تک موٹی اور سیاہ رو عورت نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ وہ اتنی موٹی تھی کہ جانے میں نہ سمانے والی بات اپنی جگہ' مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گلی میں سے گزرے تو سامنے سے آنے والا کوشش کے باوجود بچ کے نہیں نکل سکتا۔ وہ دیوار سے لگنے کے باوجود دب کے چپٹا ہوجائے تب بھی الزام آتا کہ حرامی عورتوں سے ٹکراتا ہے راہ چلتے۔ اسے ریورس گیئر میں الٹے پاؤں چل کے خاتون کو راستہ دینا پڑتا ہوگا۔ وہ کسی بدذات تے نامراد کی اس اشتعال انگیز کارروائی پر پھٹنے کے قریب تھی جو مسلسل ہر رات ہورہی تھی اور جس کا نمونہ عین اس کے دروازے پر موجود تھا۔ شرارت کرنے والا بدبختی کا شکار بھی لگتا تھا۔ شاید اس سے لڑنے والی خاتون نے دوران گفتگو اپنے میاں کا پیٹ خراب ہونے کا ذکر کیا تھا کہ وہی ملزم قرار دے دیا گیا تھا۔

خاتونِ اول یعنی مسٹر رانجھا کی ہیر تھی۔ میں قدرت کی ستم ظریفی پر مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ مسٹر رانجھا تقریباً ڈھانچا تھے اور ایکس رے کی طرح نظر آتے تھے۔ ہیر کو دیکھ کر دنت کے منہ میں زیرے کی مثال ذہن میں آتی تھی۔ اتنی وسیع و عریض ہیر کے لحیم شحیم وجود میں رانجھا بھی ایسے ہی کھو جاتا ہوگا اور خود اصل ہیر کی روح کو کتنا صدمہ ہوگا کہ اس کی رومانی داستان پر اتنی فلموں کے بعد اس کے نام کی کیسی مٹی پلید ہورہی ہے۔

میرے سوال پر جنگ میں وقفہ آگیا۔ اس نے مجھے' میرے سوٹ کیس اور بیگ کو غور سے دیکھا "کیا کام ہے تمہیں رئیس سے۔ رئیس تو تم لگتے ہو۔ وہ تو اتنا غریب ہے کہ مررہا ہے مگر علاج نہیں کراسکتا۔ اوپر سے آگئے ہو تم مہمان بن کے۔" اس نے ہاتھ سے لکڑی کے ایک زینے کی طرف اشارہ کیا جس پر چڑھنا سرکس میں کام کرنے والے کے لیے بہت آسان ہوتا۔ میرے لیے وہ پل صراط کی طرح تھا۔ میں کسی بھی مرحلے میں پھر وہیں پہنچ سکتا تھا جہاں سے بلندی کا سفر شروع کیا تھا۔

رئیس کا کمرا چار دیواروں اور ایک ٹین کی چھت پر مشتمل تھا۔ وہ تقریباً اندھیرے میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کے وہ بولا "ابے آجا۔ ادھر۔ باہر سے آیا ہے نا اس لیے کچھ نہیں دکھائی دے گا ابھی۔"

میں نے سوٹ کیس اور بیگ رکھ دیا۔ "لائٹ نہیں ہے کیا؟"

"ہے پیارے۔ مگر صرف رات کو جلانے کی اجازت ہے۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی اجازت کی' سوئچ کہاں ہے؟"

لائٹ جلانے کے بعد میں نے اسے دیکھا۔ بظاہر وہ ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اس کی ہڈیاں سلامت تھیں اور وہ زخمی بھی نہیں تھا مگر اس کا جوڑ جوڑ درد کررہا تھا۔ پاؤں کے تلوے سوجے ہوئے تھے اور وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

"بیٹھی مار لگائی ہے سالوں نے" اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا "رات بھر میں پلپلا کردیا۔ شاہ جی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ نہ بتائے تو اس کی لاش سے پوچھنا۔ مگر اپنی کچھ پرانی یاری کام آگئی۔ اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں پولیس میں۔ تھانے دار نے میری بات سنی اور مجھے فرار کرادیا۔"

"کیا یہاں نہیں آسکتا شاہ جی!" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ تھانے دار نے اسے بتادیا ہوگا کہ بندہ تفتیش کے دوران میں ہی گو ویٹ گون ہوگیا۔ اس نے کہا تھا مجھ سے کہ پھر نظر مت آنا ورنہ سچ مچ غائب کردوں گا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ مجھے واقعی تیرا پتا ٹھکانا نہیں معلوم۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس میں جھوٹ بھی کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جھوٹ سچ ان کے ماننے کی بات ہے پیارے۔ اس سے پہلے والا تھانے دار تو یہی کہتا تھا کہ تیرا جگری یار' اور تجھے پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہے۔ اب بچائے گا تو خود نہیں بچے گا صبح تک۔"

میں نے دکھ سے کہا "بات اس کی بھی غلط نہیں۔ آج کل کون کسی کا ایسا یار ہوتا ہے کہ جان دے دے مگر پتا ٹھکانا نہ بتائے۔ تجھے کچھ پتا ہے شادو کا؟"

"دیکھا تو نہیں۔ سنا ہے اس سے خود شاہ جی نے پوچھا تھا۔ مان گئے ہم تو پیارے' قسم اللہ کی' بڑی جی دار لڑکی ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ اچھا ہے تم مار دو ورنہ میں تو خود مرجاؤں گی زہر کھا کے۔ اور یار' وہ سچ مچ کود گئی کھڈ کی سے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شاہ جی کو مصیبت پڑ گئی۔"

غصّے کی انتہا اور صدمے کی شدت سے میرا جسم آتش فشاں بن کے دہکنے لگا "میں نے کل رات دیکھا تھا اسے۔ شاید شاہ جی اسے اسپتال لے گیا ہوگا۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح اسے تلاش کرتے کرتے مجھے عامر مل گیا تھا اور اب تک اس نے شادو کو میرا پیغام دے دیا ہوگا۔ شادو نے مجھے فون بھی کیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے مجھے رات کو ایسے وقت میں بتایا جب میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ رئیس یہ سنسنی خیز اسٹوری زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں دلچسپی رکھتا تھا "یار' شروع سے بتا۔"

میں نے کہا "کیا بتاؤں یار۔ وہ تو چمٹ گئی بلا کی طرح۔ صبح جان چھوڑی اس نے تو میں نکل آیا۔ ابھی ساری رات کی بات سنانے کا ٹائم نہیں ہے۔"

"یار میں کیا خاطر تواضع کروں تیری۔ ٹھیک ہوتا تو چلتے کہیں باہر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "تو لیٹا رہ آرام سے" میں نے کہا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ رئیس کو اس طرح چھوڑ کر جانے میں خطرہ ہے "بلکہ ایسا کر۔ تو چل میرے ساتھ۔ میں اٹھا کے لے جاؤں گا اگر تو خود نہیں چل سکتا۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ آخر یہاں بھی گرتا پڑتا آ گیا تھا۔ مگر۔"

"میں تجھے اسپتال لے کر جاؤں گا پہلے۔ تو فکر مت کر۔ سب مجھ پر چھوڑ دے۔ یہاں تو محفوظ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج ہی میں بندوبست کروں گا کسی مکان کا۔ کل پرسوں تک شادو بھی آجائے گی۔ اس کے بعد ہم مل کے سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

رئیس کو میں سہارا دے کر لے گیا۔ ہیر کو میں نے سمجھا دیا کہ اس کا سامان ابھی یہیں رہے گا۔ رئیس کو میں اسپتال لے جا رہا ہوں۔ کرائے کے واجبات وغیرہ کا حساب میں خود آ کے کروں گا۔ میرے پُراعتماد انداز اور ڈانٹنے والے لہجے نے ہیر کو لگام دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے رئیس کو ایک ٹیکسی میں ڈالا اور سیدھا ڈاکٹر مشہود کے اسپتال لے گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پھر ان کے سامنے تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئے "بھئی یہ کیا' لوٹ کے بدھو۔"

میں نے کہا "بدھو جیسے آپ نے ہی کہا تھا کہ جب مدد کی ضرورت ہو آجانا۔ یہ میرا دوست ہے۔ اسے پولیس نے خواہ مخواہ آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ کے دو دن رکھا اور بہت مارا۔ اس کی صورت پر مت جائیے۔ یہ بہت شریف آدمی ہے۔"

انہوں نے سر ہلایا "اچھا تم کہتے ہو تو مان لیتے ہیں' میں اس کو دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' اسے داخل کر لیں۔ ایک دو دن کے لیے' پلیز!"

میری عاجزانہ درخواست کے بعد وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے ایک وارڈ بوائے کو بلا کے حکم دیا "اس مریض کو جنرل وارڈ میں لٹاؤ۔ اور اس کے ٹیسٹ وغیرہ کراؤ۔ میں سلپ بنا کے دیتا ہوں۔ نام کیا ہے تمہارے دوست کا بھئی؟"

میں نے کہا "فقیر محمد۔ ولد امیر محمد۔ عمر چوبیس سال۔"

انہوں نے مسکرا کے پرچی پر نام لکھا اور وارڈ بوائے کو پکڑا دی۔ رئیس نے جانے سے پہلے میری طرف دیکھا "یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ تو جا کے آرام سے لیٹ۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ خطرے کی کیا بات کی تم نے؟"

میں نے کہا "دراصل۔ اسے زبردستی پکڑوا دیا تھا کچھ لوگوں نے' دشمنی میں۔"

"ہوں" وہ سوچ کے بولے "یہ کرتا کیا ہے؟"

میں نے کہا "غبارے بیچتا ہے شام کے وقت۔ دن میں ایک دکان میں کام کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی پوچھتا ہوا آئے تو۔"

انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی "اسپتال میں کون آسکتا ہے۔ تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ تمہارا دوست اب ہمارا مہمان ہے۔"

میں نے ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور سیڑھیاں اُتر کے نیچے آیا۔ ابھی میں برآمدے میں ہی تھا کہ شاہ جی کی گاڑی

گیٹ سے داخل ہوئی۔ گاڑی کو وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی صورت کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔

○☆○

رخشی کی صورت کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے۔ اس نے میرے قریب آ کے میرے کان میں سرگوشی کی "اس سے کہہ دو کہ میں بعد میں بات کروں گا۔ رات کو کسی وقت۔"

میں نے اپنا ہاتھ فون کے ماؤتھ پیس پر رکھ دیا تھا تاکہ دوسری طرف کوئی ہماری گفتگو نہ سُن سکے "آخر یہ۔ کیا معاملہ ہے؟"

"پہلے تم اسے ٹالو۔" اس نے جھنجلا کے کہا۔

میں نے ہاتھ ہٹا کے کہا "مسٹر ٹائیگر۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس وقت بڑی جلدی میں ہوں۔ ایک پولیس کانفرنس میں لوگ گھنٹا بھر سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں وہیں سے بات کر رہا ہوں" وہ بولا۔

"اچھا! مجھ سے پہلے پہنچ گئے ہو تم وہاں؟"

"یہ تم پوچھ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب تمہیں ہماری زیادہ ضرورت پڑے گی۔ اپنی حفاظت تمہارے لیے آسان نہیں ہوگی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ میں رات کو تم سے بات کروں گا۔"

"کیا وقت دوں میں باس کو؟"

میں نے دل ہی دل میں اس نامعلوم باس کو ایک گالی دی "یار وقت کا کیا ہے۔"

"یعنی دس۔ بارہ بجے؟" وہ بولا "اسی جگہ؟"

اس گفتگو کا سر پیر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے رخشی کی طرف دیکھا "رخشی۔ مجھے یہ کوئی خطرناک معاملہ لگتا ہے۔ یہ ٹائیگر کون گدھا ہے اور پرنس کس الو کے پٹھے کا نام ہے۔ ایسے نام تو ڈرگ مافیا کے یا اسلحے وغیرہ کے اسمگلر استعمال کرتے ہیں۔ جاسوسی ناولوں میں اور فلموں میں وہ باس یا ڈان' پرنس یا کنگ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک سمجھے تم!" رخشی نے کہا "فلمیں بعد میں بنتی ہیں۔ پہلے ہر کردار عملی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔ چاہے وہ ٹیلی مجنوں کی کہانی ہو یا سہراب ڈاکو کی۔ پرانے مراسم تو نبھانے ہی پڑیں گے تمہیں۔"

"پرانے مراسم۔ یعنی شاہ عالم کے پرانے مراسم۔"

وہ مسکرانے لگی "کیا تمہیں بار بار یاد دلانا ضروری ہوگا کہ اب تم ہی شاہ عالم ہو۔ اس کا نام صرف سیاست کا حصہ نہیں' کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں سیاست میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کیا شاہ عالم کی کامیابی اور ترقی صرف ذاتی صلاحیت' ذہانت' ہمت اور جدوجہد سے تھی۔"

اس کی بات سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہ سامنے کی بات تھی جو میری عقل میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ آخر میری نظر تصویر کا صرف ایک ہی رخ کیوں دیکھتی رہی۔ میں شاہ عالم کے ماضی سے واقف تھا۔ اس کے کردار کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس ملک کی عمارت جن چار ستونوں پر استوار تھی ان میں سے دو کو کرپشن اور بے ضمیری' خود غرضانہ مفاد پرستی اور ہوس کی دیمک نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ پریس کو جو ریاست کا ایک ستون تھا اسے بھی جزوی طور پر بدعنوانی کی دیمک چاٹ گئی تھی اور دبے لفظوں میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ عدلیہ کے چوتھے ستون کو نچلی سطح پر یہ دیمک لگ گئی ہے۔ سیاست داں جو پہلے ہی آدھا ملک بیچ کے کھا گئے تھے اب مردار خور گدھوں کی طرح منتظر تھے کہ باقی آدھے کا بھی کام تمام کر دیں۔ جاں بہ لب معیشت۔ دم توڑتی اخلاقی قدریں۔ آئین اور قانون کی نفی کرنے والا سیاسی اور معاشرتی نظام انہی کی چیرہ دستی کا آئینہ دار تھا۔ مایوس عوام قائداعظم کے پاکستان کو اس کی گولڈن جوبلی سے پہلے ہی اندر کے دشمنوں کے ہاتھوں اسی انجام کو پہنچتا دیکھ رہے تھے جیسے مغلوں کی عظیم سلطنت کو غداروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مل کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیا تھا۔

میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں نے اتنی محنت اور

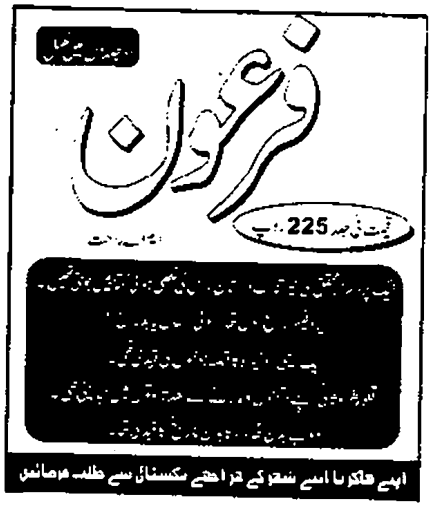

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانفشانی سے کوئی خوش قسمتی کا خزانہ حاصل نہیں کیا ہے۔ مصائب اور خطرات سے بھرا ہوا پنڈورا کا باکس خرید لیا ہے۔ میں بڑی بہادری سے جدوجہد کرکے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ بڑی ذہانت سے مشکلات کی دلدل میں اُتر گیا ہوں۔

رخشی نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا مسٹر شاہ عالم!"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "رخشندہ۔ تم کو یہ سب معلوم تھا؟ تم جانتی تھیں کہ شاہ عالم اور کیا کرتا تھا؟"

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں فاتحانہ طنز تھا اور انتقامی تلخی تھی۔ بلاشبہ وہ سب جانتی تھی چنانچہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نہ ہنگامہ کرنے کی نہ شور کرنے کی۔ نہ میری جعلسازی کا پردہ چاک کرنے کی اور نہ مجھے صحیح مشورہ دینے کی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں بڑے شوق، جذبے اور انہماک کے ساتھ اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں جہاں ٹائیگر اور پرنس جیسے لوگ پہلے ہی میرا استقبال کرنے کے لیے موجود ہیں۔ وہ اب مجھ پر بالادستی حاصل کر چکی تھی۔ میں جو خود کو یزامداری سمجھتا تھا اب محض ایک پرغمالی تھا۔

"تم نے بہت جلدی کی۔ اگر تم معلوم کر لیتے کہ شاہ عالم کیوں بار بار بانگ کانگ اور سنگاپور جاتا ہے، بیرونی ملکوں کے دورے کرتے ہیں صدر یا وزیراعظم۔ وزرا اور جنرل یا بیوروکریٹ، شاہ عالم ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف ایک بزنس مین تھا مگر تم اس کے کاروبار کی نوعیت کو سمجھتے تو تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ جس دولت سے اس نے سیاست کی دکان چمکائی تھی، وہ جائز ذرائع سے نہیں آسکتی۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کیا تم بھی۔۔۔"

اس نے کہا "ہاں۔ براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ طور پر میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شوہر سے زیادہ میرا باس تھا۔ لیکن نہ وہ اچھا شوہر تھا اور نہ اچھا باس۔ جب میں نے تمہارا موازنہ اس سے کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ ہر لحاظ سے تم کو اس پر ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ شوہر کی مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں لیکن باس بدل جائے تو اچھا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا "یعنی اب میں اس کی جگہ انڈرورلڈ کا جانشین بھی ہوں۔"

"جانشینی میں ڈنل رول نہیں چلتا۔ اوپر کی اور نیچے کی دنیا میں اب تم ہی شاہ عالم ہو۔ ٹائیگر اور پرنس کو اور بہت سے دوسرے لوگوں کو اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"تم جیسے سیانے آدمی کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں تم کو نئے سرے سے شاہ عالم بنانا پڑے۔ وہ سب کو تربیت دے کر اپنی مرضی کا آدمی بنا لیتے ہیں۔ اور انکار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص مجبور ہوتا ہے۔ اپنی وجہ سے نہیں، ان کی وجہ سے جن کو وہ اپنا سمجھتا ہے۔"

رخشی نے سب بالکل واضح کر دیا تھا۔ اب یہ پوچھنا بیکار تھا کہ ٹائیگر اور پرنس کون ہیں۔ نہ جانے اس جیسے کتنے ہوں گے جن کے نام بھی ایسے ہی ہوں گے اور کام بھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی تو میں سمجھ گیا کہ یہ اشرف کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے خیال آیا کہ پریس کانفرنس میں ٹائیگر نام کا کوئی شخص بھی ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کون ہے؟ کیا خٹک اور قریشی میں سے کوئی؟ تیور یا اشرف! وہ مجھے جانتا ہے مگر میں اسے کیسے پہچانوں گا؟

"خیال کو کنٹرول کرو۔" کسی بازگشت کی طرح میرے لاشعور نے مجھے خان اعظم کی آواز میں پکارا اور گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کرکے خیالات کے انتشار کو ختم کرکے اپنی ساری توجہ ایک خیال پر مرتکز کرنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے مجھے پریس کانفرنس سے نمٹنا ہے۔ باقی مسائل سے اس کے بعد نمٹا جا سکتا ہے۔ ایک وقت میں ایک مسئلہ یکسوئی مانگتا ہے۔

موبائل کی گھنٹی بہت دیر بجنے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ اب میں نے اشرف سے رابطہ کیا "میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

اشرف نے کہا "ہم نے یہاں ایک مشکوک شخص کو پکڑا ہے سر۔ اس کے پاس انٹری پاس نہیں تھا۔ تلاشی پر اس کے پاس سے ایک سائلنسر والا ریوالور برآمد ہوا اور ایک موبائل فون۔"

میں نے کہا "تم نے نام پوچھا اس کا؟"

"نام تو اس نے شہزادہ سلیم بتایا ہے اپنا۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شہزادہ یعنی پرنس "اس کے موبائل فون کا نمبر کیا ہے؟"

اشرف نے مجھے نمبر بتایا۔

میں نے اشرف سے کہا "ایک بار پھر بتاؤ۔"

اشرف نے نمبر دہرایا تو میں شکوک کا شکار ہو گیا۔ معلوم نہیں کیوں یہ نمبر اعداد کے مطابق وہی لگتا تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے نوٹ کیا تھا۔ ٹائیگر صاحب نے جس فون سے بات کی تھی، اس کے آخر میں ۴۵۶۷ تھا اور شہزاد سلیم کا نمبر ۴۵۶۷ پر ختم ہوتا تھا۔ میں کنفیوژن میں مبتلا ہو گیا یا تو عجلت تھی اور ذہن پر بیک وقت بہت سے مسائل کا بوجھ ہونے کے باعث میں نے یہ نمبر اپنے موبائل پر دیکھا تھا۔ وہ مجھے غلط یاد تھا یا پھر دونوں نمبر واقعی ملتے جلتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خود کو ٹائیگر کہنے والے شخص کا وہی نمبر ہو اور زیادہ آسان ترتیب کے ساتھ پرنس نے ویسا ہی دوسرا نمبر منتخب کر لیا ہو۔ کیا پتا باقی سب کے فون نمبر، جن سے میں ابھی تک متعارف نہیں تھا، انہی چار اعداد کا مرکب ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں نے بڑی ہمت اور ہوشیاری سے کسی اچانک سامنے آجانے والے بھیڑیے کا خاتمہ کرکے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ چیتے نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا جو عیاری، خونخواری اور برق رفتاری میں شیر سمیت سارے درندوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ میرا وقتی احساسِ تحفظ رخصت ہو گیا تھا اور مجھے نئی فکروں نے گھیر لیا تھا۔ سیاست کے شعبدہ باز میرے نزدیک صرف مداری تھے جو اپنا کھیل دکھا کے ہمیشہ سے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے آئے تھے۔ چرچل نے کہا تھا کہ کامیاب سیاست داں وہ ہے جو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ جمع عام میں اپنے دلائل اور خطابت کے کمال سے یہ کہہ سکے کہ کیا ہوگا اور جب وہ نہ ہو تو زیادہ بہتر دلائل اور خطابت کے اس کمال سے اسی مجمع کو قائل کر دے کہ ایسا نہیں ہوا۔

لیکن یہ ٹائیگر اور پرنس جیسے لوگ جو سیاست داں نہیں ہوتوں کی طرح اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے تھے اور ان پر کسی مداری کا جادو نہیں چل سکتا تھا۔ میں انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا اور نہ ان کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اور اعتراف کرکے اپنی جان چھڑا سکتا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میری توبہ، میرے باپ کی توبہ جو میں پھر کبھی خود کو شاہ عالم کہوں۔ میں ناصر عظیم ہی بھلا۔ خدا کے لیے مجھے بخش دو۔

اب ساری دنیا مجھے خطرناک اور مشتبہ نظر آنے لگی تھی۔ صورت ... سے کون بتا سکتا ہے کہ جو شریف آدمی ہے ... وہ کسی ڈرگ مافیا کا یا اسلحے اور کرنسی کے اسمگلر کا ایجنٹ ہے۔ میں نے اپنے نئے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو غور سے دیکھا۔ ان کی صورت کے نقوش میں سختی اور سفاکی صاف محسوس ہوتی تھی۔ کوئی گن مین یا سیکیورٹی گارڈ بھی تو ان کا ایجنٹ ہو سکتا ہے۔ اور کیا پتا اشرف بھی ان کا آلۂ کار ہو اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میری حفاظت کے لیے نہیں، نگرانی کے لیے خاص بندے لگا دیے ہوں۔

میں نے کہا "ڈرائیور صاحب۔۔۔"

اس نے مونچھیں ہلا کے اپنی عاجزانہ مسکراہٹ کو نمایاں کیا۔ "سر جی۔ ہم کہاں سے صاحب ہو گئے۔"

میں نے اس کی مونچھوں کے اصلی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سوال مناسب نہیں سمجھا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام جی۔۔۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی نے پہلی بار اس سے نام پوچھا ہو "اماں تو۔۔۔ اللہ اسے جنت نصیب فرمائے، شہزادہ بولتی تھی۔"

"شہزادہ۔۔۔ تم ہی۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔

"آہو جی لیکن اپنا بولتا تھا۔۔۔ حرام زادہ۔ تو جناب عالی، ہم نے کہا کہ بس بابر ہی کافی ہے۔ ویسے بھی سر بابر تو شہنشاہ تھا۔ شہزادہ کدھر ہو گیا۔ بابر علی اچھا ہے۔ اور بابر علی کی کیا بات ہے جی، بڑا ظالم ہیرو ہے جی۔ میری تو شکل بھی ملتی ہے اس سے کچھ۔۔۔" اس نے اپنا نصف چہرہ وائزے میں سمٹا کے میرے سامنے کیا۔

میں نے کہا "ہاں ملتی ہے۔ اس کی بھی دو آنکھیں، دو کان اور ایک ناک ہے مگر تم سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ پہلے کیا کرتے تھے تم بابر؟"

"پہلے بھی ڈرائیوری کرتا تھا جناب!" اس نے افسوس سے کہا جیسے میں نے اس کی مہارت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے یہ فرض کر لیا تھا کہ پہلے وہ مالی یا موچی تھا "لوجی، جرمنی کی مینڈک گاڑی (اس کی مراد غالباً فاکس ویگن سے تھی) سے لے کر اٹھارہ وہیل کے ٹرالر تک سب چلایا ہے۔ سرٹیفکیٹ دیکھ لو بے شک۔ اپنے فیلڈ مارشل ایوب خان کی گاڑی بھی چلائی ہے سر جی۔ انہوں نے شاباش دی کہ واہ جوان دے پتر۔ کل سے تو نے پائلٹ فائٹر جہاز اڑانا ہے۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا جی کہ میں زمین پر ہی چنگا۔ او جناب، اپنے پیر صاحب گولڑا شریف مرحوم تو بولتے تھے کہ بابر ایسی گڈی چلاتا ہے تو کہ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"کسے پتا نہیں چلتا، گاڑی کو؟" میں نے کہا اور اسی وقت گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے اچھلی اور سائڈ میں لگے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے درخت کے جھنگلے کو ناک آؤٹ کرتی ہوئی پھر سڑک پر آگئی۔ بڑی گاڑی کے ٹائر بڑے نہ ہوتے تو کھلے گڑھے میں ایک پہیا ضرور رک جاتا۔ "سرٹیفکیٹ سب مرحومین کے ہیں یا کوئی ایسا بھی ہے جو زندہ بچ گیا ہو۔ تمہاری ڈرائیونگ کے باوجود؟"

اس نے مجھے ایک درجن نام گنوائے۔ کاٹا کا چھاگڈز ٹرانسپورٹ کمپنی سے چھانگا مانگا راکٹ بس سروس کے مالکان تک لیکن بدقسمتی سے میں ان سب شہرۂ آفاق ہستیوں کے اسمائے گرامی سے ناواقف تھا۔

اب میں نے دوسرے سے پوچھا "باڈی گارڈ صاحب۔ آپ بھی اپنا تعارف کرادیں ذرا مختصر۔"

"ابھی ایبن بادشاہ زادہ ہے۔ بادشاہ زادہ ولد خان زادہ۔ ضلع اور تحصیل مردان۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "تم بھی بادشاہ ہو۔"

"بادشاہ زادہ جیب۔ آفریدی پٹھان۔ تیئس سال فوج میں نوکری کیا۔ توپ خانہ میں باؤس نائک ریٹائر ہوا۔"

میں نے کہا "بڑی ترقی کی تم نے ماشاء اللہ۔ توپ چلانا تو آتا ہوگا۔ نشانہ کیسا ہے؟"

"آپ بولے گا تو بتائے گا۔ قسم خدا کا' اپنا سر کے اوپر رکھو ایک دانہ کشمش۔"

"کشمش نئیں اوئے' کشش" ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں وئی۔ ایک دانہ رکھو اور چالیس قدم کا فاصلہ پر کڑا ہوجاؤ۔ حق متی کھل کر کے۔ ایک گولی چلائے گا' کشمش اُڑجائے گا۔"

"سر کے ساتھ۔ کشمشِ حیات سے نجات۔ دیری گڈ بادشاہ سلامت۔"

"بادشاہ زادہ" اس نے کہا۔

گاڑی پارٹی کے سیکریٹریٹ والی بلڈنگ کے سامنے ہی تھی کہ ایک جیپ اس کے آگے چلنے لگی۔ اشرف نے سر نکال کے اشارہ کیا مگر بابر نے اسے نظرانداز کردیا۔ اس کی توجہ بیک ویو مرر میں اپنی مونچھوں پر تھی' میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "کدھر دیکھ رہے ہو۔ آگے اشرف صاحب کی گاڑی ہے۔ اس کے پیچھے چلو اور دیکھو' اپنے سامنے سے شیشہ ہٹوادو اپنے چہرے سے مونچھیں۔ گاڑی چلاتے ہوئے تم دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔"

بادشاہ زادہ نے میرے مؤقف کی حمایت میں ایک اور دلیل دی "بابر علی کا ایسا جھاڑی کا جیسا مونچھ کدرا ہے' خانہ خراب۔"

بابر نے اسے خونی نظروں سے گھورا مگر کچھ بول نہ سکا۔

لینڈ کروزر اب جیپ کے پیچھے آفس کی پچھلی طرف پہنچ گئی تھی۔ اشرف علی کے چھلانگ مار کر اترتے ہی بادشاہ زادہ نے اپنی کلاشنکوف سنبھالی اور بڑی مستعدی سے باہر کود گیا۔ اس وقت لینڈ کروزر بھی رینگ رہی تھی مگر اس کی بدقسمتی کہ وہ میری طرف لپکنے والے ایک فوٹوگرافر سے ٹکرا گیا۔ فوٹو گرافر تو کیمرے سمیت گرا مگر میرے محافظ کو بھی غالباً اس کی اپنی کلاشنکوف لگنے سے ناک پر چوٹ آئی۔ فوٹوگرافر دوسروں سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے سامنے والے دروازے پر مجمع عام دیکھ کر یہ نظریہ قائم کیا ہوگا کہ حفاظتی عملہ مجھے پیچھے سے لے جائے گا۔ نظریہ درست تھا مگر محافظ سے تصادم اور اس کے نتیجے میں کیمرا ٹوٹ جانے سے اس کی ساری ہوشیاری دھری رہ گئی۔

ان کی لڑائی خاصی دلچسپ تھی مگر مجھے اشرف نے کھینچ لیا "آپ بھی کمال کرتے ہیں سر۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار' مجھے عمران خان اور گواسکر یاد آگئے تھے۔"

اشرف بھونچکا رہ گیا "جی؟"

میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "ان کی لڑائی پر شرطیں لگتی تھیں۔ ایک بار کسی نے دھوکے سے عمران خان کو شراب پلادی تھی تو وہ ہار گیا تھا۔ بڑے اچھے مرغے تھے۔"

اشرف کو یہ تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ میں نے پریس کانفرنس میں ایسی ہی بے سروپا گفتگو کی تو کل سُرخیاں کتنی نشہ آور ہوں گی۔ اس کا یہ شک فطری سی بات تھی کہ میں نے گھڑی کی طرف نہیں دیکھا اور گھڑا دیکھ کے پیتا رہا۔ شاہ عالم پیتا تھا مگر پبلک میں اپنے زہد اور پرہیزگاری کے دعوے کی نفی اپنے رویے سے نہیں کرتا تھا۔

"ویسے تو صورتِ حال بالکل کنٹرول میں ہے۔ بس آپ خود کو کنٹرول کریں۔"

میں نے کہا "اشرف۔ جہانگیر کہاں ہے؟"

وہ چونکا "جہانگیر۔ وہ کون ہے؟"

"بھئی وہ شہزادہ سلیم!" میں نے کہا "تم نے تاریخ نہیں پڑھی شاید۔ یہی شہزادہ سلیم بعد میں جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہوا تھا۔"

"وہ۔ ہم نے باندھ کے ڈال دیا ہے ابھی تو ایک طرف۔"

میں نے کہا "شہنشاہ بابر اور ایک بادشاہ سلامت میرے

ساتھ تھے۔ کیا زمانہ آگیا ہے اشرف علی۔ ایک پرنس مجھے دربار فون کرچکا ہے۔ آخر یہ سب شاہی خاندان میرے پیچھے کیوں پڑگیا ہے اور وہاں 'ایک چیتے نے بھی پریشان کر رکھا ہے مجھے۔ موبائل فون نمبر پر کال کرتا ہے۔"

اشرف حواس باختہ نظر آنے لگا "سر۔ میرا خیال ہے۔ آپ ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں اور ایک کپ کافی پی لیں۔ اس سے کافی فرق پڑے گا۔"

میں نے کہا "تم میری فکر مت کرو۔"

"نہیں سر۔ آپ کا اس حالت میں پریس کے سامنے جانا۔"

میں نے اپنے آپ کو دیکھا "کیا ہوا ہے آخر مجھے؟ کیا میں نے ٹکی پر زنانہ فراک پہن رکھی ہے یا یہ چارلی چپلن کا سوٹ لگتا ہے۔"

"میرا مطلب تھا' آپ پر کچھ نشے کا اثر ہے۔"

میں نے ایک قہقہہ اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "میں ٹھیک ہوں یار اشرف' شراب کو میں ہاتھ تو کیا پاؤں سے ٹھوکر تک نہیں لگاتا۔ مجھے تو لسی پی کے بھی نشہ ہوجاتا ہے۔ دراصل کچھ نیند کی گولیاں۔"

اس نے گھبرا کے کہا "آپ نے نیند کی گولیاں کھالیں؟ اُف۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "بے وقوف۔ جملہ پورا سنو۔ نیند کی گولیاں کھالی تھیں شبنم نے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔ اس کی وفات۔"

وہ اچھل پڑا "وفات۔ یعنی وہ مرگئی۔ آپ کے گھر میں۔؟"

"اشرف۔" میں نے سر پکڑ کے کہا "پھر آدھے جملے پر اُچھلے میں تم کو اوپر چھت تک اچھال دوں گا۔ اس کی وفات ہوجاتی تو مصیبت آجاتی۔ میں نے بلالیا ڈاکٹر فاروقی کو بروقت۔ اب چلو۔"

مرکزی کانفرنس ہال میں جہاں میں اپنے مزار کی تعمیر کے مسئلے پر کمیشن کے اجلاس میں شرکت کرچکا تھا' بڑی بدنظمی تھی۔ آگے والی کرسیوں کو سینئر صحافیوں اور خواتین کے لیے مخصوص کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی' ان پر فوٹوگرافر چڑھ گئے تھے اور ان کی ٹانگوں میں سے رپورٹروں نے لمبے لمبے ڈنڈوں والے مائیک آگے نکال لئے تھے۔ میرے اندر آتے ہی ہڑبونگ میں تو کچھ فوٹوگرافر فلیش چمکانے کی کوشش میں میز پر گرے تو کچھ رپورٹروں کے مائیک کرسیوں پر براجمان صحافیوں کے سر پر لگے۔ باہر سے کچھ لوگ سگریٹ کے ٹوٹے بجھاتے اندر لپکے۔ معاملہ عام لوگوں کا ہوتا تو پارٹی کے سیکیورٹی گارڈ جو ایف اے ایف۔ فاتح عالم فورس کہلاتے تھے' سب کو پکڑ دھکڑ کے یا ڈنڈے مار کے کنٹرول کرلیتے مگر صحافی برادری کے ساتھ ناشائستہ سلوک بھی اپنی دُرگت بنوانے کے مترادف ہوتا۔

شمس اور قریشی بڑی کوشش سے دو خاتون صحافیوں کے ساتھ بیٹھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اشرف نے میرے لئے راستہ بنایا مگر میری کرسی خالی نہیں تھی۔ اس پر محترم وکرم ابوبکر آزاد صاحب بڑی شان سے تشریف فرما تھے۔ اشرف انہیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور ان سے مصافحہ کیا۔ "میرے لیے دوسری کرسی لے آؤ" میں نے کہا۔

وہ ایک دم اٹھے "بھئی وعلیکم السلام! وہ کیا ہے کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" انہوں نے پان کے ملغوبے کو اپنے منہ کے مکسر میں ہلاتے ہوئے ارشاد کیا "مگر وہ بھی تو ہے گویا کہ دیر آید درست آید۔"

میں نے کہا "آپ تشریف رکھئے۔"

"ہاں ہاں۔ رکھیں گے وہ بھی۔ آخر آئے کس لیے ہیں مگر ہماری تشریف کے لیے وہ چاہیے گویا۔ ایڈیٹر کی کرسی۔ اور یہ ہے چیئرمین کی کرسی تو میاں غائبانہ قبضے کی روایت تو اب ختم ہوجانی چاہیے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور سرخ پیک کے ذرات کی شاور میری قمیص کے کالر پر پڑی۔

میں نے انہیں زبردستی بٹھادیا "ایسی بات نہیں ہے حضرت' صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔"

"بھئی خوب کہا۔ ہم چیئرمین تو ہوں گے نہیں اس پر اپنی تشریف رکھ کے گویا۔ اپنی وہی اوقات رہے گی کہ جو ہے۔ خیر' بڑا اچھا کیا تم نے جو لوٹ آئے عدم آباد سے۔"

میں نے دوسری کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "عدم آباد جائیں میرے دشمن۔"

انہوں نے تائید میں سر ہلایا "بے شک' بے شک۔ ایسے ہی کچھ جذبات تمہارے دشمنوں کے بھی ہوں گے گویا تمہارے لیے مگر ہوتا تو وہی ہے نا برخوردار کہ جو گویا منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

اشرف نے اس وقت تک سب کو خاموش کرادیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر وہی جھوٹ پوری تفصیل سے دہرایا جس کو اب سارے زمانے سے صداقت کی سند حاصل ہوچکی تھی۔ بڑے اخباروں کے نامی گرامی صحافی مجھ سے سخت خفا تھے کیونکہ میں نے اس سے پہلے جس پریس کانفرنس سے خفیہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر خطاب کیا تھا' اس میں انہیں عمداً نظرانداز کرتے ہوئے بالکل غیر معروف اور کسی حد تک بدنام صحافیوں کو مدعو کرلیا تھا۔ زرد صحافت کا الزام رکھنے والے یہ صحافی آج سرخرو تھے اور ایک فتنہ قسم کا چھوٹے قد والا باریش رپورٹر بار بار چلا رہا تھا "حق کا بول بالا۔ جھوٹے کا منہ کالا" جملے کا آدھا حصہ وہ ایک انگریزی اخبار کے چیف رپورٹر کی طرف منہ کرکے کہتا تھا جس کا رنگ کافی حد تک اس کے ڈارک سوٹ سے میچ کررہا تھا۔

شمس اور قریشی نے ان بڑے صحافیوں کو اکسا کے اپنی مایوسی اور کمینگی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی پارٹی پر قبضہ کرنے کی حسرتیں ادھوری رہ گئی تھیں۔ میرا بیان ختم ہوتے ہی سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔

انگریزی اخبار کے مسٹر بلیک مین نے میز پر ہاتھ مارا "مسٹر شاہ عالم! جب عمرورا زکا قتل آپ کے ایک ہم شکل نے کیا تو آپ ہانگ کانگ میں تھے۔ آپ کا وہ ہم شکل آخر کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس کا جواب آپ اسی سے پوچھئے گا۔ میدانِ حشر میں وہ بھی ہوگا میں بھی اور آپ بھی۔"

اس نے لوگوں کے ہنسنے کی پروا نہیں کی "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خود آپ نے اسی مقصد کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں؟"

میں نے سوچ کے کہا "اگر اسے بنیاد بنا کے آپ ایک اعلیٰ اختیاراتی عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کردیں تو میرے سیاسی حریف آپ کی بھرپور حمایت اور مدد کریں گے۔"

"یعنی ثبوت نہیں ہے آپ کے پاس؟" ایک اور شخص چلایا۔

میں نے ہر جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھا اور کہا "سوری۔ میرا خیال ہے کہیں گرگیا۔"

اب ایک اور صاحب بڑے طمطراق سے کھڑے ہوئے۔ "آخر آپ اتنا عرصہ خاموش تماشائی کیوں بنے رہے؟"

"تماشائی خاموش نہ رہے تو اسے ہال سے نکال دیا جاتا ہے۔ میں بھی شور کرتا تو مجھے قتل کرنے والے کہتے۔ سوری۔ ہم نے تو غلط آدمی مار دیا اور پھر مجھے مار دیتے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر کیا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں میرا سامنے آنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔"

"یعنی آپ روپوش تھے۔ آپ کو پتا ہے ان ہنگاموں میں کتنا مالی اور جانی نقصان ہوا' جو آپ کی وجہ سے ہوئے۔"

میں نے کہا "میری وجہ سے؟ آپ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ ان کی وجہ سے ہنگامے ہوئے جنہوں نے شاہ عالم کی شناخت میں غلطی کی۔ مثلاً میرے دوست جو یہاں تشریف فرما ہیں۔ شمس صاحب اور قریشی صاحب!"

میرے اشارے پر ساری گردنیں ان کی طرف گھوم گئیں۔ ان کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ "شاہ جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" شمس بولا۔

"آپ بتایئے انہیں کہ آپ نے ایک جعلساز کو کیوں نہیں پہچانا۔ کیسے اسے شاہ عالم تسلیم کرلیا تھا؟" میں نے کہا۔ "آپ تو پرانے ساتھی ہیں میرے۔"

شمس نے بڑی مشکل سے کہا "میں۔۔۔ میرا کیا۔۔۔ یہ سب اور اپنے قریشی صاحب بھی تو ہیں۔ تیمور سے پوچھئے۔"

میں نے کہا "تیمور صاحب نے تو اسے شاہ عالم کبھی نہیں مانا۔ وہ میرے ساتھ تھے اور میری وائف کے علاوہ کراچی کے ایئرپورٹ پر بھی انہوں نے ہی مجھے ریسیو کیا تھا۔"

میں نے کہا۔

ایک انگریزی ہفت روزہ میں دھانسو قسم کے کالم لکھنے والی خاتون صحافی شمشاد عرف شمی نے کہا "مسٹر شاہ عالم! کیا یہ صحیح ہے کہ جب آپ نے اپنے زندہ ہونے کا اعلان کیا تھا تو سارے شام کے اخبارات کے نمائندے اور غیر معروف صحافی بلائے گئے تھے۔ سوائے ہمارے سب سے سینئر ساتھی جناب ابوبکر آزاد کے۔"

ابوبکر آزاد نے اونگھتے ہوئے سر اٹھایا "کیا؟ بھئی یہ ہمارا نام آیا ہے گویا تمہاری زبان پر۔ اے شہ شمشاد قداں۔۔۔ جب جوانی نہ رہی۔"

بہت سے لوگ ہنسنے لگے کیونکہ شمشاد عرف شمی کا قد پانچ فٹ سے بھی پانچ انچ کم تھا۔ شمی نے جل کے کہا "جوانی کے اسٹیشن پر تو آپ کی زندگی کی ہال گاڑی رکی ہی نہیں تھی۔ آپ شریک تھے اس پریس کانفرنس میں۔"

آپا صفیہ نے سر ہلایا "اس کی گواہی دینے والا اس ریسٹورنٹ کا مالک بھی تھا۔ وہ پہچانتا تھا آپ کو۔"

"مگر آپ اس کے بعد روپوش ہوگئے تھے' آخر کیوں؟" شمی نے کہا۔

ابوبکر آزاد صاحب نے کچھ دیر غور کیا "بھئی وہ ایسا ہے عزیزو کہ اپنی یہ صورت تمہارے جیسی تو ہے نہیں کہ دنیا کو دکھاتے پھریں۔ ہم تو گویا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے کسی کو۔ اب دیکھو نا' ایک شخص آگیا ہمارے سامنے

اچانک اور کہنے لگا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ ہم نے کہا کہ بھئی بہت خوب' اچھا کیا جو واپس اسی دنیا میں لوٹ آئے۔ اس نے کہا کہ میں گیا ہی نہیں تھا کہیں تو پھر آنے کا کیا سوال۔ ہم نے کہا کہ یہ بات ہے گویا تو پھر بسم اللہ۔ اعلان کردو پریس کانفرنس میں کہ مردہ زندہ ہوگیا۔ جس کا جی چاہے مانے' جو نہیں مانتا نہ مانے۔"

میں نے کہا "پریس کانفرنس میں یہ اعلان کرنے کا مشورہ مجھے ابوبکر آزاد صاحب نے ہی دیا تھا۔ یہ اس کے علاوہ بھی ایک مرتبہ مل چکے تھے مجھ سے۔"

ایک صحافی نے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے سر!"

انہوں نے غور سے دیکھ کے کہا "سر۔ ہاں ٹھیک ہی لگتا ہے باہر سے گویا۔ اندر کا حال نہیں معلوم۔۔۔ تم چیک کرالو احتیاطاً۔"

اس نے خفگی سے ہنسنے والوں کو دیکھا "کیا آپ ملتے رہے تھے اس روپوشی کے زمانے میں شاہ عالم سے؟"

"بھئی ملاقاتی تو تقدیر ہے گویا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ان کا چلبلی کے ساتھ ایک خاص انس کا رشتہ ہوگیا ہے۔ اس کا مزاج ذرا ناساز ہو اور یہ پہنچ گئے سوئے اتفاق سے یا تائیدِ غیبی سے گویا۔ چشمِ بد دور' ان کا دیدار کافی ہوتا ہے۔ چلبلی پر جوانی آجاتی ہے گویا۔ ایسا ایک بار' نہیں دو بار ہوا غالباً۔ ہم تو تھانے بھی گئے تھے ایک ساتھ۔"

"شاہ عالم کے ساتھ؟"

"ہاں بھئی' ہم تینوں۔ یہ' چلبلی اور ہم' تین ہی ہوئے نا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "جی تین ہی ہوئے۔"

"آزاد صاحب' کیا آپ نے کہا تھا ان سے کہ خفیہ پریس کانفرنس کرو؟"

"خفیہ؟" میں نے کہا "پریس کانفرنس اور خفیہ۔ اگلے دن اس کی روداد مع تصاویر شائع ہوگئی تھی۔ ہاں یہ کچھ میری غلطی تھی اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میرا سب سے رابطہ نہ ہوسکا۔ جن سے ہوا وہ پہنچ گئے تھے۔ میری نیت کا یا مقصد کا غلط مطلب ہرگز نہ لیا جائے۔"

ایک شرپسند صحافی نے جو شاہ عالم اور شبنم کے ذاتی مراسم کے بارے میں بے بنیاد اور سنسنی خیز خبروں کو اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے استعمال کرتا تھا' سوال کیا "کیا وجہ ہے شاہ جی کہ شبنم نے آپ کو نہیں پہچانا تھا؟"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "دراصل شبنم سے میری صرف ایک بار سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔"

پھر کچھ لوگ ہنسے اور مذکورہ صحافی کا قہقہہ سب سے بلند اور استہزائیہ تھا "صرف ایک بار۔۔۔"

"جی ہاں۔ اس وقت وہ اپنے شوہر روبن گھوش کے ساتھ نگار ایوارڈ لینے آئی تھیں۔ اتنی بڑی ہیروئن تھیں وہ۔"

"میں منحانی شبنم آغا کی بات کررہا تھا" وہ لوگوں کے ہنسنے پر چلانے لگا "انہوں نے یہ ماننے سے انکار کردیا تھا کہ شاہ عالم کی ہلاکت ہوگئی ہے۔ اس لیے دوبارہ پوسٹ مارٹم کی قانونی کارروائی کی جائے لیکن جب رپورٹ سے اس کے شک کی تصدیق ہوئی تو اس نے بھری عدالت میں رپورٹ کو غلط کہا۔"

"جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ آپ صحافی لوگ ہیں اور وہ بھی آپ میں سے ہی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟" میں نے جھک کر آگے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی "بتایئے انہیں مس شبنم!"

کسی نے پیچھے سے کہا "یہاں کہاں جی' اس نے تو بن باس لے لیا۔"

ایک شخص نے گانے کی کوشش کی "جوگن بن جاؤں گی سیاں تورے پیار میں۔"

"یہاں کیا شاہ جی' پتا کریں اس دنیا میں بھی ہے وہ یا نہیں؟"

میں نے کہا "آپ لوگ بات کو جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی پڑھا تھا کہ اس تمام عرصے میں' میں شبنم آغا کے فلیٹ میں موجود تھا۔"

"آپ کو وہاں دیکھا گیا تھا۔" کسی نے کہا۔

"مجھے کہاں کہاں نہیں دیکھا گیا یہاں' ہانگ کانگ میں۔ پھر بیک وقت لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اور اس جگہ جہاں وہ جعلی آدمی مارا گیا۔"

"کیا آپ کا اخلاقی اور قانونی فرض نہیں بنتا تھا کہ فوراً اس غلط فہمی کو دور کرتے؟"

"اور خطرہ تھا کہ نقل کے ساتھ اصل بھی مٹا دی جائے گی تو آپ حکومت سے حفاظت کی درخواست کرتے۔ آخر اتنی نااہل نہیں ہے ہماری پولیس۔"

میں نے کہا "پھر کتنی نااہل ہے؟ کیا پولیس اس شخص کو بچا سکی جس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اسے پولیس نے خود مارا۔ جیسے لیاقت علی خان مرحوم کے قاتل سید اکبر کو خود ایک انسپکٹر نے مارا تھا۔ اس فرض شناسی کے مظاہرے پر عوامی احتجاج کے باوجود اسے ترقی دے کر ڈی ایس پی بنا دیا گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ پھر میں کیسے فرض نہ کرتا کہ میرے خلاف سازش خود برسراقتدار حکومت کے ایما پر ہوئی تھی۔ میں اسی حکومت سے تحفظ مانگتا۔"

"اس ایک سال میں سب سے زیادہ وزیراعظم بدلے۔ نواز شریف صاحب بھی وزیراعظم رہے۔ بے نظیر سے پہلے نگراں حکومت تھی۔"

"میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ صرف اپنے اندیشے کا اظہار کررہا تھا مگر ان حالات میں کسی پر بھی بھروسا کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میرے خلاف اب بھی سازشیں ہورہی ہیں۔ میری سیاسی ساکھ جن کے لیے خطرہ بن گئی ہے' وہ مجھے بدنام کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ مجھ پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہوسکتا ہے۔ لیکن میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور موت کو برحق سمجھتا ہوں۔ اس کا ایک دن مقرر ہے۔ اس دن سے پہلے مجھے کوئی نہیں مارسکتا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ میری زندگی میں ایک سانس کا اضافہ کرنا بھی کسی فانی انسان کے بس کی بات نہیں۔"

میری باقی تقریر جذبات اور فصاحت وبلاغت کا سیاسی شاہکار تھی۔ اسے ان گنت عوامی جلسوں' انتخابی مہمات اور کامیاب پریس کانفرنسوں کے اہم خطابات کا نچوڑ سمجھا جاسکتا تھا۔ وہی باتیں جو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد ہر سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر سے سنی تھیں' اخباروں میں پڑھی تھیں اور ریڈیو ٹی وی دہراتے رہے تھے۔ جھوٹ اور منافقت سے بھرپور خوب صورت الفاظ میں کیموفلاج کی جانے والی بدصورت حقیقت اور مسخ کیے جانے والے حقائق کی پُرفریب عکاسی کا دل نشین انداز۔ مداری کا کھیل۔

جب پریس کانفرنس کا اختتام ہوا تو صورتِ حال بہت بہتر ہوگئی تھی۔ شمس اور قریشی کی اڑی اڑی سی رنگت اور پھیکی مسکراہٹ میں ان کے دلی جذبات چھپائے نہ چھپتے تھے۔ بڑے صحافی میری سمجھ دار گفتگو اور تقریر کے فن سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی ساری غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بھی مجھے شاہ عالم مان لیا تھا اور میں اپنی پہلی سیاسی روئمائی سے بہت خوش تھا۔ میں ابوبکر آزاد کا خاص طور پر ممنون تھا جنہوں نے میری راہنمائی کرنے میں ایک پُراسرار مگر یقینی کردار ادا کیا تھا۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟

بعد میں جب صحافی خاطر تواضع کے شاندار انتظامات سے پورا پورا انصاف کررہے تھے' میری نگاہ انہیں تلاش کرتی رہی لیکن وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ مجھ سے پاولی کے مستقبل اور میرے سیاسی پلان بھی پوچھے گئے اور میں نے بڑے مدبرانہ انداز میں پُرامن بقائے باہمی' جمہوری حقوق اور انصاف کے مقاصد کی باتیں کرکے یہ ثابت کیا کہ میں اپنی پارٹی کے منشور کا پرچار کررہا ہوں اور میری باتیں صرف باتیں ہیں۔ تمام خوش آیند دعووں کے باوجود میری سیاست کا انداز وہی رہے گا۔

موقع دیکھ کے میں نے آپا صفیہ سے بات کی "کیا بات ہے' آج آپ کی صفوں میں مس شبنم آغا کا خلا ہے؟"

شمی نے قریب سے ہی طنز کیا "آپ کو تو اپنے دل میں محسوس ہوگا یہ خلا۔"

میں نے فوراً کہا "سچ فرمایا آپ نے اور اس خلا کو آپ کے سوا بھلا کون پُر کرسکتا ہے۔" جواب میں اس نے زیرِلب کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔

آپا صفیہ نے کہا "مجھے بھی تشویش ہے اس کی غیر حاضری کی۔ کچھ دن سے وہ بہت اپ سیٹ تھی۔"

میں نے کہا "آپ اسے سمجھائیں۔ صحافت کی کچھ اخلاقی ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اسے اپنے جذبات کو الگ رکھنا چاہیے۔"

آپا صفیہ نے مجھے کچھ حیرانی سے دیکھا "شاہ جی۔ کیا سمجھانے سے کوئی سمجھ جاتا ہے؟ نبی اور پیغمبر آئے' مقدس آسمانی صحیفے اترے۔ اس ملک میں جمہوریت سے مارشل لا کے کوڑے تک سب آزمایا گیا' آئین ہے۔ قانون ہے مگر کیا کوئی فرق پڑا؟"

اشرف ہال کے ایک کونے میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس وقت میں تیور سے بات کررہا تھا جو میری شاندار پرفارمنس کو کامیابی کی جانب پہلا قدم قرار دے چکا تھا۔ میں نے اشرف کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کرتے دیکھا تو بڑی صفائی سے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس تک جا پہنچا۔ درمیان میں مجھے دو فون سیاسی شخصیات کے بھی موصول ہوئے تھے جن کو عام طور پر پی بے ایف کا حلیف تصور کیا جاتا تھا۔

قریب جاکے میں نے اشرف سے کہا "کیا بات ہے اشرف! تمہاری صورت پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے سر! آپ رخصت لیں ان سب سے کہ مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے" وہ بولا۔

میرا ذہن فوراً شبنم کی طرف گیا "کسی ڈاکٹر فاروقی نے تو فون نہیں کیا ہے؟ شبنم کے بارے میں' وہ ٹھیک ہے نا؟"

وہ کچھ حیران ہوا "شبنم کو کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم سسپنس مت پیدا کرو۔"

"سر۔ وہ شہزادہ سلیم۔ بھاگ گیا۔"

"کیسے بھاگ گیا؟ تم نے اسے باندھ کے ڈالا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"پتا نہیں سر۔ ایک محافظ بھی کھڑا کردیا تھا۔ اپنا ہی آدمی تھا۔ ایف اے ایف کی وردی میں اور مسلح بھی تھا۔"

میں نے کہا "اب وہ بھی نہیں ہے؟"

اشرف نے اقرار میں سرہلایا "آپ کسی ٹائیگر نام کے آدمی کو جانتے ہیں؟"

"ٹائیگر اور آدمی' وائٹ نان سنس؟"

اس نے سرگوشی میں کہا "سچ بتارہا ہوں سر۔ اس نے فون پر اپنا یہی نام بتایا" اور پھر کہا کہ آدمی تو ہم نے چھڑالیا۔ ریوالور اور موبائل شاہ جی کو پیش کردو۔"

میں نے ریوالور لے لیا۔ یہ رشین ماوزر تھا اور اس کا سائلنسر بھی جدید وضع کا تھا۔ موبائل فون بھی بہت مختصر اور جاپانی ساخت کا تھا "اسی فون پر پیغام ملا تھا تمہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ اس پر میں نمبر دیکھ لیتا کہ وہ کہاں سے بات کررہا ہے۔"

میں لوٹ کے آیا تو کانفرنس کے بیشتر شرکا رخصت ہوچکے تھے۔ شمی اپنی داڑھی والے جنگلی قسم کے صحافی سے باتوں میں مصروف تھی۔ وہ حد درجہ بے باک اور اپنے رویے میں غیر شریفانہ حد تک آزاد لڑکی تھی مگر وہ نہ زبانِ خلق کی پروا کرتی تھی اور نہ بدنامی سے ڈرتی تھی۔ کسی بات پر اس نے قہقہہ مار کے داڑھی والے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اس نے ایک کش لگا کے سگریٹ شمی کو دے دی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف آئی "شاہ جی۔ اگلے ہفتے ایک خصوصی فیچر لگارہی ہوں میں۔ آپ کے اور شبنم کے بارے میں۔"

میں نے کہا "اچھا؟ اس سلسلے میں تم مجھ سے کوئی خصوصی انٹرویو کروگی۔ تمہیں کچھ تصویروں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔ سب مسالا ہے میرے پاس۔" وہ بولی "لیکن آپ چاہیں تو میں اسے روک بھی سکتی ہوں۔"

"وقتی طور پر؟"

"بس جو میرے پاس ہے وہ میں شائع نہیں کروں گی' ضائع کردوں گی۔"

میں نے سوچ کے کہا "اور معاوضہ کیا ہوگا اس عنایت کا؟"

"شاہ جی۔ آپ تو بڑے دل والے ہیں۔ ہمیشہ ہم جیسے غریبوں کی مدد کی ہے آپ نے۔" اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر بچے ہوئے ٹکڑے کو فرش پر ڈالا اور قالین کی پروا کیے بغیر جوتے سے مسل دیا۔

میں نے اسے اٹھایا اور میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں ڈال دیا "پہلے کی بات اور تھی۔ مس شمی' آج کل میرا ہاتھ ذرا تنگ ہے۔"

اس نے کچھ خفت سے داڑھی والے کی طرف دیکھا جو اس کے شانے کا سہارا لیے کھڑا ہوا تھا "شاہ جی۔ آپ کو معلوم تو ہوگا۔ حکومت تو کچھ دیتی نہیں علاج معالجے کے لیے۔ اخباروں کے مالکان کا رویہ بھی بالکل یہودیوں جیسا ہے۔"

داڑھی والے نے کہا "ٹوٹلی فرینک۔ ہم شادی کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "میری طرف سے پیشگی مبارک۔"

وہ تلخی سے ہنسا "زندگی کے جتنے بھی تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں وہ اچھے گزر جائیں گے۔"

شمی نے کہا "یہ ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ میں اس کی خواہش کو رد نہیں کرسکتی۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کتنا بڑا رسک لے رہی ہو۔"

"او یس۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے بچے میں انفیکشن ہو۔" وہ بولی۔

"مس شمی۔ فیچر کی مجھے پروا نہیں۔ تم جو چاہو لکھو' نہ میں تم کو منع کروں گا اور نہ اس کی تردید کروں گا۔ معاوضے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے لیے اپنے اور تمہارے مراسم کے بارے میں ایک بیان کہیں اور شائع کرادینا زیادہ آسان ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم بدنامی سے ڈرنے والی نہیں ہو لیکن تمہاری کچھ ایسی تصویریں تمہاری اپنی برادری کے لوگوں کو فراہم کردی جائیں جو ہر لحاظ سے قابلِ دید ہوں۔"

غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا "آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے؟"

"ہاں۔ جو لوگ تمہیں اس خصوصی فوٹو سیشن کے لیے لے جائیں گے وہ بڑے پروفیشنل لوگ ہوں گے" میں نے کہا "ہر لحاظ سے۔"

"شاہ جی۔ صرف پچاس ہزار کی بات ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بلیک میلنگ ہے۔ کل کوئی اور آسکتا ہے ایسا ہی مطالبہ لے کر۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم تھرڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پارٹی ڈیل کرو۔ خود کچھ نہ لکھو۔ کسی کو وہ سارا مواد فراہم کردو جس کو تم مسالا سمجھتی ہو اور اس سے تمہارا فضٹی فضٹی پر سودا ہو جائے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہوگا۔ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے اور بدمعاشی کا جواب بدمعاشی سے دینا چاہیے۔"

اس کا چہرہ مایوسی سے اُتر گیا "سیاسی مستقبل آپ کا داؤ پر ہوگا۔"

داڑھی والے نے سہلایا "ہم بدنامی سے کیا ڈریں' ہے بہار باغ دنیا چند روز۔"

میں نے کہا "آئی وش کہ آپ زندہ رہیں۔ انسانی ہمدردی کے جذبے سے کام لیتے ہوئے میں شادی کے سارے اخراجات برداشت کر سکتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شادی ایک معاشرتی جرم ہے۔ انسانیت کے خلاف ہے۔"

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" وہ بگڑ کے بولا "خواہ مخواہ معاشرے کے ٹھیکے دار مت بنو۔ ہم محبت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "آج تم ایڈز کا شکار ہو۔ شادی کے بعد شمی یہ مرض تم سے لے گی اور تمہارے بعد آنے والا بچہ اگر خون میں ایڈز کے جراثیم لے کر پیدا ہوا تو کتنے دن جئے گا۔ کیا تمہیں یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ جانتے بوجھتے معاشرے میں اس موذی مرض کو پھیلاؤ۔ کیا تم سڑک پر پیشاب کر سکتے ہو اور گھر کا سارا کوڑا کچرا باغ جناح میں ڈال سکتے ہو کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ تمہاری خود غرضی ہے اور ایک بیمار ذہن کی انتقامی سوچ۔ یہ محبت نہیں ہے' تمہاری لاشعوری خواہش ہے کہ تمہارے بعد شمی بھی مر جائے۔ یہ کسی اور کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی نہ گزار سکے۔"

اس نے شمی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "مت سنو اس کی بکواس۔"

میں نے کہا "اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم کو جیل کے الگ وارڈ میں بند کرا دیتا۔ QUARANTINE کی پابندی کے ساتھ۔"

اشرف نے اس گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا "سر۔ آپ کہہ۔"

میں نے کہا "مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ رقم کی کوئی اہمیت نہیں لیکن اب کوئی مجھے بلیک میل نہیں کر سکتا۔"

"آپ خود ہی کہتے ہیں کہ بھونکنے والے کتے کو ہڈی ڈال کے خاموش کر دینا چاہیے۔"

"میرے نظریات بدل گئے ہیں سمجھے۔ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔"

شمس اور قریشی ایک ساتھ نمودار ہوئے "شاہ جی۔ چھٹی کریں ان محافظوں کی۔ ہمیں آپ سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔"

قریشی نے کہا "پارٹی کے معاملات سے زیادہ ضروری کیا کام ہو سکتا ہے۔"

شمس نے اس کی تائید کی "پارٹی میں بہت گڑبڑ ہے۔ ہمیں کارکنوں کا مورال ٹھیک کرنے کے لیے یہ یقین دلانا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ نئی حکمتِ عملی۔"

میں نے کہا "کل صبح پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیں۔ میں تیمور سے بھی کہہ دیتا ہوں۔"

"کل صبح' اس کے لیے تین دن کا نوٹس ضروری ہے۔"

"یہ ہنگامی صورتِ حال ہے۔ مجھے سارے معاملات کو REORGANISE کرنا ہوگا۔ یہ ساری صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی' آپ کے ہوتے ہوئے۔ اتنی بڑی سازش کے محرکات کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔"

"کیا کریں گے آخر آپ۔" قریشی بولا۔

"صبح معلوم ہو جائے گا آپ کو قریشی صاحب۔ اتنے دن میں کیوں روپوش رہا آخر۔ کسی کے سامنے آئے بغیر میں سب دیکھتا رہا کہ کون دوستی کے نام پر دشمنی کر رہا تھا۔ کس دغاباز نے وفاداری کی نقاب ڈال رکھی تھی اپنے چہرے پر۔ اس بار تو میں بچ گیا۔ اگر میں مارا جاتا تو کیا ہوتا؟ ایک طرح سے میں نے یہ سب دوسری دنیا میں رہ کے دیکھا ہے اور لوٹ کے اپنی دنیا میں آیا ہوں تو مجھ پر بہت سے انکشافات ہوئے ہیں۔ مجھے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اپنی اور پارٹی کی بقا کے لیے۔ میں جانتے بوجھتے سازش کرنے والوں کو نظرانداز کر دوں تو مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔ یہ بڑا اچھا تجربہ تھا۔ کھوٹے کھرے کی پہچان ہو گئی مجھے۔ اب پارٹی میں ایک انقلابی قسم کی بنیادی تبدیلی ناگزیر ہو گئی ہے۔"

"یہ آپ ہمیں کیوں بتا رہے ہیں؟" شمس کچھ نروس نظر آنے لگا۔

"اس لیے کہ آپ نائب صدر ہیں۔ پارٹی کی ہائی کمان ہی پالیسی معاملات کو دیکھتی ہے" میں نے کہا "ایک RESHUFFLE بلکہ شیک اپ آپریشن بہت ضروری ہے شمس صاحب۔"

تیمور ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔ "چلیں شاہ جی۔ باقی

باتیں صبح میٹنگ میں ہوں گی۔ اشرف' تم اطلاع دے سکتے ہو سب کو۔"

"میں کوشش کروں گا کہ سب سے رابطہ ہو جائے۔ اگر صبح میٹنگ نہ ہو سکی تو سہ پہر کے وقت رکھ لیں گے" اشرف نے میری طرف دیکھا۔

"اگر کورم پورا نہ ہو تو ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

میں نے بڑے محتاط انداز میں قریشی کا ردِعمل بھی دیکھا تھا۔ چور اس کے دل میں تھا چنانچہ وہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کے مجھ سے کیا بات کرنے کے لیے تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے علیحدگی میں بات کر کے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتے ہوں۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کا ایک سازشی طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے کسی مخالف کو قصوروار بنا دیں اور اس کے خلاف جھوٹ کا ایسا جال بُن دیں جو کسی کو بھی نظر نہ آئے اور اگر سچ ظاہر ہونے لگے تو آپ بھی الزام سے بچ جائیں تو جھوٹ؟ کیسا جھوٹ؟ کہاں ہے جھوٹ؟ ابھی تک شمس اور قریشی کو معلوم نہیں تھا کہ باہر سے کچھ نہیں بدلا مگر اندر سے سب بدل گیا ہے۔ شاہ عالم کا ظاہر وہی محسوس ہوتا ہے مگر باطن اس کے برعکس ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔

وہ کچھ بددل کچھ خفا اور کچھ مایوس سے ہو گئے۔ میں نے تیمور اور اشرف کے سوا سب کو رخصت کر دیا۔ اندر صرف وہی عملہ رہ گیا جو مہمانوں کی خدمت پر مامور تھا۔ باہر تیمور کی فاتح عالم فورس کے نوجوان پولیس کے ساتھ مل کے سیکیورٹی کے انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے۔

کانفرنس ہال سے ملحق کمرے میں بیٹھ کے میں نے کہا "اشرف۔ کیا تم اپنی کوتاہی کی ذمے داری قبول کرتے ہو؟ تم نے اس شخص کو گرفتار کر کے یقیناً بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس کی حفاظت کرنے میں ناکامی کے ذمے دار بھی تم ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہماری فورس کا ہی آدمی تھا۔"

اس نے ندامت سے کہا "آف کورس مجھے اس کی شناخت چیک کر لینی چاہیے تھی لیکن ایک تو مجھے شک نہیں ہوا۔ یہ خیال کیسے آ سکتا تھا میرے ذہن میں کہ باہر کا کوئی آدمی اندر پہنچ گیا ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ خود ایف اے ایف والے پہچانتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "وہ ایف اے ایف کا آدمی بھی ہو سکتا ہے اشرف۔ کیا تعداد ہے ہمارے ان جوانوں کی جو حفاظتی انتظامات سنبھالتے ہیں۔"

تیمور نے کہا "پانچ سو۔ پورے ملک میں۔ یہاں نصف موجود رہتے ہیں۔ باقی بڑے بڑے شہروں میں ضرورت پڑنے پر طلب کر لیے جاتے ہیں۔"

"ڈھائی سو کو تم ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا "بے شک وہ پرانے کارکن ہیں اور انہیں کارکردگی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے مگر میں ہر ایک کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں رکھتا اور نہ بعد میں ان پر نظر رکھنا میرے بس کی بات ہے۔"

"رائٹ۔ یہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ ڈھائی سو میں سے کیا دس کی وفاداری کو خریدا جا سکتا ہے۔ خصوصاً یہ نوجوان لوگ آسانی سے ترغیب کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ لاکھ دو لاکھ کی رقم ان کی جذباتی سوچ کو بدل سکتی ہے۔ اشرف نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا ہوتا تو۔"

میری بات ایک ملازم کی مداخلت سے ادھوری رہ گئی۔ وہ سخت بدحواس اور دہشت زدہ نظر آ رہا تھا "سر!"

میں نے کہا "کیا بات ہے۔۔۔ اس طرح نوک کیے بغیر بیل کی طرح اندر گھسے چلے آ رہے ہو۔"

"ابھی سائیں' بات ایسی ہے۔ اللہ معاف کرے۔"

اس نے کان پکڑ کے ہاتھ جوڑے اور آسمان کی طرف دیکھا۔

"آپ میرے ساتھ چل کے دیکھو۔"

اس محافظ کی لاش ایک باتھ روم میں الٹی پڑی تھی جس کو اشرف نے شہزاد سلیم کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ تیمور سب سے پیچھے تھا۔ اشرف نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کی صورت دیکھی اور پھر نبض "یہ تو مر چکا ہے۔"

میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ مرنے والا چوبیس پچیس سال کا صحت مند جوان آدمی تھا۔ آثار ایسے تھے کہ ایک نظر میں قتل کے جرم کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے جسم پر نہ کوئی گولی کا زخم تھا اور نہ خنجر کا۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا گیا تھا اور تشدد یا مزاحمت کی علامات بھی واضح نہیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ یہاں رفعِ حاجت کے لیے آیا تھا کیونکہ اس کی پتلون کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ قاتل اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

قتل کے اسباب کا پتا چلانا اور قاتل کا سراغ لگانا یقیناً پولیس کا ہی کام تھا مگر میں اپنے طور پر بھی جاننا چاہتا تھا کہ اسے قتل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے مار کے یہاں نہیں ڈالا گیا تھا۔ وہ خود چل کے یہاں آیا تھا جہاں موت اس کے انتظار میں تھی۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا؟ اگر وہ پیشاب کی حاجت محسوس نہ کرتا تو کیا اسے وہیں ختم کر دیا جاتا جہاں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے جھک کر اس کی گردن پر کوئی نشان دیکھنے کی کوشش کی۔ گردن کی جلد پر نہ رسی یا تار کے کسی بل کا نشان تھا اور نہ گلا گھونٹنے والی انگلیوں کا۔ مگر میں جھکا تو مجھے ایک عجیب سی بُو کا احساس ہوا۔ یہ ایسی ہی بو تھی جیسی کڑوے بادام سے آتی ہے۔

"سائنائڈ" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "وہ خطرناک زہر جو ذرا سی دیر میں ہلاک کردیتا ہے۔"

اشرف نے سر ہلایا "اس نے خود تو نہیں کھایا ہوگا۔ اور زبردستی کھلانے والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کم سے کم دو افراد ایسا کرسکتے ہیں۔ یہ آسانی سے قابو میں آنے والا آدمی بھی نہیں تھا اور اگر اسے باتھ روم آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تو وہ کیا کرتے؟"

میں نے کہا "اشرف۔ تم نے اسے کہاں بند کیا تھا؟ جو شہزادہ سلیم کہتا تھا خود کو؟"

"اسٹور میں۔ کچن کے ساتھ۔" وہ بولا۔

"پھر اسے چائے یا کولڈ ڈرنک میں زہر دیا گیا ہوگا" میں نے کہا "اسے بس اتنی ہی مہلت ملی۔ شاید پیشاب کی حاجت اسے پہلے سے محسوس ہو رہی ہوگی۔ میں اس امکان کو بھی مسترد نہیں کرتا کہ پہلے اس نے پانی پیا اور پانی میں کوئی پیشاب لانے والی دوا تھی۔ مثلاً LASIX۔ اور آدھے گھنٹے بعد اسے چائے وغیرہ پیش کی گئی۔ اب تم پولیس کو بلاؤ۔ اس بات کا خاص خیال رکھو کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آج ہی مل جائے اور بالکل صحیح ہو۔"

تیمور نے لبوں پر زبان پھیری "مگر یہ..... بڑی خطرناک بات ہے۔ کچن میں کس کے پاس سائنائڈ تھا؟"

"شاید یہ کبھی معلوم نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"اور سائنائڈ آیا کہاں سے؟" اشرف پریشانی سے بولا۔

"دنیا میں سب مل جاتا ہے اشرف۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس نے ایک آدمی کو چائے میں سائنائڈ ملا کے دے دیا' کیا وہ مجھے یا تمہیں..... یا ان سب کو جنہوں نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ اسی طرح موت کی نیند نہیں سلا سکتا تھا؟" میں نے کہا "یہ تاریخ میں اپنی نوعیت کا انوکھا قتلِ عام ہوتا جس میں ہمارے ساتھ اتنے صحافی مرجاتے' میں اپنے نظریے کو سو فیصد درست سمجھنے پر اصرار نہیں کروں گا مگر اس امکان پر غور کرنے کی بہرحال ضرورت ہے۔"

ساڑھے سات بج چکے تھے اور مجھے اب یہاں کے معاملات سے زیادہ کمال فاروقی کے کلینک پہنچنے کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ میری عدم موجودگی میں پولیس سے تیمور اور اشرف بخوبی نمٹ سکتے تھے۔ میری گاڑی اب سامنے والے حصے میں لاکے پورچ میں کھڑی کردی گئی تھی۔ بادشاہ زادہ اس کے قریب ہی کلاشنکوف اٹھائے ٹہل رہا تھا۔ اس کی ناک پر کراس کی شکل میں ایک میڈیکل ٹیپ تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا اور اس سے ڈرائیور کے بارے میں پوچھا۔

"وہ خانہ خراب اندر سوتی اے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا' اسے خاموشی سے جگاؤ۔ ادھر بولو کہ کوئی دوسری گاڑی پیچھے لے کر آجائے۔ اشرف کی گاڑی بھی کھڑی ہوگی کہیں" میں نے کہا "ورنہ ٹیکسی لے آئے۔"

ڈرائیور گاڑی کے شیشے بند کیے سو رہا تھا۔ گارڈ نے اسے کھڑکی بجا کے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں لوٹ کے اندر گیا اور سب کی نظر بچا کے عقبی حصے سے گزرتا ہوا باہر آگیا۔ میں اسی راستے سے اندر گیا تھا۔ اب یہاں اندھیرا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

دس منٹ بعد ایک ٹیکسی میرے سامنے آرکی۔ باہر اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے لیے نیچے اتر کے دروازہ کھولا۔ "سرجی' آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ اپنے اشرف صاحب کی گاڑی کو دھکا لگانا پڑتا ہے' بیٹری ڈاؤن ہے۔"

میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا "چلو یہ ٹھیک ہے مگر تم کہاں بیٹھ رہے ہو؟"

"آپ اکیلے جاؤ گے جناب عالی! میں بادشاہ خان کو کہہ دوں؟"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے واپس آنے تک یہیں رہو گے۔ میری لینڈ کروزر کے پاس اور سیکیورٹی گارڈ بھی اسی طرح موجود رہیں گے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہیں گیا ہوں۔"

اس نے مجھے سیلوٹ کیا "آپ فکر مت کریں جناب عالی۔ مگر آپ باڈی گارڈ کو ساتھ لے جائیں ضرور۔ بادشاہ زادہ کو۔"

"میری حفاظت کرنے والا خدا ہے باہر۔"

وہ قائل نہیں ہوا "آپ سچ فرماتے ہو جی لیکن ہماری بھی ذمے داری ہے۔ بعد میں رب نہ کرے کچھ ہوا تو ہماری شامت آئے گی۔ کیا حرج ہے سرجی۔ اگر وہ بھی آگے بیٹھ جائے۔ ادھر کیا کام ہے اس کا۔"

میں نے کہا "اچھا بھیج دو اسے۔ مگر دیکھو' اس سے کہو کہ ادھر سے آئے۔ اور ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کچھ پریشان اور کچھ مرعوب سا بیٹھا ہوا تھا۔ جب بادشاہ زادہ کلاشنکوف کے ساتھ نمودار ہوا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے اس سے مؤدبانہ انداز میں پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟ اس نے یہی سوال مجھ سے کیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور ڈرائیور کو بتایا کہ مجھے آٹھ بجے تک پہنچنا ہے۔ فاصلہ کسی طرح بھی بیس منٹ سے کم نہ تھا اور ٹیکسی کسی ٹریفک جام میں رک جاتی تو میں وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا مگر ٹیکسی ڈرائیور نے معروف سڑکوں کا راستہ چھوڑ کے ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا شارٹ کٹ اختیار کیا۔ ان راستوں پر ٹیکسی گڑھوں اور اسپیڈ بریکرز کی وجہ سے بار بار اچھلتی تھی مگر ٹریفک سگنل نہ ہونے اور رش کم ہونے کی وجہ سے ٹیکسی کو کہیں رکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ڈاکٹر کمال کے کلینک سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی کو روک لیا اور بادشاہ زادے سے کہا "جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں' یہاں سے ہلنا نہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے عاجزی سے کہا "سر' کتنا وقت لگے گا؟"

میں نے اسے تسلی دی "جتنا وقت بھی لگا' تمہارا نقصان نہیں ہوگا۔"

میں اس گلی میں گھس گیا جہاں ون وے ٹریفک تھی اور کلینک بند کرنے کے بعد ڈاکٹر کمال فاروقی اپنی ایمبولینس میں ادھر سے ہی گزرتے تھے۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں وہ خبطی تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو دس منٹ اوپر ہوگئے تھے۔ میں بھاگم بھاگ پہنچا تو ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی اور کلینک بند تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دے کے روکا۔ کمال کی معاونِ خصوصی کوئن آگے بیٹھی تھی۔ وہ اتر کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "ڈیئر کوئن۔ اس جوکر کی جگہ تمہارے دل میں نہیں تو پھر پیچھے ہے" اور سلائڈنگ دروازہ کھینچ کے اندر گھس گیا۔

کمال کی حیرانی ابھی باقی تھی "تیری اپنی گاڑی کہاں ہے؟ اور پیدل کیوں آرہا تھا اُدھر سے؟"

میں نے دروازہ بند کردیا "الو کے پٹھے۔ ادھر سے گاڑی کیسے آسکتی تھی اور گاڑی ہے کہاں میرے پاس؟ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔"

اب میں نے اسٹریچر جیسے بیڈ پر لیٹی ہوئی شبنم کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے نقاہت واضح تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے صاف دیکھے جاسکتے تھے اور سفید چادر اوڑھے وہ بیمار اور کمزور نظر آرہی تھی۔

کوئن نے پیچھے دیکھ کے کہا "شی از آل رائٹ سر!"

"جب یہ آل رائٹ ہوتی ہے مس کوئن' تو استری کی طرح کرنٹ مارتی ہے۔ پارے کی طرح مچلتی ہے اور ناگن کی طرح پھنکارتی ہے۔"

کوئن نے کہا "ابھی سو رہی ہے۔ آپ جگا سکتے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" کمال نے کہا "راستے میں تماشا دیکھیں گے لوگ کہ یہ ایمبولینس میں کیا ہو رہا ہے۔"

لیکن باتوں کی آواز سے پہلے ہی دروازہ بند ہونے پر اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا تھا اور کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اس نے دوسری بار آنکھیں کھول کے مجھے زیادہ دیر تک دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے لیے سوتے ہوئے دماغ کو جگا کے میری صورت کی شناخت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایمبولینس اس وقت تک وہاں سے گزر گئی تھی جہاں بادشاہ زادہ ٹیکسی میں کلاشنکوف لیے میری واپسی کے انتظار میں تھا۔

میں نے اسے آہستہ سے آواز دی "مس شبنم!"

اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور اب مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کا جذبہ بیدار ہوتا نظر آیا۔ وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟"

اس نے سر کو خفیف سی حرکت دی "تم..... کون ہو.....؟"

میں نے کہا "میں..... ذرا پہچانو مجھے۔ کیا نام ہے میرا؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی "تم..... شاہ عالم ہو۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "بالکل ٹھیک۔"

"مگر..... وہ تو مر گیا تھا۔ میں..... کیا میں زندہ ہوں؟" وہ بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ عالمِ ارواح نہیں ہے شبنم۔ وہی دنیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے کہا "اچھا..... پھر..... یہ کیا خواب ہے؟ نہیں' جھوٹ مت بولو مجھ سے۔ میں مر چکی ہوں۔ مجھے کفن پہنا کے گاڑی میں قبرستان لے جا رہے ہیں۔ دفن کرنے کے لیے' اسی قبر میں۔"

میں نے کہا "شبنم۔ میرا ہاتھ پکڑ کے دیکھو۔ لاؤ اپنا ہاتھ دو میرے ہاتھ میں۔ کیسا محسوس ہوتا ہے تمہیں؟"

"تمہارا ہاتھ..... بہت گرم ہے۔"

میں نے کہا "اب یقین آیا..... میں شاہ عالم ہوں۔ تم بھی زندہ ہو اور میں بھی زندہ ہوں۔ یہ وہی دنیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے ایک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں کا انداز بدل گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہوں کے انداز شناسائی میں اجنبیت آگئی۔ وہ مجھے وحشت زدہ نظروں سے گھورنے لگی۔ اب اس کا دماغ بیدار ہو رہا تھا اور یادداشت واپس آرہی تھی تو مجھ سے نفرت اور عداوت کے جذبات بھی جاگ اٹھے تھے۔

میں کسی بھی شدید ردِعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر اس کی نظریں اب میرے چہرے سے ہٹ کر گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس وقت وہ کسی ایمبولینس میں ہے۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کے کوئن کو دیکھا تو کوئن نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟"

شبنم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کسی کلینک میں تھی تو ایمبولینس میں کیسے آگئی۔ ایمبولینس اسے کہاں لے جا رہی ہے اور اس میں ایک تو وہی ڈاکٹر ہے جس نے اسے مرنے سے بچالیا تھا اور دوسری اس کی مددگار نرس ہے۔ مگر میں اس ایمبولینس میں کیسے آگئی؟ اسے وہ سوال بھی پھر یاد آیا جو میں نے کچھ دیر پہلے پوچھا تھا۔

"تم۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔" اس نے اچانک کہا "تم شاہ عالم نہیں ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو آخر۔۔۔ میں یہ مان سکتی ہوں۔۔۔؟"

میں نے اسے تسلی دی "اوکے' اوکے۔ مت مانو لیکن لیٹی رہو آرام سے۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس پر نقاہت غالب آگئی اور وہ پھر گری تو اس کا توازن گاڑی کے موڑ کاٹنے سے خراب ہوا۔ میں نے اسے نہ سنبھالا ہوتا تو وہ سائڈ کی خالی جگہ میں گرتی۔

"مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔" اس نے چلا کے کہا "آخر کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟ کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟"

کمال فاروقی مجھ پر بگڑنے لگا "میں نے اسی لیے کہا تھا۔"

کوئن نے کہا "سر' آپ آگے آجائیں' میں سنبھالتی ہوں انہیں۔"

لیکن شبنم خاموش ہو گئی تھی اور اس نے آنکھیں بھی بند کرلی تھیں۔ مجھے اس پر طیش بھی آرہا تھا۔ اس سے ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے رویے پر شرمندگی بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ آخر مجھے کیا ضرورت ہے اس کو اتنی اہمیت دینے کی۔ شاہ عالم کو میں نے نہیں مارا تھا۔ نہ میں نے اسے مارنے کا کوئی فیصلہ کیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے برعکس تھا۔ شاہ عالم نے مجھے بڑی چالاکی سے اپنا آلۂ کار بنایا تھا اور وہ طے کرچکا تھا کہ استعمال کے بعد مجھ سے ایسے ہی نجات حاصل کرلے گا جیسے قاتل آلۂ قتل کا سراغ مٹاتا ہے۔ اور اگر تقدیر کی چال الٹی ہو گئی۔ میں نے اس کی چالاکی کو سمجھ لیا اور خود کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال ہونے سے تو نہ بچا سکا مگر شاہ عالم کے ہاتھوں مارے جانے سے ضرور بچالیا تو ان حالات کی ساری ذمے داری شاہ عالم پر ڈالی جاسکتی تھی یا پھر تقدیر کو الزام دیا جاسکتا تھا۔ میں نے کسی انتقامی ردِعمل کے طور پر اس کو قتل نہیں کیا تھا اور نہ میرا اس کے قتل میں کوئی ہاتھ تھا۔ وہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے ردِعمل کا شکار ہوا تھا۔

تاہم اس عورت کا دکھ فطری تھا جو شاہ عالم کو چاہتی تھی۔ جسے یہ یقین تھا کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا اور میں نے صورت کی مشابہت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے خلاف سازش کی اور اسے اپنے راستے سے ہٹا کے خود شاہ عالم بن بیٹھا۔ اس کی سیاسی کامیابی برسوں کی جدوجہد کا نتیجہ تھی جو مجھے اس قتل کے بعد خود بخود حاصل ہو گئی۔ میں نے اس کی دولت اور جائداد ہتھیالی۔ یہاں تک کہ انتہائی بے غیرتی کے ساتھ خود کو شاہ عالم ثابت کرکے میں اس کی بیوی کے ساتھ بھی رہتا ہوں۔

میں شبنم کو سمجھانا چاہتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کلہاڑی اپنے پاؤں پر شاہ عالم نے خود ہی ماری تھی۔ شبنم کا شک اور یقین غلط نہ تھے مگر اس نے بالواسطہ طور پر مجھے شاہ عالم ثابت کرنے کی غلطی کی تھی۔ اسے تقدیر کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ کام میرے لیے زیادہ دشوار ہوتا جو شبنم نے کیا۔ پہلے وہ یقین کرنا نہیں چاہتی تھی کہ شاہ عالم مرگیا ہے۔ مرنے والا کوئی اور ہے۔ جذبات کی حد تک یہ یقین ٹھیک تھا مگر اس نے قانونی فیصلہ حاصل کیا تو اس کے یقین کی عمارت اس زلزلے کے جھٹکے سے زمیں بوس ہو گئی۔ اب وہ خود کس منہ سے کہتی کہ میرا یقین اور میرا دعویٰ غلط تھے اور عدالتِ عالیہ کا فیصلہ غلط ہے اور ساری دنیا غلط سمجھ رہی ہے کہ یہ شاہ عالم ہے۔ شاہ عالم وہ ہے جو بے موت مارا گیا۔ خود اسی دامِ اجل کا شکار ہوا جو اس نے کسی اور کے لیے پھیلایا تھا۔ وہ اپنے بے نشاں مدفن میں لاوارث ہو گیا ہے۔ اب نہ اس کا شاندار مزار تعمیر ہوگا اور نہ اس کی قبر کی لوح پر اس کا نام شاہ عالم لکھا جائے گا۔ حالانکہ یہ اس کا حق ہے مگر قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نے صرف

اپنی زندگی ہی نہیں گنوائی اپنا نام اور اپنی شناخت اور ساری عمر کی نیک نامی اور بدنامی تک گنوادی۔

شبنم کی بے بسی افسوس ناک تھی۔ اب وہ سر پٹخ کے مرجاتی مگر یہ ثابت نہیں کرسکتی تھی کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتی تو اس کا انجام پاگل خانے میں ہوتا۔ مجھے اس کی بے بسی کا بھی دکھ تھا اور میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ حقیقت کو سمجھ لے تو یہ اس کے اپنے مفاد میں ہوگا۔ وہ بے سکونی اور ذہنی خلفشار سے بچ جائے گی۔ اسے صبر آجائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا' مکافاتِ عمل کا نتیجہ تھا۔ مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک عورت جذبات کے پاگل پن میں مجھے قتل بھی کرسکتی تھی مگر ایک صحافی کی حیثیت سے وہ میری پوزیشن کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاسکتی تھی۔

کمال نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی تو میں پہلے اُتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ دروازے کا لاک کھولے گا مگر وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ کوئن نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو قمر نمودار ہوئی۔ وہ دونوں شبنم کو اندر لے گئیں۔

میں نے کہا "سر۔ واٹ از دس۔"

کمال نے کہا "دیکھ یار۔ میں کچھ بتانا چاہتا تھا تجھے۔ لیکن ایک تو موقع نہیں ملا مجھے۔ اور میری ہمت بھی نہیں پڑی۔"

"ایسی کیا بات ہے آخر! کیا تم نے خاموشی سے شادی کرلی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "شادی بھی ہو جائے گی۔ اور خاموشی سے نہیں ہوگی۔ اسی طرح ہوگی جیسے سب شادیاں ہوتی ہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن تو اس میں شریک نہیں ہوگا" کمال نے یوں کہاں جیسے وہ میرے سامنے کسی اخلاقی جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا "کیوں؟ تو ڈر تا ہے کہ میرے جیسے کسی سیاست داں سے تعلق میں بدنامی ہے اور رسک ہے۔ تیرے رفاہی مقصد کو اس سے نقصان ہوگا۔ تیرا ویلفیئر اسپتال کا خواب میری سیاست کی نذر ہو جائے گا۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے ضرورت ہی کیا ہے یہ سب سمجھنے کی کہ کل کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اور لوگ ایسا نہیں سمجھتے۔"

"اور کون لوگ؟"

"یہ سب لوگ" کمال کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا "قمر اور خان اعظم اور چندا۔"

"یار صاف صاف کہہ جو کہنا ہے۔ کیوں مجھے الجھن میں ڈال رہا ہے۔ آخر یہاں کیوں کھڑے ہیں ہم' اندر چل کے بات کرتے ہیں۔"

اس نے مجھے پھر روک لیا "نہیں۔ یہ بات یہیں ہو جائے تو اچھا ہے یار!"

"الو کے پٹھے' اتنا پریشان مت ہو۔ میں نہیں کروں گا شبنم سے ایسی ویسی کوئی بھی بات" میں نے برہمی سے کہا۔

کمال نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا "بات شبنم کی نہیں۔ یہ سب میرے لیے بھی انتہائی غیر متوقع تھا لیکن ایک جذباتی ردِعمل کی بات ہے۔ میں ہرگز ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے کیا فرق پڑتا اس سے۔"

"کمال۔ پہیلیوں میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر مسکرانے کی ناکام کوشش کی "نہیں۔ میں تو سمجھا رہا تھا تجھے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ سب تو قسمت کے کھیل ہیں۔ دنیا میں میرا کون تھا۔ آج یہ نام' یہ عزت اور شہرت۔ سب کچھ حاصل ہے مجھے۔ ایسے ہی تیرے حالات تھے۔ ہم دونوں سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ تیرے شاہ عالم بن جانے سے مجھے کیا۔ میرے لیے تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ نام بہت سے لوگ بدلتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے جذبات وہی ہیں۔ جذبات بدل بھی نہیں سکتے لیکن میں قمر کو یہ بات نہیں سمجھا سکتا۔"

"قمر کیا کہتی ہے؟"

"وہی' جو سب کہتے ہیں" کمال نے تھوک نگل کے کہا "کہ تو اب وہ نہیں رہا۔ ناصر عظیم' اگر تو ہم سب کے ساتھ رہتا۔ اسی طرح جیسے پہلے رہتا تھا تو نام بدلنے سے واقعی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ تو دس بار نام بدلتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تو اب شاہ عالم کی زندگی جی رہا ہے۔ تو شاہ عالم بن گیا ہے۔ صرف نام ہی نہیں' تیرا سب کچھ بدل گیا ہے۔ تو دوسرا آدمی ہے۔ تیری دنیا ہی دوسری ہے۔ ہماری دنیا سے چلا گیا ہے تو۔۔۔ ایسا قمر بھی کہتی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے خلا نمودار ہو گیا ہے اور میں اس کے اندھیرے میں اترتا جا رہا ہوں۔ یہ بالکل ویسا ہی اندھیرا ہے جو شاہ عالم کی طرح مر کے دفن ہو جانے والوں کو قبر کے اندر ہر سمت سے گھیر لیتا ہے۔ میں یعنی ناصر عظیم مرگیا تھا اور اپنی قبر میں اکیلا گیا تھا۔ اس دنیا میں جو کبھی میری تھی' مجھ سے محبت کرنے والے میرے اپنے' میری موت پر بہت دکھی تھے اور اب جو شاہ عالم تھا' اس کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے تھے۔ اس کی بات سننے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے تیار نہ تھے۔ اس کی سن ہی نہیں رہے تھے جو انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں وہی ناصر عظیم ہوں۔

میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "میں۔۔۔ میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم۔"

کمال نے سر ہلایا "آئی ایم سوری یار' کیا تو نے دیکھا نہیں؟ اس نے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلا لیا تھا تاکہ شبنم کے ساتھ کوئی ہو۔ وہ کوئن کے ساتھ شبنم کو اندر لے گئی۔ کیا اس نے دیکھا نہیں کہ تو بھی ساتھ ہے۔ مگر اس نے تیری طرف نہیں دیکھا۔ کبھی پہلے ایسا ہوا ہے؟ وہ پہلے تجھے سلام کرتی تھی۔"

"کمال۔ میں سمجھ گیا اور مت سمجھا مجھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے چندا نے بھی ایسی ہی بات کی تھی۔ کیا تم سب لوگ پاگل ہو گئے ہو۔"

کمال نے کہا "یار' غصے میں مت آ۔ یہ سب جذبات کا مسئلہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تو نے راستہ بدل لیا ہے۔ تو ان کی زندگی سے نکل گیا ہے۔ اسی طرح جیسے آیا تھا۔ دیکھ تیری اور میری بات الگ ہے۔ ہم دوست ہیں اور دوستی راہ چلتے کسی سے بھی ہو جائے' فقیر کی بادشاہ سے یا جاہل کی کسی دانشور سے۔ یہ رشتہ رفتہ رفتہ استوار ہوتا ہے۔ باقی رشتے یا تو ہوتے ہیں' یا نہیں ہوتے۔ عارضی رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے سخت ذلت محسوس کی "لیکن' قمر تو بہن ہے میری۔"

"ہاں۔ وہ اپنا بھائی سمجھتی تھی' ناصر عظیم کو۔"

"سمجھتی تھی؟"

"ہاں۔ نہ سمجھے تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے۔ وہ جو خون کا رشتہ ہوتا ہے نا۔۔۔ اس کی نفی نہیں ہوتی' وہ رہتا ہے۔"

یہ سب بڑے بے رحم الفاظ تھے جو میرے دل میں کٹاروں کی طرح اتر رہے تھے۔ میری اذیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر تقدیر مجھ پر خندہ زن تھی۔ ہیلو' مسٹر شاہ عالم۔ اب کیسا لگا تمہیں اپنی کامیابی کا یہ غرور کہ شاہ عالم بن گیا اور تم زندہ ہو لیکن تم ناصر عظیم نہیں ہو۔ اب ذرا بیٹھو اور ترازو لے کر اور تولو کہ کچھ پانے کے لیے کچھ گنوانے کا عمل میں فائدہ ہوا تمہیں یا نقصان؟ ہے کوئی ایسا طریقہ۔ کوئی قاعدہ یا فارمولا جس کی مدد سے تم ایک طرف سارے نقصانات رکھ کے اور دوسری طرف سارے فوائد شمار کر کے دیکھو کہ تم نے زیادہ پایا یا زیادہ گنوایا۔ سب کچھ پا لیا یا سب کچھ گنوا دیا۔ تم کو اتنا دل گرفتہ اور دکھی ہو کے بھی کیا ملے گا۔

بہت بڑے مداری ہو تم' ایسے کھیل پہلے بھی دکھاتے رہے ہو۔ اور دیکھتے رہے ہو۔ تمہارے لیے رشتے بھی ایسے ہی کھیل تھے۔ مداری کے ہاتھ میں رومال رنگ بدل لیتا ہے۔ نوٹ بدل کے سارے کاغذ کے پرزے ہو جاتے ہیں۔ رسی دس جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہو' ساری گرہیں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ رسی پھر ایک ہو جاتی ہے۔ مگر وہ سب فریب نظر ہوتا ہے۔ حقیقت نہیں۔ تم نے زندگی کو بھی مداری کا کھیل سمجھ رکھا تھا؟ ناصر عظیم غائب اور شاہ عالم حاضر۔ اب تم لاکھ یقین دلاؤ' لاکھ قسمیں کھاؤ کہ یہی ناصر عظیم ہے۔ کوئی نہیں مانتا۔ وہ سب جو جانتے ہیں کہ تم مداری ہو' تمہیں یہ اجازت نہیں دیتے کہ تم ان کے جذبات کو تماشا بناؤ۔ ان کی زندگی کو مداری کے کھیل میں استعمال کرو۔ عدالت عالیہ کا حکم ہے کہ تم کو شاہ عالم مانا جائے' یس یور آنر' قمر بھی کہتی ہے۔ چندا بھی مانتی ہے۔ خان اعظم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تم کو ناصر عظیم کہنا توہین عدالت ہو گا۔ چنانچہ جاؤ' ہمارا وقت ضائع مت کرو۔ گیٹ لاسٹ۔ تم شاہ عالم ہو اور شاہ عالم ہی رہو گے۔ تم نہ کسی کے ہوئے اور نہ کوئی تمہارا ہوا۔ تمہارے سامنے زندگی کے راستے بدلتے رہے اور تم راستوں کے ساتھ رشتوں کو بھی بدلتے رہے۔ بناتے اور بگاڑتے رہے۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ جو گھر جو ٹھکانا ملا' تم نے وہاں جذبات کے عارضی رشتے جوڑے اور جب ضرورت نہ رہی توڑ دیے۔ نئی ضرورت کے مطابق نئے رشتے بنائے۔ پھر اب پریشانی کیسی؟ جاؤ اپنی نئی دنیا میں' دیکھو کہ تمہاری ضرورت کسے ہے۔ مردے کے سارے ثواب تمہارے تو عذاب بھی تمہارے۔ دوست تمہارے تو دشمن بھی تمہارے۔

کمال نے پھر کہا "یار' سب ٹھیک ہو جائے گا بعد میں۔"

میں نے کہا "بعد میں؟ بعد میں کب؟ وقت تو مٹھی کی ریت ہے جو نکلتی جاتی ہے۔ میں نے جو بھی کیا تم سب کو بتا کے کیا تھا' میں مجبور تھا۔"

"ہاں۔ وہ بھی مانتے ہیں کہ تیری وجہ سے وہ مجبور تھے مگر اب کوئی مجبوری نہیں رہی۔"

"یہی خان اعظم نے بھی کہا تھا۔ کیا مجبوری تھی ایسی۔ اس وقت صاف انکار کر دیتے۔"

"کیسے انکار کر دیتے۔ مصیبت میں تیرا ساتھ چھوڑ دیتے تو الزام ان پر آتا۔ سمجھایا سب نے تھا لیکن تیری فطرت سے سب واقف تھے کہ تیرے ارادے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ وہ صاف کہتے کہ پھر ہم سے کوئی امید نہ رکھنا تو شاید اسے بلیک میلنگ سمجھتا تو۔ ایک جیسے خیالات ہیں سب کے۔ خان اعظم

کا کہنا بھی جائز ہے کہ اس عمر میں وہ ایسے خطرناک کھیل میں کسی طرح فریق نہیں بن سکتے۔ ان کی ایڈونچر اور مہم جوئی کی عمر نہیں رہی اور وہ کیوں اپنا سکون غارت کریں۔ یہ اطمینانِ قلب اور قناعت کی زندگی انہیں بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "چندا صرف غصے میں ہے۔"

"نہیں یار۔ وہ بالکل مختلف لڑکی ہے۔ تُو جانتا ہے اسے۔ یوگا کی مشق کرنا' کتابیں پڑھنا' ستار بجانا' یہی ہیں اس کے شوق۔"

"اور مارشل آرٹ' مار دھاڑ؟"

"وہ کرنل خان نے سکھائے اور اس نے سیکھ لیے۔ محض شوق کی خاطر۔ نہ اسے کسی ظلم میں فائٹ کرنی تھی اور نہ زندگی میں کسی سے مقابلہ تھا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے وہ رومان پرست' خیال اور تصورات کی دنیا میں خوش رہنے والی لڑکی ہے۔ اس کا سیاست اور بے اصول عداوت یا بغض اور نفرت سے کیا تعلق۔ اس لیے وہ بار بار کہتی تھی تجھ سے کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ ایک اندیشہ تھا اسے کہ ابھی تک تیرے اندر کا آوارہ گرد' خانہ بدوش اور بالکل تنہا جینے والا کسی وقت بھی سارے رشتوں کی اور جذبات کی زنجیریں توڑ کے جاسکتا ہے۔ غلامی اور قید تیری فطرت کی سرکشی کے خلاف ہے اور دیکھ تُو نے ایسا ہی کیا۔"

"یار' میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا' تو ہی بتا۔"

"میں بتاؤں۔ میں کیا بتاؤں؟" کمال بولا "تیری جگہ میں ہوتا نا تو ہرگز کسی چیلنج اور فتح یا شکست کے چکر میں نہ پڑتا۔ میں بھاگ جاتا۔ غائب ہوجاتا ایسے کہ مجھے شاہ عالم بنا کے غلط استعمال کرنے والے دیکھتے رہ جاتے۔"

"یہ ناممکن تھا۔ انہوں نے سب راستے بند کردیے تھے۔"

"چھوڑ یار۔ ایک راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور خدا پر بھروسا ہو تو آدمی کیا چیز ہے' انسان ایک در بند کرے تو وہ دس دروازے کھولتا ہے۔ تو اپنی فطرت سے مجبور تھا اس لیے تو اس جنگ میں کود پڑا۔ اور تو جیت گیا۔ تو نے ہارنا سیکھا ہی نہیں۔ یہ سیکھنے کی بات بھی نہیں ہوتی' بس کوئی شروع سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ تو تھا۔"

"مگر یہ جیت کہاں ہے کمال۔ میں نے تو سب ہار دیا۔"

"نہیں۔ تو حوصلہ نہیں ہار سکتا۔ یہ احساس وقتی چیز ہے۔ تو اسے بھی انا کا مسئلہ بنالے گا۔ میں جانتا ہوں' تو طے کرلے گا کہ چندا کو حاصل کرنا ہے تو حاصل کرکے رہے گا۔"

کمال نے کہا۔

"کیا۔ میں تمہارے بات کرلوں؟"

"میں کون ہوتا ہوں اجازت دینے والا۔ میں اپنے گھر کے دروازے کبھی تجھ پر بند کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو خود سوچ کہ قمر کو آزمائش میں ڈالنے سے تجھے کیا حاصل ہوگا۔ ابھی شبنم بھی ہے۔ کوئن بھی موجود ہے۔ ان کے سامنے وہ بڑی مشکل میں پڑجائے گی۔ میں جو بتا رہا ہوں تجھے۔ کیا تجھے مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"وہ۔ واقعی ملنا نہیں چاہتی مجھ سے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے سمجھانے کا اثر الٹا ہو رہا تھا۔ وہ پاگل لڑکی کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالے۔ یہی سوچ کے میں خاموش ہوگیا۔"

کوئن باہر نکلی اور ہاتھ ہلا کے ایمبولینس میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ بڑی لے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ نہ کسی کی اچھائی میں' نہ برائی میں۔ اسے ہر حال میں اپنے کام سے کام تھا۔

کمال نے کہا "پریشان مت ہو۔ یہ عارضی بحرانی کیفیت ہے۔ بعد میں سب ٹھیک کرلوں گا میں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "قمر کو بتادینا کہ اس نے مجھے غلط سمجھا۔ میں خون کے رشتے سے اس کا بھائی نہیں تھا۔ یہ احساس دلا کے اس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے مگر میں بڑا بھائی ہوں۔ یہ ذلت برداشت نہ کروں تو کیا کروں۔ میں اسے چھوڑ نہیں رہا ہوں۔ اس کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کررہا ہوں۔"

پھر میں نے کوئن کو اشارہ کیا اور دوڑ کے آگے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کمال سے رخصت لوں۔ اسے خدا حافظ کہوں اور جب وہ اندر چلا جائے اور دروازہ بند کرلے تو میں بند دروازے کو کسی خون میں آگ بھڑکنے والی گولی کی طرح برداشت کروں اور مزید ذلیل ہوکے واپس جاؤں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے سب کو کتنا دکھی کردیا ہے۔ قمر کے لیے بھی ایسا سوچنا اور یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں رہا ہوگا۔ وہ میرے دکھ کرب اور عذاب میں مبتلا رہی ہوگی۔ ایسا ہی چندا نے محسوس کیا ہوگا۔ میں نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ کیا نہیں تھا میرے پاس کہ میں نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کی؟ چندا کو یہی اندیشہ تھا۔ کمال نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں اس کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ میں

انسان کا بچہ نہ بن سکا۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو وہ بہت پہلے مان گئی ہوتی۔ اب وہ کس امید پر میرا ساتھ دیتی اور کیا ملتا اسے میرا ساتھ دے کے۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ہم ایک دوسرے کی ضد تھے۔ میرا وجود طوفانوں' سمندروں کی بلاخیزی اور صحرائی بگولوں کی آشفتہ سری کا نام تھا۔ وہ بادِ سحر کی طرح سبک رو تھی اور اس کے مزاج میں گلبنی گھاس کی مہک جیسی نرمی تھی۔

مجھے یقین تھا یا شاید غرور تھا کہ وہ میری ہے تو میری ہونے سے اسے کون روک سکتا ہے۔ مگر اس کو مجھ پر اعتماد نہیں تھا اور جب وقت آیا تو میرے غرور کو شکست ہوئی۔ اس کا خوف بے بنیاد ثابت نہیں ہوا۔ میں نے بڑی خودغرضانہ سوچ کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ خطرات کی دلدل میں کھینچ لیا اور شاہ عالم بنتے ہوئے بالکل نہیں سوچا کہ میں نے اپنے ساتھ اس کی زندگی کو بھی داؤ پر لگادیا ہے۔

کمال نے غلط نہیں کہا تھا۔ ناصر عظیم خود کو بچانے کے لیے فرار اختیار کرسکتا تھا مگر ایسا کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ ایک راستہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ میں اپنے ساتھ قمر کو اور چندا کو بھی لے جاتا۔ ہم سب غائب ہوجاتے۔ خدا کی یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ جب مجھے محصور کرنے والے مایوس ہوجاتے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اور ان کی اسکیم فیل ہوگئی تو ہم لوٹ آتے۔ میں جن کی وجہ سے بلیک میل ہونے پر مجبور تھا وہ سب میرے ساتھ یہ شر کیا' یہ ملک بھی چھوڑ کے جاسکتے تھے۔ کسی بھی جگہ جہاں ہم خوش اور محفوظ رہ سکتے مگر میں نے ایسا سوچا ہی نہیں۔

"کیا اب ایسا نہیں ہوسکتا؟" میں نے سوچا۔

کوئن نے کہا "سر۔ آپ کا گھر آگیا ہے۔"

میں چونکا "اوہ۔ کوئن ڈیئر۔۔۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئیں۔"

"اپنا گھر بھی بھول گئے آپ؟"

"آئی ایم سوری۔ تمہیں اتنی زحمت ہوئی" میں نے کہا "میں کچھ پریشان تھا۔ اپنے خیالات میں اتنا محو ہوگیا کہ تمہیں بتانا یاد نہیں رہا۔"

"کہیں اور جانا تھا آپ کو سر!"

"نہیں۔ تھینک یو۔ میں چلا جاؤں گا" میں نے اتر کے کہا "تمہیں پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر" وہ بولی اور گاڑی کو نصف دائرے میں گھما کے واپس لوٹ گئی۔ سارا راستہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ میں کیوں پریشان ہوں مگر اس نے یہی ظاہر کیا کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس جیسی نیک اور فرشتہ سیرت لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔

کمال کی بات سننے کے بعد میں نے چندا سے مل کے اسے قائل کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ اب اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ جو ہوگیا تھا اسے خواب سمجھ کے بھلایا نہیں جاسکتا تھا اور نہ یہ ممکن تھا سب کچھ نئے سرے سے گزرے ہوئے وقت کو واپس لاکے پھر کیا جائے۔ ویسے ہی جیسے ہونا چاہیے تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سب کے فیصلے ہوگئے ہیں اور سارے فیصلے تقدیر کی طرح اٹل ہیں۔

گھڑی میں رات کے نو بجے تھے اور میں اپنے ہی گھر کے دروازے پر اجنبی بنا کھڑا تھا۔ شاہ عالم ہاؤس میں ایک عورت میری واپسی کی منتظر تھی۔ اس کا نام رخشی تھا۔ وہ شاہ عالم کی بیوی تھی مگر میں شاہ عالم تھا چنانچہ وہ میری بیوی بھی تھی۔ شاہ عالم کو چاہنے والی شبنم ہوش میں آچکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ صرف مرجانا چاہیے یا اسے بھی مار دینا چاہیے جس نے شاہ عالم کی زندگی پر غاصبانہ قبضہ کررکھا ہے۔ اشرف ایک لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنے کے لیے سرگرداں تھا۔ نہ جانے کہاں' کوئی ٹائیگر یا پرنس مجھے رات بارہ بجے کا ٹائم دے کے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بعد مطمئن بیٹھا تھا کہ اب میں وہاں ضرور آؤں گا۔ کہاں؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ میں جانتا ہوں۔

اچانک میں نے خان اعظم کو اپنے سامنے دیکھا۔

میں نے کہا "خان جی۔ میری ایک بات سن لیں' پلیز!"

انہوں نے سکون سے کہا "سنا۔"

میں نے کہا "کیا واقعی آپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟"

انہوں نے ہاتھ اپنے گاؤن کی جیب میں ڈال رکھے تھے "ہم وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ ہم وہی ہیں' تو وہ نہیں ہے۔ تو نے یہ گھر بھی چھوڑ دیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر میں واپس آنا چاہوں خان جی!"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "دلدل میں اپنی مرضی سے اترا جاسکتا ہے' اس سے نکلنا اپنے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ کیا ابھی تک اندازہ نہیں ہوا تجھے؟"

"آپ میری مدد نہیں کریں گے؟" میں نے رو کر کہا۔

"جب ضرورت تھی تجھے تو اور بات تھی۔ اب تیرے مددگار بہت اور میں ایک ریٹائرڈ بوڑھا آدمی۔ جو تھا میرے پاس وہ سب دے دیا تجھے' اس دنیا کو۔ اب تو میں خالی ہاتھ واپسی کے لیے تیار ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ نے اپنے گھر کے دروازے بھی بند کردیے ہیں مجھ پر۔؟"

"دروازے کھلے ہوں تب بھی تو آ نہیں سکتا۔ ابھی نہیں آسکتا۔ ایک دن آئے گا ضرور۔ مگر کب؟ یہ میں کیسے بتاؤں تجھے۔ ابھی تو جا" وہ آہستہ سے پلٹے اور سکون سے چلتے ہوئے اندر غائب ہوگئے۔

ایک بار پھر میں یتیم خانے میں اکیلا تھا۔ رشتوں کا ایک خلا اپنی تمام سفاکی کے ساتھ پھر میرے احساس پر محیط تھا اور میں اتنا ہی بے آسرا اور مجبور تھا جتنا خود کو یک چشم صوفی کے سامنے محسوس کرتا تھا۔ سب کچھ پالینے کے باوجود میں اکیلا تھا اور بے بسی جو میرے ساتھ تھی آج بھی وہی تھی کہ میں ساری دنیا کو خرید سکتا تھا مگر خون کے رشتے مجھے میسر نہ تھے اور یہ قوتِ خرید میں نہ آنے والی محرومی تھی۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ شاید اتنا غیر متوقع بھی نہیں تھا مگر میری نظر ستاروں سے آگے کسی اور جہاں کو دیکھ رہی تھی اور میرے عزائم کی پرواز بلندیِ افلاک پر تھی کہ یہ زمینی حقائق میری نگاہ سے اوجھل ہوگئے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا اور کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ بیک وقت ساری دنیا نے کوئی غیر منطقی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میری ساری توجہ کا مرکز کہیں اور تھا ورنہ میں ان امکانات کو فراموش نہ کرتا جو آج تلخ اور ناگزیر حقائق بن کر سامنے آگئے تھے۔

بنیادی حقیقت ایک ہی تھی کہ دنیا نے مجھے نہیں چھوڑا تھا' میں نے اپنی دنیا کو خود اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

میرا دل لہو روتا تھا اور میں ایک شکستہ آدمی تھا۔ احساسِ جرم کی خلش اور اپنے گناہ کی ندامت اب لاحاصل تھی۔ ایک حادثے نے میرے تصورات کی دنیا کو تہس نہس کردیا تھا اور میں اپنے لیے اس دنیا میں ایک تنہا اجنبی تھا۔ ناصر عظیم بھی اب شاہ عالم کو پہچاننے سے انکار کررہا تھا۔

وہ خیال کے کانٹوں اور احساس کے انگاروں والے راستے پر عذاب کا لمبا سفر تھا جو میں نے طے کیا اور پھر وہاں پہنچا جہاں ایک اجنبی' سر کہنے پر اور میری حفاظت پر مامور ایک تنخواہ دار شخص' کلاشنکوف لیے میری واپسی کا منتظر تھا۔ یہ انتظار بھی اس کے فرائض کا حصہ تھا۔ اس انتظار کی جذباتی اہمیت کوئی نہیں تھی ورنہ انتظار تو میری واپسی کا چندا کو بھی رہتا تھا اور قمر بھی بڑی معصوم بے قراری کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھی اور پھر اس کا پہلا سوال ہوتا تھا' بھائی میری چاکلیٹ لائے؟ جیسے چندا پوچھتی تھی کہ ذرا دو دن کی تاخیر کی وضاحت فرمایئے اور اس پر بھی روشنی ڈالیے کہ آخر آپ کو لیے دوڑے کیوں پڑنے لگے ہیں باہر کے۔ اور میں کہتا تھا کہ جس کا گھر نہ ہو اور گھر والی گھاس نہ ڈالے وہ باہر نہ رہے تو کیا کرے؟

میرے باڈی گارڈ نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ حکم کے غلام کو صرف تعمیل سے غرض ہونی چاہیے اور اس معاوضے سے جو اسے بس سر کہنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی مطمئن تھا — اسے آمدنی کے زیاں کا کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا۔ میرے مقابلے میں وہ غریب اور غیر اہم لوگ تھے مگر مجھے ان پر رشک آیا کیونکہ وہ مطمئن تھے۔ ان کے پاس گھر تھے اور وہ رشتے تھے جو مجھے میسر نہ تھے۔

میرا ذہن متضاد خیالوں کی رسا کشی کا شکار تھا۔ ایک خیال صرف واپسی کا مطالبہ کرتا تھا۔ دوسرا خیال امید کے ساتھ جدوجہد کا تقاضا کرتا تھا۔ آدمی نہیں ہارتا اگر وہ حوصلہ نہ ہارے۔ کمال نے ٹھیک کہا تھا کہ شکست قبول کرنا میری فطرت اور میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ احساس وقتی چیز ہے۔ تو اسے انا کا مسئلہ بنالے گا تو سب کچھ پھر جیت لے گا۔

امید کے ساتھ راحت تھی۔ میں نے سوچا کہ مایوسی سے کیا ہوگا؟ میرے لوٹ کر جانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ صرف زبانی اظہارِ ندامت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں واپس چلا جاؤں تب بھی دروازے تو بند ہی رہیں گے۔ شاہ عالم کے لیے پھر ناصر عظیم بننا اتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔ اب اور ذلت اٹھانے سے بہتر ہے کہ میں اسی دن کا انتظار کروں جب مجھے اجنبی قرار دینے والوں کو اپنے فیصلے کی غلطی پر ندامت ہو اور وہ خود تسلیم کریں کہ میں ان کے لیے شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہی تھا۔ وہ آئیں اور مجھے اپنالیں۔ اسی طرح جیسے آج سے پہلے اپنایا تھا۔ میں ثابت کردوں گا کہ شاہ عالم بننا میری مجبوری تھی۔ خواہش نہیں اور اسی مجبوری نے میرے لیے جذبات کے رشتوں کی اہمیت کو پہلے سے زیادہ بڑھادیا تھا۔ جب وہ سمجھتے کہ اب میرا ساتھ دینے والے بہت اس وقت بھی میں اکیلا تھا اور انہوں نے مجھے اکیلا کیا تھا' جانتے بوجھتے۔

شاید میں ایسا ہی سوچ سکتا تھا کیونکہ ہار کو تسلیم کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ کمال نے بتادیا تھا کہ تو نے طے کرلیا تو چندا کو پھر حاصل کرے گا۔

میں نے ایسا طے کرلیا تھا۔

طوفان آیا تھا اور گزر گیا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے قدم اکھڑ گئے ہیں مگر میں پھر استقامت کے ساتھ اپنے ارادے پر قائم تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ہزار روپے دیے اور ٹیکسی کو شاہ عالم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر روک لیا۔

وہ ایک نوجوان اسمارٹ اور مہذب آدمی تھا "سوری سر! میرے پاس کھلے نہیں ہیں" اس نے رواں انگریزی میں کہا۔

میں نے کہا "KEEP THE CHANGE."

اس نے نفی میں سر ہلایا "اگر میں فی گھنٹا چارج کردوں تب بھی تین سو روپے سے زیادہ کسی صورت میں نہیں بنتے اور میں بخشش نہیں لیتا۔"

مجھے اس کی رواداری نے متاثر کیا "تم پڑھے لکھے آدمی ہو؟"

اس نے کہا "اب اگلا سوال یہ ہوگا آپ کا کہ پڑھا لکھا ہوں تو پھر ٹیکسی کیوں چلاتا ہوں؟"

"نہیں۔ مجھے معلوم ہے کتنی بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے وہ سب کررہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لوگوں کو CHEAT کررہے ہیں یا گن پوائنٹ پر لوٹ رہے ہیں۔ ناجائز دھندوں میں لگے ہوئے ہیں اور پیسہ کمانے کے لیے خود کو اپنے ضمیر کے ساتھ رہن رکھ چکے ہیں۔"

"مجھے کوئی ندامت نہیں ہے سر۔ میں محنت کررہا ہوں کوئی جرم نہیں۔ میرا میٹر بھی ٹھیک ہے۔ میں کسی مسافر سے اس کی مجبوری کا اضافی معاوضہ بھی طلب نہیں کرتا۔"

میں نے اسے تین سو دے کر اس سے ہاتھ ملایا "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"یس سر۔ آپ شاہ عالم ہیں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ پہلے میں بھی آپ سے متاثر تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا "تمہارے خیالات بدل گئے؟"

اس نے سر ہلایا "آپ کا منشور واقعی انقلابی تھا۔ اس میں ایک نئے حقیقی پاکستان کی تعمیر کا پورا نقشہ نظر آتا تھا اور آپ کی تقریروں اور نعروں سے بھی محسوس ہوتا تھا کہ آپ عوام کو امن' انصاف اور آزادی دلا سکتے ہیں۔ لیکن وہ میری جذباتی سوچ کا قصور تھا سر۔ آپ کا نہیں' آپ نے تو بہت پیسہ خرچ کیا ہوگا۔ وہ منشور' نعرے اور تقریریں لکھوانے پر۔۔۔ عمل کرنے کی نیت آپ کی بھی نہیں تھی۔"

"تم بہت دل جلے معلوم ہوتے ہو" میں نے کہا۔

"میں ایک عام پاکستانی ہوں سر۔ جسے مسلسل جذباتی نعروں اور تقریروں سے بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ پچاس سال ہونے کو آئے۔ اقبال کا پیغام اور فرمودات قائداعظم سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے۔ جو کچھ ہورہا ہے' وہ اس کے برعکس ہے۔ لیڈر ہی ملک کو تباہی کے دہانے تک لے گئے ہیں مگر میں سچ بھی نہیں بول سکتا۔ مجبور ہوں جھوٹ سننے پر۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"سب سیاست داں بُرے نہیں ہیں" میں نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"سب ایک جیسے ہیں سر۔ بس۔۔۔ سیاست اس بازار سے زیادہ بدنام پیشہ ہے۔ طوائف تو صرف ایک آدمی کو لوٹتی ہے اور اپنا ہی جسم بیچتی ہے نا۔ یہ جو ملک اور قوم کو لوٹ رہے ہیں اور اپنا ضمیر' ایمان تک بیچ چکے ہیں' منافق اور دوغلے لوگ ہیں۔ انہوں نے مایوسی اور ناامیدی کی اس انتہا پر پہنچادیا ہے عوام کو کہ اب میں ہی کہتا ہوں کہ لعنت ہے سیاست پر۔ ملک ہے تو کیا اور نہیں رہے گا تو مجھے کیا۔ میں اور میرے جیسے سب نوجوان خود غرض ہوگئے ہیں۔ وہ لوٹ مار میں شریک ہوگئے ہیں یا چھوڑ دینا چاہتے ہیں پاکستان کو' ایسے وطن سے آدمی بے وطن اچھا۔"

میں نے کہا "مگر تم ابھی تک یہاں ٹیکسی چلا رہے ہو؟"

اس نے کہا "چھوڑیں سر۔ باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس خون جلتا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے بتاؤ' تم کیا کچھ کرنا چاہتے ہو آخر؟"

"اب تو بس یہ جی چاہتا ہے سر۔۔۔ کہ کلاشنکوف ہو میرے ہاتھ میں۔۔۔ اور میں ایک ایک کرکے ان سب کو صاف کردوں جو سیاست یا مذہب کے نام پر اس ملک کو اور عوام کو ایسے استعمال کررہے ہیں جیسے خرکار استعمال کرتے ہیں غلاموں کو۔۔۔ کسی ایک کو بھی نہ چھوڑوں۔ کوئی ایسی خفیہ تنظیم بنالوں جو کچھ نہ کرے' بس اس ڈاکو اور بے ایمان نسل کو ختم کردے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نوجوان سنبھال لیں گے حالات کو۔۔۔ بہت ٹی ٹرانے گا لیے۔ بہت ڈرامے دیکھ لیے۔ اب صرف ایک خونی انقلاب اور ایک خمینی یا اتاترک کی ضرورت ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کل کسی وقت تم مجھ سے ملو۔"

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا "آئی ایم سوری سر۔ میں کچھ زیادہ بول گیا۔ مجھے کنٹرول نہیں رہتا جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ مارے جاؤ گے کسی دن۔ آپ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاگل سمجھ کے معاف کردیں۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ نہ میں تمہاری رپورٹ کروں گا اور نہ تمہیں کسی ایجنسی کے حوالے کروں گا۔ مجھے کام ہے تم سے۔"

"نہیں سر' میں نہیں آسکتا" اس کا شک دور نہیں ہوا "میں جو کام کررہا ہوں' وہی ٹھیک ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "تم انکار نہیں کرسکتے۔ اگر واقعی تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ تو سر۔۔۔ ایسے ہی تھا۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ پاگل سمجھ کے نظرانداز کردیں میری باتوں کو۔"

وہ بار بار بھاگنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا "ایک بات سمجھ لو اچھی طرح۔ تم خود نہ آئے تو میں بلوالوں گا تمہیں۔ تمہاری ٹیکسی کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مجھ پر اعتبار کرو' مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

اس نے بے بسی سے کہا "جی۔۔۔ اچھا۔۔۔ میں آجاؤں گا۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"سعید۔۔۔ سعید ملک۔۔۔" وہ بولا۔

"ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ" میں نے کہا۔

اس نے انکار کیا "وہ تو نہیں ہے سر۔۔۔ مجھے جانے دیں پلیز۔"

میں نے بادشاہ خان سے کہا "دیکھو۔ ٹیکسی کے خانے میں اس کے سارے کاغذات ہوں گے' وہ نکالو۔"

بادشاہ خان نے بڑی مستعدی سے تعمیل کی۔ میں نے اس نوجوان کا ہاتھ چھوڑ دیا جو اب سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کے کاغذات سب میں اس کا یہی نام تھا۔ میں نے اس کا پتا بھی نوٹ کیا اور پھر کاغذات اسے واپس کرکے اس سے ہاتھ ملایا "یقین کرو۔ میں وہ شاہ عالم نہیں ہوں جو پہلے تھا۔"

"آپ کی بات کو میں غلط نہیں کہہ سکتا سر!"

"یہ حقیقت ہے' اس کا یقین تمہیں اور کسی طرح نہیں آئے گا۔ میرے قسم کھانے سے یا حلف اٹھانے سے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اب وقت آگیا ہو جب تم جیسے نوجوانوں کے خواب کو تعبیر مل جائے۔ اگر تم مرنے سے نہیں ڈرتے تو پھر تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ آخر تم اکیلے ہی تو ایسا نہیں سوچتے' تم جیسے لاکھوں ہوں گے۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا بھی تو کفر ہے۔"

"کفر ہی کفر ہے یہاں تو سر۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے فتوے سے کافر ہے۔ وہ جو کچھ کررہا ہے کسی نہ کسی کے نزدیک غلط ہے۔ میرے جیسے لاکھوں بھی اکٹھے ہوجائیں پھر بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ سب بے بس ہیں ان کے آگے جن کے پاس اختیار ہے۔ کلاشنکوف ہے یا فتویٰ ہے۔"

"ایسی بات نہیں۔ یہ ملک اللہ کی رضا سے بنا تھا۔ اس کی حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس نے ہاتھ نہیں کھینچا ہے اپنا۔ خدا جب کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اسباب خود پیدا کردیتا ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم آؤ گے ناصح۔ پھر بات کریں گے۔"

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا "آؤں گا۔ آنا ہی پڑے گا اب تو۔"

نہ جانے کیوں مجھے اس باغی اور بے باک نوجوان نے متاثر کردیا تھا۔ اگر وہ دیوانہ تھا تو مجھے اس کی دیوانگی اچھی لگی تھی۔ اس کی زبان زہر اگلتی تھی مگر اس کی سچائی نے مجھے قائل کرلیا تھا۔ ایک نئی دنیا میں جہاں میں نووارد تھا اور کسی کو پہچانتا نہیں تھا' مجھے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی جن کی نیت اور کردار کے بارے میں مجھے کوئی شک نہ ہو اور جن کو میں اپنا سمجھ کے ان پر بھروسا کرسکوں۔ میرے اردگرد شاہ عالم کے پرانے ساتھی تھے جن سے میں ایک دم قطع تعلق کرلیتا تو تنہا ہوجاتا۔ میرا ان سب کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ جب تک کہ میں انہیں' ان کے ظاہر و باطن کو اور قول و فعل کو سمجھ اور پرکھ نہ لوں۔ پھر میں اپنا انتخاب کرسکتا تھا اور ایک ایک کرکے ان سب سے پیچھا چھڑا سکتا تھا جو میرے ہم خیال نہ ہوں یا جو ذاتی مفادات کی خاطر مجھ سے پیمانِ وفا رکھتے ہوں مگر درپردہ صفِ دشمناں میں بھی شامل ہوں۔ یہ بہت مشکل اور طویل کام تھا۔ پارٹی میں نیچے اوپر تک ہزاروں لاکھوں کارکنوں اور عہدے داروں کو چھان پھٹک کے حقیقی خیرخواہوں کا پتا چلانا اور انہیں آگے لانا۔ دوغلے اور منافق لوگوں کو دشمن بنائے بغیر پیچھے کرنا اور ساتھ میں پارٹی کی قیادت کا ڈسپلن قائم رکھنا' یہ سارا کام میں تیمور' قریشی اور شمس اور اشرف پر مکمل اعتماد کے ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ قریشی اور شمس کے عزائم تو واضح تھے۔ تیمور مجبوری میں ساتھ دے رہا تھا۔ اشرف ابھی تک مجھے واحد بھروسے کے قابل ساتھی نظر آتا تھا۔ یہ انتہائی ضروری تھا کہ میرے آس پاس وہی لوگ ہوں جن سے مجھے کوئی خطرہ نہ ہو۔ مجھے ایک ٹیم کی ضرورت تھی جو اس آپریشن کلین اپ میں پوری طرح میری کمان میں ہو اور میرا ساتھ دے سکے۔

مین گیٹ پر پولیس کی ایک موبائل میں چار پانچ افراد

اونگھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی پارٹی کی یونیفارم کے مسلح کارکن مسلح کھڑے ہوئے تھے جو ایف اے ایف کی غیر سرکاری وردی میں تھے۔ ان کے ایک جیسے لباس ہی ان کی شناخت تھے جیسے وردی سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ سب انتہائی جوشیلے اور سرپھرے لوگ تھے جو پارٹی کے نام پر رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے تھے اور متعدد سیاسی جماعتوں کی طلبا تنظیموں کی طرح پُرتشدد کارروائیوں کے لیے بدنام بھی ہوگئے تھے۔ ان میں کچھ کا رویہ ہی بدمعاشی کا تھا اور اسی پر ان کے روزگار کا انحصار ہوگیا تھا۔ یہ فورس زیادہ تر پارٹی کی قیادت سے اختلاف رکھنے والوں کی آواز دبانے اور مخرفین کی سرکوبی کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

ایف اے ایف کا نوجوان مجھے دیکھ کر آگے آیا۔ اس نے مجھے سیلیوٹ کیا "آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں سر؟"

مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اور تمہیں یہ اختیار کس نے دیا ہے آخر؟"

وہ کچھ مؤدب ہوگیا "وہ سر۔ دراصل آپ سرکاری گاڑی میں نہیں آئے۔"

"میں پیدل آؤں یا بحری جہاز پر' تم کیوں پریشان ہو" میں نے کہا۔

"آپ کی حفاظتی ذمے داری تو ہماری ہے سر۔ ہم آپ کو سیکیورٹی رسک پر عام لوگوں کی طرح پھرنے کی اجازت نہیں دے سکتے" اس نے سرکشی سے کہا۔

"اجازت؟" میں چراغ پا ہوگیا "تم اجازت دو گے مجھے؟ میں تمہاری اجازت کا محتاج ہوں؟"

"یہ ہمارے فرائض میں شامل ہے سر!"

"میں تمہیں ان فرائض سے سبکدوش کرتا ہوں۔ آج کے بعد تمہاری یہ ذمے داری ختم۔ میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں اور مجھے بہرحال بھروسا ہے خدا پر۔"

"لیکن آپ ایسا نہیں کرسکتے سر!"

میں نے کہا "میں پانچ منٹ دیتا ہوں تمہیں۔ اٹھاؤ یہاں سے اپنا کیمپ اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میں کسی ایف اے ایف کے محافظ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں نے فارسی نہیں بولی۔"

"مگر میں صرف فورس کمانڈر کا حکم ماننے کا پابند ہوں" وہ اڑ گیا۔

"ایسی کی تیسی تمہارے فورس کمانڈر کی۔ میں اسے برطرف کرتا ہوں۔ ابھی بات کرتا ہوں تیمور سے" میں نے کہا۔

میں آگے بڑھا تو اس نے بادشاہ زادہ کو روک لیا "یہ اندر نہیں جاسکتا۔"

"کیوں نہیں جاسکتا۔ یہ باڈی گارڈ ہے میرا" میں نے کہا۔

"آپ کو باڈی گارڈ فراہم کرنا ایف اے ایف کی ذمے داری ہے۔ اشرف صاحب نے فورس کمانڈر کی منظوری کے بغیر باہر سے گارڈ رکھا ہے۔"

میں نے کہا "اشرف کو میں نے منظوری دی تھی۔"

"سوری سر۔ نیا ڈرائیور اور باڈی گارڈ سیکیورٹی کلیئرنس کے بغیر نہیں رکھے جاسکتے۔ خصوصاً آپ پر قاتلانہ حملے کے بعد۔۔۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا "اس سے اسلحہ لے لو۔"

اس وقت میں نے شاہ عالم کے بدلے ہوئے روپ کا پہلی بار مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ حکم دینے والا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے کرنل خان کی شاگردی میں سیکھے ہوئے مارشل آرٹ کا معمولی سا مظاہرہ کیا۔ پلک جھپکتے میں وہ ہوا میں اڑے اور پھر زمین پر گرتے نظر آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اب خود نہیں اٹھ سکتے۔ "کیا خیال ہے اب؟ اس کے لیے بھی مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت تھی مثلاً تمہاری؟" میں نے کہا اور اسے جواب دینے کی مہلت بھی نہیں دی۔

پولیس کا ایک انسپکٹر بدحواسی میں میری طرف آیا "سر۔۔۔ کیا بات ہے۔ یہ کیسی مارپیٹ ہے۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں' ان سب کو اٹھالو۔ دیکھو ان کے پاس جو اسلحہ ہے وہ غیر قانونی تو نہیں۔ ہے تو ان کے خلاف اسلحہ ایکٹ اور قاتلانہ حملے کے مقدمات درج کرو۔ ان کو میرے سوا کسی کی مداخلت پر چھوڑا نہیں جائے گا۔ صبح تک انہیں حوالات میں رکھو۔"

پھر میں نے بادشاہ زادہ سے کہا "اب تم یہاں گیٹ پر کھڑے رہو۔ میری اجازت کے بغیر اندر کوئی نہیں آئے گا۔ خواہ وہ گورنر ہو۔"

"نہیں آئے گی صاب" اس نے سیلیوٹ مار کے خوش دلی سے کہا۔

آگے پارکنگ ایریا میں چھ سات گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور اندر باہر اچھی خاصی رونق نظر آرہی تھی۔ شاہ عالم ہاؤس پھر آباد ہوگیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مجھ سے شرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاقات کے خواہش مند کس قسم کے لوگ ہوں گے۔ ان میں کچھ دوسری جماعتوں کے لوٹے خریدنے یا بیچنے والے ہوں گے جن کے دم سے لوٹا کریسی فروغ پا رہی تھی۔ کچھ سرکار کے نمک حرام بیوروکریٹ ہوں گے۔ کچھ ذاتی سفارشات کے لیے پارٹی کے خیر خواہ بننے والے ٹھیکے دار' تاجر اور اسمگلر۔ ان میں کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا اور میں اس وقت شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ یہ اپنے رشتوں سے شکست اور صدمے کا ردعمل تھا کہ میں نے ایف اے ایف کے ایک نوجوان لڑکے کو ضرورت سے زیادہ سخت سزا دے کر اپنا غصہ اتارا۔ عام حالات میں شاید میں تحمل سے کام لیتا اور مسکرا کے اندر چلا جاتا۔ تیمور کو فون کرتا اور اسے بتا دیتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

اگر میں اپنی شاہانہ سرکاری گاڑی میں لوٹتا تو میرے آنے سے پہلے ہی سب کو خبر ہو جاتی۔ فی الحال میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے سیاسی معاملات یا پارٹی کے مسائل سے زیادہ ذاتی مشکلات کا سامنا تھا جس میں میری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

میں خاموشی سے پیچھے گیا اور کچن میں داخل ہو گیا۔ وہاں گلاب اور چنبیلی کے ساتھ دو نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ وہ بیک وقت رات کے کھانے اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں اتنے مصروف تھے کہ کسی نے فوری طور پر میرے اندر آنے کا نوٹس نہیں لیا۔

پھر چنبیلی نے مجھے دیکھا اور حسب عادت انجن کی سیٹی جیسی چیخ ماری "صاحب جی' آپ ادھر ہے؟"

میں نے کہا "اس میں چیخ مارنے والی کون سی بات ہے" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "یہ دونوں لڑکے کون ہیں؟"

گلاب نے چنبیلی کو گھورتے ہوئے کہا "میں نے بلائے ہیں جی۔ اپنی مدد کے لیے' ویٹر ہیں۔"

"تم جانتے ہو انہیں تو ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا آج دوپہر کیا ہوا تھا' ذمے داری سب تم پر آئے گی" میں نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "نہیں سر جی۔ میں سب کی ذمے داری کیسے لے سکتا ہوں۔ میں نے تو بیگم صاحبہ سے کہا تھا کہ اب کام زیادہ ہو گیا ہے' انہوں نے اشرف صاحب سے کہا تھا۔"

میں نے دوسرے دروازے سے باہر جاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر میں ان سے بات کر لیتا ہوں لیکن دیکھو' ابھی کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آ گیا ہوں۔"

رخشی بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھنے سے زیادہ چینل بدلنے میں مصروف تھی۔ ٹی وی آف کر کے اس نے ریموٹ میز پر رکھ دیا "ایسے چوروں کی طرح کیوں آتے ہو۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "رخشی۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ پلیز' ان سب کو رخصت کر دو کسی طرح۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "اتنے پریشان کیوں ہو تم؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا "میرے سر میں سخت درد ہے۔ مجھے اسپرین چاہیے اور کافی۔ کیا اشرف نے فون کیا تھا؟"

"اشرف موجود ہے مہمانوں کے ساتھ" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا بلاؤ اسے ذرا خاموشی سے" میں نے کہا۔

رخشی نے انٹر کام پر دونوں کام کیے۔ اشرف فوراً آ گیا اور مجھے دیکھ کے چونکا "آپ یہاں بیٹھے ہیں؟"

میں نے کہا "اندر کون کون ہے؟"

اس نے دو سیاسی نام لیے۔ دو کے بارے میں بتایا کہ وہ پارٹی کے پرانے خیر خواہ ہیں اور بڑے بڑے چندے دیتے رہے ہیں۔ دو نے اپنا نام بتایا مگر کام بتانے سے انکار کر دیا۔"

میں نے کہا "سب سے کہہ دو کہ آج میں کسی سے نہیں مل سکتا۔ کوئی بہانہ کر دو کہ مجھے اچانک جانا پڑا۔ کراچی' لاہور کچھ بھی کہہ دو۔"

"میں کہہ دوں گا۔"

"اشرف۔ تم نے کچن کے لیے دو مددگار فراہم کیے ہیں۔ وہ بھروسے کے آدمی ہیں نا۔ دیکھو' آج ایک نہیں دو واقعات پیش آ چکے ہیں۔ ایک یہاں میرے گھر میں اور دوسرا پارٹی آفس میں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں انہیں جانتا ہوں" وہ بولا۔

"ہاں۔ ایسا نہ ہو کہ چائے پی کے تیسری ایمرجنسی پیش آئے کسی کو۔ تم سب سے معذرت کر کے فوراً واپس آؤ۔"

اس نے "یس سر!" کہا اور چلا گیا۔ رخشی نے پانی کے ایک گلاس کے ساتھ اسپرین میرے سامنے رکھ دی "آفس میں کیا ہوا تھا؟"

میں نے ایک مسلح شخص کے پکڑے جانے اور سیکیورٹی گارڈ کے قتل کے بعد فرار ہونے کے بارے میں بتایا "تم بتاؤ' ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آج یہاں شبنم نے خود گولیاں کھالیں یا اسے چائے میں دی گئیں۔ وہاں بھی چائے میں ہی زہر دینے کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اب ایسا نہ ہو کہ مہمان چائے پی کے لیٹ جائیں اور کافی پی کے میں اللہ کو پیارا ہو جاؤں۔"

وہ متفکر نظر آنے لگی "گلاب اور چنبیلی پرانے خاندانی

ملازم ہیں۔ گاؤں سے میاں جی کے ساتھ آئے تھے۔ ان پر ہرگز شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ تمہارے لیے خود کافی بنا کے لائے۔"

اس نے پھر انٹر کام پر گلاب کو تفصیلی ہدایات دیں "پتیلی دھو کے نیا پانی ابالو۔ برتن دھو کے رکھو۔ کافی کی نئی شیشی کھولو۔ کسی اور کو ہاتھ مت لگانے دو۔ صاحب سے پہلے تم کو پینی پڑے گی کافی۔"

میں نے کہا "اب ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کسی نے فون کیا تھا مجھے؟"

"تمہارے فون میرے نمبر پر ریسیو نہیں ہوتے" وہ بولی "اشرف سے پوچھو۔"

میں نے جیب سے دو موبائل فون نکال کے میز پر رکھ دیے "حیرانی کی بات یہ ہے کہ میرا فون بھی خاموش ہے۔"

"خاموش کیسے نہ رہتا۔ تم نے بات کر کے آن چھوڑ رکھا ہے" اس نے کہا "یہ دوسرا فون کس کا ہے؟"

میں نے کہا "اسی کا۔ جو خود کو شہزادہ سلیم کہتا تھا۔ اس پر بھی کوئی کال نہیں آئی۔"

اشرف پھر آیا تو میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ رخشی نے بڑا سا منہ بنایا "اب تمہاری میٹنگ یہاں ہوں گی۔ اس بیڈ روم میں۔"

میں نے کہا "سوری۔ آج کے بعد نہیں ہوں گی۔ ابھی ذرا ایمرجنسی ہے۔"

اشرف نے کہا "پوسٹ مارٹم رپورٹ سے آپ کی بات درست ثابت ہوئی۔"

"پھر۔ تم نے کیا کیا؟" میں نے کہا۔

"کیس رجسٹر کر دیا۔ پولیس نے کچن کو سیل کر دیا ہے اور سارا عملہ تفتیش کے لیے روک لیا ہے" وہ بولا "ابھی خبر اخبار والوں کو نہیں ملی۔"

میں نے کہا "عملے میں کتنے لوگ شامل ہیں؟"

"ایک شیف' دو کک' چار ویٹر" وہ بولا "سب پرانے لوگ تھے۔"

"پرانے ہی گڑبڑ کریں گے" میں نے بے خیالی میں کہا "خیر۔ میں نے ابھی ابھی گیٹ پر سے ایف اے ایف والوں کو ہٹایا ہے۔ اس کے لیے مجھے کچھ زبردستی سے کام لینا پڑا۔ وہ میری ماننے کو تیار نہیں تھے۔"

"وہ کس کی مانتے ہیں سر!" اشرف بولا۔

میں نے کہا "کل جب ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہو گا تو میرا ارادہ ہے کہ پارٹی کا یہ ونگ ختم کر دیا جائے۔ ہمیں صرف کارکن چاہئیں۔ حفاظت اور رضاکارانہ خدمت کے نام پر دہشت گردی نہیں۔ کیا ضرورت ہے ہمیں کسی فاتح عالم فورس کی۔ کیا ہمیں دنیا کو فتح کرنا ہے۔"

اشرف شش و پنج میں پڑ گیا "بات آپ کی سو فیصد ٹھیک ہے سر لیکن یہ بہت مشکل ہے۔"

"کیوں بہت مشکل ہے؟"

"وہ سب مسلح ہیں۔ زیادہ تر اسلحہ غیر قانونی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ جب یہ فورس ختم کی جائے گی تو اسلحہ واپس لیں گے۔ وہ غیر قانونی اسلحے سے کیا کرتے ہیں' اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ پارٹی کی قیادت ان کی ذمے داری نہیں رہے گی۔ ہم اس کا باضابطہ اعلان کر سکتے ہیں۔"

"اگر کمیٹی نے یہ منظور نہ کیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ یوتھ فورس جماعت کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ جمعیت اسلامی کی ہے۔ مسلم یوتھ فیڈریشن ہے۔ پی ایس ایف ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ان کے منشور اور سیاسی لائحہ عمل میں فرق ہے۔ ہم سیاست کا وہ انداز نہیں رکھنا چاہتے جو مروج ہے۔"

"امیر تیمور اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔"

"اسے میں سمجھا لوں گا۔" میں نے کہا "اور کسی سے تو خطرہ نہیں؟"

اشرف نے کہا "حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے سر۔ آپ کی عدم موجودگی سے کچھ لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی پوری منصوبہ بندی کر لی تھی۔ بے شک آپ کے آ جانے سے انہیں فوری طور پر اپنے عزائم میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ مایوس نہیں ہیں۔ محمود راز کے قتل سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ پارٹی کے بہت سے ممبران کے ساتھ مل کر اپنا گروپ تشکیل دینا چاہتے تھے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پارٹی میں محمود راز گروپ کو سینئر نائب صدر کا عہدہ دیا جائے گا۔"

"وہ تو تیمور ہے۔"

"سر۔ اس وقت پروگرام کچھ اور تھا۔ شمس یا قریشی میں سے ایک آپ کی جگہ لیتا' چیئرمین ہو جاتا۔ سینئر نائب صدر کے عہدے سے تیمور کو اس الزام کے ساتھ برخواست کر دیا جاتا کہ وہ چیئرمین کی شہادت کی سازش کرنے والوں کا آلۂ کار بنا۔ ایگزیکٹو کمیٹی میں محمود راز گروپ کے چار اراکین ہوتے۔"

"وہ تو بات ہی ختم ہو گئی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہی تو میں بتانا چاہتا تھا آپ کو' بات ختم نہیں ہوئی۔ اندر ہی اندر لاوا ایک رہا ہے۔ ابھی دو لوگ ایسے آئے تھے جو اس لیے پریشان تھے کہ وہ لاکھوں روپے پارٹی فنڈ میں دے چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے رازداری کے وعدے کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ کیا پارٹی کی قیادت میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ چیئرمین کو ہٹایا جا رہا ہے ان کے عہدے سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس یہ پیغام آیا تھا۔ ایک اور ایسے ہی شخص کو بھی بتادیا گیا ہے کہ وہ ثبوت تیار رکھے اور گواہی کے لیے بیان بھی۔"

"کیسی گواہی' کس قسم کے ثبوت اشرف!"

"کمال ہے سر۔ یہ بھی سمجھانا پڑے گا آپ کو۔ لاکھوں روپے پارٹی فنڈ میں دینے والے بے وقوف تو نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کیا ثبوت ہیں ان کے پاس۔ ٹیپ ہے' کوئی ٹیلی فون کی گفتگو کا یا ویڈیو فلم ہے۔ وہ آپ پر بدعنوانی کا الزام لگائیں گے کیونکہ رقم انہوں نے آپ کو دی تھی۔ پارٹی انکار کرے گی۔ ان کے حساب میں کچھ نہیں۔"

"اور مجھے بدعنوان اور بے ایمان ثابت کرکے نکال دیا جائے گا۔ اتنا آسان ہے یہ اشرف؟"

"سر۔ وہ دن رات مصروف رہے ہیں۔ آپ کے خلاف بہت مواد جمع کرلیا ہے انہوں نے۔ آج رات فیصلہ ہوجائے گا۔ صبح ایگزیکٹو کمیٹی آپ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کرلے گی۔"

میں نے سوچ کے کہا "مگر صرف اتنا ہی تو کافی نہیں ہے۔ میرے ویٹو کرنے کے اختیارات ہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "آپ نے خود ہی ویٹو کے اختیارات کو غیر جمہوری قرار دیتے ہوئے پارٹی کے آئین سے نکال دیا تھا۔ آپ زیادہ سے زیادہ ایگزیکٹو کمیٹی توڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں نئے انتخابات کرانا ضروری ہوگا۔ اس میں ایک امیدوار آپ ہوسکتے ہیں اور آپ پھر کارکنوں کے ووٹ سے چیئرمین منتخب ہوجاتے ہیں تو ایگزیکٹو کمیٹی نئی بنا سکتے ہیں۔ مگر اس وقت تک آپ کے خلاف تمس اور قریشی کی مہم تیز ہوجائے گی۔ آپ کے خلاف الزامات کا سلسلہ دراز ہوجائے گا۔ آپ کو اتنا بدنام کردیا جائے گا اور کارکنوں کی نظر میں اتنا گرا دیا جائے گا کہ وہ آپ کو ووٹ ہی نہیں دیں گے۔ اگر ان کی مخالفانہ مہم کے باوجود آپ ناکام رہے تو پھر وہ اپنا گروپ الگ کرلیں گے۔ پریشر گروپ یا فارورڈ گروپ۔ اگر وہ اکثریت کو توڑنے میں کامیاب رہے تو۔"

میں نے کہا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ایک تو آپ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ جو آپ کے خلاف جائے۔ ایف اے ایف کے وفد رخصت ہیں۔ اسے ختم نہ کریں۔ دوسرے صبح کے اجلاس سے پہلے تمس اور قریشی کو خبردار کردیں کہ آپ کو ان کے باغیانہ عزائم کی خبر مل گئی ہے اور وہ باز آجائیں ورنہ آپ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے ہوئے انہیں برطرف کردیں گے۔ آپ کے پاس بھی تو ثبوت ہوں گے ان کے خلاف؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ بالکل ہیں۔۔۔"

رخشی نے جو ساری گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی کہا "آپ صبح کا انتظار کیوں کرتے ہیں' ابھی آپ کریں نا۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انہیں خبردار کرنے کی کارروائی بھی کیوں۔ چھاپا مار کارروائی کریں ان کے خلاف۔ ایسے کہ انہیں سنبھلنے اور صفائی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ ملے۔ جارحیت میں ہی بہترین دفاع ہے۔" رخشی نے کہا۔

اشرف نے اسے حیرانی سے دیکھا "بھابی۔ آپ کو تو سیاسی مشیر ہونا چاہیے ان کا۔"

"ابھی وقت ہے۔ آپ انہیں معطلی کا حکم جاری کردیں۔ بدعنوانی' پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی۔ خورد برد۔ یہی الزامات لگا کے۔" رخشی نے کہا۔

"بالکل۔ سو فیصد اتفاق کرتا ہوں میں آپ سے بھابی۔" اشرف نے جوش سے کہا "آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ سازشی لوگ پارٹی کو ہائی جیک کرلیں گے۔ ابھی وقت ہے' میں اخباروں کو خبر جاری کرسکتا ہوں۔"

آدھے گھنٹے میں ہم آفس پہنچ گئے۔ اشرف نے بڑی تیزی سے سارا کام کیا۔ تمس اور قریشی کے خلاف چارج شیٹ تیار ہوگئی اور میں نے اس پر دستخط کردیے۔ ان دونوں کو تحقیقات مکمل ہونے تک کارکنوں کی اور عوامی شکایات پر نائب صدارت سے محروم کردیا گیا تھا۔

"خبر تو شائع ہوجائے گی سر۔" اشرف نے پھر گھڑی دیکھی "لیکن اگر انہوں نے معطلی کا یہ حکم وصول ہی نہ کیا' وہ صبح صاف تردید کردیں گے اور الٹا اخبار والوں کے اوپر آپ کے خلاف جھوٹ ثابت ہوجائے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "تم یوں کرو' اخبارات کو خبر فراہم کردو۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ ان سے یہ احکامات وصول کرانے کی ذمے داری میری۔"

اشرف اپنی گاڑی لے کر روانہ ہوگیا تو میں نے ایک

ملایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا "ہاں پیارے' کس کو یاد آگئی اس وقت ہماری؟"

میں نے کہا "رئیس' تو کہاں ہے اس وقت؟"

"یہ میں بتا نہیں سکتا۔ شرم آتی ہے یار" وہ ہنسا۔

"میں پارٹی آفس میں تیرا انتظار کررہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جا۔۔۔ ایک منٹ بھی اوپر ہوا تو ایک گولی زیادہ ماروں گا۔"

"ابے یار۔ یہ کیا۔۔۔ سالے نہ دن دیکھتے ہو نہ رات۔ ہمارا کوئی پرائیویٹ ٹائم بھی ہے کہ نہیں۔ ہم مصروف ہیں یار۔"

"تو آتا ہے یا میں خود آؤں تجھے لینے۔۔۔؟" میں نے کہا "مصروف کے بچے۔"

پیچھے سے کسی عورت کی آواز آئی "کون کم بخت ہے۔ کہہ دو نا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ٹال دو کسی طرح۔"

رئیس نے ٹھنڈی سانس لی "آتے ہیں ہم پیارے۔ قسم اللہ کی تیری یاری نے ہمیں مار دیا۔"

رئیس خان بیس منٹ بعد ہی نمودار ہوگئے۔ میں اس کے استقبال کے لیے گیٹ پر ہی موجود تھا ورنہ اس کا سیکیورٹی گارڈز سے جھگڑا ہوتا۔ وہ میری اجازت کے بغیر کسی باہر کے آدمی کو ہرگز پارٹی آفس میں داخل نہ ہونے دیتے۔

میں نے کہا "رئیس۔ وہ کون تھی جس نے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ ٹال دو؟"

رئیس نے مونچھوں میں دانت دکھائے "ابے یار۔ بھابی تھی تیری۔۔۔ میرا مطلب ہے ہونے والی۔"

میں نے کہا "پھر مل گئی۔۔۔ اف۔۔۔؟"

"یار' اس بار میں بہت سیریس ہوں۔ قسم اللہ کی۔ ایسی لڑکی مل جاتی پہلے تو اتنی دیر کیوں ہوتی۔"

"یہ تو نے چھ مہینے پہلے بھی کہا تھا۔ جب تیری ساتویں منگیتر تیرے ساتھ تھی۔ یاد ہے یا بھول گیا؟"

"دیکھ یار۔ بھولنے والی بات تو نہیں ہے مگر تو خود سوچ' میں نے چھوڑا اسے یا اس نے بے وفائی کی۔"

میں نے کہا "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے اور پھر ہوگا اگر دیر کی تو نے۔"

"پیارے' شادی کی تیاری میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے ہم قائل نہیں۔ دھوم دھام سے کریں گے شادی۔"

"بس پھر آپ تیاری ہی کرتے رہیں گے" میں نے کہا۔ "شادی کوئی اور کرے گا اس سے بھی۔۔۔ خیر' اس وقت میں نے ایک خاص کام سے بلایا ہے تجھے۔"

"ہاں۔ عام کام تو تیرا ہوتا نہیں سالے۔"

میں نے اسے دو لفافے دیے "دیکھ۔ ان پر پتے لکھے ہوئے ہیں۔۔۔ اور نام بھی۔ انہیں یہ خط وصول کرانے ہیں۔"

"ابے ہم ڈاکیے ہوگئے ہیں کیا؟" وہ بگڑنے لگا۔

"یہ بات نہیں یار۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انکار کریں۔ ان کے انکار کو اقرار میں تیرے سوا اور کون بدل سکتا ہے۔ کام ذرا رازداری کا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ خط وصول کرکے رسید دیں۔ دوسرے کاپی پر دستخط کریں' اصلی دستخط۔ اور ٹائم بھی لکھیں شام چھ سات بجے کا۔"

"بس! ابے یہ بھی کوئی کام ہے؟"

"ابھی آگے سن۔۔۔ جب یہ کام ہوجائے تو کچھ ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ صبح تک ان کا کسی سے بھی رابطہ نہ ہو۔ نہ پولیس سے نہ اخبارات سے اور نہ کسی سیاسی شخصیت سے۔ بس ان کے فون ڈیڈ ہوجائیں۔"

"یا وہ خود ڈیڈ ہوجائیں۔ گو ویسٹ گون۔"

"نہیں۔ صرف ان کو روکنا ہے۔ نہ وہ کسی سے ملیں اور نہ کوئی بات کریں۔ جب تک صبح کے اخبارات شائع نہیں ہوجاتے۔ پھر تو بچے پارٹی کی میٹنگ ہے۔ ان کو دس بجے تک روکنا ہے۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "اچھا۔ کرتے ہیں کچھ پیارے!"

میری سرکاری کھلانے والی لینڈ کروزر ابھی تک میرے حکم کی تعمیل میں وہیں موجود تھی۔ ڈرائیور میرے دوبارہ نمودار ہوتے ہی مستعد ہوگیا تھا مگر رئیس نے یہ گاڑی لے جانے سے انکار کردیا "ہم گرگٹ پر آئے ہیں یار' اس سے اچھی سواری کوئی نہیں' جو اپنی ہو" وہ بولا۔

گرگٹ اس کی وہی ۸۶ ماڈل کی انڈا شیپ شیراڈ تھی جس کا رنگ ہر سال بدل جاتا تھا۔ بعض اوقات کسی حادثے کے بعد اور کبھی شناخت بدلنے کے لیے۔ میں اس کے ساتھ باہر تک آیا تو گاڑی میں ایک خاتون کو منتظر دیکھا۔ رئیس کے متعارف کرنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ مجھے "کم بخت" کہنے والی اور میری ہونے والی بھابی کے سوا کون ہوسکتی ہے۔ وہ رئیس کی پسند کے عین مطابق تھی۔ اس ہونے والی بھابی کا رنگ نسبتاً صاف تھا مگر وزن سابقہ نہ ہونے والی بھابیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ وزن کا مسئلہ یہ تھا کہ رئیس کو موٹی عورتیں اچھی لگتی تھیں اور ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں کے چکر میں ہر نئی امیدوار دو چار کلو بڑھ جاتی تھی۔ اپنی زمانے سے مزاجی پسند کے جواز میں اس کا فرمانا یہ تھا کہ "یہ آج کل کی ماڈل بھی کوئی لڑکیاں ہیں کہ بس ڈھانچے پر چمڑی بھی مجبوراً چھوڑ دی ہے ورنہ نری ہڈیاں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاپے جیسی کہ لگتا ہے ہاتھ لگاتے ہی پٹ سے ٹوٹ جائیں گی۔ چائے میں ڈبو کے کھاؤ۔ ابے عورت ہونی چاہیے نرم ڈبل روٹی جیسی۔"

میں نے کہا "یار' اس ڈبل روٹی کو کیوں ساتھ لے آیا تو؟ مشکل وقت میں عورت کا ساتھ زیادہ مشکلات پیدا کرتا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "اسی کو محبت کہتے ہیں پیارے۔ ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہیں ہے۔ میں اس کا دل تو نہیں توڑ سکتا۔"

"اتنی آسانی سے ٹوٹے گا بھی نہیں۔ بھینس کا دل بہت بڑا ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"بھینس کے فائدے مت پوچھ بیٹا۔ سواری کے لیے اچھی ہے۔ دودھ بھی خوب دیتی ہے اور عقل سے بڑی چیز کہلاتی ہے۔"

میں اشرف کے ساتھ آیا تھا اور وہ اپنی گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ میرے اشارے پر بابر نے لینڈ کروزر کو اسٹارٹ کیا اور چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بجے تھے۔ مجھے اس فون کا خیال آیا جو سی ٹائیگر نے کیا تھا۔ اس کے بعد پرنس نے مجھے بارہ بجے وہیں ملنے کے لیے کہا تھا۔ یہ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا کہ وہیں سے اس کی کیا مراد تھی۔ میں تو ٹائیگر اور پرنس سے ہی ناواقف تھا۔ شاید یہ ڈرگ مافیا کی کمانیوں کا اثر تھا کہ ایسے نام شہرت پاتے تھے ورنہ اپنے وطن میں شہرت پانے والے منشیات فروشوں کے بڑے شریفانہ نام تھے۔

یہ ہو سکتا تھا کہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے ایک نے ٹائیگر کا نام استعمال کیا ہو اور دوسرے نے پرنس کا۔ انہیں یہ خطرہ بہرحال رہتا ہے کہ ان کے فون ٹیپ نہ کیے جا رہے ہوں۔ موبائل فون اس لحاظ سے محفوظ سمجھے جاتے تھے مگر محفوظ میں احتیاط ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔

اس وقت میرے ساتھ کوئی باڈی گارڈ نہیں تھا۔ بابر ڈرائیونگ کرتے ہوئے کچھ مضطرب نظر آتا تھا۔ اس نے ایک بار پلٹ کے پوچھا "سر جی' آپ اکیلے کیوں آئے تھے۔ اپنے بادشاہ سلامت کیا آرام فرما رہے تھے؟"

میں نے کہا "بھئی اسے میں نے زیادہ اہم ذمے داری سونپ دی ہے۔"

"اسلحہ تو لائے ہیں آپ اپنے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ جلدی میں خیال نہیں رہا۔"

بابر میری طرف دیکھ کے مسکرایا پھر اس نے گاڑی کو اچانک موڑ لیا۔

میں نے کہا "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"وہیں سر جی!" وہ بولا۔

پھر اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔

○☆○

سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ شاہ جی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو سارا کھیل چوپٹ ہو جاتا۔ میں نے فوراً برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے لی۔ گاڑی اتنی دیر میں گھوم کے ادھر بھی گئی جہاں کار پارکنگ کے لیے جگہ تھی۔ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شادو کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔

شادو کو اس کا باپ یہاں علاج کے لیے لایا ہوگا۔ میر نے بڑے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔ اس نے شادو کو مارا ہوگا اور شاید اسے کوئی خطرناک چوٹ آئی ہوگی یا اس کے جسم کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی۔ شادو کا جرم بہت سنگین تھا۔ اس نے مجھے فرار میں مدد دے کر اپنے جرم کی سنگینی میں اضافہ کر لیا تھا۔ وہ پکڑے جانے کے بعد کوئی جھوٹ بھی بول سکتی تھی۔ شاہ جی یقین کرتا یا نہ کرتا۔ مگر وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ سے یا ایک دو جھانپڑ مار کے چھوڑ دیتا اور کہہ دیتا کہ وہ پھر نظر آیا مجھے یہاں تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ لاش کا قیمہ کر کے کتوں کو ڈال دوں گا لیکن شادو نے اعلانیہ اعتراف محبت کرتے ہوئے مجھے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کیا تھا اور میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خالی ہاتھ نہیں جانے دیا تھا۔ اس دہرے جرم کی سزا شادو نے اکیلے ہی برداشت کی تھی۔

طویل برآمدے میں ستونوں کی ایک قطار تھی۔ میں ایک کے بعد دوسرے کی آڑ لیتا آگے بڑھتا گیا۔ شاہ جی گاڑی پارک کر کے واپس آیا تو اس نے شادو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھکے ہوئے قدموں سے چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ مضمحل اور بے جان محسوس ہوتا تھا۔ لب سختی سے بند تھے اور وہ ایک ہاتھ کی مٹھی اعصابی کشیدگی میں بدلی بند کیے چل رہی تھی جیسے اس نے مٹھی کھولی تو امید کا پنچھی بھی پھر سے اڑ جائے گا۔

وہ میرے بہت قریب سے گزری۔ میں دو فٹ سے بھی کم فاصلے پر ایک گول ستون کی اوٹ سے اس کو تک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل مجری طرح مچل گیا تھا اور میں نے اسے چھونے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ وہ اپنے پیچھے

خوشبو کا دلنواز احساس چھوڑ کے آگے نکل گئی۔ شاہ جی کی نظر سے بچنے کے لیے میں ستون کے گرد تھوڑا سا گھوم گیا تھا۔

پھر اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے میرے عقل و ہوش گم کر دیے۔ شادو کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے اور اس نے گھوم کے اس سمت دیکھا جہاں میں ستون کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ دوسرے لمحے وہ پھر سامنے دیکھ کر قدم بڑھانے لگی۔ کیا شادو نے مجھے دیکھا تھا' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا؟ نہیں' یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں ستون کی اوٹ میں تھا۔ اس کی نظر نے مجھے تلاش کیا تھا مگر دیکھا نہیں تھا لیکن یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی یا اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا؟ اس نے ستون کے پاس سے گزرتے ہوئے خوشبو سے میری قربت کو محسوس کر لیا تھا؟ بالکل اسی طرح جیسے مجھے اس کے وجود کی مہربان خوشبو کا سندیسہ ملا تھا۔

رئیس کی فکر اب مجھے لاحق نہیں رہی تھی۔ اس وارڈ میں وہ بہت محفوظ تھا۔ اول تو شاہ جی کو خیال ہی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس نے تو پولیس کی بات مان لی ہوگی کہ تفتیش کے دوران میں بندہ مر گیا اور لاوارث تھا چنانچہ ہم نے دفن بھی کرا دیا۔ ویسے بھی وہ فقیر محمد کے نام سے داخل تھا اور بدقسمتی سے ایسا اتفاق ہو تا کہ شاہ جی اسے وارڈ میں دیکھ لیتا تب بھی ڈاکٹر مشہود کے مہمان سے پنگا لینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں اب کسی طرح شادو کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنی موجودگی کا اور اپنے قریب ہونے کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ ایسا کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہیں تھا۔ شاہ جی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ موقع محل دیکھے بغیر مجھے پکڑ لے۔ ریوالور ہمیشہ اس کے پاس رہتا ہے۔ وہ مجھے گولی تو نہیں مار سکتا تھا مگر اس کے عیار اور مکار ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ مجھے خطرناک مجرم' چور یا جیب کترا قرار دے کر پکڑوا دے اور پولیس کے حوالے کر دے۔ یہاں نہ میرا کوئی حمایتی تھا نہ میری شرافت کا گواہ۔ ڈاکٹر مشہود کو خبر ہونے سے پہلے ہی میں پولیس کی تحویل میں پہنچ جاتا اور اس کے بعد بس اللہ اللہ۔

بہت سوچ کے میں نے ایک شخص سے بال پین مانگا اور پھر ایک کاغذ حاصل کیا۔ میں نے جلدی میں لکھا۔

"شادو۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ میں یہاں تمہارے بہت قریب اس اسپتال میں ہوں مگر سامنے نہیں آ سکتا۔ میں یہ پیغام تم تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ پیغام مل جائے تو کسی طرح ڈاکٹر مشہود کے آفس میں پہنچ

محمود احمد مودی کا سسپنس' اسرار اور لہو میں ڈوبا تحیر خیز ناول

لہو کا سراغ

جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر موقع نہ ملے تو گھبرانا نہیں۔ میں آج یا کل تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آ رہا ہوں۔

تمہارا ــــ ناصر۔"

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں آؤٹ ڈور مریضوں کے شعبے میں گیا۔ وہاں ایک ازدحام تھا۔ شاہ جی اپنی بیٹی کو ایسے عام مریضوں کی بھیڑ میں شامل نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا۔ وہ کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جائے گا جو اسے جانتا ہوگا یا کسی کے ذریعے پرائیویٹ ٹائم لے کر آیا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ وہ کس ڈاکٹر کے پاس جائے گا؟

میں نے آرتھوپیڈک ڈاکٹرز میں دیکھا۔ اگر اس کا مسئلہ ہڈی ٹوٹنے کا ہوگا تو وہ کہیں نظر آ جائے گی۔ میں بہت محتاط تھا۔ مجھے شاہ جی کے علاوہ ڈاکٹر مشہود کے ملنے کا بھی ڈر تھا۔ وہ مجھ سے پوچھتے کہ بھئی' یہاں کیا سیر سپاٹا ہو رہا ہے؟ کیا اسپتال کا معائنہ کر رہے ہو۔

رقعہ میری مٹھی میں تھا اور میری نظریں ہر سمت میں دیکھ رہی تھیں۔ میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار تھے۔ اچانک میں نے شاہ جی کو تنہا اپنے سامنے سے گزر کے باہر جاتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اس نے باہر برآمدے میں آ کے سگریٹ جلائی اور ایک کش لیا۔ وہ صرف سگریٹ پینے کے لیے باہر آیا تھا اور یہ میرے لیے تقدیر کی عطا کردہ بہترین مہلت تھی۔ میں واپس بھاگا اور تیزی سے ایک راؤنڈ ہر وارڈ میں لگانے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ ہڈیوں کے شعبے میں نہیں تھی تو پھر عام بیماریوں کے کسی ڈاکٹر کے پاس ہو سکتی تھی یا پھر خواتین کے وارڈ میں۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ شاہ جی اطمینان سے پورا سگریٹ پیے۔ وہ دو چار کش لینے کے بعد بھی واپس آ سکتا تھا۔ میں تیز قدموں سے زنانہ وارڈ کی طرف گیا مگر بدقسمتی سے شادو کو اس وقت دیکھا جب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ شاہ جی اس کے ساتھ اندر نہیں جا سکتا تھا چنانچہ وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک جمعدارنی کو دیکھا جو لمبے ڈنڈے والے وائپر کے ساتھ فرش پر فینائل کا گیلا پونچھا مار رہی تھی۔ وہ زیادہ عمر نہ ہونے کے باوجود خرابی صحت کے باعث عمر رسیدہ نظر آتی تھی مگر اس کا لباس بہت شوخ تھا۔ اس سے زیادہ شوخی جمعدارنی کے مزاج میں تھی کہ آتے جاتے چپراسی اور وارڈ بوائے اس سے ہر قسم کا مذاق کرتے تھے اور وہ انہیں بڑی بے تکلفی سے کوئی دل خوش کرنے والا جواب بھی دے رہی تھی۔

اس کے قریب پہنچ کے میں نے کہا "دیکھو۔ میرا ایک کام کردو گی' میں سو روپے دوں گا تمہیں۔"

وہ کچھ حیران ہوئی اور مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی "کیا کام ہے؟" اس نے کہا اور وائپر کو فرش پر رگڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

"ایک رقعہ پہنچانا ہے" میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"رقعہ! کس کو؟ کوئی مریض ہے یا نرس؟" وہ مجھے آنکھ مار کے مسکرائی۔

میں نے کہا "اس کمرے میں ابھی ابھی ایک لڑکی گئی ہے۔"

جمعدارنی نے پلٹ کے دیکھا۔ قریب سے گزرنے والے ایک وارڈ بوائے نے اس کی اور میری جوڑی کے بارے میں نہایت واہیات تبصرہ کیا جس کا اس نے زیادہ واہیات جواب دیا۔ میں اسے شادو... کی صورت اور اس کے لباس کے بارے میں بتاتا رہا۔ میری نظریں مخالف سمت میں دیکھتی رہیں جدھر سے شاہ جی کسی وقت بھی نمودار ہو سکتا تھا۔

جمعدارنی نے بڑی صفائی سے رقعہ وصول کیا اور اس کے ساتھ ہی نوٹ مٹھی میں دبالیا "سمجھ لو تمہارا محبت نامہ پہنچ گیا۔"

اسی وقت شاہ جی نمودار ہوا "دیکھو..... وہ اس کا ظالم باپ ہے' اسے پتا نہ چلے ورنہ....."

"ورنہ کیا....؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے اور سینہ تان کے بولی "ادھر بد معاشی نہیں چلتی کسی کی اور میرا بھی نام ہے شیاما۔"

شاہ جی دروازے سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ میں اس سے بہت دور ایک خراب پڑے ہوئے الیکٹرک واٹر کولر کے پیچھے چھپ کر جمعدارنی کی کارکردگی دیکھتا رہا۔ اگر اس نے ڈاکٹرنی کے کمرے میں رقعہ پہنچادیا پھر تو کوئی مسئلہ شاید نہ ہو۔ شادو باہر آگئی اور پھر جمعدارنی نے کوشش کی تو شاہ جی دیکھ بھی سکتا ہے۔ جمعدارنی سو روپے کی خاطر رسک کیوں لے گی۔ وہ شاہ جی کو بتادے گی کہ تیری لڑکی کے کسی چاہنے والے نے رقعہ دیا تھا اور سو روپے دیے تھے۔ پھر شادو کی شامت اور میری بھی۔

جمعدارنی کمرے میں چلی گئی تو میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اب پیغام تو شادو تک پہنچ جائے گا مگر وہ' ڈاکٹر مشہود کے کمرے میں نہیں پہنچ سکے گی۔ شاہ جی دروازے کے سامنے موجود ہے۔ میں نے سوچا۔ وہ کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتی۔

پہلے جمعدارنی باہر آئی اور اس نے مجھے اِدھر اُدھر تلاش کیا' اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ میرے سو روپے حرام نہیں گئے۔ چند منٹ کے بعد ہی شادو برآمد ہوئی اور اس کی نگاہوں نے بھی میری جستجو کی۔ شاہ جی تو یہی سمجھا ہوگا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھا تو میں واٹر کولر کے پیچھے سے نکل آیا اور میں نے شادو کی طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا تاکہ وہ میری طرف متوجہ ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ شاہ جی کے ساتھ چل پڑی۔

شادو کے چہرے کی رونق جیسے لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی میں چراغ سے جل اٹھے تھے۔ میں اس کے ہونٹوں پر بھر جانے والی تمتع کی کرنوں جیسی مسکراہٹ اور گالوں کی لالی کو دیکھ بھی سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا۔ اس معمولی سی کامیابی نے میرے دل کو خوشی کی طاقت سے بھر دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ شادو کا تعاقب کروں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہوں۔ شاید وہ پھر پلٹ کر دیکھے اور مجھے دیکھ لے مگر اس میں اتنا ہی رسک شاہ جی کے دیکھ لینے کا بھی تھا۔ میں برآمدے میں رک گیا اور پھر میں نے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی میرے سامنے سے گزری۔ شاہ جی ڈرائیونگ کرتے ہوئے سیدھا دیکھ رہا تھا۔ شادو پیچھے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں ایک دم سامنے آگیا اور ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ اس کا اثر شادو پر وہی ہوا جو بجلی کا کرنٹ لگ جانے سے ہوتا۔ وہ بُری طرح چونکی اور اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ پھر گاڑی موڑ کاٹ کے باہر نکل گئی۔

میں لوٹ کے اندر گیا تو جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ میں نے اس جمعدارنی کو تلاش کیا۔ وہ کاریڈور کے آخری حصے میں تھی۔ "اب کیا ہے کاکا؟"

میں نے کہا "شیاما۔ تم نے رقعہ دے دیا۔ اس نے کچھ کہا؟"

وہ مسکرانے لگی "ہاں۔ پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"پھر۔ تم نے کیا بتایا؟"

اس نے بتایا "میں نے کہا وہ ادھر ہی ہے' باہر کھڑا ہے۔"

بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "اوہ شیاما۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔"

وہ ہنس پڑی "ہائے میں صدقے جاواں۔ چوم لے کون سا منہ گھس جائے گا میرا۔ اب شرما تا کیوں ہے؟"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہیں کچھ پتا ہے وہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

"پتا تو نہیں۔ مگر پتا چل سکتا ہے۔ نکال ایک اور نوٹ۔"

میں نے ایک سو روپے شادو کا صدقہ نکال دیا۔ "کیسے پتا چلے گا؟"

اس نے کہا "ٹھہرا دھر ہی۔ میں سسٹر کو بلا کے لاتی ہوں مگر دیکھ' اس کو بھی خوش نہ کیا تو وہ کچھ نہیں بتائے گی۔"

سسٹر صورت سے کرسچن نظر آنے والی خاصی موٹی عورت تھی۔ شیاما نے اسے پہلے ہی بتادیا ہوگا کہ ایک الو کے پٹھے عاشق کی جیب سے کتنی رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔ اپنی حیثیت اور مرتبے کی مناسبت سے اس نے پانچ سو لیے اور پھر کہا "وہ آئی تھی بچہ گرانے۔"

میں حیرت اور صدمے سے مفلوج ہو گیا "بچہ گرانے۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ کس کی بات کر رہی ہو تم؟"

"ہائے ہائے۔" وہ بُرا مان کے بولی "مینوں پاگل کہندا اے۔ نئیں۔ یقین تو جا پوچھ لے ڈاکٹر صاحب سے۔"

میں نے کہا "نام کیا تھا اس کا؟"

"ناں۔؟ مجھے ہنے یاد سی۔ ہا شاہدہ شاہ۔ پرچی دکھاؤں؟"

میرے قدموں کے نیچے زمین ہلنے لگی "سسٹر۔ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ دراصل..... میں جانتا ہوں۔"

وہ اور شیاما ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھی کھی کرنے لگیں اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پھر شیاما نے کہا "اوئے کاکا' بندے کو اس وقت پتا نئیں ہوتا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے برہمی سے کہا "ایسی بات ہوتی تو میں تم سے چھپاتا۔ مگر مجھے معلوم ہے نا۔ جب اسے چھوا تک نہیں میں نے۔ میرا مطلب ہے....."

"اوئے مطلب ہم سمجھتے ہیں سب۔ کیا پتا تو بھی سچا ہو" شیاما نے کہا "وہ تجھ سے ہی چھپانا چاہتی ہو۔"

غصے سے سارا خون کھنچ کر میری کنپٹی میں جمع ہو گیا "تم اسے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھتی ہو؟"

"ناناں۔ بڑی شریف زادیاں آتی ہیں ادھر تے۔ غصے کی کون سی بات ہے۔ کل آ کے آپ دیکھ لینا۔"

"کل..... وہ پھر آئے گی؟"

"نئیں۔ ایس دے نال کون سی..... اودا باپ؟ وہ رپورٹ لے کر آئے گا آج الٹرا ساؤنڈ تے ہو گیا" نرس نے کہا۔

میرے ذہن میں ایک دم خیال آیا "یہ لیڈی ڈاکٹر..... اس کا نمبر کیا ہے..... فون نمبر۔"

"اسپتال کا نمبر ملا کے پوچھنا ڈاکٹر کنیز فاطمہ۔ آپ ملادیں گے۔ یہ ٹھیک ہے' تو ان سے گل کر لے۔ تیری تسلی بھی ہو جائے۔"

میں کسی پاگل بگولے کی طرح باہر نکلا۔ اسپتال کے آس پاس کہیں پی سی او نہیں تھا۔ احاطے کے باہر ایک کیسٹ کی دکان پر مجھے بورڈ نظر آگیا۔ پی سی او میں داخل ہو کے اپنی باری پر..... میں نے اسپتال کے ایکس چینج کا نمبر ملایا پھر اس سے ڈاکٹر کنیز فاطمہ کا نمبر مانگا۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ نے کہا "کیا نام بتایا۔؟ شاہدہ شاہ۔ ہاں ہے' مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ ہم ایسی باتیں کسی کو فون پر نہیں بتاتے۔"

"پلیز ڈاکٹر۔ میں اس کا منگیتر ہوں..... مجھے پتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ پھر وہ کیوں آئی تھی آپ کے پاس؟"

وہ کچھ دیر بعد بولی "وہ خود نہیں آئی تھی۔"

"اس کا باپ لایا ہوگا اسے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ شخص پاگل ہے۔ نفسیاتی مریض ہے کوئی۔ اس کی بیٹی کو کچھ نہیں ہے۔ پتا نہیں اسے شک کیوں ہوا؟"

میں نے سکون کا سانس لیا "آپ نے ٹھیک کہا' وہ پاگل ہے۔"

"اپنے پاگل پن میں وہ لڑکی کی جان بھی لے سکتا تھا۔ اس نے محض سیسے کو دور کرنے کے لیے ایسی دوائیں دے دی تھیں..... جو خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس نے ABORTION کرانے کے لیے کسی سے لکھوائی تھیں۔ انہی سے خرابی پیدا ہوئی۔"

"کیسی خرابی ڈاکٹر!" میرا سانس پھر رکنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ لڑکی ٹھیک ہو جائے گی لیکن ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد اس کے بچے نہ ہوں۔ لازمی نہیں مگر چانس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے" اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

شاہ جی کے خلاف میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ وہاں رہ کے میں نے شادو سے محبت کے نام پر محض فلمی ڈائیلاگ نہیں بولے ہوں گے۔ اس سے جسمانی مراسم بھی استوار کرلیے ہوں گے اور کسی اناڑی دائی مڈ وائف یا ڈاکٹر نے تصدیق بھی کردی ہوگی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس قسم کے لوگ صرف اپنے پیسے بنانے کے لیے مریض کی جان سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ شادو کو بلاوجہ خطرناک دوائیں دے دی گئیں اور بالآخر اسے اسپتال لانا پڑا۔ جو تکلیف شادو نے اٹھائی وہ الگ۔ اس نے اپنی محبت کی رسوائی پر کتنی ذلت محسوس کی ہوگی۔ اس نے انکار کیا ہوگا، قسمیں کھائی ہوں گی کہ یہ الزام غلط ہے اور کتنی مجبور ہوکے اس نے گناہ کے اس داغ کو دھونے کی سزا قبول کی ہوگی جو اس کے دامن پر تھا ہی نہیں۔ اب آئندہ اسے نقصان ہوگا تو اس کی تلافی کون کرے گا؟ مجھے تو اس سے فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میں شادو سے محبت کرتا ہوں مگر کیا شادو کے لیے یہ ساری عمر کا دکھ نہیں ہوگا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی کیونکہ اس کی مامتا کا چمن اجاڑ دیا گیا ہے۔ ایک مکمل عورت نظر آنے کے باوجود وہ عورت کی تخلیقی صلاحیت سے محروم ہے۔

یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ شادو پر یہ الزام میرے نام کے ساتھ آیا تھا۔ اب یہ زیادہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں شادو کے ساتھ پیمانِ وفا کو پہلے سے زیادہ استوار کروں۔ اسے پہلے سے زیادہ یقین دلاؤں کہ میری چاہت اب پہلے سے زیادہ ہے اور وہ مجھ پر پہلے سے زیادہ اعتماد کرسکتی ہے۔

آج کے دن کو ابتدائی کامیابی کے اعتبار سے اچھا سمجھا جاسکتا تھا۔ میں سازگار حالات میں ڈاکٹر مشہود کے گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اپنے اکاؤنٹ کا خود ذمے دار بن گیا تھا۔ میں نے رئیس کو تلاش کرکے مناسب اور محفوظ جگہ منتقل کردیا تھا۔ شادو سے رابطہ قائم ہوجانا بیک وقت ایک خوش گوار اتفاق تھا اور دل آزردہ کرنے کا سبب بھی لیکن اب میں زیادہ پُراعتماد تھا کہ میری کوششوں کی کامیابی کو تائید ایزدی حاصل ہے۔

میرا سامان رئیس کے بالاخانے پر رکھا ہوا تھا اور مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہیر رانجھا کس قسم کے لوگ ہیں اور وہاں میرا سامان کس حد تک محفوظ رہے گا۔ اس برائے نام کمرے میں کوئی قفل بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ آخر رئیس بھی تو وہاں رہتا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت سامان ضرور ہوگا۔ وہ غریب لوگ ضرور ہیں مگر ضروری نہیں کہ چور بے ایمان بھی ہوں۔ ایسا ہوتا تو رئیس خود مجھ سے کہہ دیتا کہ اپنا سامان اٹھالے۔ مجھے ابھی بہت سے کام تھے۔ میں سارا دن ایک سوٹ کیس اور بیگ اٹھائے نہیں پھر سکتا تھا۔

ان فقیروں سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا جو شہر کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سب مجھے نہیں جانتے تھے جو شاہ جی کے ڈیرے پر دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے میرا یہ روپ نہیں دیکھا تھا جس میں فقیر سے زیادہ میں رئیس نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ جی کا علاقہ محدود تھا۔ وہاں کوئی میرے سامنے آکے دستِ سوال دراز کر بیٹھتا تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی سمجھتا کہ میری صورت اس ناصر عظیم سے بہت ملتی ہے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں۔

فی الحال میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ رئیس جہاں رہتا تھا وہاں میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اکیلا نہیں تھا، مجھے شادو کے ساتھ رہنا تھا۔ شادو اپنے رکھ رکھاؤ اور اندازِ حسن سے ہی اس علاقے میں ہر نگاہ کی توجہ کا مرکز بن جاتی اور اس کے ساتھ مجھے دیکھنے والوں کو بجا طور پر دال میں کالا نظر آنے لگتا۔ باتیں بنانے والے ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر اپنے نمایاں ہوکے رہنے میں خطرہ بڑھ جاتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ شادو کے غائب ہوتے ہی شاہ جی غصے سے پاگل ہوجائے گا اور پھر ہماری تلاش میں دن رات ایک کردے گا۔ وسائل کی اسے کمی نہیں تھی۔ پولیس سے زیادہ اس کی فقیر فورس خطرناک تھی جو شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ جی دوسرے ٹھیکے داروں کا تعاون بھی حاصل کرسکتا تھا۔ ہر فقیر کے پاس میرے حلیے کی تفصیل پہنچانے کے بعد اس کا کام آسان ہوجاتا۔ وہ شادو کی گمشدگی کے معاملے پر ذاتی رسوائی سے بچنے کے لیے پردہ بھی ڈال سکتا تھا لیکن وہ ہم دونوں کے بارے میں ہزاروں کی تعداد میں فقیر فورس کے جاسوسوں کو بتادیتا تو ہم بہت جلد پکڑے جاتے۔ خاص طور پر ایسے محلوں میں جہاں رئیس رہتا تھا اور غربت کی انتہائی مجبور زندگی گزارنے والے سب ہی فقیروں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں کتنے مزدور، قلی اور ایسے ہی جسمانی مشقت کے مگر بے عزت کام کرنے والے ہیں اور کتنے فقیر۔ کام کرکے محنت سے حلال کی روٹی کمانے والے کی عزت کا درس اب ایسی کتابوں میں رہ گیا تھا جن کو پڑھنا لازمی نہیں تھا یا بچوں کی کتابوں میں تھا۔ یہ اکیسویں صدی سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والے بچے حقائق کو اپنے بزرگوں سے بہتر طور پر سمجھتے تھے اور انہی سے

یہ سیکھ چکے تھے کہ عزت نہ علم کی ہوتی ہے نہ نسب کی اور نہ کسب کی۔ عزت دار صرف مالدار ہے۔

میرے ذہن میں انتشار نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ میں شادو کو نکال لاؤں اور اس سے شادی کرلوں لیکن یہ سوچنے میں جتنا آسان تھا، عملی طور پر اتنا ہی مشکل محسوس ہورہا تھا۔ مجھے ایک گھر کی ضرورت تھی جہاں میں اسے شادی کے بعد رکھ سکوں۔ ایسا گھر نچلے متوسط طبقے کی کسی بھی آبادی میں ایک یا دو کمروں والا کرائے کا مکان ہوسکتا تھا۔ میں یہ آسانی اس کا ایڈوانس بھی دے سکتا تھا اور کرایہ بھی لیکن میں نے تلاش کا آغاز کیا تو دشواریاں میرے سامنے آگئیں۔

میں گلی گلی پھر کے کسی سے پوچھتا یا "کرائے کے لیے خالی ہے" کی سختی تلاش کرتا تو لاہور جیسے شہر کی خاک چھاننے میں ہی ایک مہینہ گزر جاتا۔ یہ تلاش کامیاب بھی ہوسکتی تھی لیکن ایک فیصد چانس پر سارے زمانے میں دھکے کھانے سے بہتر تھا کہ میں مخصوص ٹھکانوں سے رجوع کروں۔ یہ مخصوص ٹھکانے پراپرٹی ڈیلر اور اسٹیٹ ایجنٹ تھے جو خالی مکانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا معاوضہ جائز طور پر ایک ماہ کے کرائے کے مساوی کمیشن کی صورت میں وصول کرتے تھے۔

پہلے ایجنٹ نے میرے سوال پر بڑی مستعدی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا "فوجی مکانوں سے ہی لاہور بنا ہے نا۔ سارے مکان ہی مکان ہیں۔ آپ فرماؤ کتنے چاہئیں۔"

میں نے خندہ پیشانی سے کہا "ظاہر ہے بندہ ایک ہی میں رہ سکتا ہے۔"

وہ کرسی پر باؤں سمیٹے بیٹھا تھا اور بار بار دائیں جانب اتنا جھک کر حقے کا کش لیتا تھا کہ مجھے ہر بار اس کے کرسی سمیت لڑھک جانے کے امکانات خاصے روشن نظر آتے تھے مگر اسے بہت پریکٹس تھی۔ شاید وہ برسوں سے ایسی مہارت کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے حقہ پی رہا تھا۔ وہ حقے کو کچھ اور بھی اوپر رکھ سکتا تھا ورنہ اس کی نالی لمبی کرسکتا تھا مگر اس کی مشکل کو حل کرنے کا سوچنا میرا کام نہیں تھا۔ کچھ لوگ مشکل پسند بھی ہوتے ہیں۔

اس نے ایک کش لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کچھ سوچا یا دھوئیں کو جسم کے اندر گھمانے میں مصروف رہا۔ جب دھواں نکلا تو اس کے حلق سے آواز بھی نکلی "فوجی، ہم تو بیس سال سے کررہے ہیں یہی کام۔ تم کو کیا پتا ایک بندہ کتنے مکانوں میں رہتا ہے۔ ایک اپنے ملک صاحب ہیں خیر سے چوتھی بھی کرلی ہے اس عمر میں۔ اور باقی بھی اپنے اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا "میری تو ابھی ایک بھی نہیں ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "اچھا! تو خیر سے ابا کی کتنی ہیں؟"

میں نے کہا "میں والدین کے ساتھ نہیں رہتا۔"

اس نے بڑے تاسف کا اظہار کیا "گزر گئے خیر سے؟ چلو جی۔ سدا کس کے ماں باپ رہتے ہیں۔ کتنے بندے ہیں گھر میں۔ بھائی، بھابی یا چاچا ماما جو تمہارے ساتھ رہیں گے؟"

میں نے اسے بتایا "میرے ساتھ صرف میری بیوی رہے گی، شادی کے بعد۔"

وہ سیدھا ہوکے بیٹھ گیا "مطلب یہ کہ ابھی خیر سے چھڑے چھانٹ ہو؟ ابھی سے سوچ لیا ہے کہ شادی کے بعد گھر میں کسی کے ساتھ نہیں رہنا۔ او برخوردار، مل جل کے ساتھ رہنے میں برکت ہے۔ بے شک جھگڑے ہوتے ہیں گھر میں۔"

میں نے کہا "ابھی میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ شادی کب ہوگی، یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کرائے کا مکان چاہیے، آپ کی نصیحت نہیں۔"

اس نے بڑے زور سے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ ایویں ٹیم برباد کیا میرا بھی اور اپنا بھی۔ گھر بار کوئی نہیں، بیوی بچہ بھی نہیں تو مکان کون دے گا تمہیں ادے؟ چلو تشریف لے جاؤ کہیں اور۔"

میں نے کہا "دیکھیے، میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"سب ایسے ہی کہتے ہیں اور نظر بھی آتے ہیں، پر آج کل بس مزاج شریف ہے یا بارہ شریف۔ جس کے گھر میں بہن بیٹی ہو وہ تو کسی چھڑے کو کرائے پر رکھتا نہیں۔"

میں نے تلخی سے کہا "میں کسی کی بہن بیٹی کو بھگا کے لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

اس نے برا نہیں مانا۔ حقے کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس نے کہا "ارادہ تو بن جاتا ہے بعد میں کاکا جی۔ جب شیطان ورغلاتا ہے۔ ہم نے بھی یہ عمر گزاری ہے آخر اور تمہاری تو شکل پر لکھا ہوا ہے کہ تم کسی کو بھگالاؤ گے؟ وہ کسی کی بہن یا بیٹی تو ہوگی۔"

مجھے سخت غصہ آیا "میری شکل پر لکھا ہوا اتنی دیر میں کیوں پڑھا آپ نے؟"

وہ بولا "کتاب پڑھنے کے لیے اسے کھولنا پڑتا ہے۔ بندے کا چہرہ ہی اس کے دل کی کتاب ہوتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں باہر نکل آیا۔ اپنے آپ پر مجھے زیادہ غصہ تھا کہ میں نے یہ سب کیوں نہیں سوچا تھا۔ ایسا ہی دستور ہے ہر جگہ۔ غیر شادی شدہ کو کہیں سے بھی شرافت اور اعتماد کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ زمانہ خراب ہے۔ یہ بات لوگ نہ جانے کب سے کہہ رہے ہیں۔ جب ٹی وی اور فلمیں نہیں تھیں تب کیا لڑکیاں رُسوا نہیں کرتی تھیں اور گھر سے بھاگ کے شادی نہیں کرتی تھیں۔ کوٹھوں پر نہیں پہنچتی تھیں۔ ورغلانے والے صرف لڑکے ہی ہوتے ہیں؟ لڑکی کچھ نہیں کرتی؟ ایک بیوی ہو تو پھر گویا لائسنس مل گیا ہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کا۔ وہ چاہے ورغلاتا پھرے محلے میں 'الٹا معاملہ ہے۔ اعتماد اپنی بہن بیٹیوں پر ہو تو پھر محلے میں کوئی شریف رہے یا بدمعاش۔ ڈر کیسا؟

جب میرا غصہ اتر گیا اور میں حقائق کا "جیسے ہیں اور جہاں ہیں" کی بنیاد پر جائزہ لینے کے قابل بھی ہوا تو مجھے کرائے پر مکان حاصل کرنے کے امکانات صرف تین سمتوں میں نظر آئے۔ ایک یہ کہ لاکھوں میں ایک کوئی میرے جیسے اکیلے آدمی پر اعتبار کرنے والا مالک مکان مل جائے۔ بظاہر یہ ناممکن تھا۔ دوسرا یہ کہ میں جھوٹ بولوں تو اس کے بارے میں بہت کچھ فرمایا گیا ہے کہ، جھوٹ کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ ہر جگہ ہر وقت ہر شخص جھوٹ بولتا ہے اور سنتا ہے مگر میرا یہ جھوٹ پکڑا جائے گا۔ ایک ایسا جھوٹ تھا جو چل سکتا تھا۔ میں کہہ دوں کہ شادی شدہ ہوں اور شادو کو بیوی بنا کے لے آؤں مگر اتنا بڑا جھوٹ بولنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں اپنے آپ سے ڈرتا تھا۔ یہ مجھے گناہ سے پہلے اس کی نیت کے اعتراف کی طرح لگتا تھا اور میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ شادو کے ساتھ نکاح کے بغیر رہنے لگوں۔ آخری صورت یہ تھی کہ... میں ہر ایک کو صاف سچ بتا دوں اور دیکھوں کہ سو میں سے ایک ہی ہے جو صورتِ حال... کو سمجھتے ہوئے مجھ سے ہمدردانہ بات کرے اور مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے اسے کارِ خیر سمجھتے ہوئے اور میری حق گوئی کو سراہتے ہوئے کہے کہ "آؤ جی بسم اللہ' اللہ تمہارا گھر شادو آباد رکھے۔ تیموں سے حسنِ سلوک کا بڑا اجر ہے اور مستحق کی مدد کرنی چاہیے۔ تم تو بڑی نیکی کر رہے ہو کہ ایک لڑکی کو عزت کی زندگی دینا چاہتے ہو۔ ایسی سب باتیں زبان سے کہنے والوں میں کوئی ایک بھی ہے جو ان پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔

نچلے اور متوسط طبقے کو اپنی اور خاندان کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ شاید اس لیے کہ اس عزت کے سوا ان کے پاس کچھ ہوتا تھا ہی نہیں جو چور ڈاکو لے جائیں۔ اونچی سوسائٹی میں جہاں اہمیت کا پیمانہ مختلف ہے۔ لوگ اپنی کوٹھیوں میں پینگ گیسٹ رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اور گھر کا ایک بیڈ روم یا انیکسی کسی کو بھی کرائے پر اٹھا دیتے تھے جو منہ مانگا کرایہ ادا کرنے کا قائل ہو۔ اس کے جوان، بوڑھے شادی شدہ اور کنوارے ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایسی سوسائٹی میں ہمارا گزر نہ تھا اور گزارا نہ تھا۔

شام تک میں نے جھک ماری پھر ایک بروکر نے مسکرا کے کہا "میاں جی' تم ٹھیک جگہ پہنچ گئے۔ اس پورے شہر میں ایک میں ہوں جو بے چارے چھڑوں کو سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کرتا ہوں۔"

ابھی میں نے وضاحت نہیں کی تھی کہ میں عنقریب شادی شدہ ہو جاؤں گا۔ اس کی بات نے میری امید بڑھا دی "دیکھیں ناجی۔ آخر چھڑے کہاں جائیں۔ ہر شخص کو ہوسٹل میں جگہ نہیں ملتی۔ ہوٹل میں کون رہ سکتا ہے۔ اور سب چھڑوں کے بارے میں ایسا سمجھتا کہ وہ جہاں رہیں گے' محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور بھگا لے جائیں گے' بڑی غلط بات ہے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں جی۔ ہم بھی چھڑے تھے کبھی۔ سب ہی ہوتے ہیں شادی سے پہلے؟" اس نے گویا مجھ پر انکشاف کیا "اب اس وقت میری نظر میں دو گھر ہیں۔ دونوں جگہ ایک ایک کمرا ہے۔ غسل خانے کے ساتھ۔ اور کرایہ بھی بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ان کو اپنے گھر میں رکھنا ہے کسی کو۔ کمپنی کے لیے اور حفاظت کے لیے۔"

پہلا گھر اچھا تھا۔ کرایا بھی اچھا تھا مگر وہاں ایک باتونی بڑھیا مجھ سے بلائے بے درماں کی طرح چمٹ گئی۔ اس نے کمرا دکھانے کے بعد کہا کہ یہاں سب کچھ ہے بیٹا۔ تمہیں کچھ لانے کی ضرورت نہیں۔ فرنیچر' بیڈ اور ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ تمہیں بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ماشاء اللہ چار جوان بیٹیاں ہیں میری۔ ایک سے ایک بڑھ کے سلیقہ شعار۔ امورِ خانہ داری میں ماہر۔ سینے پرونے' کھانے پکانے میں ایسی کہ میں کیا کہوں۔ کھانے کی فکر بھی مت کرنا۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ہمارے ساتھ ہی کھاؤ گے۔ ہم تو کرائے دار نہیں گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔ جو کام ہوا کہہ دیا۔ ساجدہ سے راشدہ سے زاہدہ یا عابدہ سے۔"

کھٹک تو میں پہلے ہی گیا تھا۔ جب انہوں نے مسلسل بیٹیوں کے جوان ہونے اور لاکھوں میں ایک ہونے کے ساتھ

ان کی بے پناہ خوبصورتی کا تذکرہ بھی شروع کیا اور مجھے بتایا کہ ماشاء اللہ سے ساجدہ نے نویں تک پڑھا اور راشدہ سات جماعت پاس ہے۔ عابدہ اور زاہدہ قرآن شریف اور اردو کا اخبار پڑھ لیتی ہیں۔ بس اب اللہ بھیج دے کوئی اچھا سا رشتہ تو ان کے ہاتھ پیلے کروں۔ میرے سوا دنیا میں کون ہے ان کا۔"

میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کے نکلا۔ ان چاروں حور پری جیسی چڑیلوں کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ دروازے سے لگی مسلسل کھی کھی کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کو آگے دھکیل دھکیل کر میرے سامنے کرنے میں مصروف تھیں۔ چل ہٹ بے شرم' ارے اللہ میاں اس کو ہمارا گھر پسند آجائے۔ اماں کہاں جانے دیتی ہیں کسی کو۔ اری ضرورت مند ہے تو جائے گا کہاں؟ ایسے بہت سے تبصرے سن سن کے میں پریشان ہو گیا تھا۔ ان کا گھر امورِ خانہ داری میں مہارت اور سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ گھر میں ہر چیز وہاں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میلے کپڑے' برتن' کاٹھ کباڑ۔ دیواروں اور چھتوں سے جھولتے ہوئے مکڑی کے جالے اور گندگی ان کے پھوہڑپن کا ثبوت تھے۔

میں نے باہر آ کے بروکر سے کہا "اپنے کرائے دار رکھ کے بڑھیا نے کتنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کیے ہیں۔ اور تم نے کیا شادی دفتر بھی کھول رکھا ہے۔ ہر شادی پر کیا لیتے ہو ایسے ضرورت مندوں سے؟"

اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا "میں کیا کمیشن لوں گا بیٹا۔ میں تو اس عورت کی مدد کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مجبوری اس کی ہے یا تمہاری؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"مجبوری ایک کی ہو یا دو کی' مجبوری ہوتی ہے۔ ان کا باپ یہی ایک گھر چھوڑ کے مرا تھا۔ بعد میں پتا چلا اس پر بھی قرض ہے۔ ایک شخص نے قرض ادا کیا اور سات میں سے ایک بیٹی پسند کر لی جو سب سے اچھی تھی۔ جس سے ان کو بڑی امیدیں تھیں کہ پڑھ لکھ گئی ہے تو ان کے مسائل حل کرے گی۔ وہ بی اے بی ایڈ تھی۔ ایم اے کر چکی تھی اور لیکچرر ہونے والی تھی۔ ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ ماں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا وہ بیٹی قرض کے بدلے میں دے دے' یا باقی بیٹیوں کے سر چھپانے کا آسرا بھی نہ رکھے۔ اتنی جوان لڑکیوں کے ساتھ وہ کہاں جاتی' بڑی چلی گئی تو باقی کو سنبھال کے رکھنا مشکل ہو گیا۔ ادھا مکان کرائے پر اٹھایا تھا۔ ان کا ایک لڑکا دوسری لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ شادی تو ہو گئی مگر لڑکے والے گھر چھوڑ گئے۔ انہوں نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ لڑکے نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ تیسرا ایک کمرے میں کرائے پر آ کے رہا تھا۔ وہ طالب علم تھا اور ایل ایل بی کرنے کے علاوہ کہیں نوکری بھی کرتا تھا۔ تیسری کی شادی اس سے ہو گئی' چار ابھی باقی ہیں۔"

"چوتھی کے ہاتھ بھی پیلے ہو جاتے اگر میں پھنس جاتا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو کیونکہ تم مجبور نہیں ہو۔ مجبوری کی ہزار صورتیں ہوتی ہیں برخوردار۔ معلوم ہے میری مجبوری کیا ہے' میں چچا ہوں ان لڑکیوں کا۔ سگا چچا۔ جو بھی میں ان کے لیے کرتا ہوں' میری بیوی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ تو چاہتی ہے میں ان سے تعلق بھی نہ رکھوں' مدد کرنا تو دور کی بات ہے۔ مگر میں اس بھائی کو کیسے بھول جاؤں جس کے مجھ پر بڑے احسان تھے۔ آج میں جو بھی ہوں' اسی کی وجہ سے ہوں۔ اچھا کما رہا ہوں اس لیے کہ یہ انجمن اسی بھائی کی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اب میں آمدنی سے کچھ دیتا بھی ہوں تو چوری چھپے۔ بیوی کی نظر بچا کے۔ بہت بزدل ہوں میں۔ یہی سمجھو کے قرض مگر میری اپنی بھی چار بیٹیاں ہیں اور ان کی شادی بھی ہونی باقی ہے۔ میں اپنے گھر کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوں۔ پہلی مجبوری میرا کمیشن ہے۔"

وہ اپنی دکان میں داخل ہو گیا اور میں باہر کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا سمجھوں؟ صرف ایک بروکر' یا ایک اچھا آدمی جو مجبور ہونے کے باوجود اپنے بھائی کے احسان کا بدلہ کسی نہ کسی صورت میں چکا رہا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مجبوری کی ہزار صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت کا سامنا مجھے تھا اور میری ایک مجبوری میں بھی کئی مجبوریاں شامل تھیں۔

رات تک میں نے دو بار شادو سے بھی فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر گھنٹی بجتی رہی۔ کسی نے بھی ریسیور نہیں اٹھایا۔ شاید شاہ جی نے خود ہی رابطے کا یہ ذریعہ منقطع کر دیا تھا۔ اس نے فون بند کرا دیا تھا یا تار کاٹ دیا تھا۔ بے شک میرا پیغام شادو تک پہنچ گیا تھا مگر جواب کا آسرا کوئی نہ تھا۔ عاجز بھی وہاں جا کے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے مجھے اس پر بھی غصہ آیا مگر پھر میں نے سوچا کہ وہ بچہ ہے۔ وہ مجھ سے رابطہ کرنا بھی چاہے گا تو کہاں کرے گا۔

میں بالکل مایوس ہو چکا تھا اور اب میرے سامنے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری راستہ یہی رہ گیا تھا کہ میں اپنی جمع پونجی کا آدھا حصہ کسی دور دراز علاقے میں چھوٹا سا مکان خریدنے میں صرف کردوں۔ میں اتنی بڑی رقم مکان میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میرے پاس کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا اور میں نے طے بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے میں کیا کروں گا۔ جب میں زندگی کے بارے میں سوچتا تھا تو بے یقینی کا شکار ہونے لگتا تھا۔ کہاں تک ہے زندگی۔ میری اور شادو کی اور ہم دونوں کی۔ کتنی لمبی مسافت ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟ یہ بڑا لمبا سفر تھا جس پر میں روانہ ہونے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکا تھا۔

رئیس ہاسپٹل میں مزے سے لیٹا ہوا تھا اور مجھے امید تھی کہ ابھی کم سے کم دو دن اس کا علاج ہوگا تو وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے اس کو توجہ بھی ملے گی اور ممکن ہے وہ چند دن اور وہاں گزارے۔ تاہم ایک ہفتے بعد اس کو بہرحال لوٹ کے گھر آنا تھا۔ اس کا گھر مجھے کسی طرح بھی گھر نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ ہمارے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائے تو اسے ہیر رانجھا کی غلیظ بستی سے نکال کرلے جاؤں۔ سوال پھر وہی سامنے آتا تھا کہ کہاں؟ ابھی تو خود مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری رات بھی ہیر وارث شاہ کے کاشانے میں اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو سونگھتے ہی گزرے گی۔ مسٹر رانجھا کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ ان کی زبان دانی گھر کے باہر ہی ختم ہوجاتی ہوگی۔ وہ اپنے جدید طریقۂ علاج سے تو ہم مریضوں کے سامنے چوبیس گھنٹے بولنے کا کوٹہ پورا کرکے لوٹتے ہوں گے کیونکہ گھر میں تو ہیر کی زبان کے آگے قینچی کچھ نہ تھی۔ یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ وہ الیکٹرک ٹوکا تھی۔ میں نے اسے رئیس کے غریب خانے میں قیام کے دوران میں رکتے نہیں سنا تھا اور یہ بڑا وحشت ناک خیال تھا کہ آج رات۔ وہ ہوئے ہم سے ہم کلام اللہ اللہ۔ صبح تک مجھے ذرا دیر کو خواب آئیں گے۔

رئیس کو دیکھنے کے لیے میں اسپتال بھی گیا۔ وہاں ملاقات کا وقت مقرر تھا مگر ڈاکٹر مشہود کا نام داخلے کا اجازت نامہ بن گیا۔ ایک بیمار قسم کی نرس نے مجھے ڈانٹ کر بھگانے کی کوشش کی کہ چلو پھوٹو آجاتے ہیں ہر وقت منہ اٹھا کے" پھر میں نے اسے ڈانٹا کہ میں ڈاکٹر مشہود کا بھائی ہوں اور یہ مریض میرا دوست ہے تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فرض شناسی کے اس مظاہرے کا میں نے برا نہیں مانا تو اس نے مجھے مطلع کیا کہ فقیر صاحب سو رہے ہیں کیونکہ انہیں سلا دیا گیا ہے۔

میں واپس لوٹ رہا تھا کہ اندر جاتے ہوئے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ عادتاً اور اخلاقاً میں نے بھی سوری کہا مگر وہ رک گیا۔ اس نے مجھے آواز دے کے روکا تو میں پلٹا "میں نے تمہیں دیکھا ہے پہلے بھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے بھی دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔"

"تم وہی ہو۔ نام مجھے یاد نہیں رہا۔"

میں نے کہا "اور تم وہی وکیل ہو جس نے وسیم سے اس کا مکان خریدا تھا۔ ناصر کے باپ کا مکان؟"

"ویری گڈ۔ یاد آگیا۔ تمہارا نام بھی ناصر ہے۔ تم اس مکان میں کیوں INTERESTED تھے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "آپ بھی ہوں۔ کیا وہ خالی ہے ابھی تک؟"

"ہاں۔ میں نے اس پر خاصا خرچ کیا۔ اس کی حالت ٹھیک کرنے کے لیے مگر میری بیوی کا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "کیا اسے وہاں آسیب نظر آتا ہے۔"

وہ حیران ہوا "نہیں۔ اس نے قدم نہیں رکھا اس گھر میں۔ اسے وہم ہوگیا تھا کہ وہ مکان منحوس ہے۔ جو مالک تھا اسے پھانسی ہوگئی۔ اس کی بیوی غائب ہوگئی تھی۔ سنا ہے بھائی نے اسے قتل کرکے لاش کہیں غائب کردی تھی۔ ایک لڑکا بچا تھا۔ وہ حادثے میں مرگیا۔ معلوم نہیں اسے یہ سب کس نے بتادیا۔ میں نے تو اچھا سستا مکان دیکھ کے لیا تھا کہ آرام سے رہیں گے۔ کہیں تم نے تو یہ حرکت نہیں کی تھی؟"

"کیسی حرکت؟" میں نے کہا۔

"اسے ساری باتیں بتانے کی۔ تم وسیم کی جان کے دشمن ہو رہے تھے؟"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"ہمارا تعلق رہتا ہے پولیس سے۔ وسیم کا ایک سالا پولیس میں تھا۔ سب انسپکٹر' اس نے تمہارے بارے میں سب بتایا تھا مجھے۔ میں اور وہ پہلے کلاس فیلو تھے" وکیل نے کہا۔

"اب تو وہ وسیم کا سالا نہیں ہے؟"

"ہاں۔ وسیم نے اپنی پہلی بیوی کو نکال دیا ہے۔ طلاق دے کر اور دوسری شادی کرلی ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا "وکیل صاحب۔ اگر وہ مکان خالی پڑا ہے ابھی تک۔ تو مجھے کرائے پر دے دیں۔ مجھے اشد ضرورت ہے۔"

"کرائے پر؟ تم اکیلے رہو گے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا حرج ہے۔ آپ کے مکان کی چوکیداری مفت میں ہوگی۔ میں کرایہ بھی پورا دوں گا" میں نے کہا "جتنا آپ چاہیں۔"

"ایک ہزار روپے دے سکتے ہو؟ اور دس ہزار ایڈوانس؟"

میں نے کہا "بالکل دے سکتا ہوں۔ بیعانہ آپ ابھی لے لیں۔ مکان تو میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"لیکن۔۔۔ محلے والے۔"

میں نے کہا "آپ کہہ سکتے ہیں کہ خالی مکان کی حفاظت کے لیے میں نے اپنے بھائی کو رکھا ہے۔ ویسے میرا بھائی بھی ساتھ ہوگا دو۔۔۔ اسی مہینے میری شادی بھی ہوجائے گی۔"

"شادی!" وہ حیران رہ گیا "تمہاری۔۔۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ کیا عمر ہے تمہاری ابھی؟"

میں نے کہا "بس آپ یہی سمجھ لیں کہ مجبوری ہے۔ شوق کی بات نہیں' کوئی رہنے کو گھر نہیں دیتا۔ ہر جگہ مشکوک سمجھا جاتا ہوں صرف اس لیے کہ اکیلا ہوں۔ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کیا کنوارے کا مطلب بدمعاش ہوتا ہے۔"

وہ ہنس پڑا "ہوتا ہے بھائی۔ ہم کیا کریں' اس دنیا کا دستور تو بدل نہیں سکتے۔ خیر تم آجاؤ۔"

خوشی سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ جو مسئلہ سارا دن خوار ہونے کے باوجود حل نہیں ہوا تھا' وہ ایسے اچانک حادثاتی طور پر یوں حل ہوگیا۔ میں نے فوراً نوٹ نکالے اور اسے ایک نوٹ تھمادیا۔ وہ انکار کرتا رہا کہ "بھئی بات ہوگئی اتنا کافی ہے۔ بیعانہ کیسا؟"

میں نے کہا "باقی آپ کو کل صبح بینک کھلتے ہی مل جائیں گے۔ آپ اگر چاہیں تو کرایہ نامہ بنوالیں۔"

"وہ تو میں ضرور بنواؤں گا" وہ نوٹ جیب میں رکھ کے بولا "تم کل میرے آفس آجاؤ' شام کے وقت۔ وہیں سب طے کرلیں گے۔ میں تم کو چابیاں بھی دے دوں گا۔ ناصر عظیم نام ہے نا تمہارا' یہ لو میرا کارڈ۔"

میں نے کارڈ جیب میں رکھ لیا اور اس کا شکریہ ادا کرکے باہر آگیا۔ یہ سب مجھے بہت عجیب اور ناقابلِ یقین لگتا تھا کہ کل تک جس گھر میں قدم رکھنا میرے لیے جرم کا درجہ رکھتا تھا اب اسی میں مجھے رہنے کا قانونی حق حاصل ہوگیا تھا۔ وہ گھر ناصر کا تھا اور اتنے عرصے بعد آج پھر اس کی صورت کے نقوش میری نگاہوں میں بس گئے تھے' تصور میں اس کی لہو آلود' شکستہ لاش کو دیکھ رہا تھا جو سفید کفن پہنے لیٹی تھی۔ خون کے داغ لٹھے کی سفیدی میں بھی سرخ پھولوں کی طرح نمودار ہوگئے تھے۔ اس کی مظلوم خاموشی سوال کرتی تھی کہ آخر ساری سیہ بختی کا سزاوار میں ہی کیوں ہوں۔ میرا باپ پھانسی چڑھ گیا۔ ماں بیوہ ہونے کے بعد صرف اس لیے قتل ہوئی کہ اس کے لیے آبرومندی سے جینا ناممکن ہوگیا تھا اور میں حادثے کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ میری اور ماں کی زندگی کی بس اتنی ہی قیمت تھی؟ کچھ نقد' زیورات اور ایک چھوٹا سا مکان۔

میں اپنے خیالوں میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ ناصر عظیم جو میرا دوست اور میرا بھائی تھا۔ صرف میرا ہم نام ہی نہیں تھا' وہ پھر میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کے خون کا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی اور اس کو پورا کرنے کے لیے دیوانگی کی ساری حدیں عبور کرگیا تھا۔ اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کو چیلنج کرکے میں نے اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگادیا تھا مگر آج پھر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سب میری آزمائش تھی۔ کوئی دستِ غیب ہے جو حالات و واقعات کو ایک خاص انداز میں مرتب کررہا ہے۔ یہ قدرت کا نظامِ انصاف ہے جہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ اس دنیا کی ہر عدالت سے بڑی عدالت میں یہ کیس داخل دفتر نہیں ہوا تھا۔ وہ جو نظامِ ہستی بڑے عدل اور توازن کے ساتھ چلا رہا ہے' طے کرچکا تھا کہ انصاف کیسے ہوگا اور کیا ہوگا؟

ناصر عظیم کا میرا ہم نام ہونا اور میرا اس سے جذباتی تعلق واقعات کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ پھر اس کی المناک موت نے میرے لیے انتقام کی خواہش سے مغلوب ہوکے قسم کھانے کے اسباب پیدا کیے۔ ایک طوفانی رات میں پیش آنے والا واقعہ آج تک میرے لیے ایک پُراسرار معما تھا جب میں خواب میں چلنے والے کی طرح اس گھر تک پہنچ گیا تھا جہاں ناصر کی ماں کا مدفن تھا اور میری راہنمائی کرنے والی بھی وہ خود تھی۔ صبح میں ناصر کی قبر پر بے ہوش پڑا ہوا پایا گیا تھا۔ عقل آج بھی اس کی توجیح سے قاصر تھی کہ ایک روح نے کیسے مجھ تک رسائی حاصل کی اور وہ حقیقت تھی یا محض خواب کا کرشمہ؟ میں نے ناصر کی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ اخباروں میں صرف ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کے قتل کی لرزہ خیز اور حیرت انگیز واردات کی تفصیل تھی مگر میں نے ناصر کی ماں سے سنا تھا یا خواب میں جانا تھا کہ وہ قتل کیسے ہوا تھا اور کس نے کیا تھا۔ یہ بعد میں ناصر کے چچا کے رویے سے ثابت ہوا تھا کہ جو میں نے تصور کا کرشمہ یا خواب کا نقش سمجھا تھا وہی حقیقت تھی جس نے ایک ہوس پیشہ قاتل کی نیندیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرام کردی تھیں۔

تصدیق کے چکر میں ایک رات اسی مکان میں رئیس کے ساتھ گیا تھا مگر یہ میرے لیے ناممکن تھا کہ میں غیب سے منکشف ہونے والے سچ کو دیکھ سکوں اور دکھا سکوں۔ میری گرفتاری کے بعد رہائی کو بھی میں انتظام دست غیب سمجھ سکتا تھا۔ حالات آہستہ آہستہ ایک قدرتی انجام کی سمت بڑھ رہے تھے اور واقعات مجھے اسی سمت میں لے جا رہے تھے۔ پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ ناصر کے چچا وسیم نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ پولیس کی طاقت اور حمایت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے خائف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اسے معاف کردوں۔ آخر یہ سب خبریں مجھے کیوں پہنچ رہی تھیں؟

آج اچانک اسی قدرت کے نظام انصاف کی میزان تماشے والے ہاتھ نے میرے ہاتھوں میں اس گھر کے حقوق داخلہ تھما دیے تھے جہاں میرے یقین کے مطابق ایک قاتل کے خلاف بنیادی' شہادت موجود تھی۔ یہ سب میرے ارادے سے ممکن نہیں ہوا تھا۔ ایک خاص ٹائم ٹیبل کے ساتھ واقعات اپنا رخ بدلتے رہے اور وقت کی بھول بھلیوں سے گزر کے میں خود وہیں پہنچ گیا تھا جہاں مجھے پہنچانا طے تھا۔ شاید اس کے بعد بھی جو کچھ ہو گا اس میں میرے ارادے سے زیادہ کائنات کے منصف اعلیٰ کے فیصلے کا دخل ہو گا۔

رات گزارنے کے لیے مجھے لوٹ کر رئیس کے غریب خانے پر جانا پڑا۔ میری جیب میں اتنے پیسے تھے کہ میں ایک رات کسی ہوٹل میں گزار سکوں مگر ایک تو مجھے اپنے سامان کی فکر تھی۔ دوسرے میں ہیرا رانجھا کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ میں بن بلایا مہمان بلائے جان نہیں تھا۔ رئیس کا دوست تھا اور میں نے اسے اسپتال میں داخل کرادیا ہے۔ مجھے رئیس کے واجبات کا حساب بھی برابر کرنا تھا اور پھر وہاں سے اپنے سامان کے ساتھ اس کا سامان اٹھانا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب میں تنگ و تاریک گلی سے گزرا تو کئی جگہ میرا پاؤں گندے پانی کی نالی میں یا انسانی جسم کے نظام اخراج کی غلاظت پر پڑا۔ آدمی حیوان ناطق سہی۔ حیوان سے کم مجبور نہیں۔ حیوان کو باتھ روم کی ضرورت نہیں پڑتی جس آدمی کے پاس ایک دو مرلے کی جھونپڑی جیسا گھر ہو اور اس گھر میں باتھ روم کی جگہ ہی نہ ہو وہ گلی سڑک کو چوری چھپے استعمال نہ کرے تو کیا کرے۔

ہیرے نے چیختے چلاتے دروازہ کھولا۔ وہاں کال بیل نہیں تھی کہ اس پر انگلی رکھ کے انتظار کرتا۔ میں نے پہلے مین کے دروازے پر ایک انگلی سے شرمیلانہ انداز میں دستک دی مگر اس سے ہیرا رانجھا بیدار نہیں ہوئے تو میں نے دروازہ کو بجانا شروع کیا یہاں تک کہ میرے پیچھے والے مکان سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور نہ جانے کہاں سے کسی نے مجھے خاصا برا بھلا بھی کہا۔ جیسے میں شوقیہ یہ کام کر رہا ہوں۔ ملاں صاحب کے حکم کی تعمیل میں کہ۔ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔

ہیرے نے بھی اندر سے چلا کے کہا "کون نامراد آگیا آدھی رات کو دروازہ توڑنے۔" مجھے دیکھا تو اس نے باقی گالیاں دل ہی دل میں دیں لیکن دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ پھر مجھ میں گئی۔ کوئی پھر اس کے درخاص پر گمراں نشان فرما گیا تھا۔ شاید کوئی اسے جان بوجھ کے پریشان کرتا تھا اور اس کی ہنگامہ آرائی سے لطف لیتا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے مشتبہ افراد کی فہرست میں سے میرا نام خارج کردیا۔ میں خاموشی سے اوپر چلا گیا۔ وہ غائبانہ مجرم اور اس کو پیدا کرنے والوں کی سات پشتوں کا رشتہ نجس جانوروں سے ملا رہی تھی کہ نامعلوم سمت سے کسی نے ایک پتھر پھینکا اور چلا کے کہا "چپ کر کتی۔ آدھی رات کو بھونکنا بند کر۔"

وہ ضرور کوئی بہادر آدمی تھا اور ہیرا سے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے ڈرتی ہو گی جبھی اس نے خاموشی سے دروازہ بند کر کے میری خبر لینا بہتر سمجھا۔ میں جوتے اتار چکا تھا کہ وہ دروازے میں نمودار ہوئی۔

"اکیلے آگئے ہو جیسے تم ہی رہتے ہو یہاں" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا "اس کو کہاں گاڑ آئے۔"

میں نے کہا "وہ اسپتال میں ہے۔"

"مجھے تو نظر آرہا تھا کہ اس کا بچنا محال ہے۔ لوٹ کے گھر آئے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

اس نے سینے پر دوہتڑ مارے "ہائے میں مرگئی۔ اوئے رانجھے' اٹھ میرا ویر مرگیا۔ ہائے میرا رئیس۔ نام کا ہی نہیں دل کا بھی رئیس تھا۔ کتنا خیال کرتا تھا میرا۔ روز میرے لیے دہی بھلے' کبھی پکوڑے' کبھی جلیبی ضرور لاتا تھا۔"

میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے۔ بند کرو یہ ڈرامہ۔ کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ رئیس مرگیا؟"

اس کے بین کرنے کی آواز گھڑی کے الارم کی طرح جو

ہو گئی "لے' ابھی خود تو نے کہا ہے کہ نہیں' وہ اسپتال میں ہے اور کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اس کا یہ مطلب نکال لیا تم نے کہ رئیس خدانخواستہ فوت ہو گیا؟"

مسٹر رانجھا کانپتے ہوئے تمودار ہوئے۔ "کیا ہو گیا' کیا ہو گیا۔ کیسے فوت ہو گیا رئیس۔ اسپتال گیا تھا نا۔ اور سارے ملک الموت بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ رئیس زندہ ہے سو فیصد۔ اور ایک دو روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہیرے کے بین کا شور سن کے ایک ساتھ کئی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور دروازے پر کھڑے چلا رہے تھے۔ "او خیر تو ہے؟" کوئی بولا۔

کسی نے کہا "سنا نہیں' وہ فوت ہو گیا رئیس۔۔۔ اس کا کرائے دار تھا۔"

"اچھا۔ میں سمجھا رانجھا فوت ہو گیا" کوئی مایوسی سے بولا۔

جب ہیرے نے ترکی بہ ترکی کہا کہ مریں رانجھے تو فوت کرنے والے اور غلط فہمی رفع ہونے کے بعد تعزیت کرنے والے بھی رخصت ہو گئے تو میں نے ہیرا اور مسٹر رانجھا کو وضاحت سے سمجھایا کہ میری بات کا کیا مطلب تھا۔ "وہ اب یہاں نہیں' میرے ساتھ رہے گا۔"

ہیر خاصی مایوس نظر آنے لگی "کیوں' ادھر کیا تکلیف تھی اسے؟ اگر کرایہ زیادہ تھا تو مجھ سے کہتا' میں پانچ روپے کم کردیتی۔"

مسٹر رانجھا نے کہا "کرائے کی بات کرتی ہے' روز فرمائش کرتی تھی ان سے کہ آج یہ لانا' آج وہ لانا۔ کھا کھا کے اپنا یہ حال کرلیا۔ اس کا مفت الگ کھاتی تھی۔ وہ جانا نہ تو کیا کرتا۔"

جب ان کی لڑائی شروع ہوئی تو میں نے ہاتھ جوڑ لیے "آپ لوگ نیچے جا کے صبح تک لڑیں۔ مجھے سونے دیں۔"

وہ چلے گئے تو میں رئیس کے میلے کچیلے بستر پر دراز ہو گیا۔ عین میرے سر کے اوپر زرد بیمار روشنی پھیلانے والا چالیس واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ میں نے کمرے کے اسباب کا جائزہ لیا۔ رئیس کا سامان کچھ بھی نہیں تھا۔ اس چارپائی کے علاوہ جسے یہاں چھوڑا جا سکتا تھا ایک پرانی میز اور کرسی تھی۔ وہ بھی لے جانے کے قابل نہیں تھیں۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹین کا صندوق تھا جو مقفل تھا۔ دیواروں پر کچھ کپڑے لٹکے ہوئے تھے اور میز پر کنگھی شیشہ' سر میں لگانے والے تیل کی شیشی اور شیو کرنے کے لیے پرانی سینٹی وغیرہ پڑے تھے۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں سخت تھکا ہوا ہونے کے باوجود کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ دیواروں پر چھپکلیاں دوڑ رہی تھیں اور ٹین کی چھت پر بلیاں لڑ رہی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے وہ منتشر باری باری آتے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔ کبھی میرا تصور اس ناصر عظیم کو دیکھتا تھا جس کی موت پر میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے میں مر گیا ہوں۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ دنیا کس حد تک سفاک اور خود غرض ہو سکتی ہے۔ موت کیسی بھیانک چیز ہے اور زندگی کتنی ناپائدار۔ صرف ایک بار ملنے والی۔ اور کسی تصور کے بغیر ہی اچانک چھین لی جانے والی۔ اور یہ کہ انصاف لینے والا کمزور ہو تو انصاف نہیں ملتا۔ چنانچہ میں نے کمزور نہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنی زندگی کی ساری محرومیوں کے ذمے دار لوگوں سے انتقام لینے کا بھی۔

دوسرا تصور شاہد کا تھا جو میرے خیال کی رو ایسے بدل دیتا تھا جیسے کوئی ایک سوئچ سے بلب بجھائے اور دوسرے سے ٹیوب لائٹ جلادے۔ میں سب کچھ بھول کے ایک البم کے صفحے پلٹنے لگتا تھا۔ شاہد کے روپ کو میری آنکھوں نے ہزاروں انداز سے دیکھا تھا اور ہر نقش اس البم میں محفوظ تھا۔ اس کے ساتھ میں نے بڑے یادگار لمحے گزارے تھے جو میری یادوں کا سرمایہ بن گئے تھے۔ اب میرے سامنے مستقبل کے خواب تھے جو زیادہ دلنواز اور پرکشش تھے۔

صبح میں ذرا دیر سے جاگا۔ ہیر نے مجھے بتایا کہ چھت کے آخری حصے کی بغیر چھت والی تین دیواریں ہی خاندان کا مشترکہ مردانہ و زنانہ بیت الخلا ہے۔ اس نے ایک بڑے سائز کے لوٹے کی دھار سے مجھے نالی پر بیٹھ کے منہ دھونے کا موقع بھی فراہم کیا اور پھر بڑی محبت سے ایک کپ چائے بھی پیش کی۔ اسے میں نے چائے سمجھ کے پی لیا۔ اس میں چائے کی پتی نہ سہی دودھ چینی جیسا خلوص بہرحال شامل تھا۔

مسٹر رانجھا اپنا کلینک کھولنے کے لیے روانگی اختیار کرنے والے تھے کہ اچانک ہڑبونگ مچ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید ہمارے کانوں نے ہی صور اسرافیل نہیں سنا ورنہ قیامت آگئی ہے۔ بستی کا ہر شخص چیختا چلاتا بھاگ رہا تھا یا بھاگنے کا مشورہ دے رہا تھا اور ہر گھر سے عورتوں بچوں کی چیخ پکار کا شور اٹھ رہا تھا۔ مسٹر رانجھا بھی سر پر ٹوپی رکھ کے دوڑے اور چند منٹ میں ہانپتے کانپتے بدحواسی میں ہکلاتے نمودار ہوئے۔ ہیر رانجھا کے درمیان جو مکالمے ہوئے' اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایل ڈی اے والے اس ناجائز تعمیر ہونے والی برسوں پرانی آبادی کو گرانے کے لیے بلڈوزر لے آئے ہیں اور انہوں نے مکینوں کو صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے کہ وہ جو سامان اٹھانا چاہیں' اٹھا کے نکل جائیں۔ یہ معاملہ بہت عرصے سے ٹل رہا تھا۔ کبھی علاقے کا کوئی نمائندہ اپنے ووٹ پکے کرنے کے لیے اس ظلم کے خلاف احتجاجی مہم چلا دیتا تھا تو کبھی عدالت سے عارضی حکم التوا حاصل کرلیتا تھا۔ کبھی یہ معاملہ سیاسی رخ اختیار کرلیتا تھا تو کبھی انسانی مجبوری کا مسئلہ بنا دیا جاتا تھا۔ تاہم جو غیر قانونی تھا' وہ ایل ڈی اے کی نظر میں اپنے وجود کا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔

مسٹر رانجھا کی حالت غیر تھی۔ ہیر چیخ چیخ کے ظالم حکومت کے کارندوں کو گالیاں بھی دے رہی تھی' رو بھی رہی تھی اور سامان بھی سمیٹ رہی تھی۔ خود میں نے بڑی عجلت میں اپنا اور رئیس کا سامان اٹھایا۔ میں واضح طور پر بلڈوزر چلنے کی آواز بھی سن رہا تھا اور گرنے والے مکانوں کا شور بھی۔ کئی برس گزر جانے کے بعد اکثر لوگوں نے پکے مکان بنائے تھے۔ دیوہیکل مشینوں کی طاقت کے سامنے یہ ریت کی دیوار سے بھی کمزور ثابت ہوئے۔ ٹین کی چھتوں کے' اینوں کی دیواروں کے اور سامان کے گرنے اور ٹوٹنے پھوٹنے سے جو شور بلند ہو رہا تھا' اس میں وہاں رہنے والوں کے چیخنے چلانے' گالیاں کوسنے اور بددعائیں دینے کا شور بھی شامل تھا۔

بالآخر ہم بھی بھاگے۔ مسٹر رانجھا نے آخری وقت میں بڑی پھرتی دکھائی۔ گلی میں ٹریفک جام تھا۔ لوگ ایک ساتھ نکلنا چاہتے تھے۔ ان کے سروں پر بکس تھے اور ہاتھوں میں بھی سامان تھا۔ گھر کا ہر فرد عورت اور بچے' بوڑھے اور جوان کچھ نہ کچھ اٹھائے ہوئے تھے اور اس ظلم کے خلاف فریاد کرتے بھاگ رہے تھے۔ کچھ عورتیں اونچی آواز میں رو بھی رہی تھیں۔ ان میں ہیر بھی شامل تھی۔ اس گلی سے نکلنا ہی بڑا مشکل کام تھا۔ دو صندوق اور ایک بیگ اٹھا کے اس ہجوم سے گزرنا جو تنگ گلی میں پھنسا ہوا رینگ رہا تھا' انتہائی صبر آزما جدوجہد تھی۔

بالآخر میں گلی کے آخری حصے میں طلوع ہوا اور میں نے سارا سامان سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ مسٹر رانجھا مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں رک کے ہیر کا انتظار کروں اور جب وہ ہجوم سے برآمد ہو تو اسے یہاں سامان کے ساتھ ہی رکھ دوں۔ پھر وہ دوسرا پھیرا کرنے کے لیے گلی میں یوں گھس گئے جیسے کوئی طوفانی دریا میں دھارے کے خلاف تیرنے کے لیے چھلانگ مار دے۔ میں اس شخص کی ہمت کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں تین چکر لگائے اور اپنے گھر کا بیشتر سامان فرنیچر کے سوا' لانے میں کامیاب رہا۔ فرنیچر دو چارپائیوں' ایک الماری' نعمت خانے اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ یہ سب چیزیں برسوں پرانی تھیں اور انہیں اٹھانے کی نہ مہلت تھی اور نہ مسٹر رانجھا میں ہمت۔

ہیر سامان کے پاس بیٹھی مسلسل رو رہی تھی اور اپنے سوا سب کو کوس رہی تھی خواہ وہ اس بیلے کا ذمے دار تھا یا نہیں مثلاً مجھے۔ میں منحوس تھا کہ میرے قدم رنجا فرماتے ہی بسابسایا گھر اجڑ گیا۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور ڈیلاگ بھی بولے کہ شاید اس میں بھلائی ہو اور خدا اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ مایوسی گناہ ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا دل اپنے گھر کی تباہی پر سخت دکھی تھا۔

میں خود بھی دکھی اور پریشان لوگوں کے بے گھر ہونے کا یہ منظر دیکھ کے دکھی ہو گیا تھا۔ وہ سیکڑوں خاندان تھے جن کے سر پر اچانک چھت نہیں رہی تھی اور ان سب کو یہ فکر لاحق تھی کہ ان کی رات آج کہاں اور کیسے گزرے گی۔ کچھ پہلے سے طے شدہ ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو گئے تھے مگر اکثریت ابھی سڑک کے کنارے اپنے سامان کے ڈھیر پر ایسے بیٹھی تھی جیسے لٹے پٹے مہاجروں کے قافلے۔

"یہ تو ایک دن ہونا تھا" مسٹر رانجھا بار بار ٹوپی اٹھا کے اور سر کی جلد کھجا کے آہ سرد کے ساتھ کہتے تھے۔

بالآخر ہیر نے چلا کے کہا "اوئے نامراد۔ اتنی دیر سے ایک ہی بات کہہ رہا ہے۔ بڈھے طوطے' یہ ہونا تھا تو پھر تو نے کیا سوچا تھا؟ ادھر سڑک کے کنارے ہی زندگی گزرے گی؟ اب کیا ہوگا' یہ سوچ۔"

"ہاں۔ سوچ تو سہی۔ خالی رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

ان کے ساتھ میں بھی پھنس گیا تھا۔ اگر یہ سب ایک دن کیا ایک گھنٹے بعد ہوتا تو مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ میرا سب سامان نہ جانے کہاں جاتا۔ اگر مسٹر رانجھا اس سامان کو اٹھاتے تو پھر انہیں اتنے بڑے شہر میں تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں رئیس کا دوست اور ان کا مہمان تھا۔ ہیر اسے اپنا بھائی کہتی تھی' خواہ اس سے وہی بھلے اور جلیبی کھانے کے لیے ہی کیوں نہ کہتی ہو مگر میں اسے اس حال میں چھوڑ کے نہیں جا سکتا تھا۔ میں ان کے بُرے وقت میں شریک ہونے پر مجبور تھا اور یہ ناممکن تھا کہ میں اپنا سامان اٹھا کے کسی ٹیکسی' رکشے میں رکھوں اور کہوں کہ اچھا بھئی' ہم تو چلتے ہیں۔ اب

تم جانو اور تمہارا کام۔

میں بڑے شش و پنج میں مبتلا تھا۔ میں اس شخص کی طرح اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا جس کی جیب میں درد کی دوا ہو مگر وہ کسی ضرورت مند کو اس خیال سے نہ دے کہ اس کی ضرورت مجھے بھی پڑ سکتی ہے۔ آج شام ایک مکان مجھے ملنے والا تھا مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہیر رانجھا کو وہاں عارضی پناہ کی پیش کش کروں یا نہ کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اٹک جائیں ہمیشہ کے لیے اور انہیں نکالنا مشکل ہو جائے۔ میں ایل ڈی اے تو ہوں نہیں کہ بلڈوزر لے کر چڑھائی کر دوں۔ میں اور شادو ان کے ساتھ کیسے رہ سکتے تھے۔ پانچواں شخص رئیس تھا۔ دو کمرے اور ڈھائی خاندان۔

بالآخر میرے اندر کا مزاحمت کرنے والا خود غرض انسان ہار گیا اور میں نے انہیں تسلی دی "ایک مکان ہے میرے پاس۔ فی الحال ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں۔ جب تک تمہارا کوئی اور انتظام نہ ہو۔"

وہ رونا دھونا بھول گئی "مکان ہے؟ تمہارا اپنا؟"

میں نے کہا "میں نے کرائے پر لیا تھا۔ شام کو قبضہ ملے گا۔ ایک ہزار روپے مہینہ کرایہ ہے۔"

"ایک ہزار" ہیر نے چیخ سی ماری "اتنا تو ہم نہیں دے سکتے۔"

مسٹر رانجھا نے سہلایا "اتنی کمائی نہیں ہوتی پورے مہینے میں۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی شہرت کی ریڑھی اچھی چلتی ہوئی جگہ پر تھی اور وہ شرتوں کے کمیسچر اور بچوں کے مغز سے جس قسم کے مریضوں کا علاج کرتا تھا' وہ بھی اچھے خاصے بے وقوف ہوتے تھے چنانچہ اچھی خاصی رقم دے جاتے تھے مگر کسی انکم ٹیکس افسر کی طرح اس کے بیان کو غلط ثابت کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں نے کہا "کرایہ میں دوں گا۔ تم اس وقت تک وہاں رہ سکتے ہو جب تک تمہیں اپنے مطلب کا کوئی مکان نہ ملے۔"

مسٹر رانجھا نے خوش ہو کے کہا "اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

ہیر نے بھی کہا "تم تو فرشتہ بن کے آئے ہو ہماری مدد کے لیے۔"

رانجھا نے اسے یاد دلایا "مہمان کو اسی لیے رحمت کا فرشتہ کہتے ہیں۔ پھر کیا خیال ہے' سامان اٹھائیں؟"

سامان یہاں سے اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔ بستی کے سارے مکان ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ آبادی کی جگہ ایک کھلا میدان سا نمودار ہو گیا تھا۔ درمیان میں صرف ایک مسجد باقی رہ گئی تھی۔ مکانوں میں رہنے والے سڑک کے کنارے اپنے اپنے سامان اور بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے رو رہے تھے۔ حکومتی کارندوں کو گالیاں دے رہے تھے اور حسرت سے اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جسے وہ اپنا سمجھ بیٹھے تھے۔ شاید ان کی اکثریت ایسے ہی آباد اور برباد ہونے کی عادی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ اب کس طرف کا رخ کیا جائے اور خانہ آبادی کے لیے کس جگہ پر قبضہ کیا جائے جہاں سے انہیں پھر دو چار سال کوئی نہ اٹھائے اور انہیں شہر سے زیادہ دور بھی نہ جانا پڑے۔

میں ایک ریڑھے والے کی خدمات حاصل کرنے گیا تو ایک خستہ حال ریسٹورنٹ میں چائے کے ساتھ پاپے بھی کھائے۔ گیارہ بجنے والے تھے اور میں نے ناشتا تک نہیں کیا تھا کہ بستی اجاڑنے والے اخوان الشیاطین آ گئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی ٹرک بھر کے آئی تھی اور ایک ایس ڈی ایم بھی تھا تاکہ بستی والوں کی طرف سے مزاحمت ہو تو لاٹھی چارج سے ختم کر دی جائے۔ مگر ایک تو بستی والے ذہنی طور پر اس قیامتِ صغریٰ کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے' دوسرے ان میں مزاحمت کا حوصلہ بھی نہ تھا۔

اب پولیس انہیں سڑک کے کنارے سے بھی سامان اٹھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے راہ چلتے لوگ بھی رک جاتے تھے۔ اس سے ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ ایسے لوگوں کی اپنے پیارے پاکستان میں کمی نہیں جو صرف تماشا دیکھتے ہیں۔ تماشا کیسا بھی ہو' اپنے ہی گھر میں آگ لگنے کا ہو یا اپنا ہی گھر لٹ رہا ہو' وہ زیادہ سے زیادہ اپنی بے بسی پر رو سکتے ہیں اور فریاد کر لیتے ہیں۔

میں نے رانجھا کو پتا سمجھایا "تم چل کے سامان اس گھر کے دروازے پر رکھو' میں جاتا ہوں وکیل کے پاس۔"

"وکیل کے پاس کیوں؟" ہیر نے کہا۔

رانجھا نے اسے سمجھایا "یہ کیس کریں گے کارپوریشن پر۔ ہمارا مکان گرا دیا۔"

میں نے کہا "وہ مکان کا مالک ہے۔ اگر مل گیا تو ابھی چابیاں لے لوں گا ورنہ تمہیں شام تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ ہم نے وکیل صاحب سے مکان کرائے پر لیا ہے۔ شام تک وہیں بیٹھے رہنا۔"

جب ریڑھے پر سامان کے ساتھ مسٹر رانجھا اور ہیر بھی آ گئے تو میرے ہاتھ میں صرف ایک بیگ رہ گیا۔ اس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے کپڑے تھے اور ان کے درمیان میں نے بڑی احتیاط سے ریوالور چھپایا تھا۔ اس میں میری چیک بک بھی تھی میرا نیا بنا ہوا شناختی کارڈ بھی تھا۔

ریڑھے کے روانہ ہوتے ہی میں نے رکشا تلاش کیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ صبح رئیس سے ملوں گا اور شیاما کی ڈیوٹی لگاؤں گا کہ جیسے ہی شاہ جی نمودار ہو' مجھے بتادے۔ اسے آج شاہد کی الٹراساؤنڈ رپورٹ لے کر آنا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ نرس کو بھی رشوت دے کر اپنے ساتھ ملالوں گا اور اسے کہوں گا کہ وہ شاہ جی کی رپورٹ فوراً لیڈی ڈاکٹر کے سامنے نہ رکھے بلکہ جتنی دیر ہو اتنا اچھا۔ اسی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بے خوف و خطر جاؤں گا شاہد سے ملنے اور اگر وہ مان گئی تو اسے کہوں گا کہ چل نیک بخت' اپنا ٹھکانا بن گیا۔ جو سامان اٹھانا ہو' اٹھالے اور چل میرے ساتھ۔ لیکن صبح صبح شروع ہونے والی کارروائی سے میرا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا تھا۔

میں اس امید کے ساتھ شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچا کہ شاید ابھی وہ اسپتال میں ہوگا۔ گزشتہ روز بھی وہ اسی وقت اسپتال گیا تھا۔ دس بجے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر کبھی نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر مشہور جیسے بہت کم تھے جو وقت پر ڈیوٹی کے لیے پہنچ جاتے تھے۔

تصدیق کے لیے میں نے شاہ جی کی گاڑی تلاش کی مگر گاڑی وہاں نہیں تھی جہاں ہمیشہ کھڑی رہتی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں گیٹ سے داخل ہوا اور زینے کے پاس رک گیا۔ اوپر والا دروازہ بند تھا۔ اس دروازے کے پیچھے شاہد تھی۔ اس کے تصور نے مجھے بے قرار کردیا۔

میں نے بیگ میں سے ریوالور نکالا اور پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں نے بیگ کو ایسی جگہ رکھا جہاں اسے ایک نظر میں کوئی نہ دیکھ پائے لیکن مجھے فرار ہونا پڑے تو میں آسانی سے بیگ اٹھا کے نکل جاؤں۔ اوپر جانے سے پہلے میں نے نیچے کے ہال میں دیکھا مگر وہاں نہ عامر تھا نہ کوئی اور۔ رات کو فقیروں کے کھانتے' تھوکتے' سگریٹیں پھونکتے اور چرس کی بو پھیلاتے فقیروں کا ایک غلیظ بدبودار ہجوم یہاں اپنی اپنی گدڑیاں بچھائے نظر آتا تھا۔ وہ جو اس وقت بھی تاریک ہال کی دیواروں میں قید تھی۔ ان کے بندھے ہوئے بستر دیواروں کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں نظر آرہے تھے۔ میری نظر اس جگہ پر گئی جہاں میں بھی انہی قابلِ نفرت لوگوں کے درمیان چند راتیں گزار چکا تھا۔ شاہد جی' کیا کیا نہ ستم ہم نے سہے آپ کی خاطر۔ بے گھر ہوئے' فقیر ہوئے۔ شکن چھوڑی آن قربان کی۔ عزتِ نفس گنوائی' خودی کو غرق کیا۔ تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔

زینے پر پہلا قدم رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ شاہ جی اچانک آگیا تو میں کیا کروں گا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے ریوالور پر گیا۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ شاہد مجھے کہیں چھپادے اور جب اس کا باپ باتھ روم میں ہو تو میں نکل جاؤں۔ دوسری صورت مقابلے کی تھی۔ اس کا مقابلہ میں خالی ہاتھوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کو بھی اتنی مہلت نہیں دینی تھی کہ وہ ریوالور نکال کے مجھے گولی مار دے۔ وہ غصے کا انتہائی تیز اور ہائپر ٹینشن کا مریض بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ غصے میں آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا اور سوچے سمجھے بغیر وہ مجھے شوٹ کردے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کہاں ہوگی۔ ویسے وہ سوچ سمجھ کے قتل کرنے کا بھی اہل تھا۔ اس نے نیلے کو بڑے سکون سے سزائے موت سنائی تھی اور اس پر فوری عمل درآمد کا حکم رئیس کو اور مجھے دیا تھا۔

یہ سوچ کے مجھے شرم آئی کہ میں نے بلاچون وچرا شاہ جی کے جلاد کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ میں اس قتل میں شریک تھا۔ مجبوری کا عذر کوئی عذر نہیں ہوتا۔ میں انکار کردیتا اور بھاگ جاتا۔ اس انکار پر شاہ جی مجھے قتل نہ کرتا۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ انکار پر مسترد ہونے کے بعد میں اپنی شاہد سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھے واقعی اس عشق نے پاگل کردیا تھا۔

میں نے اوپر جاکے دروازے کا ہینڈل گھمایا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دی تو چند سیکنڈ کے بعد دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے شاہد کو دیکھا۔

مجھے دیکھتے ہی شاہد کے تیور بدل گئے۔ اس نے چلّا کے کہا "تو یہاں کیوں آیا ہے کمینے!"

میں نے کہا "شاہد جی۔ مجھے معلوم ہے تم خفا ہو مجھ سے۔ مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

"چل دفع ہو یہاں سے اپنی منحوس شکل لے کر۔" اس نے نفرت سے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کردیا "اور خبردار' جو پھر ادھر کا رخ کیا۔"

حیرت' صدمے اور احساسِ ذلت سے میں گنگ ہو گیا اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔

پھر غصے کی ایک طوفانی لہر میرے ہوش و حواس کو بہالے گئی۔ میں نے دروازے پر ایک لات رسید کی۔ دروازہ کھول

شاہد' نہیں تو میں توڑ ڈالوں گا۔" میں نے چیخ کے کہا۔

میں نے دروازے پر دوسری لات ماری تو دروازہ کھل گیا اور ہوا میں پاؤں جھٹکنے سے میرا توازن بگڑ گیا۔ میں نے اپنے سامنے شاہ جی کا غضبناک چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے اور صورت پر وحشت طاری تھی۔

اس نے مجھے ایک گندی گالی دی "۔۔۔ دروازہ توڑے گا۔ تیری تو۔۔۔" اس نے ایک دم مجھے کالر سے پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔

میں جھٹکے سے فرش پر منہ کے بل گرا۔ میرے گھٹنوں اور ہاتھوں پر رگڑ سے چوٹ آئی مگر مجھے اس وقت صرف یہ خیال تھا کہ میں نے اپنا دفاع کرنے میں دیر کی تو شاہ جی اس غصے کی دیوانگی میں مجھے جان سے مار ڈالے گا۔

میں ایک دم اٹھا اور دوڑ کے سامنے کی دیوار سے چپک لگائی۔ میرا ہاتھ خود بخود جیب میں گیا۔ ریوالور نکالتے ہی میں نے اس کا رخ شاہ جی کی طرف کردیا۔ وہ میری طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے ذہن کو جھٹکا لگا اور وہ جہاں تھا' وہیں رک گیا۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پایا۔ آج سے پہلے میں نے کبھی ریوالور استعمال نہیں کیا تھا اور مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ جب میں ٹریگر دباؤں گا تو اس میں سے گولی نکلے گی یا نہیں۔ نکلی تو گولی کدھر جائے گی اور میں کدھر جاؤں گا۔ میں نے سنا تھا کہ گولی چلتے ہی زبردست جھٹکا لگتا ہے۔

میری کامیابی کا سارا دارومدار میری اچھی اداکاری اور اعتماد کے مظاہرے پر تھا۔ شاہ جی کو میری اندرونی کیفیت کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اسے ایسا ہی لگنا چاہیے جیسے میں ریوالور چلانا جانتا ہوں۔ میرے لیے ریوالور ہاتھ میں لے کر کسی دشمن کو نشانہ بنانے کا یہ پہلا تجربہ نہیں ہے اور میں واقعی اس کی جان لے سکتا ہوں۔

"شاہ جی۔ اس سے آگے ایک قدم مت بڑھانا" میں نے اپنی پھولی ہوئی سانس اور مرتعش آواز پر قابو پانے کی کوشش کی "یہ مت سمجھنا کہ ریوالور نقلی ہے یا میں فینکا ہوں جسے تم اتنی آسانی سے مار دو گے۔"

شاہ جی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اسے میں نے مارا تھا یا تو نے؟"

میں نے کہا "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مجبور تھا اس وقت۔ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر تم نے میری جان لینے کی کوشش کی تو میں ساری گولیاں تم پر فائر کردوں گا شاہ جی۔"

آہستہ آہستہ شاہ جی کا غصہ خوف میں بدلنے لگا تھا۔ مجھ سے زیادہ اسے آتشیں اسلحے کی پہچان تھی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ کھلونا یا کسی کباڑی سے خریدا ہوا ناکارہ پستول نہیں ہے۔ ڈاکٹر مشہور اپنی حفاظت کے لیے جدید ترین خودکار ریوالور افورڈ کر سکتے تھے۔ اس کے گم ہونے سے وہ پریشان ضرور ہوئے تھے مگر یہ صدمہ مالی نقصان کا نہیں تھا۔ انہوں نے فوراً ایسا ہی دوسرا ریوالور خرید کے اپنے باڈی گارڈ اور ڈرائیور کو دے دیا تھا۔

"ناصر' ہوش میں آ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ گولی چل جائے" شاہ جی نے اپنا لہجہ بدل لیا۔

میں کچھ پُرسکون ہو گیا۔ اس احساس نے مجھے اعتماد اور اطمینان دیا کہ جسمانی طور پر شاہ جی کے برابر نہ ہونے کے باوجود میرا پلہ بھاری ہے کیونکہ طاقت میرے ہاتھ میں ہے۔ طاقت کا منبع اور سرچشمہ ایک فولادی کھلونا تھا جس کے اندر موت ایک گولی کی صورت میں کسی کی موت کے وقت کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ "میں ہوش میں ہوں شاہ جی۔ پہلے مجھے ہوش نہیں تھا۔ جب میں تمہارا زر خرید غلام بن کے رہتا تھا' تم سے ڈرتا تھا۔"

شاہد میرے بائیں ہاتھ پر جُت بنی کھڑی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کے لیے بھی میرا اتنی بے خوفی سے جان ہتھیلی پر رکھ کے مرنے یا مارنے کی نیت سے دیوانہ وار آنا بالکل ناقابلِ یقین تھا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وہ کبھی مجھے دیکھتی تھی کبھی شاہ جی کو۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں اس کی محبت کے جنون میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا تھا اور شاہ جی کی نظر میں میری محبت ہی ناقابلِ معافی جرم کا درجہ رکھتی تھی۔ اگر اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو کے رہ گئی تھی تو یہ بالکل فطری بات تھی۔

"دیکھ ناصر۔ اس پاگل پن سے کوئی فائدہ نہیں" شاہ جی لمبی لمبی سانسیں لینے لگا "تو کیا چاہتا ہے آخر؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟" میں نے نفرت اور حقارت سے کہا "میں شاہد کو چاہتا ہوں۔ سنا تم نے' میں تمہارے سامنے بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں۔ کیا ضرورت ہے مجھے ڈرنے کی۔"

شاہد نے دبے دبے لہجے میں منت کی "ناصر۔ آرام سے بات کر۔"

میں اس پر برس پڑا "اب کہتی ہے آرام سے بات کر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الو کی پٹھی' تو نے ہی دھتکار دیا تھا مجھے۔ دروازہ بند کر دیا تھا۔ کیا سمجھتی ہے تو آخر۔ میں ایسا گیا گزرا فقیر ہوں جو کسی فقیر سے خیرات مانگنے آیا تھا۔۔۔ میں تجھے لینے آیا تھا۔"

وہ سسکیاں لے کر رونے لگی "میں نہیں چاہتی تھی۔۔۔ کہ یہ سب ہو۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ ابھی تو چلا جائے۔"

"اب میں تجھے لے کر ہی جاؤں گا اپنے ساتھ۔"

شاہ جی پھر غصے سے بے قابو ہونے لگا "اتنا آسان سمجھ رکھا ہے تو نے۔"

میں نے کہا "گالی مت دے۔۔۔ پھر گالی دی تو نے مجھے تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔ کام کوئی مشکل نہیں ہوتا۔"

"ابھی شاہد کا باپ زندہ ہے" اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔

"کوئی نہیں روک سکتا میرا راستہ۔ اور تو نے غلموں والا ڈاٹیلاگ بولا نا میرے سامنے کہ میری لاش پر سے گزر کے ہی شاہد جا سکتی ہے تو میں دو منٹ میں لاش بھی بنا دوں گا تجھے" میں اب تم سے تو پر آ گیا تھا اور میں نے اپنا لہجہ بھی حقارت آمیز کر لیا تھا۔

شاہد نے ایک قدم آگے بڑھایا "ناصر۔ میری بات سن۔"

میں نے اسے ہاتھ بڑھا کے روک دیا "تو ست آ بیچ میں۔ وہیں کھڑی رہ۔ ایسا نہ ہو تیری بے وقوفی کسی کی جان لے لے۔ میں مرنے کی نیت سے آیا تھا شاہد اور مار ڈالوں گا تجھے بھی مرنے سے پہلے۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے رک گئی "خدا کے لیے ناصر۔"

میں نے اس کی بات نہیں سنی اور شاہ جی کو اشارہ کیا "بیٹھ جا اس جگہ' فرش پر۔ ہلنا جلنا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ تجھے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا' اچھا ہے ہو جائے۔"

شاہ جی وہیں بیٹھ گیا "مجھے۔۔۔ پانی دے شاہد۔"

شاہد ایک گلاس لے کر اس کی طرف بڑھی۔ وہ شاہ جی کو کوئی گولی بھی دینا چاہتی تھی۔ میں نے کہا "شاہد۔ سامنے مت آنا۔ بیٹھ کے دور سے گلاس آگے کر دے۔ گولی اس کے ہاتھ پر رکھ دے۔ ایسا نہ ہو یہ تجھے ڈھال بنا لے اور پھر کہے مجھ سے کہ اب چلا گولی۔"

شاہد نے میرے حکم کی تعمیل کی اور بستر پر پاؤں لٹکا کے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ بیڈ کے دوسرے کنارے پر میں بھی بیٹھ گیا "کل اسپتال گیا تھا میں۔ میں نے تجھے دیکھا تھا وہاں۔ تو شاہد کو لے کر گیا تھا ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس۔"

شاہد کے چہرے کی زردی میں ذرا سی دیر کے لیے لالی آئی۔

"اسے کچھ بخار تھا۔۔۔" شاہ جی نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے تو۔ جھوٹ بولتا ہے سؤر کے بچے!" میں نے چلا کے کہا۔

شاہ جی کی صورت پر خفت آمیز برہمی کے آثار نمودار ہوئے۔

"میں ملا تھا اس ڈاکٹر سے۔۔۔ اور اس نے سب بتا دیا ہے مجھے۔ جاہل سفاک آدمی۔ کیا ملا تجھے اپنی بے گناہ بیٹی پر شک کر کے۔ کیوں یہ ظلم کیا تو نے اس پر؟ بے غیرت سمجھتا ہے اپنی طرح سب کو۔ ساری عمر تو انسانوں کو ذلیل کرتا رہا۔ ان کی عزتوں کو تماشا بناتا رہا۔ اپنی بیٹی کو بھی نہیں بخشا تو نے؟ کون ذمے دار ہوتا اگر یہ مر جاتی یا اس تذلیل کو برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر لیتی۔"

اس نے اپنا سر جھکا لیا "بے شک۔ غلطی ہوئی مجھ سے۔"

"غلطی۔؟ ذرا دیکھ اس کی طرف۔ کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔" میں نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا "کس شک کا وجود مٹا رہا تھا تو کینسر آدمی۔ ہر آئینے میں اپنی صورت نظر آتی ہے نا تجھے۔ ایسا تو نے کیا ہو گا کسی کی بیٹی کے ساتھ۔ اب ڈرتا ہے کہ ویسا ہی تیری بیٹی کے ساتھ نہ ہو جائے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا ملتی ہے اولاد کو۔"

شاہد رونے لگی "میری کسی قسم کا اعتبار نہیں تھا میرے باپ کو۔ میں کتنی بدنصیب بیٹی ہوں۔"

میں نے کہا "شاہد۔ جا قرآن اٹھا لا۔ میرا منہ مت دیکھ۔"

شاہد بادلِ ناخواستہ اٹھی اور پلٹ کے ایک کونے تک گئی جہاں قرآن ایک طاقچے جیسے شیلف پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے خوب صورت جزدان میں لپٹا ہوا قرآن میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ادھر آ۔ میرے پاس" میں نے کہا "اس پر ہاتھ رکھ۔ اپنا میرے ہاتھ کے ساتھ اور بتا اسے۔"

شاہد نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے سر جھکا لیا اور قالین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدنے لگی "میں بہت ذلیل ہو چکی' اب کیا فائدہ۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ قرآن پر رکھ لیا "تجھے بھروسا ہے اس مقدس کتاب کی گواہی پر؟ صرف

شیطان ہی شک کر سکتا ہے اس پر جو خدا اور رسول کی اس کتاب پر حلف اٹھائے۔ لعنت ہو اس پر اور اس کے پیدا کرنے والے پر جو خود کو مسلمان بھی سمجھتا ہو اور اتنی بڑی قسم پر اعتبار نہ کرے۔ میں نے شاہد سے محبت کی۔ ہم چاہتے تھے ایک دوسرے کو مگر یہ چاہت کبھی ہوس نہیں بنی۔"

شاہ جی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا "چل جانے دے۔ شاہد مجھے معاف کر دے بیٹا!"

میں نے کہا "صرف معافی مانگنے سے تلافی ہو جائے گی۔ جو نقصان ہو گا شاہد کو' اس کا ذمے دار کون ہو گا؟ مجھے اس ڈاکٹر کا نام بتا جس نے تیرے دل میں آنے والے گندے خیال کی تصدیق کی تھی اور محض چند روپوں کے لیے شاہد کو ایسی گالی دی تھی۔ اسے خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا تھا اور اس کی جان سے کھیلنے کی کوشش کی تھی؟ کون تھا وہ؟ کوئی ڈاکٹریا عطائی۔"

"اس نے میری کوئی بات نہیں مانی" شاہد اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی "میں نے بہت کہا۔ خدا رسول کو حاضر ناظر جان کے قسم کھائی مگر اس نے مجھے جھوٹا کہا۔ اس نے کہا کہ سب لڑکیاں ایسا ہی کہتی ہیں۔ پہلے پیچھے لگتی ہیں۔ پھر معصوم بن جاتی ہیں۔ نتیجہ سامنے آتا ہے تو جان بچانے کے لیے انکار کرتی ہیں مگر ان کے انکار سے سچ نہیں بدلتا۔ میں کیا بتاؤں۔ کیا کیا کہا تھا اس حرام زادی نے۔ اس نے میری ایک نہیں سنی اور زبردستی مجھے انجکشن لگا دیا۔ زبردستی مجھے گولیاں کھلا دیں۔ میں کیسے مقابلہ کرتی اس کا جب خود میرا باپ اس کے ساتھ مل کر میری جان لینے پر تلا ہوا تھا۔" یہ سب کہتے ہوئے شاہد کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے خود کو بڑا دکھی محسوس کیا "مت رو شاہد۔ مجھے معاف کر دے میں بھی ذمے دار ہوں تیری اس حالت کا لیکن اس کو نہیں چھوڑوں گا میں' جس نے کوئی الزام نہ ہونے کے باوجود تجھ پر فردِ جرم عائد کی تھی۔ نام بتا مجھے اس کا۔"

"چھوڑ نا ناصر۔ اس کا کیا قصور' جب میرا باپ مجھ پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا تو اسے میں کیا کہوں اور تو کس کس سے نمٹے گا۔ کس کس کو اپنی اور میری بے گناہی کا یقین دلائے گا۔ ہم جانتے ہیں اور ہمارا خدا جانتا ہے سب۔"

میں نے کہا "نہیں شاہد۔ ایسے لوگوں کو معاف نہیں کرنا چاہیے جو لوگوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔ کتنے پیسے لیے تھے اس نے؟"

"دو ہزار" شاہد نے بڑی مشکل سے کہا۔

شاہ جی خود اپنی نظر میں ذلیل ہو کے خاموش بیٹھا تھا "تو اس کی فکر مت کر ناصر' اسے یہ دو ہزار بہت مہنگے پڑیں گے۔ پیسہ پیسہ وصول کرلوں گا میں۔"

"پیسے کا نقصان ہے یہ صرف تیرے لیے۔ جو عذاب برداشت کیا اس نے۔ جو خطرہ اس کی جان کو تھا" میں نے چلا کے کہا "کل کو ایسی ویسی کوئی بات ہو گئی تو کیا ہو گا۔ کیا دو ہزار واپس مل جانے سے سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

"شاہد کو کچھ نہیں ہو گا" شاہ جی بولا "میں بھی باپ ہوں اس کا' کوئی دشمن نہیں۔ میں نے جو بھی کیا تھا' اس کی بھلائی کے خیال سے کیا تھا۔ میں اس کا اچھے سے اچھا علاج کرا سکتا ہوں۔ ولایت بھی لے جا سکتا ہوں اسے۔"

میں نے کہا "ولایت کے بچے۔ اب میں شاہد کو تیرے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا۔ تیرے جیسے ظالم قسائی کے ساتھ اس کی زندگی محفوظ نہیں رہی۔ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ کیسے ہو سکتا ہے' تیرا کیا رشتہ ہے شاہد سے۔۔۔ میں باپ ہوں اس کا۔"

میں نے شاہد کی طرف دیکھا "نہیں مانتی شاہد تجھے اپنا باپ۔"

"اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔" شاہ جی بولا "یہ تیرے ساتھ جائے گی تو میں تیرے خلاف اغوا کا پرچہ کٹواؤں گا۔ تو جانتا ہے نا مجھے۔ جیل میں سڑا دوں گا۔"

"میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں شاہ جی۔ شاہد بالغ ہے۔ بولتی کیوں نہیں شاہد" میں نے برہمی سے کہا۔

اس نے سر اٹھا کے مجھے اور پھر شاہ جی کو دیکھا "ہاں۔ میں اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

شاہ جی کا چہرہ سرخ پڑ گیا "کس کے ساتھ۔ اس حرامی لٹے کے ساتھ جس کے نہ ماں باپ کا پتا ہے اور جو ابھی خود نابالغ ہے۔ جس کے پاس اپنا گھر نہیں ہے رہنے کے لیے۔"

میں اس کی بات سے مشتعل نہیں ہوا۔ میں نے جیب میں سے اپنا شناختی کارڈ نکالا "یہ دیکھ۔ میرا شناختی کارڈ۔ اسے تو چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس کی رو سے میں بالغ ہوں۔"

"یہ جعلی ہے" وہ چلایا "اور تو اسے شادی کے بغیر اپنے ساتھ رکھے گا؟"

میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا۔ میں بے وقوف نہیں ہوں شاہ جی۔ تیرے سارے ہتھکنڈے جانتا ہوں۔ گھر بھی ہے میرے پاس اور اتنی عقل بھی کہ اسی گھر میں شاہد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھ میری قانونی بیوی بن کے رہے گی۔ وہ گھر ایک وکیل کا ہے۔"

شاہ جی کا چہرہ بے جان ہو گیا "تو۔۔۔ شادی کرے گا شادو سے۔"

"ہاں۔ وہ بہت بڑا وکیل ہے۔ اس نے مجھے سب سمجھایا ہے۔ قانون ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور تیرے غیر قانونی حربوں کا مقابلہ میں کر سکتا ہوں۔"

اس کی حالت اب پٹے ہوئے مہرے جیسی تھی۔ شادو' کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

شادو نے اقرار میں سر ہلایا۔

شاہ جی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "پھر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم دونوں خوش رہ سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ میں کروں گا تمہاری شادی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم تھا شاہ جی۔ تو یہی کہے گا لیکن میں تیری چال کو سمجھتا ہوں۔ جھوٹ بول رہا ہے تو۔"

"کیسے یقین آئے گا تجھے۔۔۔ یہ بتا۔۔۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔"

"تو نے اعتبار کیا تھا شادو کی قسموں پر۔۔۔ تیری قسم کا کیا ہے شاہ جی۔ تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ جھوٹا حلف تک اٹھا سکتا ہے۔ تیرے جیسے ہی ہوتے ہیں جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر واہتوں میں جھوٹی گواہی دیتے ہیں۔ ان کا کوئی ایمان نہیں ہوتا' ضمیر نہیں ہوتا۔"

وہ منت سماجت پر اُتر آیا۔ "شادو۔ اسے سمجھا' میں نے ایک غلطی کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیری خوشیوں کا دشمن ہوں۔ اس کی تو میں آنتیں باہر نکال کے بینک دوں گا جس نے دو ہزار کے لیے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور میرے دل میں اپنی ہی بیٹی کے خلاف شک پیدا کیا تھا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اپنی اور تیری عزت بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ تو جانتی ہے میں کتنی محبت کرتا ہوں تجھ سے۔ کبھی انگلی بھی اٹھائی میں نے تجھ پر۔ تجھے خوش رکھنے کے لیے میں نے۔۔۔ وہ سب کیا جو دنیا کے باپ کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کے تیرا خیال رکھا۔ تیری خاطر دوسری شادی نہیں کی میں نے۔"

"ڈراما مت کر شاہ جی!" میں نے چلا کے کہا "تجھے کیا ضرورت تھی شادی کی۔"

"نہیں ناصر۔ شادی سب کرتے ہیں۔ شادی لوگ گھر بسانے کے لیے کرتے ہیں۔ بیوی کے بغیر کوئی گھر نہیں بنتا۔ آباد نہیں ہوتا۔ آدمی اکیلا ہی رہتا ہے خوامخواہ۔۔۔ اس کی زندگی میں کتنی ہی عورتیں کیوں نہ آئیں۔ مجھے صرف شادو کا خیال تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سوتیلی ماں اس پر ظلم کرے۔ میرے دل سے بھی اس کا پیار چھین لے۔"

میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی کی جذباتی باتوں کا شادو پر اثر ہونے لگا ہے۔ وہ پھر رونے لگی تھی۔

میں نے کہا "شادو۔ اس مکار آدمی کی باتوں میں مت آنا۔ یہ تجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تو میرے ساتھ نہ جائے پھر یہ زبردستی تیری شادی کسی سے کر دے گا۔"

شادو نے نفی میں سر ہلایا "زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ میں بھی بہت ضدی ہوں' اپنی جان دے سکتی ہوں۔"

"کوئی زبردستی نہیں کرے گا تیرے ساتھ۔۔۔" شاہ جی نے اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "تیرے سوا کون ہے اس دنیا میں میرا۔ تیری ماں تو بہت چھوٹا سا چھوڑ گئی تھی تجھے۔ میں نے ہی ماں اور باپ بن کے اتنا بڑا کیا ہے تجھے۔ کیا اس لیے کہ تیری جان کا دشمن ہو جاؤں۔ تیری خوشیوں کا خون کر کے مجھے کون سی خوشی ملے گی۔ کیا آج تک میں نے جو بھی کیا' صرف تیری خوشی کے لیے نہیں کیا تھا۔ بول' اور کیا نہیں کیا میں نے تجھے خوش دیکھنے کے لیے؟"

میں نے کہا "شادو۔۔۔ یہی موقع ہے۔ بعد میں تو کچھ نہیں کر سکے گی۔ ابھی یہ آدمی مجبور ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ زبردستی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تیرے انجکشن بھی تو لگوا دیا تھا اس نے۔ گولیاں بھی کھلا دی تھیں تجھے۔"

شادو نے روتے روتے اپنے آپ سے کہا "مگر شادی زبردستی کیسے ہو سکتی ہے۔ زبردستی کی میرے ساتھ تو میں زہر کھا لوں گی۔ تیزاب پی جاؤں گی۔ مرنے کے بہت طریقے ہیں۔"

شاہ جی نے سہلایا "نہیں شادو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر تو اتنا ہی پسند کرتی ہے ناصر کو۔ میرا خیال تھا کہ ابھی اس کی شادی کی عمر نہیں ہوئی۔"

اس وقت شادو نے ایک بے وقوفی کی بات کہی "یہ تو ٹھیک ہے ابا۔۔۔"

میں نے بگڑ کے کہا "کیا ٹھیک ہے۔ کون کہتا ہے کہ میں شادی نہیں کر سکتا۔"

اس نے ڈر کے کہا "تو نے کہا بھی تھا۔۔۔ کہ ہم چار سال

بعد شادی کریں گے۔ جب تیری عمر بائیس سال ہو جائے گی اور میری چھبیس۔"

شاہ جی کا اعتماد بحال ہو گیا "بڑا اچھا فیصلہ تھا تمہارا۔ بائیس سال سے پہلے شادی کرنی بھی نہیں چاہیے۔ شادو کو چار سال بڑا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ناصر کی عمر کم ہے ابھی۔ مرد کے لیے شادی کی عمر بائیس کے بعد ہی شروع ہوتی ہے مگر لڑکیوں کی شادی بائیس تک ہو جائے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

"کیا ٹھیک رہتا ہے۔ پہلے بارہ تیرا سال کی عمر میں لڑکیاں بیاہ دی جاتی تھیں اور آج بھی انڈیا پاکستان کے بہت سے علاقوں میں ایسا ہوتا ہے۔ سولہ سال کا لڑکا گھر سنبھال لیتا ہے۔"

"تو صحیح سمجھتا ہے اسے؟ کم عمری کی شادی سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات ہے تجربے کی جو ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے صدیوں میں حاصل کیا تھا۔ ابھی تیری عمر ہے جدوجہد کی۔ ابھی سے شادی کر لے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چوبیس پچیس سال تک چار چھ بچوں کا باپ بن گیا تا تو جدوجہد کا حوصلہ ہی نہیں رہے گا۔ ذمے داریوں کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ذرا سوچ کہ ابھی تو کیا ہے' ابھی تو نے کیسں قدم رکھے ہی نہیں۔ جمانے کی بات دور کی ہے۔ ایک جگہ نہیں دس جگہ کوشش کرے گا تو کہیں قسمت کی مہربانی سے کوئی راستہ بن جائے گا۔ اس کے بعد تلاش کا مرحلہ گزر جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ محنت کرنے والا خود ترقی کرتا جاتا ہے۔"

شادو نے اچانک کہا "بابا بھیک کہتا ہے ناصر۔ ابھی سے اپنے پاؤں میں بیڑیاں مت ڈال ورنہ تیرے قدم کہیں جمنے سے پہلے رک جائیں گے۔"

"ایسی باتوں سے میں حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں شادو۔ کیا پہلے لوگ ترقی نہیں کرتے تھے جب ان کی شادی کم عمری میں ہو جاتی تھی اور شادی کا آدمی کے کام سے کیا تعلق۔ تو اچھی طرح جانتی ہے میرے عزائم کو۔ کوئی چیز میری منزل کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ ذمے داری بڑھتی ہے تو کام کی ضرورت اور لگن بھی بڑھ جاتی ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ بیویاں اپنا نصیب ساتھ لاتی ہیں مگر میں یہاں بحث کرنے اور دلیل دینے نہیں' تجھے لینے آیا تھا۔"

شاہ جی نے کہا "لے جانا ہے تو عزت کے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا۔ مجھے کیا اگر تم آج ہی شادی کرنا چاہتے ہو۔ تو خود چار سال انتظار کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے تجربے کی بات سمجھائی تھی۔ ایسے انتظار کون کر سکتا ہے' ساتھ رہتے ہوئے۔ خواہ مخواہ گناہگار بنو گے اور مجرم کہلاؤ گے۔ چھپ چھپ کے اور دنیا سے ڈر کے رہو گے۔ رسوائی ہو گی میری بھی اور تم خود اپنی نظر میں گر جاؤ گے۔"

میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی "شادو۔ سیدھا صاف جواب دے مجھے۔ تو میرے ساتھ چل رہی ہے یا نہیں' ابھی۔۔۔ اسی وقت۔"

شاہ جی نے محسوس کیا ہو گا کہ بازی اس نے تقریباً جیت لی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "جا۔۔۔ چلی جا شادو اس پاگل کے ساتھ۔ میں تیرا راستہ نہیں روکوں گا۔ جو نصیب میں ہو' وہ ہو کر رہتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تیری شادی ہو عزت آبرو کے ساتھ' دھوم دھام سے۔"

"بھاڑ میں جائے دھوم دھام۔ یہ سب چکربازی کی باتیں ہیں شادو۔ بعد میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ شاہ جی میرا دشمن ہو جائے گا۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ اس کے چیلے چانٹے جو سارے شہر میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں' ان میں چور ڈاکو بھی ہیں۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ پولیس مروا دے گی مجھے۔ کیا تو خود نہیں جانتی کہ شاہ جی سے دشمنی کر کے میں کہیں نہیں جی سکتا۔ یہ مجھے بھی غائب کرا دے گا اور تجھے بھی۔ آج میں چلا گیا تو ادھر لوٹ کے نہیں آ سکوں گا۔ ہم پھر اس دنیا میں کبھی نہیں مل سکیں گے شادو۔ اس کی باتوں میں مت آ۔ سوچ میں مت پڑ۔ بس اٹھ اور چل میرے ساتھ۔ بے وفائی مت کر مجھ سے۔ میں جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا ہوں شادو۔"

یہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے میری آخری کوشش تھی جو کامیاب رہی۔ شادو کھڑی ہو گئی "چل پھر کہاں جانا ہے۔۔۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔"

شاہ جی کی جیتی ہوئی بازی ہارنے سے حالت غیر ہو گئی۔ "شادو۔ پاگل مت بن۔ میری بات مان لے۔"

میں نے کہا "یہی پاگل پن ہماری زندگی ہے شاہ جی۔ تیری باتوں سے صاف مکاری کی بو آتی ہے۔ ہمارا راستہ مت روک۔ شادو' تیرے قول پر میں جان دینے آیا تھا' تو نے قول نہ نبھایا تو میں اپنی جان ایک کر دوں گا۔"

"میں نے کہا نا کہ چل" شادو نے کہا اور ایک بیگ اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

"ایسے ہی جائے گی تو۔ تجھے کچھ بھی نہیں لینا ہے یہاں سے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھا وہ بیگ میں ہے" وہ بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ جی کی صورت قابل رحم ہوگئی "یہ سب تیرا ہی تھا شاہد۔ تیرے لیے ہی سب کچھ کیا تھا میں نے۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس میں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتی۔ میں عزت اور آزادی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ یہ جھوٹے اور مکار فقیروں کی کمائی کا صدقہ ہے شاہ جی۔ حق حلال کی اور محنت کی کمائی میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے اپنے باپ سے شرم آتی ہے۔ نفرت ہونے لگتی ہے۔ نفرت ہونے لگتی ہے یہ سوچ کر کہ میں کیا ہوں' یہ عیش' آرام' یہ ٹھاٹ باٹ۔ روپیہ پیسہ سب بے کار ہے میرے لیے۔ میں فقیر ہوں' فقیر کی بیٹی کہلاتی ہوں' فقیروں کی کمائی کھاتی ہوں۔"

"میں تجھے نہیں جانے دوں گا شاہد۔ تیرا دماغ خراب کردیا ہے اس لڑکے نے۔ اس نے دھوکا دیا تجھے تو کیا کرے گی؟ ایسے چاہنے والے دو دن میں بھاگ جاتے ہیں ساتھ چھوڑ کے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ تو کون سی بیاہ کے کسی عزت دار گھر میں جارہی ہے جو عزت کی بات کرتی ہے" شاہ جی نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے ساتھ مرنے جینے کی قسم کھائی تھی۔ ہم جہاں رہیں گے جس حال میں ہوں گے' خوش رہیں گے۔ ہم محبت کے پجاری ہیں' بھکاری نہیں۔"

شاہ جی چلانے لگا "سب فضول باتیں ہیں۔ چار دن میں ساری محبت ختم ہوجائے گی تو پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا صرف پیسے سے ہے۔ پیسہ نہ ہو تو زندگی عذاب ہوجاتی ہے۔ محبت پیٹ نہیں بھرتی۔ بچے نہیں پالتی۔ ضروریات پوری نہیں کرتی۔ ساری دنیا پاگل نہیں ہے کہ پیسے کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ سب کو تجھی اور کار کے خواب دیکھتے ہیں محبت کے خواب نہیں۔"

میں نے اطمینان سے کہا "تو کیا سمجھتا ہے کہ میں بھوکے پیٹ لیٹا ہوا خواب ہی دیکھتا رہوں گا۔ شاہد فاقے کرے گی میرے ساتھ؟ نہیں شاہ جی' آج بھی میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ میں شاہد کو آرام سے رکھوں گا۔ اسے وہ عزت ملے گی میرے ساتھ جو فقیروں کی دنیا میں تیرے جیسے لاکھوں کمانے والے نہیں دے سکتے کیونکہ خود ان کے پاس عزت نہیں ہوتی۔ عزت پیسے سے نہیں ملتی۔"

"یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ عزت صرف پیسے سے ملتی ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھے گا تو پتا چلے گا۔" شاہ جی نے کہا "حرام حلال کی کمائی کی باتیں وہی کرتے ہیں جن کے خوابوں کو تعبیر نہیں ملتی۔ یہ ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی' پروفیسر' شاعر' فنکار اور دانش ور' جھوٹی تسلی دیتے ہیں خود کو۔ سر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں کو ٹھی کار والوں کو۔ محنت کی عظمت کی بات کرتے ہیں۔ خود انہوں نے فرض کرلیا ہے کہ ان کے پاس عزت کی دولت ہے۔ دنیا انہیں جانتی بھی نہیں۔ کوئی پہچان بھی لے تو کیا۔ دنیا میں حکومت پیسے کی ہے۔ عزت پیسے کی ہے۔" شاہ جی نے شاہد کو روکنے کی آخری بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے شاہد کا ہاتھ پکڑا "چلو شاہد جی۔ کیا فائدہ وقت ضائع کرنے سے۔"

شاہ جی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "چھوڑ دے اس کا ہاتھ۔" اس نے چیخ کے مجھے گالی دی۔

میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا "تو مرنا چاہتا ہے؟ ہٹ جا میرے سامنے سے ورنہ میں گولی مار دوں گا شاہ جی اور یہ مت سمجھنا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ کوئی گواہ نہیں ہے اس وقت۔ کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا میں۔"

شاید میرے لہجے سے اور میری صورت سے اس نے اندازہ کرلیا کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں کرسکتا ہوں۔ وہ پیچھے ہٹ گیا "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں کمینے' حرامی کتے۔ میں دیکھتا ہوں تو مجھ سے بچ کے کہاں جاتا ہے۔ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے میرے لیے۔ میں تلاش کرلوں گا تجھے۔ اور شاہد' تیرے سامنے میں نے اس کے ٹکڑے کرکے کتوں کو نہ ڈالے تو میرا نام شاہ جی نہیں۔ تو مجھ پر تھوک کے جارہی ہے۔ اپنے باپ کے منہ پر۔"

شاہد کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔

"تمہاری بیٹی نہیں ہوں میں شاہ جی۔ میں نے کبھی تمہیں اپنا باپ نہیں سمجھا اس لیے کہ تم میرے باپ نہیں تھے۔ مجھے معلوم ہے سب۔"

شاہ جی پر ان الفاظ کا وہ اثر ہوا جو کسی دلیل کا نہیں ہوا تھا اور ریوالور کی نال سے جھانکنے والی موت سے آنکھیں چار کرکے نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا اور پلک جھپکائے بغیر شاہد کو دیکھتا رہا۔ "کیا معلوم ہے تجھے شاہد؟"

"تم نے اپنی بیوی کو قتل کرادیا تھا۔ میں اس عورت کی بیٹی ہوں جس کو تم چاہتے تھے۔ اس کی تصویر تمہارے کپڑوں کی الماری میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے میرے باپ کو بھی قتل کرادیا تھا۔ میری ماں کو بیوہ کردیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت مگر جو بات بہت سے لوگ جانتے ہوں' وہ چھپی نہیں رہ سکتی۔ تمہارے بارے میں سب کچھ

مجھے لوگوں سے معلوم ہوا۔ تمہارا مجھ پر بس اتنا ہی حق ہے کہ تم نے میری پرورش کی۔ مگر جو حق تم نے چھین لیا تھا' میرے باپ کو قتل کرکے' اس کے بعد تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ تمہارا ساتھ دینے والی خود میری ماں نہ ہوتی تو میں تمہیں معاف نہ کرتی شاہ جی لیکن یہ سب معلوم ہوجانے کے بعد میں یہاں مجبوری میں رہی۔ میرا تمہارا یہ رشتہ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ یہ خون کی بُو دینے والا رشتہ تھا۔ دہرے خون کے رنگ میں ڈوبا ہوا رشتہ تھا۔ تمہارا کوئی اخلاقی حق نہیں بنتا مجھ پر۔ قانونی حق کی بات مت کرنا۔ تم مجھے مروا سکتے ہو' اپنا نہیں سکتے شاہ جی۔"

اب اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دروازے سے گزر کے باہر آگئے۔ میں نے اپنا رخ دروازے کی طرف رکھا اور الٹے پاؤں چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاہ جی ہمارے پیچھے دوڑے گا۔ وہ ریوالور نکال لے گا اور اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کی آخری کوشش ضرور کرے گا مگر وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ شاہد اب واپس نہیں آئے گی .... خود فریبی کا کھیل ختم ہوگیا تھا۔ کھیل تو بہت پہلے ہی ختم ہوگیا تھا جب برسوں نادانی اور لاعلمی کے پردے میں چھپی رہنے والی حقیقت نے خود کو شاہد پر آشکار کردیا تھا لیکن اس کے بعد شاہد موت یا مجبوری میں انجان بن کے رہی۔ اب وہ سچ سے انکار کرتا بھی تو کیسے۔ شاہد نے جھوٹ کا رشتہ ہی ختم کردیا تھا۔

زینے پر اترنے سے پہلے میں نے دروازے کی کنڈی باہر سے لگادی۔ میرا ذہن اور اعصاب میرے قابو میں نہیں تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ایک مبہم سی امید تھی کہ شاید تقدیر مہربان ہو تو شاہد سے ملاقات ہوجائے یا اس کی ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ یہ خیال نہیں تھا کہ اچانک فیصلے کی گھڑی آجائے گی۔ ریوالور ساتھ ہونے کے باوجود میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میں اس کی مدد سے شاہد کو چھین لاؤں گا اور شاہ جی منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ شروع سے ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ جب بھی موقع ملا' ہم خاموشی سے غائب ہوجائیں گے۔ شاہ جی کی نظروں کے سامنے اس کی دشمنی کو للکار کے بزورِ بازو شاہد کو ساتھ لانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر یہ سب اچانک ہوگیا تھا اور اب وہی آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے والی صورتِ حال تھی۔ عشق بے خطر آگ میں کود پڑا تھا مگر عقل محوِ تماشا نہیں تھی۔ یہ احساس غالب تھا کہ میری کامیابی کا اگلا لمحہ شاہ جی کی چالاکی' عیاری اور تجربے کاری سے ناکامی میں بدل سکتا ہے۔

میں نے شاہد کا ہاتھ پکڑا تو وہ بالکل سرد تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا رنگ غالب تھا۔ عشق کی سرشاری کا نشہ' ذاتی خود اعتمادی سے حاصل ہونے والی آزادی پر غرور یا خوابوں کی تعبیر کی راہ پر پہلا قدم اٹھانے کی خوشی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا شوخ' متبسم اور جذبات کی آنچ سے روشن چہرہ بے یقینی کے شکوک اور اندیشوں کے ڈراؤنے پن کی تصویر نظر آتا تھا۔ وہ اندر سے بھی کانپ رہی تھی اور اس بچے کی طرح سہمی ہوئی تھی جو گھر کی محفوظ پناہ گاہ سے نکل کے پورا دن شہر کی رونق اور رنگینی میں کھویا رہے مگر رات آئے تو ایک جنگل کی تاریک رات میں ڈرانے والے سارے خیالات کی یلغار کے سامنے وہ اکیلا ہو اور خوف کا کمزور کرنے والا احساس اسے ہر سمت سے محصور کرلے۔

آخری زینے سے احاطے کے گیٹ تک بیس فٹ کا راستہ پل صراط کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کے پیچھے دیکھا' اوپر والی منزل کی ہر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاہ جی کسی بھی کھڑکی سے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے اپنا ریوالور اٹھانے کے لیے بہت وقت مل گیا تھا۔ اس کے نشانے کی مہارت پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پچیس تیس فٹ سے وہ مجھے جہاں چاہتا گولی مار سکتا تھا۔ صرف ایک بار ٹریگر پر اس کی انگلی کی حرکت سے میرے سارے سجنی بھرے وعدے اور محبت کے خواب ختم ہوجاتے۔ ہم جو جذبات کے رنگین کیمس بھرے غباروں کو تھام کے آسمانوں میں اڑنا چاہتے تھے' بے رحم حقائق کی سنگلاخ زمین پر آگرتے۔

یہ زندہ رہنے کی خواہش اور بقا کی جدوجہد کو پُرخطر حالات میں غیر معمولی قوت فراہم کرنے والی حیوانی جبلت تھی جس نے مجھے خوف سے بے نیاز کردیا اور مجھے نیا حوصلہ عطا کیا۔ موت سامنے ہو اور فرار کے راستے مسدود ہوں تو بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔

میں نے شاہد کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما "دیکھو گیٹ تک ہم زندہ سلامت پہنچ گئے تو پھر شاہ جی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

شاہد میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے مسکرائی "ڈرمت ناصر۔ میں تیرے ساتھ ہوں' چل۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچا اور بھاگا۔ میرے کانوں نے ایک دھماکا سنا۔ گولی شاید میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری تھی کہ میرے کان سن ہوگئے۔ رکنے اور پلٹ کر دیکھنے کا مجھے خیال تک نہیں آیا۔ میں نے چشمِ تصور سے شاہ جی کو کھڑکی سے ہاتھ نکال کے دوسری بار نشانہ لیتے دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اور تیز بھاگا۔ شادو نے خود بخود میری تیز رفتاری کا ساتھ دیا۔ وہ لڑکھڑائے اور گرے بغیر مجھ سے منسلک رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ فائر کی آواز کے بعد کوئی گرتا یا چیخ مارتا تو پتا نہیں بغیر معلوم ہو جاتا کہ گولی کس کو لگی ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب صرف چند قدم کی بات تھی لیکن مجھے اپنا بیگ بھی اٹھانا تھا۔ میں ایک جست میں بیگ کے ساتھ لوٹا پھر اچانک میں نے خود کو شادو کے ساتھ گیٹ کے باہر پایا اور مجھے یقین آیا کہ دوسری گولی کو بھی دست اجل نے اِدھر اُدھر کر دیا تھا کیونکہ خدا کی عطا کردہ زندگی کی مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔

شادو لرز رہی تھی اور اس کی سانس بُری طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا "آہستہ آہستہ شادو جی۔ بس اب خطرے کی بات نہیں رہی۔"

اس نے بڑی مشکل سے سر ہلایا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے اور منہ سے کچھ کہنے کی طاقت نہیں تھی۔

ہم سڑک پر آ کے بھی بھاگتے رہتے تو سب دیکھنے والوں کی نظر میں مشکوک ہو جاتے۔ تیز تیز چلتے ہوئے میں نے آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے دور دور تک کوئی رکشا یا تانگا نظر نہیں آیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شادو کسی وقت بھی گر کے بے ہوش ہو جائے گی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا شادو" میں نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں رکھ کے پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کی "ہم یہاں سے نکل جائیں۔"

اس کے لبوں پر ایک دبی دبی مسکراہٹ ایسے نمودار ہوئی جیسے خوشی میں آنسو کا ایک قطرہ بے اختیار آنکھوں سے نکل آتا ہے۔ یہ مسکراہٹ بھی امید' روشنی دینے والی تھی۔ جیسے بادلوں سے بھرے آسمان کے آخری کنارے پر پل بھر کے لیے نمودار ہونے والی سورج کی کرن جو صبح کی خبر دیتی ہے' جو بتاتی ہے کہ رات ختم ہو گئی۔

جیسے جیسے اس گھر سے فاصلہ بڑھتا گیا میرا خوف کم ہوتا گیا۔ میرے اور شادو کی حالت میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ ہمارے قدم زیادہ سکون اور اعتماد کے ساتھ زمین پر پڑنے لگے اور ہمارا اپنے مستقبل کے خوابوں پر یقین پھر بحال ہونے لگا۔ ہم بار بار مڑ کے دیکھنے کے باوجود اندر سے پھوٹنے والی خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے گئے۔ خاموشی کی زبان میں چلانے لگے۔ ہا' ہم کامیاب ہوئے۔ ہم نے وہ کر دکھایا جو چاہا اور جو سراب تھا اسے حقیقت بنا دیا۔ میرا ذہن دباؤ سے آزاد ہونے لگا اور دہشت کا بھلا جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا' ایسے ختم ہونے لگا جیسے سورج سے نکل آنے کے بعد دھوپ میں دھند تحلیل ہونے لگتی ہے۔

موڑ کے بعد مجھے ایک رکشا نظر آیا تو میں ہاتھ ہلاتا اس کے پیچھے دوڑا اور نہ جانے کیا سوچ کے گولی کی رفتار سے جانے والے رکشا ڈرائیور نے بریک لگا دیے۔ میں کچھ کہے بغیر شادو کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے جو ہیرو کوارٹر جانے کا کہا تھا مگر آدھے راستے میں ... مال پر رکشے نے ایک سائیکل والے سے ہو گئی۔ سائیکل والا معمولی زخمی ہوا تھا مگر اس نے سائیکل کا نقصان پورا کرنے کا مطالبہ کر کے مجمع اکٹھا کر لیا۔ یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ غلطی کس نے کی تھی مگر رائے عامہ سائیکل والے سے ہمدردی رکھتی تھی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ رکشا چھوڑ دیا جائے۔ یہ جھگڑا جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اور شادو بس اسٹاپ پر کھڑے ہو گئے۔

میں نے کہا "شادو۔ ڈرکی اب کوئی بات نہیں۔"

"ایسا تم سوچ سکتے ہو" اس نے کہا۔

"کیوں۔ تمہیں کس کا ڈر ہے' تمہارے ساتھ میں ہوں۔"

"ڈر بھی تو اسی کا ہے کہ تم نے ساتھ چھوڑ دیا پھر۔"

میں نے کہا "پاگل۔ بھروسا نہیں ہے ابھی تک مجھ پر۔ تم نے جو چاہا میں نے وہی کیا۔ حالانکہ آسان کچھ بھی نہیں تھا۔"

"تم مرد ہو۔ اکیلے بھی جی سکتے ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں رہا۔ ایک گھر تھا جو میں نے چھوڑ دیا۔ میں بالکل اکیلی ہوں ناصر۔"

"میرے ساتھ بھی اکیلا سمجھتی ہو خود کو۔"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ تم بعد میں پچھتانے نہ لگو۔ مجھے اپنے پاؤں کی زنجیر نہ سمجھنے لگو۔ تمہارے ارادے بہت بلند ہیں اور منزل بہت آگے۔ پتا نہیں میں تمہاری تیز رفتاری کا ساتھ دے پاؤں گی یا نہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں ذہنی انتشار میں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ اب سوچ سوچ کے پریشان ہونا کیسا۔ میری اور تمہاری منزل الگ تو نہیں ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ آگے دیکھو۔ آنے والے اچھے وقت کے بارے میں سوچو اور خوش ہو جاؤ" میں نے کہا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے ناصر؟"

"اپنے گھر۔ میں ایسے ہی تو نہیں آ گیا تھا تمہیں لینے۔"

"میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ ایسا سوچتی ضرور تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ یہ سب اچانک ہو جائے گا" وہ بولی۔

"اسی لیے تم کچھ بھی ساتھ نہیں لائیں۔ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں۔"

اس نے کہا "وہاں سے کچھ لانا نہیں چاہتی تھی میں۔ لاتی بھی کیسے' سوچا تھا ضروری چیزیں لے لوں گی مگر ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"زیور یا نقد پیسہ نہ سہی' تمہارے کاغذات تو ہوں گے۔"

"کیسے کاغذات" وہ بولی "میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا۔ وہ پھر مل جائے گا۔ چیک بک بھی دوسری لے لوں گی مگر ناصر۔ کس کا ہے وہ مکان جہاں تم مجھے لے جا کے رکھو گے اور کون ہو گا وہاں؟"

"کوئی نہیں۔ بس میں اور تم۔" میں نے کہا "اب تم سوچ رہی ہو گی کہ اکیلے ہم کیسے رہیں گے؟"

"سوچنا تو پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "مت سوچو۔ ہمارے ساتھ ہیرا رانجھا ہوں گے۔ ایک ہی گھر میں لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا۔ نہیں آئی بات سمجھ میں؟"

"شاہ جی کے سامنے کیا کہہ رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ سب بھی ہو گا' گھبراؤ نہیں۔ پہلے چل کے گھر دیکھو۔ گھر میں ابھی کچھ نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو پہننے کے لیے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ سب خریدنا پڑے گا۔"

"چلو پھر یہاں کیوں کھڑے ہو؟" وہ بولی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ رئیس کو دیکھ لوں۔ وہ اسپتال میں ہے۔"

"کیوں؟ اسے کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "اس کو میرے جرم کی سزا دی تھی شاہ جی نے کیونکہ وہ میرا دوست تھا۔ صبح سے انتظار کر رہا ہو گا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کے اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔"

"وہی ڈاکٹر مشہود... جن کے ساتھ تم رہتے تھے؟"

"ہاں۔ اس اسپتال میں ان کا بہت رعب ہے۔ رئیس ہم فقیر محمد لکھوایا تھا' شاہ جی کے ڈر سے۔ چلو پیدل چلتے ہیں۔ اسپتال سامنے ہی ہے۔"

رئیس میرے ساتھ شادو کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "ناصر... آپ آئے ہو۔ میری خیریت معلوم کرنے۔"

شادو اس کے بیڈ پر پیروں کی طرف بیٹھ گئی "کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟"

"میں... مجھے کیا ہوا جی۔ اپن تو عادی ہیں تھوڑی بہت جھاڑ پھٹک کے۔ یہ اپنا یار زبردستی یہاں لے آیا اور لٹا دیا بستر پر۔ دو چار دن میں ایسے ہی ٹھیک ہو جاتا۔ لیٹ لیٹ کے بور ہو گیا جی۔"

"اچھا ہے یہاں آرام بھی ملے گا اور علاج بھی ٹھیک سے ہو گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جی مگر میں اب بالکل ٹھیک ہوں" وہ بولا۔

میں نے کہا "رئیس۔ صبح ایس ڈی اے والوں نے ساری آبادی پر بلڈوزر چلا دیا۔ سارے گھر گرا دیے۔"

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا "یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ ہیر رانجھا کا کیا ہوا؟"

"وہی جو سب کا ہوا۔ تھوڑا بہت سامان اٹھا کے نکل آئے۔ میں نے تیرا جو سامان تھا وہ سب نکال لیا۔ سوائے اس بیش قیمت فرنیچر کے۔"

وہ ہنسنے لگا "پیارے' نکالنے کو کیا تھا وہاں۔ اے سی' فریج۔ ٹی وی اور قالین۔ اب وہ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "میں نے مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ شام کو چابی مل جائے گی۔ اب ہم سب ساتھ رہیں گے۔"

وہ کچھ کنفیوز ہوا "ہم سب... یعنی..."

"ہیر رانجھا' شادو اور میں... اور تو... کمرے دو ہی ہیں مگر پانچ افراد رہ سکتے ہیں۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔"

"کیا... کیا کہا تو نے؟ ہم سب..." اس نے پہلے شادو اور پھر میری طرف ایسے دیکھا جیسے اپنی سماعت کے فتور پر شرمندہ ہو "ہم ایک گھر میں رہیں گے اور آپا جی...؟"

شادو تھوڑا سا شرما کے مسکرائی "کیا تم مجھے اپنے گھر میں نہیں رکھو گے؟ اگر میں بھی رہوں تمہارے ساتھ تو حرج ہے کوئی؟"

"حرج کیسا جی... لیکن آپ... اور شاہ جی...؟" وہ ہکلانے لگا۔

میں نے کہا "بھول جا شاہ جی کو۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اپنی دنیا بسائیں گے' ان فقیروں کی نگری سے الگ۔ عزت سے رہیں گے۔"

"مگر پیارے' آپا جی... ان کو عادت نہیں ہے... اپنی زندگی کا اسٹائل اور ہے۔ تو جانتا ہے' بہت تکلیف ہو گی انہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شاہدو نے شاہ جی کا وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب جو میرا گھر ہے' وہی شاہدو کا گھر ہوگا۔ کیوں شاہدو؟" میں نے کہا۔

شاہدو جواب دینے کے بجائے دوسری طرف دیکھنے لگی مگر اس کے لبوں کی مسکراہٹ صاف اقرار کرتی محسوس ہوتی تھی۔

"یار ناصر' کہاں ہے وہ گھر' مجھے ابھی لے چل اپنے ساتھ۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آتا یارے!" وہ بستر سے اترنے لگا۔

میں نے اسے ڈانٹا "یہ کیا کر رہا ہے تُو؟"

"ابے ہم ساتھ چلیں گے۔ بس کہہ دیا ناہم نے" وہ چپل پہن کے کھڑا ہو گیا۔

"ایسے کیسے چلیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں گے تو چھٹی ملے گی یہاں سے۔ اس طرح کوئی نہیں بھاگنے دے گا۔"

"یار' ہم کیا کچھ چرا کے بھاگ رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کون سالا ہمیں روکتا ہے۔ ان کے کپڑے ہی پہن رکھے ہیں نا۔ وہ چھوڑ جاتے ہیں اور بتا جاتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔ زیادہ ہمیں چڑکی تو اللہ قسم ہاتھ ماردیں گے۔ لو یہ کوئی زبردستی ہے۔ ہم ٹھیک ہیں اور گھر جانا چاہتے ہیں تو روکنے کا کیا سوال۔ اسپتال ہے یا جیل خانہ۔۔۔" رئیس بگڑ گیا۔

میں نے ہنس کے کہا "اچھا بھائی چل۔ تجھ سے کون بحث کرے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بتا دیتا ہوں فون کر کے تاکہ کوئی جھگڑا نہ ہو۔"

رئیس اس خیال سے بہت EXCITED تھا کہ اب ہم ایک گھر میں' ایک فیملی کی طرح رہیں گے۔ اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور شاید خیالات کی پرواز زبان کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ ناقابلِ یقین تھا اور ناقابلِ تصور بھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں آنے والے دنوں کی نقشہ کشی کر رہا تھا۔ ہم کیا کریں گے' کیسے کریں گے۔ کیسے رہیں گے۔ "قسم اللہ پاک کی۔ اپنا یہ پہلا گھر ہوگا جو بالکل اپنا ہوگا' ہوگا نا۔ جہاں کوئی پوچھنے والا ہوگا کہ رئیس خاں کہاں گئے تھے' کیوں گئے تھے اور رئیس خاں کی بولتی بند ہو جائے گی۔ جھوٹ بولیں گے جان چھڑانے کو' ہاتھ جوڑیں گے کہ بھائی' قسم سے پھر دیر نہیں ہوگی۔ آئندہ جہاں جاؤں گا بتا کے جاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "بھائی پہلے ہی بنالی' ہے نا پاگل۔"

"پیارے جو ہے سو ہے۔ آج نہیں تو کل ایسا ہوگا پھر ٹیک کام میں دیر کیسی۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "تو میرا بھائی تو یہ بھائی۔"

شاہدو نے مصنوعی خفگی سے کہا "رئیس۔ میں ماروں گی۔"

"مارو بھابی' مارو۔ پہلے کی مار کچھ اور تھی' قسم اللہ کی اب تو جی چاہتا ہے مار کھانے کو۔ بڑے نصیبوں والے ہوتے ہیں جن کو ماں یا بڑی بہن اور بھابی کی مار پڑتی ہے۔ بڑی برکت ملتی ہے اس مار سے۔۔۔ ہم نے کہہ دیا کہ بھابی تو بس بھابی' اب ہماری زبان کاٹ دو بے شک۔ ہماری زبان سے کچھ اور نہیں نکلے گا۔"

رکشے میں بیٹھ کے بھی وہ باز نہیں آیا۔ "یار ناصر! بڑا قسمت والا ہوں میں۔ بھائی بھی مل گیا بھابی بھی مل گئی۔ ایک وہ ہیرے' قسم اللہ کی بالکل اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہے۔ کرایہ لینا اس کی مجبوری تھا۔ زبان کی تیز ہے ذرا مگر دل کی بڑی کھری ہے۔ بڑی کوشش کی پیارے اس نے کہ ہم سدھر جائیں مگر ہم ٹھہرے کتے کی دم' ٹیڑھے تھے تو ٹیڑھے ہی رہے مگر اب دو گنی شد ایک شد۔"

میں نے کہا "یک نہ شد دو شد۔"

"ابے ہاں وہی' ہم نے ہمیشہ سے یہی سنا تھا۔ ایک بڑی بہن اور ایک بھابی۔ دونوں مل کے اور مار مار کے رئیس خاں کو گیدڑ کی طرح سیدھا کر دیں گی اور پیارے اب ذمے داری ہوگی گھر کی تو سب پرانے کرتوت چھوڑنے پڑیں گے۔ تیری بھی آزادی ختم اور اپنی بھی۔"

شاہدو نے کہا "بڑی پسند تھی یہ آزاد زندگی۔"

وہ ہنسا "قسم اللہ کی بھابی۔ اب تو دل بھر گیا ہے اس سے بھی۔ روز کھانی پڑے بریانی تو وہ بھی زہر لگنے لگتی ہے۔ اب تو جی چاہتا تھا کہ تیرے گھر جائیں بدھو لوٹ کے تو۔۔۔ دال چاول ملیں' گرم گرم روٹی ہو توے کی اور کوئی پوچھنے والا ہو کہ آج کیا کھاؤ گے رات کو۔ کیا پسند ہے تمہیں۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ۔۔۔ ویسی مکھن کے ساتھ۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ ایسے نخرے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ کرلے تُو بھی شادی۔۔۔"

اس نے سینے پر ہاتھ مارا "ہائے۔ کیا بات کہہ دی تُو نے پیارے۔ یہ بھی کوئی چاہنے سے ہونے والی بات ہے۔ جوڑے اوپر بنتے ہیں اللہ میاں کے پاس۔ اپنا جوڑا تو اس نے بنایا ہی نہیں ہوگا شکل دیکھ کے مگر کیا پتا' اپنے جیسی کوئی بدبخت ہو کہیں۔ اسے ڈھونڈنا ہمارا کام ہے کیا؟ ابے یہ کام کرتی ہیں ماں' بہنیں اور وہ نہ ہوں تو بھابیاں۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا "ابے یار' اتنی مار کھائی ہے تمہاری خاطر شاہ جی سے۔ سالے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

مارنے میں۔ بڑی جھوٹی قسمیں کھائیں تو جان چھوٹی۔ تم اتنا بھی نہیں کرو گے ہمارے لیے۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کر۔ تیرا گھر ہم بسائیں گے رئیس مگر دیکھو' ابھی شادی تو نہیں کی ناہم نے۔ آپس کی بات اور ہے۔ دنیا کے سامنے تیرا شاہدو کو بھابی کہنا ٹھیک نہیں۔ ابھی وہی ٹھیک ہے' آپا جی!"

وہ اداس نظر آنے لگا "کب کرو گے تم شادی؟ اور شادی سے پہلے۔۔۔ ایک ہی گھر میں کیسے رہو گے' کوئی اچھی بات تو نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "تُو جو ہوگا ساتھ۔ ہیرا رانجھا ہوں گے۔"

اس نے میری دلیل سے اتفاق نہیں کیا مگر خاموش ہو گیا۔ میں نے رکشے کو سڑک کے کنارے روک لیا جہاں فٹ پاتھ پر سامان کے ساتھ ہیرا رانجھا بڑی قناعت سے بیٹھے تھے۔ رئیس کو دیکھتے ہی ہیر کو اپنے گھر کی بربادی کا المیہ یاد آگیا جیسے کسی کی موت پر لواحقین ہر آنے والے سے گلے مل کے روتے ہیں' ایسے ہی ہیر نے رو رو کے رئیس کو سب بتایا اور نامراد ایل ڈی اے صاحب کو کوستی رہی "اللہ کرے اس ایل ڈی اے صاحب کے گھر بجلی گرے۔ زلزلہ آئے صرف اس کے گھر میں۔ وے تیرا کھوہ نہ روہے' ایل ڈی اے صاحب!"

رئیس ہنسنے لگا "چل جانے دے میری بہن۔ اس غریب کو بددعاوے کے تجھے کیا ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں جو ہوا اچھا ہوا۔"

"ہائے ہائے۔ پاگل ہو گیا ہے تُو؟ کہتا ہے اچھا ہوا۔ کیا اچھا ہوا۔ اتنی مشکل سے گھر بنایا تھا" وہ بگڑ کے بولی۔

"اب اس سے اچھا بنے گا۔ وہاں سے نہ اٹھائے جاتے تو پڑے رہتے اسی گندخانے میں۔ روز تیرے دروازے پر کوئی۔۔۔"

"ہائے مجھے پتا چل جاتا ایک بار اس حرامی کا پھر ساری عمر لیٹرین جانے کے قابل نہ چھوڑتی۔" وہ غصے میں افسوس کرنے لگی۔

میں نے مسز رانجھا سے کہا "کوئی آیا تو نہیں تھا؟ کسی نے اعتراض تو نہیں کیا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"اعتراض تو کیا تھا" اس نے ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "ہم نے بتایا بھی کہ نادان' ہمیں پہچانو ہم کون ہیں۔ سمجھتا ہی نہیں تھا پھر ہیر نے اسے سمجھایا اپنی زبان میں تو بھاگ گیا۔"

ہیر اپنے نام پر متوجہ ہوئی "وے ناصر۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ شادی ہوئی نہیں اور لڑکی کو لے آیا اپنے ساتھ۔ معتبر ہے تو کیا' جب تک نکاح نہ ہو جائے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم یہ سب مجھے مت سمجھاؤ۔ میں جانتا ہوں' نکاح بھی ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

"لے میں فکر کیسے نہ کروں' آگے پیچھے کون ہے تمہارا؟ صاف سن لے تو بھی۔ ہوگا تو اپنے گھر میں ٹنڈے لاٹ کا پتر مگر ہاتھ توڑ دوں گی تیرے جو تو نے لڑکی کو چھوا۔ ہاں' نکاح میں کراؤں گی خود۔ یہ کوئی مخول ہے' نکاح کے بغیر بڑے گناہ کی بات ہے۔"

میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "یہاں آتے جاتے سب سن رہے ہیں۔ تم کو جو کرنا ہو کر لینا میری ماں۔ ابھی تو معاف کرو۔"

رئیس کو اور شاہدو کو ان کے پاس چھوڑ کے میرا ارادہ تھا کہ وکیل کے پاس جاؤں اور کرایہ داری کی رسمی کارروائی پوری کر کے مکان کی چابی لے آؤں مگر میرے منع کرنے کے باوجود رئیس دیوار پھاند کے اندر اترنے لگا "ابے یار' اب زبان سے بات ہو گئی تو تکھا پڑھی کا کیا ہے' ہوتی رہے گی۔ ہم کیا یہاں سڑک کے کنارے پڑے رہیں گے۔ قسم اللہ کی۔ اس سالے وکیل کی بہن یا بھائی ایسے ہی ٹپکی ہوتیں کہیں تو پتا چلتا۔ کہہ دینا اس سے کہ ہم زبان کے پکے ہیں اور شریف کے ساتھ شریف ہیں' حرامی کے ساتھ حرامی۔"

میں نے کہا "رئیس۔ یہ غلط ہے۔"

"ابے غلط تو سب ہے۔ ٹھیک کیا تھا ہمارے ساتھ پیارے۔ دنیا میں جو ہو رہا ہے' غلط ہو رہا ہے۔" اس نے کہا اور اندر غائب ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے پیچھے والا دروازہ کھول دیا "لو بھئی آجاؤ اللہ کا نام لے کر سارے۔ قسم اللہ کی بڑا برکت والا ہے آج کا دن۔ دیکھ بچھڑے ہوئے مل گئے۔ ایک گھر ایل ڈی اے صاحب نے اجاڑا تو اللہ نے دوسرا بسا دیا۔ سارے کام ٹھیک ہو گئے۔ کہاں کہاں سے لا کے اللہ نے ایک خاندان بنا دیا۔ کیا کہتے ہیں وہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا' بھاڑ مٹی نے کنبہ جوڑا۔"

"بھان متی نے۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"ابے ہاں وہی۔ تو پیارے اپنا کام کر۔ تیرے آنے تک ہم سب سیٹ کریں گے یہاں" رئیس نے کہا۔

"اور اگر اس وکیل کا ارادہ بدل گیا ہو۔ آج اس نے کہہ دیا کہ نہیں دیتا مکان کرائے پر۔ پھر؟"

"پھر کیا۔ بتا دینا اسے کہ قسم اللہ کی رئیس خاں کا بھائی ہوں اور تم نہیں جانتے ابھی کہ رئیس خاں کیا چیز ہیں۔ زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے کے پھرنے والے پر چاقو ایسے پھیرتے ہیں ہم کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ جسم الگ' جان الگ۔ سر الگ گردن الگ۔ ہم تو بیٹھ گئے ڈیرا ڈال کے پیارے۔ اب اٹھانا ہے تو کرے ہم سے تھانہ کچہری۔ ایسے ہم نکلنے والے نہیں ہیں۔ بھوت ہیں بھوت۔ وہ ایک ایک کر کے سامان اندر لاتا رہا اور بولتا رہا۔ ہیرا رانجھا بڑے شوق اور خوشی کے ساتھ اس پکے مکان کو دیکھتے رہے جس میں کچن اور باتھ روم بھی صاف تھے۔ نلکا بھی اندر تھا اور گلی بھی اتنی چوڑی تھی۔ وہ حسرت سے اپنے گھر کو یاد کر کے آہ بھرتے تھے اور پھر شاید یہ سوچنے لگتے تھے کہ اب ایسا ہی گھر بنائیں گے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب کرائے نامے پر دستخط کرا کے ہاشمی صاحب نے مکان کی چابی مجھے تھمادی۔ وہاں اس وکیل کو سب ہاشمی صاحب ہی کہہ رہے تھے۔

میں نے کہا "ہاشمی صاحب۔ آج میں کسی وجہ سے بینک نہیں جاسکا۔ آپ فقط چاہیں تو ایڈوانس کل لے لیں ورنہ چیک میں ابھی دے سکتا ہوں۔"

اس نے کہا "جیسی تمہاری مرضی۔ کل دے دینا۔ پہلے کہاں رہتے تھے تم؟"

میں نے کہا "تھی ایک بستی جسے آج صبح ایل ڈی اے صاحب نے اس کا نام و نشان مٹادیا۔"

میری پوری بات سن کے اس نے سر ہلایا "اچھا۔ یہ آج صبح کی بات ہے؟ وہ سب ناجائز قابضین تھے۔ کارروائی تو قانون کے مطابق ہوئی۔ سب کو نوٹس بہت پہلے دیے جاچکے تھے۔ ایسے ہی محض ووٹ پکے کرنے کے لیے ایک صوبائی اسمبلی کے نمائندے نے عدالت میں کیس کیا تھا اور کیس کو ایکشن تک کھینچا تھا مگر عدالت کسی اور کی زمین پر آپ کے قبضے کو جائز کیسے قرار دے سکتی ہے۔ ایک دن ایسا ہونا تھا۔"

میں نے کہا "پھر بھی افسوس کی بات ہے۔"

"ابھی تم سمجھتے نہیں۔ یہ سارا کھیل ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔" ہاشمی صاحب نے کہا "کچھ لوگ جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہیں۔ وہ سرکاری زمین پر قابضین کو بٹھاتے ہیں اور ان سے پیسے لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آرام سے رہو یہاں۔ ہمارے ہوتے تمہیں کون اٹھا سکتا ہے اس جگہ سے۔ دس ہزار روپے مرلے کی زمین کسی اختیار کے بغیر پانچ سو ہزار روپے مرلہ میں بیچ دیتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اشاپ پیپر پر خریدنے والے کو حقِ ملکیت تک بنادیتے ہیں۔ خریدنے والے غریب ان پڑھ خوش ہوجاتے ہیں کہ بڑی سستی زمین مل گئی اور وہ مالک ہوگئے۔"

ہاشمی صاحب کے ایک ماتحت نے کہا "رجسٹری ہوجاتی ہے ایسی جعلی دستاویزات کی سر۔"

ہاشمی صاحب نے اسے گھورا "بے وقوف آدمی رجسٹری سے کیا غیر قانونی دستاویزات کی حیثیت قانونی ہوجاتی ہے؟ بھئی رجسٹرار تو صرف اس لیے بیٹھا ہے کہ کوئی بے دستاویز اس کے سامنے پیش کی جائے کہ اسے رجسٹرڈ کردے۔ اسے کیا' وہ فیس اور اپنا نذرانہ لے کر ٹھپا لگادے گا۔ کس پر اپرنٹی' کس نے بیچی' کسے بیچی اور کیوں بیچی؟ غلط بیچی یا ٹھیک اس سے رجسٹرار کو کیا؟ بعد میں جھگڑا ہوتا ہے تو اس کی سے۔ عدالت میں فریقین خود نمٹا کریں۔"

میں نے کہا "سر۔ یہ بات آپ جانتے ہیں تو اور سب وکیل بھی جانتے ہوں گے۔ رجسٹرار سے عدالتوں کے ججوں تک سب کو معلوم ہوگی۔"

"ہاں۔ ہر بڑے شہر میں لینڈ مافیا ہے۔ زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے اور ان کے سودے کرنے والے۔"

"پھر آپ سب مل کے انہیں روکتے کیوں نہیں۔ یہ قانون کے خلاف ہے اگر۔"

وہ ہنسنے لگا "کیا قانون سے چوری ڈکیتی اور قتل جیسے جرائم ختم ہوگئے ہیں۔ قانون موجود ہے عصمت فروشی کے خلاف۔ جیز کے خلاف' گداگروں کے خلاف مگر جہاں قانون سے بڑی طاقت پیسہ بن جائے وہاں قانون ایک تماشا ہوجاتا ہے۔ جج کیا کرے؟ خود سارے شہر میں پھر کے دیکھتا رہے کہ قانون شکنی کہاں ہورہی ہے۔ جرم کہاں ہورہا ہے' کیسے ہورہا ہے اور کون کررہا ہے؟ وہ انصاف کرنا چھوڑ کے سراغ رساں بن جائے یا پولیس بن جائے۔ وہ تو بیٹھا ہے اپنی کرسی پر اور بس سنتا رہتا ہے سب کی۔ جھوٹ سچ کو سمجھنا ہے مگر حلف اٹھا کے بیان دینے والے کو خود جھوٹا کیسے کہہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"

وہ کچھ فارغ تھا اس لیے میری باتوں سے محظوظ ہونا رہا۔ "جب دنیا دیکھو کے تو پتا چل جائے گا برخوردار۔ اب تم یہی مثال لو۔ سرکاری زمین ایسے ہی کوئی نہیں بیچ سکتا۔ زمین بیچنے والے سب پہلے سے طے کرلیتے ہیں تاکہ سرکاری اہلکار خاموش بیٹھے رہیں۔ پولیس کچھ نہ بولے۔ ہزار ہوں تو ایک چوتھائی سرکاری محکمے والوں کے۔ ایل ڈی اے ہو یا ایل ایم سی۔ ایک چوتھائی پولیس کے۔ ایک چوتھائی دوسرے خدائی فوج داروں کے اور باقی چوتھائی اپنے۔ سب کو اپنا اپنا حصہ مل جاتا ہے تو خاموشی سے کئی سال بھی گزر جاتے ہیں اور اس سے پہلے ہی اخبار والے یا قانون کے خیر خواہ ہنگامہ کریں تو پھر

معاملہ عدالتی ہوجاتا ہے۔ وہاں وکیل اور عدالت کے پیش کار تک سب کماتے ہیں۔ غریب جھوٹی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور آخر میں ہوتا وہی ہے جو آج تمہارے ساتھ ہوا۔"

میں نے فوراً اپنی صفائی پیش کی "میں تو بس کرائے دار تھا۔ ویسے بھی وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔"

"یعنی لوگوں نے رہنے کے ساتھ کرائے پر بھی مکان اٹھا دیے تھے۔ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ۔" ہاشمی صاحب نے کہا "کون تھے تمہارے یہ لینڈ لارڈ۔"

میں نے اسے ہیر رانجھا کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔

"ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ ایک جگہ سے اٹھائے گئے تو دوسری جگہ بیٹھ گئے۔ بے گھر ہونا یا خانہ بربادی ان کے لیے کوئی غیر متوقع صدمے کی بات نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ ہوگا مگر وہ اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ دو چار ہزار خرچ کیے اور کہیں دو چار سال رہ لیے۔ نہ کرایہ دیا نہ کسی قسم کا ٹیکس۔ مفت کی بجلی پانی استعمال کرتے رہے۔ کرایہ دار رکھ لیا۔ جتنا خرچ کیا تھا اس سے سو گنا وصول ہوگیا۔ اب کہیں اور قسمت آزماتے ہیں۔"

میں نے کہا "بڑا اچھا ہوا کل آپ مل گئے اور خود آپ نے مکان کی بات کی ورنہ میں بھی آج بیٹھا رہتا سڑک پر۔"

"یہ ہیر رانجھا کیا لگتے ہیں تمہارے؟"

وہ کچھ ہنسا "بس میرے بڑے بھائی نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔"

"میرا مطلب تھا۔ اور لوگ نہیں ہیں۔ ماں باپ یا رشتے دار؟"

میں نے کہا "وہ جی نہیں۔ اب اللہ نے چاہا تو میں گھر بساؤں گا پہلے۔"

"بڑے بھائی سے پہلے؟" وہ مسکرایا "حق تو اسی کا بنتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ۔ دراصل۔ اس کا اصرار تھا اور اس نے قربانی دی میرے لیے۔ گھر ہے تو اس کی شادی بھی ہوجائے گی۔"

میں اس کا شکریہ ادا کر کے نکلا اور واپس پہنچا تو ہیر رانجھا نے گھر کو سیٹ کردیا تھا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ ہیر کے ساتھ شادو ایک کمرے میں سوئے گی۔ دوسرا حضرات کے لیے وقف تھا۔ کمرے چھوٹے تھے لیکن ان میں تین افراد زمین پر بستر بچھا کے آرام سے سوسکتے تھے۔ رئیس باہر برآمدے میں سونا چاہتا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ حفاظتی انتظامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھے۔ دو محبت کرنے والوں کو شرافت کے دائرے میں محدود کرنے کے لیے چنانچہ میں نے بے حد خلوص' محبت اور جذبۂ ایثار کے ساتھ رئیس سے کہا کہ بڑا بھائی برآمدے میں سوئے اور چھوٹا کمرے میں' ناممکن۔ اس نے جواب میں دلیل دی کہ مجھے ایک پُرتکلف بیڈ روم میں سونے کی عادت تھی اور وہ تو عادی ہے فٹ پاتھ یا پارک میں ہر جگہ سونے کا۔ مسٹر رانجھا نے غیر جانب داری اختیار کی کیونکہ ان کی توقعات کے خلاف ان کو میاں بیوی کی حیثیت سے الگ بیڈ روم دینے پر غور ہی نہیں کیا گیا تھا اور میں نے ان پر واضح کردیا تھا کہ وہ مہمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی مرضی نہیں چلے گی اور دوسری افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان کا قیام عارضی ہوگا۔ ایک دن مہمان دو دن مہمان' تیسرے دن بلائے جان۔ ان کا یہ اطمینان باقی نہ رہا تھا کہ بے گھر ہوتے ہی کسی پریشانی اور تردد کے بغیر رہائش کا مسئلہ حل ہوگیا۔

بالآخر میں نے اپنی ویٹو پاور استعمال کی "اے میرا گھر ہے' جہاں میرا جی چاہے گا سوجاؤں گا۔"

رئیس نے کہا "اے یہ چکر دینا کسی اور کو۔ جی تو چاہتا ہوگا تیرا کچھ اور پیارے مگر وہ جو ہیر ہے نا۔ اس نے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے شادو کو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہاں بھی وہی ظالم سماج۔"

ہیر جتنا زیادہ بولتی تھی' مسٹر رانجھا اتنے ہی خاموش طبع واقع ہوئے تھے۔ گھر کے اندر بھی ہیر ایک آمریت پسند منتظم تھی اور کسی سے مشورے کی قائل نہیں تھی۔ اس کی عمر تو شاید تیس سال ہوگی یا کچھ زیادہ مگر اپنے رویے سے وہ بہت بڑی بن گئی اور جب اس نے شادو کو قائل کرلیا کہ اسے ماسی کے تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میں بھی اسے ماسی ہیر کہنے پر مجبور ہوگیا۔

بڑی مستعدی سے ماسی ہیر نے سب کو حسبِ حیثیت سونے اوڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ فراہم کردیا۔ میرے حصے میں ایک دری آئی اور سرہانے کی جگہ میں نے تولیے کو تہ کر کے رکھا۔ وہ بھی نچا رہا تو میں نے تولیے میں اپنے میلے کپڑے لپیٹ کر تکیہ ایجاد کیا۔ شادو کچھ اداس کچھ پریشان کچھ خوش تو کچھ پشیمان یہ سب دیکھتی رہی اور خاموش نظروں سے خلا میں اپنے ماضی' حال اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے سوالوں کے جواب تلاش کرتی رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آج تو ٹیم نہیں ہے" ماسی ہیر نے آبادکاری کے مسئلے سے فراغت پاتے ہی کہا "چل راجے بازار سے کھانے کو کچھ لے آ۔ کڑی بھوکی ہے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ کڑی کی بڑی فکر ہے۔ منڈے کا کوئی خیال نہیں؟"

"لے۔۔۔ تو کیا بھوکا رہے گا۔ آج گزارہ کریں گے مگر کل سے گھر میں بچے کا کھانا۔ سچ بتاؤں گی میں کیا سامان لانا ہے۔ کچھ برتن پانڈے چاہئیں۔ چولہا ہے لیکن تیل چاہیے۔ اندر کی خیر ہے مگر باہر سونے والے کے لیے ایک چارپائی ضروری ہے۔ پتا نہیں نلکے میں پانی کب آتا ہے۔ ایک ڈرم بھا تگی ہونی چاہیے۔"

میں حیرانی سے اس کے احکامات سنتا رہا۔ شاید گھروں میں مائیں اسی طرح نظم و نسق چلاتی ہوں گی۔ باپ ایسے ہی خاموش بے نیازی سے سب سنتے ہوں گے اور بیٹا ہو اس ڈسپلن کو ناپسند کرنے کے باوجود قبول کرتے ہوں گے۔ یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا اس لیے کہ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ اپنا گھر ہونے کی خوشی' اطمینان' فخر اور طاقت کا احساس میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ زبان سے کہنے کی بات اور تھی۔ میرے لیے ماسی ہیر اور انکل رانجھا کو جلد یا بدیر اپنے گھر سے رخصت کرنا شاید ممکن نہیں ہوگا۔ صرف شاہو میرے اور رئیس کے وجود سے ایک گھریا خاندان کا تصور ادھورا رہ جائے گا۔ ہم اس مکان کی طرح ہوں گے جس کی دیواریں بھی ہوں' کھڑکیاں اور دروازے بھی اور باہر سے دیکھنے والے کو وہ مکمل بھی نظر آتا ہو مگر اس کی چھت نہ ہو۔ یہ خیال اندر جا کے آیا کہ یہ مکان نہیں' بس ایک احاطہ ہے۔ سر کے اوپر چھت کا تحفظ نہ ہو تو کھلے میدان میں اور احاطے میں کیا فرق۔

رات کے وقت برآمدے میں بیٹھ کے انکل رانجھا نے ہمیں اپنی زندگی کے حیرت انگیز تجربات اور اقوالِ زریں سنائے۔ ان کا ایک قولِ فیصل تھا کہ علم سب سے بڑی دولت نہیں ہے۔ عقل سے تجربہ اور تجربے سے عقل آتی ہے۔ وضاحت انہوں نے یوں کی کہ سب سے زیادہ علم ہوتا ہے سائیکلوپیڈیا..... میں مگر وہ عالم فاضل اور عاقل و بالغ نہیں ہوتے اور پڑھنے کو ایک ٹیپ ریکارڈر کیا نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزی' فارسی' لاطینی۔ سائنس کے فارمولے اور حکیم لقمان کے نسخے' مگر وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا۔ عاقل و عالم کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب وہ خود تھے۔ مجسم عقل اور علم۔ ان کی زندگی حصولِ علم اور تجربات میں گزری تھی۔ علم

انہوں نے مسجد کے مولوی رحمت اللہ سے آئن اسٹائن اور کوہ ہمالیہ کے برفانی غار میں تنک دھرنگ کچھ کھائے پیے بغیر ایک سو تیس سال کے سنیاسی باوا ٹنک سب سے حاصل کیا تھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے ریسرچ کر کے اس مطلب جدید کے ذریعے خلقِ خدا پر صحت اور شفا کے در کھول دیے تھے جس کو ایلوپیتھی' ہومیو پیتھی' آیورویدک اور یونانی طریقہ علاج کا نچوڑ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ خوش خبری سنانے کے بعد کہ چند روز میں وہ ایک دکان میں کلینک کا افتتاح کرنے والے ہیں۔ (ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ افتتاح وزیراعظم سے یا صدر سے کرایا جائے) وہ شب بخیر کہہ کے رخصت ہوئے تو میں نے اور رئیس نے سکون کا سانس لیا۔

"قسم اللہ کی۔ خود تو پاگل ہے سالا۔ ہمیں بھی کر دے گا اپنی باتوں سے" رئیس نے اس کے جاتے ہی سگریٹ جلائی۔

اندر سے ہیر نے آواز لگائی "او نامراد۔ چھوڑ دے' چھوڑ دے یہ دھواں اندر ڈالنا اور نکالنا۔ جل جائے گا اندر سے سب کچھ۔"

"جلنے دے۔ تو سو جا چپ کر کے" رئیس نے بھنا کے کہا۔

شاہو نے کہا "ماسی ہیر کا خیال ہے کہ حقہ اچھا ہوتا ہے سگریٹ سے۔ سارا زہر پانی میں رہ جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپا جی!" رئیس نے کہا "اگر پانی تمہاری ماسی پی لے۔ تو کل سے میں حقہ شروع کر دوں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ ذہنی انتشار کی کیفیت میں شاہو کے لیے بھی سونا مشکل ہوگا مگر ماسی ہیر کی وجہ سے وہ اٹھ کر ہمارے پاس نہیں آئی۔ رئیس کو اور مجھے مستقبل کی فکر تھی۔

"اپنا تو روزگار بھی نہیں رہا کوئی۔ اوپر سے شاہو جی کے ساتھ اتنا بڑا پنگا لے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "زرمت یار۔ اللہ پر بھروسا رکھ۔ جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔"

"شاہو جی سانپ ہے سانپ بلکہ اژدھا۔ بڑا آہستہ پر دور اور زہریلا ہے۔ وہ چھوڑے گا نہیں ہمیں" رئیس بولا۔

"یار پتا نہیں کیوں' مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ کرنا ہوتا تو وہ اسی وقت کر سکتا تھا۔"

"کوشش تو کی تھی اس نے تجھے گولی مارنے کی۔ تیری قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ اب اس کے بس میں کچھ نہیں رہا۔ شاہو نے صاف کہہ دیا اسے کہ نہ وہ باپ ہے اور نہ وہ بیٹی۔"

"وہ اس ذلت کا بدلہ ضرور لے گا۔"

میں نے کہا "زیادہ ذلت اٹھائے گا وہ' اگر شاہو نے وہی بات بھری عدالت میں کہہ دی۔"

"ابے عدالت کے گھوڑے۔ وہ تو بعد میں ہوگا سب کچھ۔ اس سے پہلے پولیس چھترمار مار کے چٹنا پاپڑ کر دے گی تجھے۔ اغوا اور زنا کا کیس بنا دے گی تیرے خلاف۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں' ہاشمی صاحب سے بات کروں؟ مجھے وہ اچھے آدمی لگتے ہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ تو نے کرلی ہوگی۔ وہ شاہ جی کے خلاف درخواست لگا دیں عدالت میں تیری طرف سے کہ تجھے ان کی طرف سے جان کا خطرہ بھی ہے اور ہو سکتا ہے وہ تجھ پر جھوٹا الزام لگا کے تجھے گرفتار کرا دیں۔ اگر ہاشمی صاحب تیری گرفتاری قبل از ضمانت کرا دیں۔"

"ضمانت قبل از گرفتاری" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی مگر اس کے لیے ضامن ہونا چاہیے۔۔۔ یا نقد ضمانت۔"

میں نے کہا "یار رئیس' تو وکیل ہے پورا۔"

وہ ہنسا "پیارے۔ دن رات پولیس والوں سے واسطہ پڑا تو قانون کا بھی پتا چل گیا تھوڑا بہت۔"

میں نے کہا "رقم میں فراہم کر دوں گا۔ ضامن تو بن جانا۔"

وہ ہنس پڑا "قسم اللہ کی۔ تجھے کچھ پتا نہیں دنیا کا۔ ابے مجھے تو خود اپنی فکر ہے۔ پولیس نے شاہ جی کے کہنے پر مجھے پکڑ لیا۔۔۔ پھر؟"

"کس الزام میں؟"

"الزام کون پوچھتا ہے۔۔۔ شاہ جی کچھ بھی کہہ دے گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "دیکھ رئیس۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ اب شاہ جی سے بھاگ کے ہم کہیں نہیں جا سکتے' اس کا مقابلہ کریں گے ہم۔ میں ہاشمی صاحب کو سب بتا سکتا ہوں۔ ایک معاملہ تو ہے نپٹنے کا۔"

"اس میں ہم بھی لٹک جائیں گے پیارے۔"

میں نے کہا "دوسرا معاملہ ہے اس بدمعاش فقیر کا۔ جو عامر کے ساتھ زیادتی کرتا تھا۔ شاہو جانتی ہے کہ اس کے باپ کو اور اپنی بیوی کو شاہ جی نے مروایا تھا۔ بے شک ثبوت گواہ کوئی نہیں مگر شاہ جی کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ ہم بھی بس تڑی دیں گے کہ ہم چپ چاپ مرنے والے نہیں ہیں' اسے بھی ساتھ لے کر مریں گے۔ ہمارے پیچھے بھی کسی طاقتور کا ہاتھ ہو تو شاہ جی سنبھل جائے گا۔"

"طاقتور کا ہاتھ۔ ہمارے پیچھے؟" رئیس تلخی سے ہنسا۔

میں نے کہا "چل یار۔ کل سوچیں گے۔ پہلے ہاشمی صاحب سے بات ہو جائے' کیا پتا شاہو کا بیان کرانا پڑے۔"

رئیس کی مایوسی برقرار رہی "اپنا اس شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا یار۔ کوئی کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ کام نہ تو نے کبھی کیا ہے نہ ہم نے۔۔۔ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "رئیس۔ کیا تجھے فرق محسوس ہوتا ہے؟"

"فرق کس چیز میں؟"

"صحن کا فرش نیا بنا ہوا ہے" میں نے نظر جما کے کہا۔

"ہاں۔ تو نے پہلے بھی بتایا تھا مگر تیری بات اپنے پلے نہیں پڑی پیارے کہ وہ تیرے دوست ناصر کی ماں تھی جو تجھے یہاں لائی تھی اور وہی دفن ہے اس صحن میں۔"

میں نے کہا "سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتیں۔ تو جادو کو سمجھتا ہے؟"

رئیس نے کہا "تجھے یقین ہے کہ وہ روح تھی اس کی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "روحیں بھٹکتی پھرتی ہیں اگر ان کو چین نہ ملے۔ ناصر کی ماں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا پھر اس کے بیٹے کو جیسے قتل کیا گیا۔"

رئیس نے کہا "یار ناصر۔ اتنے روگ مت لگا اپنی ایک جان کو۔ شاہو والا معاملہ ہی بہت ہے۔ اس کے بعد تجھے آگے کی سوچنا چاہیے۔۔۔ شادی اور اس کے بعد کے بڑے مسئلے ہوں گے۔ امتحان بھی دینا ہے تجھے اور کوئی کام کاج بھی کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو لیکن جیسے ہی مجھے موقع ملا اور فرصت ملی میں اس فرش کے نیچے ضرور دیکھوں گا تاکہ میرا وہم دور ہو جائے۔ یہ پتا چل جائے کہ وہ میرا خیال تھا یا حقیقت تھی۔ اب جلدی سے چل ہم دیکھتے ہیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔"

رئیس نے کانپتی آواز میں کہا "ابے فرش کر' سچ مچ لاش کا ڈھانچا نکل آیا نیچے سے پھر؟"

"پھر کیا۔۔۔ ثبوت مل جائے گا۔"

"کیا کرے گا تو ثبوت حاصل کر کے۔ یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پولیس ہمیں بھی تفتیش میں شامل کرلے گی' وسیم کے ساتھ۔ اسے پھانسی ہونے تک ہماری جان بھی عذاب میں رہے گی اور وسیم کو پھانسی ہو گئی تب بھی کیا ہوگا' کیا ناصر واپس آ جائے گا یا اس کی ماں پھر زندہ ہو جائے گی؟"

میں نے کہا "یہ سب میں بھی سمجھتا ہوں اور دوسرے بھی بہت سمجھ چکے ہیں مجھے لیکن رئیس میں وہ سب کچھ کیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھول جاؤں جو میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ ایک قاتل میری نظروں کے سامنے بے خوفی سے پھر رہا ہے۔ اسے میں کیسے نظرانداز کروں۔ یہ تو بڑی بزدلی کی بات ہے اور بڑی خودغرضی ہے کہ میں زندہ ہوں اس لیے مجھے کیا' کوئی کسی کو بھی قتل کرتا پھرے۔ مجھے پریشانی اٹھانی پڑے گی اس لیے میں قاتل کا نام بھی نہ لوں۔"

"دنیا ایسی ہی جگہ ہوگئی ہے پیارے!" رئیس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہو نہیں گئی ہے' ہم نے بنادی ہے۔ کل کوئی مجھے قتل کردے تیری نظروں کے سامنے تو کیا تو بھی نظر پھیر کے کھڑا ہوجائے گا۔ انجان بن جائے گا کہ میں نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"خیر' اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ہم چھوڑنے والے نہیں ہیں اس سالے کو۔"

میں نے کہا "باتیں کرنے اور کچھ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ یہ جو قانون ہے نا رئیس' یہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"کیا کتابوں میں ایسا لکھا ہے؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہم قانون کی مدد نہیں کریں گے تو کل خود بھی مارے جائیں گے اور کوئی ہماری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔"

"وقت آئے گا تو پتا چل جائے گا بیٹا! یہ قانون ہے' شاہ جی جیسے لوگوں کا غلام۔ طاقتور نے بنایا ہے' اپنی طاقت بڑھانے کے لیے۔ ہم جیسے چوہوں کے لیے ایک چوہے دان ہے یہ قانون۔ پھانسی کا پھندا ابھی اپنی ہی گردن میں فٹ آنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ کتابی باتیں چھوڑ۔" وہ جماہی لے کر کھڑا ہوگیا۔

تھکن سے چور ہونے کے باوجود میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ میرا ذہن خیالات کے طوفان کی زد میں تھا۔ شادو کو حاصل کرلینے کے باوجود ابھی تک میں خوشی اور اطمینان کے احساس سے محروم تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا تھا تو خوف اور اندیشے مجھے مضطرب کرتے تھے۔ ڈاکٹر مشہود بھی اسی شہر میں ہیں۔ کبھی نہ کبھی ان کا اور بیگم صاحبہ کا سامنا بھی ہوگا اور انہیں معلوم ہوجائے گا کہ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ شاہ جی بھی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ شادو سے شادی کرلینا تو مشکل نہیں مگر اس کے بعد میرا مستقبل کیا ہوگا؟ دہی آٹے تیل لکڑی کا چکر جس میں عام آدمی کولھو کے بیل کی طرح زندگی گزار دیتا ہے؟ ابھی میں نے میٹرک بھی نہیں کیا۔ پاؤں میں شادی کی زنجیر پڑ جائے گی تو ترقی خاک کروں گا۔ لوگ شادی کرتے ہیں زندگی کی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے بعد۔ میں نے ایک ذمے داری کا بوجھ پہلے ہی اٹھالیا ہے۔ اب جدوجہد اور کامیابی مشکل سے مشکل تر ہوجائے گی۔ میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے پھر میں نے مایوسی کے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ شاید میری سوچ ہی غلط ہے۔ شادی کے بعد ہی ترقی کرتے ہیں سب اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایک آہٹ پر میں چونکا پھر میں نے دروازے پر دستک سنی۔ بہت آہستہ۔ جیسے کوئی اپنی آمد کی خبر سے میرے سوا سب کو بے خبر رکھنا چاہتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار بھی سنی۔ تیسری بار کسی نے کنڈی بجائی تو میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں صحن سے گزر کے گلی میں کھلنے والے دروازے تک گیا اور کنڈی اندر سے کھولی۔ اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھ کے مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

باہر اتنا اندھیرا نہیں تھا کہ میں اس عورت کی صورت کے نقوش نہ دیکھ سکتا۔ ذرا سی دیر کے لیے خوف کی سنسنی نے میرے اعصاب کو مفلوج کردیا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا "تم۔۔۔!"

اس نے اندر آکے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ لی "ہاں۔ میں وہی ہوں" اس نے آہستہ سے کہا "جسے تم ناصر کی ماں سمجھتے ہو۔"

میرا حوصلہ کچھ بحال ہوا "تم ناصر کی ماں نہیں ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ تو مرچکی ہے۔ یہاں۔۔۔ اس صحن کے نیچے دفن ہے۔"

میں نے دہشت زدہ نظروں سے سیمنٹ کے پختہ فرش کو دیکھا "اس روز' تم ہی لائی تھیں مجھے یہاں؟ تم ناصر کی ماں کی روح ہو۔"

"روح! تم یہ سمجھے تھے کہ میں روح ہوں؟"

"تم روح نہیں ہو۔۔۔ پھر کون ہو؟" میں نے کہا۔

"میں ناصر کی ماں کو جانتی تھی۔ اس کی رازدار تھی۔ اکیلی ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اکیلی کیوں؟ میرا مطلب ہے گھر کے دوسرے لوگ۔"

"دوسرے کون۔۔۔ ایک بیٹا بچا ہے۔ وہ بھی نہ زندوں

میں ہے نہ مردوں میں۔ دو سال سے مفلوج پڑا ہے۔ دوسرا بیٹا' ایک بیٹی اور شوہر سب ایک ہی حادثے میں مرگئے تھے۔ میں بدبخت تھی کہ بچ گئی۔ خراش تک نہیں آئی تھی مجھے۔ ایک ناصر کی ماں ہی تھی جس کا سہارا تھا۔ جو ہمدردی کے دو بول بولتی تھی۔ حوصلہ بڑھاتی تھی کہ دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ دکھی ماں کے دل سے نکلنے والی آہ تو فرش تک ہلا دیتی ہے۔ بس اسی انتظار میں جی رہی ہوں کہ شاید کسی دن بیٹا آنکھیں کھول دے ورنہ کب کی مرجاتی۔ جینے کو اب کیا ہے؟"

میں خاموش کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا اور اس کی آواز سنتا رہا۔ بہت پرانی وہ رات پھر میرے خیالوں میں زندہ ہوگئی جب بارش اور طوفانی ہواؤں اور تاریکی میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کسی خواب میں چلنے والے کی طرح میں اس کے ساتھ ہولیا تھا اور وہ مجھے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے مجھے ناصر کی ماں کے قتل کے بارے میں وہ سب بتادیا تھا جس کی تصدیق بعد میں پرانے اخبار کی ایک خبر سے ہوئی تھی۔

میں نے کہا "اگر تم روح نہیں ہو۔۔۔ تو پھر وہ ڈراما کیوں کیا تھا میرے ساتھ۔"

"میں نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا" اس نے دل گداز لہجے میں کہا "میں نے تو تمہیں وہ سب بتایا تھا جو سچ تھا۔"

شاید باتوں کی آواز اندر رئیس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ میرے پیچھے دروازہ کھلا اور رئیس میرے ساتھ آکھڑا ہوا "یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ ناصر کی ماں ہے۔ جو قتل ہوگئی تھی۔ اس کی روح۔۔۔"

رئیس نے پہلے اسے دیکھا اور پھر مجھے۔ "یہ مجھے تو روح نہیں لگتی۔"

عورت نے سر ہلایا "میں یہی سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں۔ روح کا دنیا چھوڑ دینے کے بعد واپس آنا کیسے ممکن ہے۔ وہ میں ہی تھی۔ مجھے ناصر کی ماں کے بارے میں سب معلوم تھا۔ ایک ایک بات اس نے مجھے بتائی تھی۔ میرے داغ پر اس کا بہت اثر تھا۔ جب اس کے شوہر کو پھانسی ہوگئی تھی اور وسیم نے کوشش کی تھی کہ بڑے بھائی کی بیوی سے شادی کرلے تو وہ میرے پاس آکے روتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دیور کی نیت اس پر بھی ہے۔ مکان پر بھی اور زیور پر بھی۔ جب وسیم اپنے ارادے میں ناکام ہوگیا تو اس نے ناصر کی ماں کو شادی کے بہانے ایک بردہ فروش کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ ناصر کی ماں نے ایک خط لکھا تھا مجھے۔ اس میں سب بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ میں ناصر کو اپنے گھر لے جاؤں اور اس کو اپنا بیٹا سمجھ کے پالوں۔ اسے وسیم سے بچاؤں ورنہ ظالم بچا اسے بھی مار ڈالے گا۔"

میں نے کہا "وہ خط ہے تمہارے پاس۔"

"ہاں۔۔۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ دھوکے سے اس کا نکاح کیا گیا اور وہ شوہر نہیں کوئی دلال ہے۔ میں اسے بھی قتل کردوں گی اور وسیم کو بھی۔ اس نے پورا پلان بتایا تھا مجھے کہ وہ وسیم کو کیسے قتل کرے گی۔ اس کا شوہر وسیم کو بلائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ میری بیوی کے گہنے کہاں ہیں۔ ان کی مالیت ستر اسی ہزار تھی۔ وہ جعلی شوہر بھی لالچ میں پڑ گیا تھا۔ ناصر کی ماں کا خیال تھا کہ وسیم کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے نام نہاد شوہر کا کام تمام کردے گی اور پھر وسیم کو اس کے ریوالور سے ہلاک کردے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ سارا دن روتی رہتی تھی اور یہی سوچتی رہتی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے سمجھاتی۔ شاید اپنے ساتھ لے آتی مگر اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں قید ہے۔ اس نے نہ جانے کس کے ہاتھوں وہ خط پوسٹ کرایا تھا۔"

میں نے کہا "وہ خط ڈاک سے آیا تھا تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ لفافہ بھی موجود ہے۔ اس پر ڈاک خانے کی مہر بھی ہے۔"

میں نے کہا "ڈاک خانے کا نام بھی ہوگا۔ جہاں سے خط بھیجا گیا تھا۔"

"خط ملنے کے بعد میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ خوف سے میرا برا حال تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وسیم کا کام تمام کرتے ہی وہ میرے گھر پہنچ جائے گی اور پھر اپنے بیٹے ناصر کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوجائے گی یا خاموشی سے کہیں چلی جائے گی۔ اپنے بیٹے کے جوان ہونے کا انتظار کرے گی اور اس وقت لوٹ کر آئے گی جب بیٹا اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہوجائے گا مگر وہ نہیں آئی۔ میں اکیلی تھی اور میرا بیٹا مفلوج پڑا ہوا تھا۔ میں کیا کرسکتی تھی' اس کے علاوہ کہ انتظار کروں۔ میری رات کی نیندیں ہی اڑ گئی تھیں۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت آجائے گی۔۔۔ قتل کرکے۔ اس کے ہاتھوں پر اور کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہوں گے پھر میں کیا کروں گی۔ میں وہ خط لے کر پولیس کے پاس بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اکیلی عورت پولیس کے چکر میں کیسے پڑ سکتی ہے۔ دوسرے دن' رات کے وقت میں نے ساتھ والے گھر سے عجیب سی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی فرش توڑ رہا ہو۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ درمیان کی دیوار کافی اونچی تھی مگر میں نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ گئی۔ جو منظر میں نے دیکھا' اسے دیکھتے ہی مجھے چکر سا آیا اور میں گرتے گرتے بچی۔ ناصر کی ماں کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کپڑے بھی دیکھے جو خون میں تر تھے۔ ناصر کا چچا وسیم فرش توڑ کے زمین کھود رہا تھا اور اس کی بیوی ساری لائٹس بجھا کے لالٹین جلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے مل کے میرے سامنے ناصر کی ماں کو فرش کے نیچے گاڑ دیا اور پھر صبح تک ناصر کے چچا نے ٹوٹا ہوا فرش اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ وہ کوئی راج مستری نہیں تھا۔ اس کا بنایا ہوا فرش ناہموار تھا۔ صبح ہونے سے پہلے اس نے پرانے فرش کا ملبہ تک باہر پھینک دیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیسے رات بھر چارپائی پر کھڑی رہی۔ میں سب دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنا کام ختم کر کے سو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا مگر میں چشم دید گواہ ہوں۔ اگر میں چیخ مارتی یا حلق سے کوئی آواز نکالتی تو شاید وہ مجھے بھی مار کے اسی جگہ دفن کر دیتے۔ میں بے ہوش بھی نہیں ہوئی مگر میری دماغی حالت بگڑ گئی۔ میں سارا دن روتی رہی اور پھر ساری رات جاگتی رہی۔ میں اتنی ڈر گئی تھی کہ سونے لیٹتی تھی تو خواب میں وسیم نظر آتا۔ وہ کہتا تھا کہ اب تیری باری ہے۔ تو سب جانتی ہے اور میں چلانے لگتی تھی کہ نہیں نہیں' مجھے مت مارو' میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ میرا بیٹا ہوش میں نہیں تھا ورنہ ضرور پوچھتا کہ ماں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بالکل پاگل ہو جاتی اگر مجھے اپنے بیٹے کا خیال نہ ہوتا جو صرف میری توجہ کے سہارے پر زندہ ہے۔ اسے نہلانا دھلانا' پیشاب پاخانہ کرانا' کھلانا پلانا سب مجھے بستر پر ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں اسے وقفے وقفے سے کروٹ بدلواتی ہوں ورنہ اس کی پیٹھ پر آبلے پڑ جائیں۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ کبھی روتی تھی' کبھی ہنستی تھی۔ میرا کھانا پینا سب چھٹ گیا تھا۔ میں نفسیاتی مریض ہو گئی تھی اور نیند میں چلتی تھی۔ یہ بیماری مجھے بہت عرصہ رہی۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے بارے میں کس سے معلوم ہوا تھا؟"

"میں نے تمہیں ناصر کے چچا کے گھر میں دیکھا تھا۔ تمہارا جھگڑا ہوا تھا اس سے کیونکہ تم نے سب کے سامنے سچ بولنے کی بے وقوفی کی تھی۔ وسیم نے تمہارے منہ پر تھپڑ بھی مارا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم بھی ناصر عظیم ہو۔ وہ تمہارا دوست تھا اور تم کو اس کی موت کا سخت صدمہ تھا۔ ناصر عظیم نے مرنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر پھر اچانک تم غائب ہو گئے۔ مجھے بھی ناصر کی موت نے بالکل پاگل کر دیا تھا۔ میں مجبور تھی۔ میں ایک عورت تھی اور مجھے ایک بیٹے کو زندہ رکھنا تھا' خواہ وہ دیکھنے میں زندہ نظر نہ آتا ہو۔ میں نے سوچا کہ وہ سب بتا دوں جو تمہیں معلوم نہیں۔ یہ خیال میرے ذہن اور اعصاب پر سوار تھا۔ میں نے یہ معلوم کرا لیا کہ تم ہمارے ساتھ یتیم خانے میں تھا۔ اسی محلے کا ایک لڑکا جو اب ڈاکٹر بن گیا ہے' وہ روز آتا ہے میرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے۔ میری بہت مدد کرتا ہے۔ اس نے تمہارا پتا چلا کے مجھے بتایا کہ وہ ناصر ہمارے اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر مشتاق صاحب کے ساتھ رہتا ہے۔"

"اور تم نے مجھے خط لکھنے یا فون کرنے کے بجائے اس طوفانی رات میں اکیلے ملنے کا فیصلہ کیا۔ بارش کی اور اندھیرے کی پروا نہیں کی۔ تم نے روح بن کے مجھے سارے واقعات سنائے۔" میں نے کہا۔

"نہیں ناصر۔ جو کچھ میں نے کیا' بے خبری میں کیا۔ میں ایک نفسیاتی مریض بن گئی تھی۔ اس ڈاکٹر کے علاج کے باوجود مجھ پر خود فراموشی کے دورے پڑتے تھے۔ میں نیند میں چلتی ہوئی ایک بار ناصر کی قبر پر پہنچ گئی تھی۔ کئی بار میری آنکھ کھلی تو میں یہاں تھی۔ اس جگہ سو رہی تھی جہاں وہ دفن ہے' ناصر کی ماں۔ یہ گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ ایسے ہی نیند میں چلتی ہوئی میں اس رات تمہارے پاس پہنچ گئی تھی۔ اور تمہیں اپنے ساتھ لے آئی تھی۔"

میں نے کہا "نیند میں چلنے والے کو کچھ یاد نہیں رہتا۔"

"جب میں نے تمہیں دیکھا تو میں جاگ گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے جو کیا' وہ مجھے یاد ہے۔ میں نے تمہیں ناصر کی ماں کے قتل کی ساری روداد سنا دی تھی۔ میں نے اس کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے اپنے پاگل پن میں مجھے سب لکھ دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی۔ میں نے وہی تم کو بتا دیا مگر مجھے بہت افسوس ہے۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ تم نے بھی کچھ نہیں کیا۔ تم بھی سب بھول گئے۔ جیسے میں سب بھول گئی رفتہ رفتہ۔"

میں نے کہا "میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔"

"مگر وہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میں یا تم کچھ نہیں کر سکتے۔ سب کی اپنی اپنی تقدیر کی مجبوری

ہیں لیکن تمہیں اچانک یہاں دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ وہ سب بھی تمہیں بتا دوں جو تمہیں معلوم نہیں تھا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "وہ خط کہاں ہے؟"

اس نے قمیص کے اندر سے ایک مڑا ہوا لفافہ برآمد کیا اور مجھے پکڑا دیا "اس میں سب وہی ہے جو میں نے بتایا تھا' اخباروں میں بھی آیا تھا۔"

"اخبار میں صرف قتل کی خبر آئی تھی" میں نے کہا۔

"قتل کی خبریں آتی رہتی ہیں اخباروں میں۔ وہ قاتل بھی پڑھتے ہوں گے جو کبھی پکڑے نہیں جاتے۔"

رئیس بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا کھڑا سب سن رہا تھا جس بات کو وہ آج تک میرا وہم سمجھتا تھا' وہ حقیقت ثابت ہو گئی تھی "اس وقت تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو مائی۔" اس نے پوچھا۔

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ ایک پاگل عورت۔ ایک مجبور ماں' ایک دکھی روح۔۔۔ مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں خود نہیں آیا' مجھے تقدیر یہاں لے آئی ہے۔"

"تقدیر یا اس کی شامتِ اعمال" وہ بولی "اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔ جو کر سکتے ہو تم کر سکتے ہو' میں نہیں کر سکتی۔ آگے تمہاری مرضی۔"

وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی خاموشی سے لوٹ گئی۔ اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ میں اور رئیس چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر میں نے کہا "اب کیا کہتا ہے تو؟"

اس نے سر کھجایا "وہی سب جو پہلے کہا تھا۔ اپنی جان ایسے بلاوجہ کے شیطانی چکروں سے بچا۔ اپنا وقت ضائع کر کے تجھے کچھ نہیں حاصل ہو گا۔"

"سارے ثبوت ہوں پھر بھی قاتل کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟"

"ثبوت! ابے تو سمجھتا نہیں ابھی قانون کو۔ وکیل ایسے چکنیوں میں اڑا دیں گے تیرے یہ ثبوت۔ مانا کہ قتل ہوا مگر کس کا ہوا' کس نے کیا' کیوں کیا؟ ایک نہیں ہزار مرحلے ہوتے ہیں پیارے' صرف ایک لاش برآمد ہونے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ڈھانچا خود نہیں بولتا۔ اگر پوسٹ مارٹم رپورٹ دینے والوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کسی مرد کی لاش ہے جو ستر سال کا تھا پھر تو کیا کرے گا؟ ہائی کورٹ میں جائے گا پھر سپریم کورٹ میں؟ سالے خود خرچ ہو جائے گا اس چکر میں۔ وسیم کیا آسانی سے مان لے گا اور پہنچ جائے گا پھانسی کے تختے پر؟"

میں نے کہا "ایک چشم دید گواہ بھی ہے۔"

"ایک پاگل عورت' جو خود مانتی ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ اس کی گواہی کی کیا اہمیت" رئیس بولا "اپنے ساتھ شاہد کو بھی مشکل میں مت ڈال۔ تو شرط لگا لے مجھ سے۔ یہ جو ہاشمی صاحب ہیں نا' تو نے ان سے بات کی تو وہ فوراً نوٹس دے دیں گے کہ میرا مکان خالی کرو۔ اس نے مصیبت میں پڑنے کے لیے مکان کرائے پر نہیں دیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔"

"کسی اور وکیل سے بات کر کے دیکھ۔ وہ بھی یہی کہے گا کہ بیٹا۔ قانون کے گورکھ دھندے سے دور رہو گے تو اچھے رہو گے۔ گڑے مردے اکھاڑو گے تو مارے جاؤ گے" رئیس بولا۔

"پھر بھی یار' اسے سزا تو ملنی چاہیے" میں نے کہا۔

"ہاں سزا ضرور ملنی چاہیے۔ سزا تو ہم بھی دے سکتے ہیں سالے کو۔ ایسی کہ یاد رکھے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"بتاؤں گا بعد میں۔ ابھی کسی سے کچھ کہنے اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو جا آرام سے۔"

میں نے کہا "تو بھی مت بتانا کسی کو۔ شاہد کو بھی نہیں۔"

"اچھا مگر یہ خط تو پڑھ کے سنا۔" رئیس بولا "اپن کو بھی نیند نہیں آئے گی ایسے۔"

ہم نے کچن کا دروازہ بند کر کے لائٹ جلائی اور وہ خط پڑھا جو ایک مظلوم عورت نے مرنے اور مارنے سے پہلے لکھا تھا۔ وہ واقعی پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے قتل ہونے اور قتل کرنے سے پہلے ہی سب لکھ دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی' کیسے کرے گی اور کب کرے گی؟ جو کچھ اس خط میں لکھا ہوا تھا' اس کی تصدیق اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے بھی ہوئی تھی مگر یہ مسئلہ اب میری ترجیحات میں سب سے اوپر نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے پہلے اپنے آپ کو اور شاہد کو بچانا تھا۔ شاہ جی سے بھی اور قانون کی گرفت سے بھی۔ اس کے بعد مجھے سوچنا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ ابھی میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا اور میں جاہل نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ترقی کے لیے تعلیم کی بنیادی اہمیت تھی۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا تھا کہ سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی۔ کوئی سنگین معاشی مسئلہ فوری طور پر درپیش نہیں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا اور شادو کا اندوختہ طویل عرصے تک ہماری تمام ضروریات کی کفالت کے لیے کافی تھا۔ یہ بعد میں طے کیا جاسکتا تھا کہ اس سرمائے کو معقول آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

مسٹر رانجھا جن کو اب ہم اتفاق رائے سے انکل رانجھا کا خطاب دے چکے تھے۔ صبح دم ایسے اٹھے جیسے اپنے پرانے گھر میں اٹھے ہیں۔ صرف چوبیس گھنٹے میں وہ نقل مکانی کرکے نئی جگہ آباد ہو چکے تھے مگر ان کے معمولات وہی پرانے تھے۔ ماسی ہیر نے ان کو بازار بھیج کے مٹی کا تیل منگوایا اور چائے بنانے کے سب لوازمات۔ وہ لوٹے تو حلوا پوری بھی ساتھ لائے اور یوں ایک خاندان نے اپنی زندگی کی نئی صبح کا آغاز ناشتے سے کیا۔

ناشتے کے بعد انکل رانجھا نے کنگھی میں تر انگلیوں سے مونچھوں کو پالش کیا اور اپنے کلینک چلے گئے۔ ان کو اسی ہفتے میں اپنا کلینک ریڑھی سے دکان میں منتقل کرنا تھا۔ وہ رانجھا شربت فروش سے ڈاکٹر رانجھا ہونے والے تھے اور غالباً پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اس کلینک کا نام "ہیر کلینک" ہوگا۔

ماسی ہیر نے مجھے ایک کاپی پنسل دے کر کہا "لے بھئی، اب جو میں بولوں لکھ۔"

میں نے کہا "کیا محبت نامہ ہے کسی کے نام؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "ہائے اب کہاں وہ زمانہ۔ کیا ٹیم تھا اور کیا جوانی تھی۔ محلے کے تیرے جیسے جوان صبح، شام تک راہ دیکھتے تھے۔ چٹھیاں لکھ لکھ بھیجتے تھے۔ چوری چوری۔۔۔ جدھر سے گزرتی تھی، دیکھنے والے دل تھام کے رہ جاتے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کتنے چاہنے والے تھے تمہارے ماسی؟"

رئیس نے کہا "درجن میں بتاؤ، دو درجن یا چار درجن؟"

اس نے شربا کے مصنوعی خفگی دکھائی "بدتمیز نہ ہو تو۔ میں کوئی حساب رکھتی تھی، پر تھے بہت۔"

"اور ان میں سے تم نے بھی کیا پیں چُنا۔ انکل رانجھا میں ایسا کیا نظر آیا کہ باقی سب کو ہری جھنڈی دکھادی؟" میں نے کہا۔

"یہ مت پوچھ کاکا۔ اس وقت بندہ کچھ نہیں دیکھتا۔ یہ عقل کا سودا نہیں ہوتا۔ مجھے بتا تو نے کیا دیکھا اس کڑی میں جو ساری دنیا کو چھوڑ دیا؟"

"چت کردیا تم نے ماسی ہیر۔ ایسا دھوبی پٹخا دیا ہے کہ آگے میں کچھ بول ہی نہیں سکتا" میں نے کہا۔

"بس تو پھر لکھ کمبالانا ہے بازار سے۔"

سامان کی فہرست لکھوا کے وہ گھر کی صفائی میں جُت گئی۔ شادو ناشتے کے بعد سے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے سوچ بچار میں مصروف تھی۔ اس نے جو قدم اٹھایا تھا، وہ بھی ایک بہت بڑے جذباتی فیصلے کا نتیجہ تھا۔ اس پر غور کرنے کا وقت اب آیا تھا۔ ایک سوال تھا جو ہم سب کے ذہن میں، تصور میں اور احساس میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ ہم لاکھ اس سے نظریں چرائیں، وہ ہمارے سامنے آجاتا تھا۔ ہم اپنے کان بند کرلیں مگر اس کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اس سوال کا خوف سب کے اعصاب پر طاری تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈرنے سے ڈر دور نہیں ہوتا۔ میں باہر جانے لگا تو شادو نے مجھے روک لیا۔ "تمہیں شاہ جی کے جاسوس دیکھ لیں گے۔"

میں مسکرایا "ان کے ڈر سے کتنا عرصہ گھر میں بیٹھ کے گزار سکتا ہوں میں؟ باہر جانا ہی پڑے گا۔"

"آج پہلا دن ہے" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "آپا جی ٹھیک کہتی ہے پیارے۔"

میں نے چڑ کے کہا "تیرے لیے آپا جی کی بات غلط کیسے ہو سکتی ہے۔"

"یار میرا مطلب تھا، ایک معمولی سے کام کے لیے دو کا ساتھ جانا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ خدانخواستہ ایک کو کچھ ہو تو دوسرے کو خبر ہو۔"

وہ بولا "اور ایک ساتھ دو پکڑے جائیں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو جا۔ تیرے لوٹ آنے کے بعد میں جاؤں گا۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے حساب لگایا۔ تین ہزار چار سو روپے اب بھی بچے ہوئے تھے۔ فوری طور پر مجھے بینک جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی ایک دستخط سے بینک والے میرے چیک کو قبول کرلیں گے اور دوسری بات یہ کہ مجھے شادو کے لیے کچھ کپڑے، جوتے خریدنے تھے۔ وہ گھر سے تن کے ایک جوڑے میں میرے ساتھ آگئی تھی۔

اسے اکیلا پاکے میں نے کہا "تم اُداس ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں ڈری ہوئی ہوں۔ شاہ جی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطرناک قومی ہے۔"

"کیا کرنے گا وہ' مار ڈالے گا؟ کیا فرمایا ہے شیخ صاحب نے کہ۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ جو ہوگا دونوں کے ساتھ ہوگا۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں ناصر۔"

میں نے کہا "تم جا بھی کیسے سکتی ہو مجھے چھوڑ کر۔ اب تو ساتھ ہی ہوں گے جہاں بھی ہوئے۔ اس دنیا میں یا اس دنیا میں۔"

"میری وجہ سے تم کو وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں تم عزت کے ساتھ اور بڑے آرام سے رہتے تھے۔"

"تم نے بھی تو اپنا گھر چھوڑ دیا۔ تم بھی شہزادیوں کی طرح رہنے کی عادی تھیں۔ اب یہاں اس کوارٹر میں ایسے پڑی ہو جیسے ہم قیدیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماسی ہیر اور انکل رانجھا چلے جائیں گے کچھ دن بعد۔"

"نہیں ناصر۔ ہم اکیلے کیسے رہیں گے؟"

"جیسے سب میاں بیوی رہتے ہیں" میں نے موانہ وار کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ شادی کی کوئی جلدی نہیں۔ ہم نے شادی کرلی تو تمہاری پڑھائی رہ جائے گی۔ مجھے معلوم ہے' جو ہم نے طے کیا تھا وہی ہوگا۔ تم بی اے ضرور کرو گے پہلے' چار سال کی بات ہے۔"

"چار سال" میں نے سر پر ہاتھ مارا "میرے چار دن نہیں گزریں گے۔"

"گزر جائیں گے۔ ابھی تمہاری عمر واقعی شادی کے لیے کم ہے۔ میرے حساب سے تو چوبیس سال سے پہلے مردوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔"

"یعنی اب چار سے بڑھا کے تم نے چھ کردیے۔"

"ماسی ہیر کا ہمارے ساتھ رہنا اچھا ہے۔ گھر میں کوئی بڑا ہونا چاہیے۔ وہ زبان کی ذرا تیز ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ ایک خاندان میں ڈسپلن ہونا چاہیے۔ ہم سب اس کی بات مانیں گے۔ بے شک ہم سب آزاد ہیں مگر آزادی بھی بے مہار اور ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ پوچھنے والا کوئی نہ ہو ورنہ گھر اور جنگل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہم جانوروں کی طرح نہیں "انسانوں کی طرح آزاد رہیں گے۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ انکل رانجھا کی وجہ سے ہم محفوظ بھی ہوں گے۔ ان لوگوں کو جو آس پاس رہتے ہیں' یہی معلوم ہو تو اچھا ہے کہ یہاں ڈاکٹر رانجھا رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رانجھا" میں ہنس پڑا "عجب تیری قدرت' عجب تیرے کھیل۔"

ہیر نے آواز لگائی "کیا اندر بیٹھے کبوتروں کی طرح غٹرغوں کررہے ہو' چل کڑیے ایک کمرے کی صفائی میں کرتی ہوں' دوسرا تو صاف کر۔ چٹلی طرح دیواریں اور چھت سب کو جھاڑ۔ یہ جالے شالے ہٹا' فرش کو پونچھا مار۔"

میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ آس پاس کے سب گھر ایسے ہی تھے جن میں غریب کہلانے والے لوگ چار پانچ مرلے کے مکانوں میں اپنے خاندانوں کے ساتھ آباد تھے۔ کوئی گھر بڑا تھا تو دس مرلے کا تھا۔ یہ دھرم پورے کا علاقہ تھا جس کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے مصطفیٰ آباد کا نام دے دیا گیا تھا مگر جو نام لوگوں کی زبان پر چڑھا ہو وہ ختم نہیں ہوتا۔ گلیوں میں پرانے طرز کی چھوٹی اینٹوں کا بنا ہوا فرش تھا اور گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ ان میں سے گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔ گاڑی رکھنے کا یہاں کوئی سوچتا بھی نہیں تھا۔ کچھ گھروں میں موٹر سائیکلیں آگئی تھیں ورنہ سائیکل بھی غریب آدمی کی سواری تھی جس میں اپنی جان کے سوا کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ پٹرول اور آئل کی جگہ اپنا خون پسینہ۔

گلی میں دو پرچون کی دکانیں تھیں۔ ایک بڑی تھی اور زیادہ چلتی تھی۔ دوسری کسی بوڑھے نے محض وقت گزارنے اور تھوڑی بہت کمائی کے لیے کھول رکھی تھی۔ وہ ٹافیاں' مُرمُرے' کاپیاں اور پنسل جیسی چیزیں رکھے بیٹھا تھا چنانچہ اس کے گاہکوں میں بچوں کی اکثریت تھی۔ ایک گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھے دو بزرگ حقہ پی رہے تھے اور اخبار پڑھتے ہوئے خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جارہے تھے۔ دوسری طرف میری ہی عمر کے چار لڑکے زور زور سے باتیں کررہے تھے پھر تین ہاتھ ملا کے رخصت ہوگئے۔ میں نے چوتھے سے تعارف حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میں یہاں نیا آیا ہوں۔ میرا نام ناصر ہے۔"

"میرا نام صفدر ہے" وہ بولا "کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"دسویں کا امتحان دوں گا۔"

وہ بولا "میں سیکنڈ ایئر میں ہوں اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "ایک میرا چاچا ہے۔ اس کی ایک لڑکی ہے۔ ایک لڑکا ہے میرے برابر۔ چاچی ہے اور میں۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "تمہیں نہیں معلوم۔ دھرم پورہ ہے

ویسے تو۔ یہ پرانا دھرم پورہ ہے۔ یہ گلی اور آس پاس کا علاقہ پیرن چوہچہ صاحب کہلاتا ہے۔ اس گلی میں آگے چوہچہ ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک احاطہ سا ہے۔ اندر ایک یا دو کمروں میں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں چوہچہ صاحب۔ ادھر آگے جاکے الٹے ہاتھ مڑ جائیں تو دیوار ہے۔ دیوار کے دوسری طرف نہر والوں کے دفتر ہیں۔ سڑک ہے اور نہر ہے۔ یہ سڑک کا شارٹ کٹ ہے۔ دیوار ٹوٹی ہوئی ہے کئی جگہ سے۔ لوگ دفتروں کے بیچ میں سے گزر جاتے ہیں۔ ایک راستہ بھی بن گیا ہے اور۔۔۔"

میں نے کہا "اس مکان میں تالا پڑا ہوا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "ہاں' ایک بڈھی رہتی تھی یہاں۔"

"رہتی تھی کا کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"چھوڑ کے چلی گئی۔ اس کا گھر ختم ہوگیا۔ وہ سب کسی شادی میں شاید رہ گئے تھے۔ پُل کے پاس لاری نے ٹکر ماردی۔ تانگے میں جتنے تھے سب مرگئے۔ ایک یہ بڈھی بچی۔ ایک اس کا بیٹا۔ وہ کئی مہینے اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا پھر اسپتال والوں نے کہا کہ اسے گھر لے جاؤ اور بس دعا کرو۔"

"محلے کا کوئی ڈاکٹر اسے دیکھنے جاتا تھا؟"

وہ پھر حیران ہوا "ہاں۔ میرا بڑا بھائی اور اس کا بیٹا دوست تھے۔ بچپن میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وہ میٹرک کرکے ادھر مغل پورہ ورکشاپ میں بھرتی ہوگیا تھا۔ کئی مہینے بستر پر ایسے ہی پڑا رہا۔ ہوش نہیں آیا' ایسے ہی مرگیا۔"

میں اچھل پڑا "مرگیا۔۔۔ کب؟"

"پرسوں۔ شام کو اسے دفن کردیا۔ بڈھی پتا نہیں کدھر چلی گئی۔ ویسے بھی پاگل ہوگئی تھی۔ اس حادثے کے بعد اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ بیٹھی رہتی تھی بیٹے کے پاس۔ وہ جواب تو دیتا نہیں تھا۔ یہ باتیں کرتی رہتی تھی اسی سے۔ محلے کی عورتوں سے کہتی تھی کہ میرے پتر کے لیے کوئی کڑی ہو تو بتاؤ۔ اس سال عید کے بعد شادی کرنی ہے اس کی۔ جب حادثہ ہوا تو وہ بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھی کوئی۔ کہتی تھی کہ اب خیر سے کام پر بھی لگ گیا ہے۔ بہو لائی ہے' پھر حادثے نے اسے پاگل کردیا۔ عورتیں ترس کھا کے چلی جاتی تھیں۔ کوئی کھانا بھیج دیتی تھی کوئی کپڑے۔ رات کے وقت بھی لوگوں نے اسے گلی میں پھرتے دیکھا۔"

میں دروازے پر پڑے تالے کو دیکھتا رہا "کل ادھر ہی تھی وہ؟"

"تم نے دیکھا تھا؟" وہ بولا "یہاں وہ کسی سے نہیں ملی۔ محلے والوں نے سوچا تھا کہ سوئم کا انتظام کردیں مگر وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہوگئی اور کوئی تھا بھی نہیں اس کا جس کے پاس جاتی۔ ہم نے تو قبرستان جاکے بھی دیکھا کہ کہیں بیٹے کی قبر پر نہ بیٹھی ہو۔ جاہل عورتیں ڈرتی تھیں اس سے۔ کہتی تھیں اس پر سایہ ہے کسی بدروح کا۔ بچے سمجھتے تھے کہ وہ خود بدروح ہے' جن بھوت یا چڑیل ہے۔ دراصل وہ نفسیاتی مریض تھی۔ میرا بھائی اس کا علاج بھی کرتا تھا۔ اسے نیند میں چلنے کی بیماری بھی ہوگئی تھی۔ ایک بار میں نے اسے دسمبر کی سخت سردی میں آدھی رات کے وقت دیکھا۔ وہ ننگے پاؤں نہ جانے کہاں جارہی تھی اور کوئی دیکھتا تو ڈر جاتا۔ میں اسے پکڑ کے واپس لے گیا۔"

اگر میں اسے بتاتا کہ رات کو وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مجھے ایک پرانا محفوظ رکھا ہوا خط دینے کے لیے تو وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ میں محلے میں نیا تھا' نہ میں کسی کو جانتا تھا اور نہ کوئی مجھے۔ اس بڑھیا کا مجھ سے کہاں کا تعلق نکل آتا۔ اگر میں صفدر کو بتاتا کہ وہ ایک بار سوتے میں چلتی ہوئی میرے گھر آئی تھی اور میں اس کے ساتھ اسی مکان میں آیا تھا۔ میں نے اسے روح سمجھا تھا اور اس رات بھی سخت سردی تھی' بارش تھی اور طوفانی ہوا تھی تو صفدر شاید مجھے بھی پاگل ہی سمجھتا۔

میں نے کہا "ایک بات اور پوچھوں؟ یہ مکان جو ہم نے لیا ہے' یہ بھی خالی پڑا تھا' کوئی لیتا نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگا "ہاں۔ ایسے ہی مشہور ہوگیا تھا کہ یہاں آسیب ہے۔"

میں نے کہا "میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم یہاں پرانے رہنے والے ہو' تمہیں معلوم ہوگا؟"

اس نے کہا "یہاں جو بندہ رہتا تھا' وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا' دھرم پورے کے بازار میں برتنوں کی دکان تھی اس کی۔ اس نے کسی کو قتل کردیا تھا بعد میں اسے پھانسی ہوگئی۔ اس کا بھائی یہاں رہنے آگیا اپنی بیوی کے ساتھ۔ بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ اس کا کچھ معاملہ تھا۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر پہلی بیوی نے ہنگامہ کردیا۔ بیوی کا بھائی تھانے دار تھا ورنہ اس بندے کو روک کون سکتا تھا۔ کہتے ہیں یہ عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اپنے بیٹے کو بھی چھوڑ گئی۔ بعد میں جس کے ساتھ بھاگی تھی اسی نے قتل کردیا۔ اس کا آشنا بھی مارا گیا۔ وہ بھی حادثے کا شکار ہوکے مرگیا۔ اسی لیے باتیں مشہور ہوئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دہر کو پھانسی ہوئی' بیوی قتل ہوئی' بیٹا حادثے میں مرا۔ پیچھے
ہوٹا بھائی اور اس کی بیوی رہ گئے تھے۔ وہ بھی مکان کسی
یل کو بیچ گئے۔ وکیل کی ملازمہ یہاں آئی اور عورتوں سے ملی
اسے سب معلوم ہوا۔ اس نے بھی یہاں رہنے سے انکار
کردیا۔ مکان اسی لیے خالی پڑا ہوا تھا۔"

"میں نے وکیل سے ہی مکان کرائے پر لیا ہے" میں نے
ا "اچھا میں چلتا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔"

میں گھر آیا تو رئیس بھی واپس آچکا تھا۔ اس وقت میں
نے رئیس کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ ماسی ہیر کو پریشان کررہا تھا اور
س سے گالیاں کھاکے بے مزہ نہیں ہورہا تھا' ہنس رہا تھا۔
البابیہ ان کا پرانا معمول تھا۔ اس نے ایک لوٹا پیش کیا "یہ تم
نے نہیں لکھوایا تھا مگر اس کے بغیر آدمی اور جانور ایک
وجاتے ہیں۔ قیمت صرف ایک سو بیس روپے۔"

"ہائے میں مرگئی" ہیر نے سر پر ہاتھ مارا۔

"ایک لوٹے پر مرگئیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم بابا رانجھا
ر مرتی ہو۔"

"اوئے نامراد۔ ایک سو بیس روپے کا لوٹا" اس نے
رئیس کو ایک دو ہتڑ رسید کیا۔

"ارے ماسی' ولایتی ہے اور بے پیندے کا نہیں ہے۔
و چیز ملکہ استعمال کرتی ہے وہ تم کروگی۔ تو قسم اللہ کی میم نظر
ؤگی" رئیس دانت نکالتا رہا۔

میں بینک گیا اور زندگی میں پہلی بار چیک کاٹتے ہوئے
خود اعتمادی کے نئے احساس سے دوچار ہوا۔ بیس ہزار روپے
میں سے شام کو میں نے دس ہاشمی صاحب کی خدمت میں پیش
کردیے۔ اس وقت وہ مصروف تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے
یک پرائیویٹ بات کرنی ہے اور ان کے ویٹنگ روم میں بیٹھا
رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ جب ان کے مؤکل رخصت
ہوگئے تو انہوں نے مجھے بلالیا۔ میں نے انہیں شاہد کے
بارے میں سب بتادیا۔ وہ حیرت اور پُرفکر انداز میں سب
سنتے رہے۔

"یہ تو بڑی غلط حرکت کی تم نے۔ شاہ جی نے ضرور
تمہارے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھوادی ہوگی" انہوں نے
بالآخر کہا "تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو مارے جاؤ گے۔"

"اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میری مدد کریں ہاشمی
صاحب۔ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اور دیکھئے' مجھے معلوم ہے
کہ آپ کے وقت کی قیمت ہے۔ آپ مجھ سے ایک عام
مؤکل کی طرح پوری فیس لیں" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگے "پہلے یہ بتاؤ لڑکی کہاں ہے اس
وقت؟"

"اسی گھر میں۔۔۔ جہاں میں ہوں۔"

"اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے' کسی رشتے دار کا گھر یا کسی
دوست کا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سر' رشتے دار ہوتے تو میں یتیم
خانے میں کیوں پرورش پاتا۔"

"ایسے بہت ہوتے ہیں جن کو خود رشتے دار یتیم خانوں
کے حوالے کرجاتے ہیں۔"

مجھے فوراً ناصر کا خیال آیا جسے اس کا سگا چچا وہاں چھوڑ
گیا تھا "مجھے تو اپنے ماں باپ کا بھی علم نہیں ہے سر۔ اگر
شاہد کے رشتے دار ہوں گے تو وہ اس کے باپ کے طرفدار
ہوں گے۔"

"یہ شاہ جی اس کا حقیقی باپ نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ میں نے بتایا نا۔"

"لڑکی نے میٹرک کیا ہے۔ اس میں باپ کے نام کی جگہ
کس کا نام لکھا ہوا ہے؟" ہاشمی صاحب ایک پیڈ پر کچھ لکھتے
جارہے تھے۔

میں نے کہا "سرٹیفکیٹ میں نے نہیں دیکھا۔"

"اس میں تاریخ پیدائش بھی ہوگی۔ مجھے اصل لاکے
دو۔ اگر شاہ جی کے بجائے اس میں کسی اور کا نام ہے' پھر تو
کوئی مسئلہ نہیں۔ شاہ جی کے دعوے کی کوئی قانونی حیثیت
نہیں رہے گی۔ اگر نام شاہ جی کا ہوا تو شاہد' کیا نام ہے
پورا۔۔۔؟"

میں نے کہا "شاہد پرویز۔"

"اس سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ خیر' شاہدہ کا حلف نامہ
داخل ہوگا اور وہ عدالت میں بیان دے گی۔ میرا مشورہ ہے
کہ قتل کا مسئلہ مت چھیڑو۔ شاہدہ یہ نہ کہے کہ شاہ جی نے
اپنی بیوی کو اور شاہدہ کی ماں کو مروادیا تھا۔ یہ ثابت کرنا مشکل
ہوجائے گا۔ اس پوائنٹ پر میں شاہ جی سے خود بات کروں گا۔
دباؤ ڈالنے کے لیے۔ لڑکی اب خود مختار ہے' بالغ ہونے کا
ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ ضرور حاصل کرلو سول سرجن سے'
کام آئے گا۔"

میں نے سر ہلادیا "جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں
گا۔"

"آسان کام بھی پیسہ خرچ کیے بغیر مشکل ہوجاتے ہیں۔
خصوصاً قانونی کام اور تمہیں جلدی بھی ہے۔ پانچ سو خرچ
کرکے ایک دن میں سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ میں تمہیں ایک
لیٹر بنادوں گا۔ یہ کام کل ہی کرلو مگر اس سے پہلے' شاہدہ کو

میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

"آپ کے پاس کہاں؟"

"میرے گھر۔ اس طرح تم اغوا کے الزام سے بھی بچ
جاؤ گے اور تم پر حدود کا کیس بھی نہیں بنے گا۔ عدالت میں
اس کو میں پیش کروں گا اور وہ بیان دے گی کہ میں بالغ اور
خود مختار ہوں۔ شاہ جی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ وجہ یہی کہ
وہاں فقیروں کا اڈا ہے اور شاہ جی جو کام مجھ سے کراتا ہے' وہ
مجھے پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھیک مانگوں اور فقیروں
کی جاسوسی کروں۔ یہ بھی ایک پوائنٹ ہے جس پر شاہ جی کو
بڑی پریشانی ہوگی۔ شاہدہ اس کے سارے کاروبار کا پول
عدالت میں کھولنے کی دھمکی دے سکتی ہے۔ اس میں جھوٹ
کوئی نہیں۔ اخبار والے فقیروں کی ٹھیکے داری کے اس
دھندے کو خوب اچھالیں گے۔ اس کا سارا کاروبار چوپٹ
ہوجائے گا۔ فقیروں کے ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا۔"

"ہاشمی صاحب نے خوش ہوکے کہا "اسے پکڑا جانا چاہیے۔"

ہاشمی صاحب پھر مسکرائے "پولیس مجبوراً اسے پکڑے
گی لیکن بعد میں سب ختم ہوجائے گا۔ دنیا میں سب سے
پرانے پیشے کون سے ہیں؟ معلوم ہے' ایک ہاتھ پھیلانے کا
اور دوسرا جسم فروشی کا۔ دنیا کی تاریخ اٹھاکے دیکھ لو۔ کوئی
ملک ایسا نہیں' تاریخ میں ایسا دور کبھی نہیں آیا اور نہ آئے
گا جب یہ دو پیشے ختم ہوجائیں لیکن ابھی پریشانی ہوگی شاہ جی
کو۔ میں اس سے بات کروں گا کہ شاہدہ کا بیان ایسا ہوسکتا
ہے جس میں اس کے کاروبار کا کوئی ذکر نہ آئے۔"

"ہوسکتا ہے کہ بیان کی نوبت بھی نہ آئے۔"

"نہیں۔ بیان ضروری ہے۔ تمہارے اپنے تحفظ کے
لیے۔ اس نے آج رپورٹ ضرور لکھوادی ہوگی۔ وہ گھاگ
آدمی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ ناصر اس کی بیٹی کو
ورغلاکے لے گیا۔ اس نے لکھوایا ہوگا کہ تم اسے گن
پوائنٹ پر اغوا کرکے لے گئے ہو۔"

ریوالور کی بات میں نے ہاشمی صاحب کو نہیں بتائی تھی۔

"یاد رکھے گا کہ تم اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ گئے
تھے۔ تم نے اسے مارا پیٹا۔ گھر میں سے نقد اور زیور سب
اٹھالیا اور شاہدہ کو زبردستی لے گئے۔ کیس ایسے ہی بنائے
جاتے ہیں۔ ایک منٹ' یہ کون سی جگہ ہے۔ تھانہ کون سا
لگے گا؟" اس نے سوچ کے کہا "پتا لکھوا۔ کرشن نگر۔"

اس نے پتا نوٹ کیا اور پھر ڈائری میں دیکھ کے کسی کا
فون نمبر ملایا۔

"انچارج صاحب' ہاں مجھے معلوم ہے وہ گشت پر ہوں
گے۔ میں گلزار ہاشمی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اینڈ سپریم کورٹ
بول رہا ہوں۔ ڈیوٹی افسر صاحب ایک بات پوچھنی تھی آپ
سے۔ ذرا دیکھ کے بتاؤ۔ شاہ جی نے اغوا کی کوئی رپورٹ
لکھوائی ہے؟ کون شاہ جی۔۔۔ یار' اب ہم سے بھولے مت
بنو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس شاہ جی کی بات کررہا
ہوں۔ وہی فقیروں کا چوہدری۔"

پھر وہ کچھ دیر سنتا رہا' سر ہلاتا رہا اور
"اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور؟" کہتا رہا۔ ریسیور رکھ کے اس نے
میری طرف دیکھا "ایف آئی آر درج کرادی ہے اس نے
تمہارے خلاف اور وہی لکھوایا ہے کہ تم اسے گن پوائنٹ پر
لے گئے۔ ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کے زیورات کے
ساتھ۔"

میں نے اسے غصے میں گالی دی "حرام زادہ۔ کیا بتائے گا
کہ اتنی دولت کہاں سے آئی اس کے پاس؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ کوئی بہت بڑی رقم
نہیں۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ اور اس کا کیس سے کوئی
تعلق بھی نہیں بنتا کہ یہ سب اس کے پاس کہاں سے آیا تھا۔
تمہارا جرم کتنا سنگین ہوگیا ہے' ڈکیتی' اغوا' ناجائز آتشیں
اسلحے کا استعمال۔ تم ایسے گھومتے پھر رہے ہو' جب جانتے ہو
کہ سارے فقیر اس کے مخبر ہیں اور تمہیں پہچانتے ہیں۔
پولیس بھی جانتی ہے۔ تمہیں تو یہ کوئی بہادری نہیں ہے'
حماقت ہے۔ قسمت اچھی تھی تمہاری کہ پکڑے نہیں گئے
ورنہ اب تک ہر جرم کا اعتراف کرچکے ہوتے اور تمہاری
شاہد برآمد ہوکے واپس پہنچ گئی ہوتی وہیں۔ میرے لیے الگ
پریشانی ہوتی کیونکہ تم نے اسے میرے مکان میں رکھا تھا۔
مکان بھی کل ہی دیا تھا میں نے تمہیں۔ اب تم فوراً جاؤ اور
اسے لے کر آؤ۔ ایک گھنٹے میں شاہد کو میرے گھر پہنچادو۔ باقی
باتیں میں اس کو سمجھاؤں گا اور دیکھو' ٹیکسی لے کر جاؤ۔ اچھا
نھمو' میں بھی آفس بند کرکے گھر ہی جارہا ہوں" اس نے انٹر
کام کا بٹن دبا کے کسی ماتحت کو بلایا۔

دس منٹ بعد میں اس کی شاندار گاڑی میں بیٹھا ہوا خود
کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ آج میں
صرف قسمت سے بچ گیا تھا۔ بروقت ہاشمی صاحب کو سب
بتانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو ایک دو دن میں میری گرفتاری یقینی
تھی پھر تھانے والے میرے سر سے عشق کا بھوت ایسے
اتارتے کہ میں خود بھوت بن کے عالم ارواح میں بھٹکتا پھرتا۔

میں نے کہا "سر۔ آپ تو بہت بڑے وکیل ہیں۔ بہت
فیس لیتے ہوں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مسکرایا "ہاں... لیکن بعض اوقات بڑے وکیل آئینی معاملات یا بنیادی حقوق کے لیے اور حکومت کے غیر قانونی اقدامات کے خلاف خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی میں کیس بلا معاوضہ لڑتے ہیں۔"

"میرا کیس بھی ہمدردی میں لے رہے ہیں آپ؟"

"یہی سمجھ لو۔ تم دونوں یتیم ہو اور مظلوم ہو۔ میرے نزدیک حق پر ہو۔ تمہاری نیت ٹھیک ہے اور تم میری فیس دے بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "سر' آپ کا یہ احسان۔"

"احسان کے بدلے کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک بات یاد رکھو۔ زندگی میں کبھی موقع ملے تو کسی ضرورت مند کی مدد کرتے وقت یہ مت سوچنا کہ تمہارا وقت ضائع ہو گا یا تمہیں پریشانی ہو گی اور نقصان ہو گا۔ کسی کے لیے کچھ کرنے میں کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ وقت یا پیسہ یا توجہ۔ اپنی کوئی چیز یا جگہ۔ کوئی مشورہ یا تسلی اور ہمدردی کے دو بول۔ اکثر لوگ استطاعت رکھتے ہیں کچھ نہ کچھ دینے کی مگر نہیں دیتے۔ اس لیے معاشرے میں اتنی نفسا نفسی اور بے حسی آ گئی ہے۔ کوئی نیکی ہفت میں بھی ملتی ہو تو لینے والا نہیں ملتا۔ ہے نا یہ افسوس کی بات" انہوں نے گاڑی روک دی "جاؤ' اسے لے آؤ۔"

میں خاموشی سے اتر گیا۔ سب لوگ کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ماسی ہیر نے دعوت جیسا اہتمام کیا تھا۔ میں نے شاہدہ سے چلنے کے لیے کہا تو اسے مایوسی ہوئی "کھانا تو کھا کے جاؤ۔"

میں نے کہا "واپس آ کے کھائیں گے۔ باہر وکیل صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں۔"

شاہدہ نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شاید میری صورت سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ شاہ جی نے میرے خلاف کیا رپورٹ لکھوائی ہے۔ اب وکیل صاحب ہی ہمیں بچا سکتے ہیں۔ انہیں ہر بات بالکل سچ بتانی ضروری ہے اور ان کے مشورے کو بلا چون وچرا قبول کرنا پڑے گا ورنہ مجھے جانا پڑے گا جیل اور اسے واپس اپنے اسی گھر میں۔

ہاشمی صاحب نے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ ان کی کوٹھی دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر مشہود کی کوٹھی کی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ پھر انہوں نے وسیم سے وہ فضول سا مکان کس کے لیے خریدا تھا۔ ان کے عالی شان ڈرائنگ روم کی آرائش بھی قابلِ دید تھی۔ شاہدہ مسحور سی ہر چیز کو دیکھتی رہی اور مجھ سے احمقانہ سوالات کرتی رہی مثلاً یہ کہ اس چیز کی کیا قیمت ہو گی۔ کوٹھی میں کتنے کمرے ہیں' ملازم کتنے' وکیل صاحب ہر مہینے کتنا کماتے ہوں گے۔ جھلا کے میں نے کہا کہ "تم اب یہیں رہو گی۔ خود وکیل صاحب سے پوچھ لینا۔"

"میں یہاں رہوں گی' کیوں؟"

میں نے اسے بتایا۔ اس ماحول کی شان و شوکت نے ہمیں مرعوب کر دیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ایک خادم آیا اور ہمارے سامنے ٹرے میں کھانا رکھ گیا۔ وکیل صاحب انڈر ڈائننگ ہال میں کھانا کھا کے آئے۔

"شاہدہ۔ تمہیں ناصر نے سب سمجھا دیا ہے؟" انہوں نے بیٹھ کے سگار جلایا۔

"جی۔ بتایا ہے" شاہدہ ان کی دوستانہ شخصیت سے متاثر ہوئی۔

"اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ دکھاؤ۔"

شاہدہ نے انہیں بیگ سے سرٹیفکیٹ نکال کے پیش کیا۔ انہوں نے اس پر ایک نظر ڈال کے کہا "ہوں!" اور کچھ سوچنے لگے "اس پر شاہ جی نے خود کو تمہارا باپ ظاہر کیا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ تمہارا باپ نہیں۔"

شاہدہ بوکھلائی "ثبوت... ثبوت تو کوئی نہیں۔"

"کوئی گواہ ہے۔ کسی ایسے شخص کو جانتی ہو تم جس نے تمہارے ماں باپ کو ایک ساتھ دیکھا ہو۔ جسے معلوم ہو کہ وہ میاں بیوی تھے؟"

شاہدہ نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا "میں بہت چھوٹی تھی۔"

"پھر تم کیسے جانتی ہو کہ تمہاری ماں کوئی اور تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے شاہ جی نے تمہارے باپ کو مروایا۔ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹایا۔ کیا بعد میں شاہ جی نے شادی کر لی تھی تمہاری ماما سے۔"

"نہیں" شاہدہ نے جھجک کے کہا "سنا ہے میں نے..."

"کس سے سنا ہے؟"

"کچھ لوگ ہیں... جو مجھے سب بتاتے رہے۔"

ہاشمی صاحب اسے دیکھتے رہے "لڑکی۔ کیا سب لوگ سچ بولتے ہیں؟ اور جن لوگوں نے تم کو یہ سب بتایا' کیا وہ ضرورت پڑنے پر مانیں گے کہ انہوں نے ہی تمہیں ہر بات بتائی تھی؟ نہیں' وہ صاف انکار کر دیں گے۔ کیا پتا کہ ان کی کیا نیت تھی۔ کوئی تمہیں شاہ جی کے خلاف کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا تھا یا تمہیں متاثر کرنے کے لیے ہمدردی کے

تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تم بہت خوب صورت اور جوان ہو۔ تمہارے لیے کون جھوٹ نہیں بول سکتا مگر میں فرض کر لوں کہ انہوں نے سچ ہی بتایا تھا تب بھی ان کی گواہی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ جی کے خلاف عدالت میں کوئی نہیں بولے گا' اس لیے یہ سب بھول جاؤ۔"

شاہدہ نے سر ہلایا "اچھا جی۔"

"تمہیں وہی کہنا ہے جو میں کہوں۔ شاہ جی قانونی طور پر تمہارا باپ ہے اور تمہارے لیے انکار کرنا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہو گا کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔ تم صرف یہ کہو کہ بچپن سے تم بھیک مانگ رہی تھیں کیونکہ شاہ جی کا حکم تھا۔ تم اس وقت بھی بھیک مانگنے سے نفرت کرتی تھیں مگر شاہ جی انکار پر تمہیں مارتا تھا۔ جب تم بڑی ہو گئیں تو اس نے تمہیں بھیس بدل کے فقیروں کی جاسوسی پر لگا دیا۔ یہ حقیقت ہے اور تم جو جانتی ہو' کھل کے بتا سکتی ہو۔ ایک باپ اپنی جوان بیٹی سے ایسا غیر اخلاقی کام کرائے تو وہ قانونی طور پر بھی مجرم ہو جاتا ہے۔ تمہیں یہی کہنا ہے کہ وہ جبر کرتا تھا اور تمہارے لیے انکار ممکن نہیں تھا مگر اب وہ تمہاری شادی کسی فقیر سے کرنا چاہتا تھا جو عمر میں تمہارے باپ کے برابر تھا۔ تم نے انکار کیا تو تم پر تشدد کیا گیا۔ موقع پاتے ہی تم گھر سے فرار ہوئیں اور عدالت آ گئیں۔ تم کسی وکیل سے ملنا چاہتی تھیں۔ تمہاری ملاقات مجھ سے ہو گئی اور میں تم کو اپنے گھر لے گیا۔ تم ناصر عظیم کو جانتی ہو اور رئیس خاں کو بھی۔ وہ فقیروں میں شامل تھے۔ ناصر عظیم کچھ پڑھا لکھا تھا اور شاہ جی اس پر اعتبار کرتے تھے مگر اس سے تمہارا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے تمہیں اغوا نہیں کیا۔ اس کے خلاف شاہ جی نے کوئی رپورٹ لکھوائی ہے تو وہ غلط ہے۔ شاید شاہ جی کی اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہو گی۔ ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ زیور والی بات بھی غلط ہے۔ تم شاہ جی کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں کیونکہ تم اس پیشے اور ماحول سے نفرت کرتی ہو اور عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ اگر تمہیں اپنے باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا گیا تو تمہیں ڈر ہے کہ زبردستی تمہاری شادی کسی فقیر سے کر دی جائے گی۔ تم پڑھنا چاہتی ہو اور واپس جانے پر کسی صورت تیار نہیں۔ حالات اور واقعات کی شہادت پر تمہارا یہ بیان عدالت قبول کرے گی اور تمہیں اپنی مرضی سے آزادانہ زندگی گزارنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ اس کے بعد تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ایڈووکیٹ گلزار ہاشمی کے گھر میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ والدہ کی طرف سے ان کی میری رشتے داری تھی اور میں ان سے مل چکی تھی۔ اس لیے ضرورت پڑنے پر میں ان کے پاس گئی تھی۔ بس یہی ہو گا تمہارا بیان۔ اس کے بعد میں تمہارا ضامن ہو جاؤں گا۔ عدالت تمہیں میرے گھر میں رہنے کی اجازت دے دے گی۔ کل میں تمہارے اور ناصر کے لیے بلوغت کے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانے کا انتظام کروں گا اور کل ہی شاہ جی کو اپنے آفس میں بلا کے اس سے بات بھی کروں گا کہ وہ ایف آئی آر میں لگائے ہوئے الزامات واپس لے کر معاملہ ختم کر دے ورنہ وہ خود مشکل میں پڑ جائے گا۔ لڑکی اس کا سارا کچا چٹھا عدالت میں سب کے سامنے کھول دے گی۔ عدم ثبوت پر اس کا بری ہو جانا اور ضمانت پر رہائی حاصل کر لینا' یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس کے خلاف قتل کے بہت سے الزامات کی تفتیش شروع ہو سکتی ہے۔ اس کا سارا کاروبار ختم ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے اس کو جیل ہو جائے۔ ایک تو میرے آفس میں میرے سامنے وہ زیادہ چیں چپڑ نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے کہ میں کون ہوں پھر وہ خود بھی سمجھ لے گا کہ لڑکی وکیل صاحب کے گھر میں ہے تو اس کے خلاف کچھ بھی کہہ سکتی ہے اور وہ لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ الٹا میں نے درخواست لگا دی کہ لڑکی کو اس سے جان کا خطرہ ہے تو اسے ضمانت پہلے داخل کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "یہ تو محفوظ ہو جائے گی وکیل صاحب۔ میرا کیا بنے گا؟"

"ہاں۔ اب رہا تمہارا مسئلہ" انہوں نے پھر سگار جلایا۔ "تم اور رئیس ایک تو ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے درخواست دو گے مگر ابھی نہیں' پہلے شاہدہ کا معاملہ طے ہو جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کوشش کی تب بھی ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ اس کے بعد تمہاری درخواست آئے گی تو منظور ہونے کا امکان زیادہ ہو گا۔ کوئی ضامن ہے تمہارے پاس؟"

میں نے مایوسی سے کہا "ایسا ضامن کوئی نہیں۔"

شاہدہ نے کہا "کیوں؟ ڈاکٹر مشہود تمہاری ضمانت نہیں دے سکتے؟"

"یہ ڈاکٹر مشہود کون ہیں؟"

اب مجھے ان کے بارے میں بھی بتانا پڑا "وہ بہت اچھے آدمی ہیں مگر۔ شاہدہ کے معاملے میں ان کو کچھ پتا نہیں۔ میں نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور ڈاکٹر بنوں۔"

"اور تم صرف مجنوں بننا چاہتے تھے؟" ہاشمی صاحب نے طنزیہ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی۔ یہ بات نہیں۔ میرے اپنے عزائم ہیں۔"

"کیا عزائم ہیں۔ آخر کیا بننا چاہتے ہو تم؟ میٹرک کا امتحان ابھی دیا نہیں تم نے۔ عمر ہے اٹھارہ سال۔ یہ بھی شناختی کارڈ کی رو سے۔ اگر تمہاری ناقص عقل میں میری بات آتی ہے تو ابھی نقصان نہیں ہوا۔ واپس لوٹ جاؤ۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں آرام سے رہو اور پڑھو۔ وہ ڈاکٹری بنانا چاہتے ہیں نا۔ موٹر مکینک یا موچی تو نہیں۔ میں کسی پیشے کی تحقیر نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے لیے وہ اعلیٰ مقصد سامنے رکھ کر سوچتے ہیں تو یہ ان کی بڑائی ہے۔ کیا INTEREST ہے آخر ان کا تمہاری کامیابی میں؟ ان کی کوئی بیٹی ہے یا بہن ہے جس کے لیے وہ سوچ رہے ہوں کہ گھر داماد تیار کرلیں؟"

میں نے سر جھکا کے کہا "کوئی نہیں۔"

"پھر۔ شادی کی جلدی ہے" انہوں نے خفگی سے کہا۔ "اس عمر میں۔"

میں نے کہا "ایک بات تو یہ ہے سر۔ کہ ڈاکٹر میں بن ہی نہیں سکتا۔ میں پرائیویٹ امتحان دوں گا اور سائنس کا مضمون نہیں لے سکتا۔ ڈاکٹر صاحب یہ بات بھولے ہوئے تھے۔ میں بی اے کے بعد قانون پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت چالاک ہو۔ وکیل کے سامنے بیٹھ کے بات کر رہے ہو نا۔"

میں نے کہا "مجھے اندازہ تھا کہ آپ ایسا ہی سوچیں گے مگر میں جھوٹ نہیں بولتا۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گا۔ آپ کی مرضی ہے اعتبار کریں' نہ کریں۔"

شادو نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کرلیا "وکیل صاحب۔ یہ تو وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔ پوچھ لیں اس سے؟"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "یہ کواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بچپن کی بات تھی۔ جب مجھے وزیراعظم کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا۔"

ہاشمی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا "بچپن کی سہی مگر بات تو شاہدہ کی غلط نہیں تھی۔ عام طور پر بچے ڈاکٹر' انجینئر یا پائلٹ بننے کی بات کرتے ہیں' تمہیں سیاست سے دلچسپی تھی۔ یا ہے؟"

"بالکل نہیں سر۔ میں صرف دولت مند بننا چاہتا ہوں۔ بہت دولت کمانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ دنیا میں طاقت صرف دولت کا نام ہے۔ غریب پیدا ہونا' غریب جینا اور غریب مرجانا میرے نزدیک جرم ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرا احساسِ محرومی ہے۔ احساسِ کمتری ہے۔ جو بھی ہے' مجھے اس سے انکار نہیں۔ نہ دولت مند ہونے کی خواہش رکھنا اخلاقی اور قانونی اعتبار سے غلط ہے۔ نہ جرم ہے۔"

ان کی آنکھوں میں اب تجسس کی چمک آگئی تھی "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہر شخص کو عیش و عشرت کی زندگی گزارنے یا اس کی خواہش رکھنے کا حق ہے۔ دولت کو مقصد بنانا بھی جائز ہے مگر تم دولت کیسے کماؤ گے؟"

میں نے کہا "محنت سے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم جیسے نوجوان کو معلوم ہوگا کہ محنت اور صرف محنت سے زندگی آرام کے ساتھ گزاری جاسکتی ہے مگر دولت سے طاقت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اتنی دولت جو طاقت ہو' صرف ناجائز ذرائع سے آتی ہے۔"

"میں بزنس کرسکتا ہوں۔"

"قانون پڑھ کے؟" ہاشمی صاحب نے کہا "مجھے بے وقوف مت سمجھو نوجوان' بچے کی خواہش میں بھی اس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ تمہارے لاشعور میں بھی یہ بات ہے کہ قانون کو راستہ بنا کے تم سیاست کے اور اقتدار کی منزل تک پہنچ سکتے ہو۔ اقتدار کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو قائداعظم سے سہروردی یا فیروز خان نون تک تھا۔ یہ سب لوگ وکیل تھے اور کامیاب سیاست داں مگر اب کامیاب سیاست داں کا نام بدنام ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ کیوں؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "میں لوٹ مار کے لیے اور ملکی دولت کے وسائل پر قابض ہونے کے لیے وزیراعظم نہیں بننا چاہتا تھا۔"

"پھر دولت کی طاقت سے تمہاری کیا مراد تھی؟ تم کسی مافیا کے سربراہ بنو گے؟ ۔۔۔ خیر' مجھے کیا ضرورت ہے اس بحث میں پڑنے کی۔ تم وہی کرو گے جو تم چاہو گے۔ مسئلہ تھا تمہاری ضمانت تحلیل از گرفتاری کا' وہ حل ہوجائے گا۔ اگر تم کو پولیس کے یا شاہ جی کے تحبوں نے پہلے ہی پکڑ لیا۔۔۔۔ تو میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

"میں نقد ضمانت جمع کرا سکتا ہوں۔"

"ایک لاکھ کی ضمانت مانگی عدالت نے۔۔۔ پھر؟"

میں نے کہا "میں فراہم کردوں گا۔"

وہ کچھ دیر حیران بیٹھے رہے۔ "آئی سی۔ تم پہلے ہی دولت مند ہو۔ اس کی طاقت حاصل کرچکے ہو۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیسے۔ مگر تم جاؤ۔ مجھ سے رابطہ رکھو مگر سامنے آئے بغیر۔"

شادو نے کہا "وکیل صاحب۔ شاہ جی اسے نقصان نہ پہنچائے۔"

ہاشمی صاحب نے اس کے لہجے کی بے قراری کو محسوس کیا اور مسکرائے "نہیں پہنچائے گا۔ تم تسلی رکھو۔ اسے کچھ ہوا تو تم بھی جان سے جاؤ گی' مجھے معلوم ہے۔"

ہاشمی صاحب کی باتوں سے شادو کی حوصلہ شکنی ہوئی تھی اور مجھے بھی شرمندگی کا احساس تھا لیکن ان کی باتوں کی سچائی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا پھر ان کے علاوہ ہمارا مددگار کوئی نہیں تھا اور اتنے بڑے وکیل کا محض ہمدردی میں ہمارا ساتھ دینا کسی طرح بھی نائید ایزدی سے کم نہ تھا۔ انہی کے طفیل ہمیں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی میسر آیا تھا۔ میری بات کا ردِعمل الٹا ہوتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ چلو میاں مجنوں' مجھے اپنے جھگڑے میں مت گھسیٹو۔ کہیں اور جاؤ اپنی لیلیٰ کے ساتھ۔ شاہ جی جیسے خطرناک شاطر کا مقابلہ گلزار ہاشمی جیسا مضبوط مہرہ ہی کرسکتا تھا۔ ان کا نام بڑا تھا اور پولیس بھی ان کے کسی مؤکل پر لاقانونیت کا ڈنڈا نہیں چلا سکتی تھی۔

میں جانے کے لیے اٹھا تو شادو کی صورت ایسے اترگئی جیسے میں طویل عرصے کے لیے یا رخصت ہو کے بہت دور جا رہا ہوں۔

ہاشمی صاحب نے کہا "لڑکی کا مؤقف مضبوط ہے اور میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس نے ایک اعلیٰ مقصد اور باعزت زندگی کے لیے اپنے ماحول کو چھوڑا لیکن تم پھر سوچو' ابھی وقت ہے۔ جذباتی جلد بازی میں اپنا مستقبل داؤ پر مت لگاؤ۔ تم ڈاکٹر مشہود کے گھر میں بہت محفوظ رہو گے اور۔۔۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ میں واپس نہیں جاسکتا۔"

"آخر کیوں۔ تمہیں اچھا دوستانہ ماحول میسر ہے۔ تم ایک مہذب فیملی میں رہتے ہو اور تمہارے پاس مواقع ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے' ترقی کرنے کے۔ شادی کوئی مقصد نہیں ہوتی۔ سب کی ہوجاتی ہے اور ایسے کروا دیے۔ سر سے کفن باندھ کے کروا سہرا باندھ کے۔ دو چار مہینے گزرتے ہیں تو سب شادیاں ایک برابر ہوجاتی ہیں لیکن جو وقت گزر جاتا ہے اور جو نقصان ہوجاتا ہے' اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔"

"مجبور! مائی فٹ۔ سیدھی طرح کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ تم میں صبر نہیں ہے۔ انتظار کا حوصلہ نہیں ہے۔ تم دوری برداشت نہیں کرسکتے۔ ڈرتے ہو کہ تمہارے یا اس لڑکی کے جذبات جو آج ہیں وہ کل بدل نہ جائیں۔ اعتماد کی کمی ہے یہ جو تمہیں مجبور کرتی ہے کہ محبت پر نکاح کی مہر تصدیق آج ہی لگ جائے تاکہ تمہیں ایک دوسرے کے حقوقِ ملکیت حاصل ہوجائیں۔ بھروسا ہو اپنی محبت پر تو ڈر کیسا۔ چار چھ سال کیا' ایک عمر گزر جائے مگر جذبات نہیں بدل سکتے۔ تم وہاں رہو آرام سے۔ یہ یہاں رہ سکتی ہے۔ محبت کرو' ملو' گھومو پھرو مگر ایک ڈسپلن کے ساتھ۔ یقین اور ضبط کے ساتھ۔ جو چیز تمہاری ہے' وہ تمہاری رہے گی۔ بلاوجہ پریشان اور خطرہ مول لینے سے کیا محبت بڑھ جاتی ہے۔ آج رسک زیادہ ہے' تم ایک دوسرے کے جذبات کو آزما بھی سکتے ہو کہ یہ وقتی کیفیت تھی یا تمہاری پسند بدل نہیں سکتی۔"

میں نے ٹالنے کے لیے کہا "لیکن سر۔ اتنی بڑی ذمے داری آپ کے لیے۔"

"ذمے داری میں کیا مجھے سر پر پہاڑ اٹھانا ہے؟ اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ خدا کا شکر ہے مالی مسئلہ کوئی نہیں۔"

مجھے اب ان کے دلائل سے چڑ ہونے لگی تھی "سر۔ ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں۔ اتنی بڑی اور شاندار کوٹھی ہے آپ کی پھر آپ نے وہ مکان کیوں خرید لیا شادو سے۔ میں نے ایک بار آپ کو موٹر سائیکل پر دیکھا تھا۔"

"ہاں۔ شاید گاڑی سروس کے لیے گئی ہوگی" انہوں نے بے نیازی سے کہا "مکان تو میں نے ایک ملازمہ کے لیے لیا تھا۔ وہ بیوہ ہے اور اکیلی ہے۔ ساری عمر خدمت کی ہماری۔ بیٹے بہو کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر بچ گئی نہیں۔۔۔ اگر تم صبح جلدی آجاؤ تو میرے ساتھ چلو۔ گاڑی مجھے کورٹ میں چھوڑ دے گی' پھر ڈرائیور تم دونوں کو سول سرجن کے پاس لے جائے گا۔ میں فون کردوں گا اسے۔"

میں نے کہا "میں آجاؤں گا سر۔"

واپسی پر میں کچھ دل شکستہ' مایوس' خوف زدہ اور پریشان تھا۔ میں نے سارا دن کسی ڈر کے بغیر گھومتے پھرتے گزار دیا تھا لیکن اب ہاشمی صاحب کے گھر سے نکلا تو مجھے ہر طرف خطرہ نظر آرہا تھا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کے گھر پہنچا۔ رات کے گیارہ بجے رحیمی دروازے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"یار آپا جی کہاں ہے؟" مجھے اکیلا دیکھ کے وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

میں نے کہا "وہ واپس چلی گئی یار۔ ڈر گئی۔"

"بکواس کرتا ہے تو۔ وہ ایسی نہیں ہے۔"

میں اس کے پاس آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا "ابے سب ایک جیسی ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ باسی کڑھی کا ابال ہوتی ہے ان کی محبت۔ ہاشمی صاحب نے سمجھایا اور ڈرایا کہ یہ ہوجائے گا' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوجائے گا۔ بس ایز گیا عشق کا بخار۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اے نہیں۔ اپنا دل نہیں مانتا۔"

"پھر کیا میں اسے خود واپس کر آیا؟ رکھوا دیا اسے کسی بینک کے لاکر میں یا بیچ دیا؟" میں نے جیب سے دس ہزار کی گڈی نکالی۔

"قسم اللہ کی۔ خنجر گھونپ دوں گا" اس نے جیب سے کمانی دار چاقو نکال کے کھولا اور اس کی دھار پر انگلی پھیری۔

میں نے ریوالور نکال لیا "چل پھر آجا مقابلے پر۔ سالے شاہ جی کے غبارے کی ہوا نکل گئی تھی اسے دیکھتے ہی۔"

"سیدھی طرح بتا یار۔ مجھے آپا جی کے سر کی قسم۔ ورنہ میں بلاتا ہوں ماسی ہیر کو۔" وہ بولا "اس کی زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو مشین گن سے بھی۔"

میں نے کہا "کیا وہ سوگئے ہیں؟"

"ہاں۔ ایک رات کی جدائی تو برداشت کرلی تھی ہیر رانجھا نے۔ آج ایک کمرے میں گھس کے سوگئے۔ آج نہیں سوچا کہ شاہو کہاں سوئے گی' نہ تیرے ساتھ نہ میرے ساتھ تو کیا برآمدے میں اکیلی۔"

میں نے کہا "چل دروازہ باہر سے بند کردے۔ ہم چلتے ہیں کہیں چائے پینے' شاہو کا اب کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہے گی۔ کمرے میں صرف میں اور تو۔"

چائے پینے کے لیے ہمیں کافی دور جانا پڑا۔ راستے میں اسے میں نے ہاشمی صاحب سے ملاقات کی ساری روداد سنادی۔

"ابے یہ تو بڑا کمال ہوگیا۔ ایسی کی تیسی شاہ جی کی۔ یہ تو بالکل فرشتہ غائب ثابت ہوا۔"

"فرشتۂ غیب" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی اور مجھے اس کی بات سولہ آنے کھری لگتی ہے۔ تو چلا جا واپس۔ ہم اسی طرح یہاں رہیں گے جیسے وہاں رہتے تھے۔"

میں نے کہا "پاگل کے بچے۔ واپس کیسے چلا جاؤں۔ وہاں وہ خوب صورت بلا جو بیٹھی ہے۔ وہ کھا جائے گی مجھے۔"

رئیس ہنسنے لگا "پیارے' جب تک گھر کی مرغی نہیں۔ ملتی' دال کھا اور یار' دال بھی مزے کی ہے۔ خوش قسمتی ہے تیری۔ خوب صورت بلا کیا بدصورت چڑیل تک نہیں ملتی ہمیں تو۔ عیش کر جب تک نصیب میں ہے۔"

میں نے کہا "رئیس ہجس دن ڈاکٹر صاحب کو شک بھی ہوگیا نا بیٹا' وہ لگادیں گے زہر کا انجکشن۔ پوسٹ مارٹم تک نہیں ہوگا۔ کتنی ذلت ہوگی اگر احسان فراموشی اور نمک حرامی کے الزام میں مارا گیا۔"

"نمک تو نے چکھ تو لیا۔"

"اسی لیے ڈرتا ہوں اب۔ میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں مگر وہاں نہیں اور سوچ جو بات۔ مجھے معلوم ہے وہ تیری جی کو پتا چل جائے تو وہ کیا حشر کرے گی میرا۔ وہ بڑی خونخوار چیز ہے۔ مجھے بھی مار ڈالے گی اور خود بھی مرجائے گی۔ نہیں یار' جو ہاشمی صاحب کہہ رہے ہیں' وہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے۔ آپا جی کو رہنے دے وہاں۔ تو یہاں رہ۔ پڑھ آرام سے۔ ہم بھی کریں گے کوئی کام۔ عادت تو نہیں ہے محنت کرنے کی مگر اب ڈالیں گے پیارے۔ ڈاکٹر رانجھا کے کلینک میں جھاڑو دیں گے اس سے کہیں گے چپراسی رکھ لے' کمپونڈر بنالے۔"

"ساری عمر یہی کرے گا؟ ایسے زندگی گزرے گی ہماری؟"

"تو پڑھ لکھ کے بڑا آدمی ضرور بنے گا پھر اپنے دن بھی پھریں گے۔ ابھی سے شادی کے چکر میں مت پڑ پیارے۔ سال کے سال بچے ہونے لگیں گے۔"

میں نے جھنا کے کہا "بند کر اپنی بکواس۔ سارا زمانہ میری شادی کے خلاف ہوگیا ہے۔ جیسے شادی کے بعد آدمی کچھ کرہی نہیں سکتا۔ سب نیت کی اور ارادے کی بات ہے۔ میں کرکے دکھاؤں گا۔ میں اور شاہو مل کے سب کو غلط ثابت کردیں گے جو اس شادی کو بربادی سمجھتے ہیں۔"

"شاہو کیا کہتی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی موقع نہیں ملا اس سے بات کرنے کا۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"پتا نہیں کیوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس پر ہاشمی صاحب کی باتوں کا اثر ہورہا تھا۔ وہ بات ہی ایسے کرتے ہیں۔ وکیل ہیں نا' ان کے دلائل کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ رہے گی وہاں تو کہیں اس کے خیالات نہ بدل جائیں۔"

"آپا جی بہت سمجھدار ہے۔"

"اور میں بے وقوف گدھا ہوں" میں نے جھلا کے کہا۔ "اس کی خاطر ہی سب کیا تھا۔ فقیر بننے کی ذلت تک اٹھائی تھی۔ اب وہ بھی کہے کہ واپس چلا جا تو۔ لعنت مجھ پر' اور اس محبت پر۔"

"بس۔ اتنی جلدی لعنت بھیج دی۔ ابھی کچھ ہوا نہیں

اور تو نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ وکیل صاحب کی بات سچ ہوگی نا۔ ایسی محبت پر واقعی لعنت جو دور رہنے سے ختم ہوجائے۔ اب چھ سال کیا سو سال بعد بھی جذبات وہی رہنے چاہئیں اگر محبت سچی ہے۔"

میں نے خفت مٹانے کے لیے کہا "یہ وہ قصے کہانیوں والی لیلیٰ مجنوں کی محبت نہیں ہے۔ فلمی ڈائیلاگ مت مار میرے سامنے۔ میں نہیں رہ سکتا اس کے بغیر۔"

"الو کے پٹھے۔ کوئی چھین رہا ہے اسے تجھ سے۔ کیا وکیل صاحب نے کہا ہے کہ ملنے پر پابندی ہوگی۔ ایک دوسرے سے پردہ کروگے تم۔"

میں نے کہا "کوئی اور بات کر یار۔ تو نہیں سمجھ سکتا میری بات اور میں پاگل ہوں' کسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ہم کچھ دیر خاموشی سے چائے کا دوسرا کپ ختم کرتے رہے پھر میں نے رئیس کو اس عورت کے بارے میں بتایا جو گزشتہ رات ہمیں ایک خط دے گئی تھی۔

"اس نے بتایا تھا کہ لڑکا بیمار ہے۔ اسے مرے تین دن ہوگئے اور وہ مکان خالی پڑا ہے دو دن سے۔" میں نے اسے صفدر سے ہونے والی بات بتائی۔

"قسم اللہ کی یار۔ مجھے ڈر لگتا ہے اب تو۔ یہ واقعی آسیب کا چکر ہے۔"

"دیکھ روح والا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ وہ ناصر کی ماں نہیں تھی جو مجھے یہاں لائی تھی" میں نے کہا۔

"مگر اور بہت سی باتیں ہیں پیارے جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں سے بھاگنا پڑے گا کسی دن" وہ اٹھ کھڑا ہوا "ورنہ کوئی بھوت چمٹ جائے گا یا بھتنی پیچھے لگ جائے گی۔"

رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا۔ شاہو قریب آکے پھر دور چلی گئی تھی۔ میں دل کو سمجھاتا رہا کہ یہ دوری کیسی' مجبوری ہے۔ اس کے تحفظ کی ضامن ہے اور یہی طلب کی منزل کا راستہ ہے۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ میرے تاریک تصور میں فروزاں رہا اور اس کے خیال کا آزار دل میں میٹھی میٹھی خلش جگاتا رہا۔

ہاشمی صاحب نے مجھے صبح جلدی بلایا تھا۔ اس وجہ سے بھی میری آنکھ جلدی کھلی تھی۔ کچن میں ماسی ہیر کی کھٹ پٹ سنائی دے رہی تھی کہ وہ ناشتے کی تیاری کررہی ہے۔ ڈاکٹر رانجھا غسل خانے میں گاؤن اور نماز رہے تھے "ڈولی چڑھیاں ماریاں ہیر چیخاں۔"

میں نے کچن میں جھانک کے کہا "دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے پھر یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہائے کس ڈرامے کی بات کررہا ہے تو۔" وہ آنکھیں نکال کے بولی۔

"یہ جو تمہارا رانجھا کہہ رہا ہے کہ ڈولی میں بیٹھتے ہوئے تم نے چیخیں ماری تھیں" میں نے کہا۔

اس کے اٹھلانے اور شرمانے پر مجھے شتر غمزے کی تشبیہ یاد آئی "وہ تو سب کڑیاں روتی ہیں' تو کدھر مرگیا تھا رات؟"

"میں آیا تو تم بھی ایک ساتھ مرے پڑے تھے۔ ہیر رانجھا۔"

وہ کچھ جھینپی "دراصل رانجھے کا حال کچھ ٹھیک نہیں تھا۔"

میں نے کہا "دل کا حال؟"

اس نے چمٹا اٹھایا "مار کھانی ہے سویرے سویرے۔ شاہو کو کدھر چھوڑ کے آیا ہے؟"

"اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ کہنے لگی یہ بھی گھر ہے کوئی۔ مرغی کا دڑبا۔ وکیل صاحب کی بڑی عالی شان کوٹھی ہے۔ اس کی کار میں بیٹھ کے گئی تو واپس آنے سے انکار کردیا۔ اب وہیں رہے گی" میں نے منہ بسور کے کہا۔

"ہائے وہ کیوں؟" اس نے چائے کا ایک کپ میرے سامنے رکھ دیا۔

"عورت کی ذات ہی بے وفا ہے" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "دولت پر رجھ گئی اس کی۔ اب تم ہی انصاف کرو۔ پچاس سال کا تو ہوگا وکیل۔ گنجا ہورہا ہے اور ہے بھی مجھ سے ایک بالشت کم۔ مجھے دیکھو کیسا گبرو جوان ہوں۔ ایسا سوہنا منڈا کہ تم سے کہوں تو تم رانجھے کو چھوڑ کے میرے ساتھ بھاگ جاؤ گی۔"

اس نے محبت اور غصے میں میرے ایک چمٹا رسید کیا۔ "بکواس کیے جارہا ہے' صحیح بات بتا۔"

مسز رانجھا سر کے صحرا میں کہیں کہیں نظر آنے والے بالوں کے گلستان کی اصل زلف دراز قلہ ہیئر آئل سے آبیاری کرتے ہوئے نمودار ہوئے "بھئی ہم نے بڑے چمٹے کھائے ہیں۔ آہ کیا چیز تھی جوانی بھی۔ کیا راز و نیاز چل رہے ہیں خیر سے؟"

میں نے کہا "ہیر ورغلا رہی ہے مجنوں کو کہ مجھے بھگا کے لے جاؤ۔ رانجھا کیا کہتا ہے؟"

دوسرے چمٹے سے بچنے کے لیے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر رانجھا بہت خوش تھے اور اس سین سے محظوظ ہوئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ تمہاری لیلیٰ کو کیا فرہاد لے گیا۔ بڑی گڑبڑ ہے بھئی' کیا زمانہ آگیا ہے۔"

میں نے کہا "واپس آ کے بتاؤں گا۔ ابھی دیر ہو رہی ہے۔"

ہیر نے کہا "کہتا ہے وہ ادھر ہی رہے گی' وکیل کے گھر میں۔"

رانجھا میری جگہ بیٹھ گیا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اوئے کاکا جی' آج افتتاح ہے بھئی کلینک کا۔ بعد نمازِ ظہر رنجیلا آئے گا' تم بھی آجاؤ۔"

"رنجیلی آئی تو میں ضرور آجاتا۔ ابھی تو جا رہا ہوں میں۔ واپسی پتا نہیں کب ہو گی پھر بھی کوشش کروں گا" میں نے بالوں میں کنگھی پھیری اور دس ہزار روپے ماسی ہیر کی طرف بڑھا دیئے "یہ رکھ لو۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "یہ کس لیے؟"

میں نے کہا "خرچ کے لیے۔ گھر میں ضرورت ہو گی۔"

"ہائے جھلا نہ ہو تو۔ خرچ کیسا۔" اس نے خفگی سے کہا "چل پکڑ۔"

رانجھا نے بھی سر ہلایا "کاکا جی۔ اللہ کے فضل سے دال روٹی چل رہی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ تمہاری وجہ سے سڑک پر نہیں بیٹھے ہیں۔ رئیس پہلے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ایک تمہارے آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا "اچھا ایسے ہی رکھ لو۔ میں کہاں ساتھ لیے پھروں گا۔ بس میں جیب کٹ گئی تو سب جائیں گے۔"

وہ پراٹھے بنانے لگی تھی اور معصر تھی کہ میں کھا کے جاؤں مگر میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ہاشمی صاحب کے گھر پہنچنے کے لیے مجھے رکشا لینا پڑا۔ وہ تیار رہتے اور شاید پانچ منٹ بعد نکل جاتے۔

پچھلی سیٹ پر شادو کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس مسافر کی طرح جو سیاہ پتھر کے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے رات بھر بھٹکتا رہے اور صبح دیکھے تو دوسری طرف پھولوں کے سارے رنگ سورج کی کرنوں سے دمکتے نظر آئیں۔ یہ ایک رات کی جدائی کا اثر بھی تھا کہ اس کی مسکراہٹ کا شرمیلا انداز مجھے گھائل کر گیا۔ وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے کپڑے بھی نئے پہن رکھے تھے جو اس کے بدن پر ایسے آئے تھے جیسے اسی کے لیے سیے گئے تھے۔ گہرے کتھئی رنگ کی شلوار قمیص پر موتیے کے سفید پھول جگمگا رہے تھے اور اسی رنگ کا چھاپا ہوا جارجٹ کا دوپٹہ اس کے شانوں پر تھا۔ اس نے نہا دھو کے بال برش کیے تھے اور ہیئر اسپرے کیا تھا یا کوئی خوشبو لگائی تھی۔ شاید خوشبو سے ان کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔

میرے نظر جما کر دیکھنے سے وہ کچھ شرمائی اور اس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہاشمی صاحب اور ان کے گھر کی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی مگر ہاشمی صاحب کسی فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے اور صبح کے رش کی شوفر کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ میں نے شادو کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا' کھسک کے کچھ دور ہو گئی۔

"رات نیند تو ٹھیک آئی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وکیل صاحب نے الگ بیڈ روم دے دیا۔ ایسا کہ تم دیکھو تو آنکھیں پھٹی رہ جائیں۔ اے سی بھی تھا اس میں۔"

میں نے واقعی جل کے کہا "میں تو رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ اتنی گرمی تھی اور پنکھا تک نہیں ہے ابھی وہاں' گھر الگ تھے۔"

وہ مجھے اور جلانے کے لیے بتاتی رہی کہ صبح اس نے جس باتھ روم میں شاور لیا' وہ کتنا شاندار تھا۔ وکیل صاحب کے گھر میں نوکر کتنے مہذب ہیں۔ ناشتا انہوں نے ایک سائز ڈائننگ ہال میں کیا۔ بڑی لمبی میز ہے۔ آدھا انچ موٹا شیشہ ہے اوپر۔ خانساماں کے ساتھ اس کی بیوی بھی کچن میں مدد کرتی ہے۔ بڑے پرانے ملازم ہیں۔ گھر کے فرد کی طرح ہیں۔

وکیل صاحب مسکراتے رہے اور میں کڑھتا رہا۔ گھر کی تعریف میں نہ مبالغہ تھا اور نہ رنگ آمیزی مگر یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب وکیل صاحب ہائی کورٹ کے لیے نکلے اترے تو انہوں نے ایک لفافہ مجھے دیا اور کچھ ہدایات شوفر کو دیں۔ وہ بریف کیس اور لنچ باکس اٹھا کے ساتھ چلا گیا تو موقع ملا۔

"یہ قیمتی لباس بھی وکیل صاحب نے ہی دیا ہو گا۔"

"ظاہر ہے۔ رات کے وقت درزی تو سی نہیں سکتا تھا۔" وہ بولی۔

"ہر چیز شاندار ہے وکیل صاحب کی۔ عیش ہو تمہارے تو۔"

"ہاں۔ تم کیوں جلتے ہو اور میرے لیے نئی چیز نہیں۔ یہ سب تھا میرے پاس جو میں چھوڑ آئی۔"

"میرے لیے۔ یہ بھی جتا دو۔ یہ بھی کہہ دو کہ ڈاکٹر مشہود نے ترس کھا کے رکھا تھا۔ تمہارے باپ کا

تھا۔"

"ناصر۔ پاگل ہو گئے ہو تم۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "وکیل صاحب کے گھر کیا میں خود گئی تھی۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کے آئے تھے اور وکیل صاحب جو کچھ کر رہے ہیں ہمارے لیے۔"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "آئی ایم سوری! محبت واقعی پاگل کر دیتی ہے آدمی کو۔ کسی دن میں تمہارے لیے اس سے زیادہ عالی شان محل بناؤں گا اور ایک نہیں چار گاڑیاں ہوں گی تمہارے پاس۔"

"صرف چار!" وہ ہنس پڑی اور پھر انگلیوں پر گننے لگی "ایک گدھا گاڑی' ایک بیل گاڑی' ایک اونٹ گاڑی۔۔۔"

"چوتھی ہو گی محبت کی گاڑی جسے عشق کا خچر یعنی ناصر عظیم کھینچے گا' حسن کی دیوی شادو کو بٹھا کے۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "وکیل صاحب اتنے شریف آدمی ہیں۔ بالکل فرشتہ۔"

میں نے کہا "اور ان کی بیوی؟"

"بیوی نہیں ہے۔ آٹھ سال پہلے مر گئی تھی۔ انہوں نے دوسری شادی کی۔ ایک سال بعد اس نے طلاق لے لی' یہ اسی کے کپڑے ہیں۔"

"اچھا؟ اب یہاں کس کے ساتھ رہتے ہیں وکیل صاحب!"

"کسی کے ساتھ نہیں۔ ایک بیٹا کینیڈا میں ہے' دو بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تو تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ کہیں تم پر رال نہ ٹپک جائے بڑے میاں کی۔ تمہیں ویسے بھی وہ فرشتہ لگتے ہیں۔ مجھے اس لیے پٹی پڑھا رہے تھے کہ ابھی شادی مت کرو چار چھ سال۔ چار چھ دن میں تمہیں پھنسا لے گا۔"

شادو کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہو گئے۔ "ناصر۔ ایسے کمینے پن کی باتیں مذاق میں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا "بہت شرم آرہی ہے۔ یہاں کہیں چلو بھر پانی ہے؟"

اس نے باہر اشارہ کیا "وہ گٹر کھلا ہوا ہے۔"

شوفر لوٹ کے آیا اور ہاشمی صاحب کی ہدایات کے مطابق ہمیں سول سرجن کے پاس لے گیا۔ میں نے لفافہ اس کے پی اے کو دیا تو اس نے ہمیں ایک ویٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ ایک گھنٹے بعد ہماری پیشی سول سرجن کے سامنے ہوئی۔ اس نے مجھ پر اور شادو پر صرف ایک نگاہ ڈال کے سر ہلا دیا۔ قانونی کارروائی پوری ہو گئی۔ ایک گھنٹا انتظار کیا پھر پی اے صاحب نے مجھے طلب کیا "ایک ہزار!" اس نے رکھائی سے کہا اور مجھے دو لفافے تھما دیئے۔

میں نے کہا "ہاشمی صاحب نے پانچ سو کہا تھا" اور پانچ سو دے کر اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر چل پڑا۔

شوفر ہمیں واپس کورٹ لے گیا۔ ہاشمی صاحب تاخیر پر برہم تھے مگر میں نے وضاحت پیش کر دی کہ دیر سول سرجن صاحب نے اور ان کے پی اے کی وجہ سے ہوئی۔ وہ شادو کی طرف سے درخواست پیش کر چکے تھے اور اس کا بیان ریکارڈ کرانا چاہتے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ آج تمہارا کوئی کام نہیں۔ تم جا سکتے ہو مگر میں نے شادو کے واپس آنے تک رکنے پر اصرار کیا تو انہوں نے مجھے شوفر کے ساتھ بار کی لائبریری میں بھیج دیا جہاں میں دو گھنٹے تک کھیاں مارتا رہا۔ وہاں سنجیدہ صورت سفید بالوں اور کالے کوٹوں والے وکیل خاموشی سے آتے تھے اور کسی پانچ دس کلو کی کتاب کے مطالعے میں خاموشی سے غرق ہو جاتے تھے۔

ہاشمی صاحب نے بڑی رازداری سے سارا کام کرا لیا تھا۔ انہیں ایف آئی آر کی نقل مل گئی تھی۔ شاہدہ کی عمر اور بالغ کی حیثیت سے خود مختار ہونے کی دستاویزات مل گئی تھیں۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا تھا اور پولیس کی کارروائی سے پہلے ہی وہ پکا انتظام کر چکے تھے کہ شادو ان کی حفاظتی تحویل میں رہے۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ شاہ جی کو اس کارروائی کی خبر ہو مگر پولیس میں اس کے بھی نمک خوار بہت تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ عدالت میں پہنچ جائے یا میری وہاں موجودگی کی خبر ملے تو وہ پولیس کے ساتھ دھاوا بول دے۔

یہ ہاشمی صاحب کے ذاتی وسائل اور اثر رسوخ کا کمال تھا کہ ایک ہفتے یا ایک مہینے کی مشکل قانونی کارروائی ایک [illegible] میں پوری ہو گئی۔ وہ ایک بجے شادو کے ساتھ آئے تو بے حد [illegible] تھے۔ جج نے شادو کی عبوری حفاظت منظور کرتے ہوئے [illegible] ہاشمی صاحب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ عدالت سے شاہ جی کو نوٹس بھی جاری ہو گیا تھا۔ عبوری فیصلے کی نقل انہوں نے ڈی آئی جی لاہور کے علاوہ اس تھانے کے ایس ایچ او کو بھی دے دی تھی جہاں ہمارے خلاف ایف آئی آر درج تھی۔

ہم نے ہاشمی صاحب کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ شادو ان سے بہت مرعوب اور متاثر نظر آرہی تھی۔ "وکیل صاحب کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جج بھی بہت لحاظ کرتے ہیں۔ جج صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم خوش قسمت ہو۔ ایسے مقدمات میں لڑکیاں بہت پریشان ہوتی ہیں۔ ان کو دارالامان میں رکھا جاتا ہے۔ میڈیکل چیک اَپ ہوتا ہے اور تفتیش' بیان گواہی کا عمل بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ وکیل صاحب کی ذاتی ضمانت اور ذمے داری پر تم جا سکتی ہو۔"

وکیل صاحب مسکراتے رہے "شاہدہ پروین اب بالکل محفوظ ہے۔ میں آج شاہ جی کو بلاؤں گا اور اس سے بات کروں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ ناصر عظیم کی وکالت بھی میں کر رہا ہوں۔ کوئی غلط فہمی ہے اس کے دل میں تو نکال دے۔ میرے ساتھ بدمعاشی نہیں چلتی کسی کی۔ بہتر ہے وہ معاملے کو ختم کر دے ورنہ خود ایسا پھنسے گا کہ جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "سر' آپ میرے ساتھ رئیس خاں کا حوالہ بھی دیں۔ کہیں کہ وہ بھی میرا مؤکل ہے اور وہ کسی رفیق کے کیس کی بات کر رہے تھے۔"

"بھئی یہ کیا کیس ہے؟" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا "اس نے ایک کیس رفیق عرف فیکے کا بھی کروایا تھا۔ اس نے ملا ٹھیکے دار کی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ملا بھٹی فقیروں کا ٹھیکے دار ہے۔ اس سے کہیں کہ ایک لڑکا ہے عامر' اس کی وجہ سے ایک داڑھی والا فقیر بھی مارا گیا تھا۔ یہ اندر کی باتیں ہیں۔"

"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" وہ ہنسے "مجھے یہ سب یاد نہیں رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ ایک کاغذ پر سب لکھ دو۔ بات کرتے وقت میں اپنے سامنے فائل رکھوں گا۔ اس میں یہ سب کچھ ہو گا تو مجھے آسانی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ شاہ جی فوراً ہتھیار ڈال دے گا پھر بھی کل تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کے ساتھ ہی اس کو بھی تمہاری درخواست پر ضمانت کا پابند کرا دیں گے۔ اس کی طرف سے تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اب فکر کرو اپنے مستقبل کی۔"

میں نے مطلب سمجھ لینے کے باوجود کہا "وہ تو سب کرتے ہیں سر۔ مجھے بھی ہے۔"

"نہیں۔ تمہیں شادی کی زیادہ فکر ہے" ہاشمی صاحب بولے "کل رات میری شاہدہ پروین سے تفصیلی بات ہوئی۔ یہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے' تم سے زیادہ۔ MATURE ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا I.Q بہت زیادہ ہے۔ اس سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے لیکن MATURITY ایک بچے میں نہیں آ سکتی خواہ اس کا آئی کیو ڈیڑھ سو ہو۔"

میں نے بڑی خفت محسوس کی "آپ مجھے بچہ کہہ رہے ہیں؟"

شاہد ہنسنے لگی "یہ بہت چڑتا ہے اگر اسے بچہ کہا جائے۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا اور یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میرے بارے میں گواہی چاہیے تو ڈاکٹر مشہود کی بیوی سے پوچھو کہ میں بچہ ہوں یا جوان مرد۔

"بھئی بچہ کب کہا ہے میں نے اسے۔ کچھ لوگ سات سال کی عمر میں بھی MATURE نہیں ہوتے۔ یہ تو ایک رویہ ہے زندگی کے بارے میں۔ آج بھی کم عمری کی شادیاں ہوتی ہیں۔ چودہ سال کا لڑکا گیارہ سال کی بیوی کا شوہر بن جاتا ہے مگر طبی نقطۂ نظر سے اور کچھ معاشرتی حالات کے تقاضے ایسے ہیں کہ مردوں کو پچیس سال سے پہلے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یورپ اور امریکا میں تیس پینتیس سال کی عمر شادی کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہے۔"

اب میرے لیے برداشت کرنا ممکن نہ رہا "سر۔ آپ صرف میرے قانونی مسائل کو دیکھیں۔ میں نے اسی لیے فیس کی پیش کش کی تھی۔ نجی مسائل ہم پر چھوڑ دیں۔"

انہوں نے بالکل بُرا نہیں مانا "اب شاہدہ پروین میری حفاظتی تحویل میں ہے تو اپنے تجربے کی روشنی میں صحیح مشورہ دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ عدالت کا قطعی فیصلہ ہونے تک تم ٹھنڈے دل سے جذبات کو الگ رکھ کے سوچو گے تو میری بات تمہیں صحیح لگے گی۔ شاہدہ پروین نے میری ایک بات مان لی ہے کہ میٹرک کے امتحان سے فراغت تک تم اور کچھ نہیں کرو گے۔ ساری توجہ تعلیم کو دو گے اور پڑھو گے۔ خوب دل لگا کے۔ اس وقت تک یہ تم سے نہیں ملے گی۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں نہیں ملے گی؟"

"بھئی اس لیے کہ تمہیں یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملے۔ تمہارے خیالات میں کسی قسم کا انتشار نہ ہو۔"

"یہ تو آپ بالکل الٹی بات کر رہے ہیں۔ اگر میں شاہدہ سے نہ ملا تو میرا سکون غارت ہو جائے گا۔ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ کیوں شاہد جی' کیا تم بھی ایسا سمجھتی ہو کہ تم سے دور رہ کے میں جی سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "ناصر' تم وکیل صاحب کی بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"ہاں نہیں سمجھ رہا۔ مت ماری گئی ہے میری۔ اتنی عقل کہاں کہ میں ایسی بات سمجھ سکوں۔ لاطینی یا عبرانی بول رہے ہیں نا وکیل صاحب!"

"اگر تم امتحان میں کامیابی حاصل کرو گے تو کس کے لیے؟ یہ سمجھ لو کہ جو بھی تم چاہتے ہو وہی میرا بھی مقصد ہے۔" شاہد نے کہا۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں صاف بتا رہا ہوں تمہیں۔ پاس ہونا میری ذمے داری ہے لیکن تم نے یکطرفہ طور پر کوئی فیصلہ کیا تو نقصان کی ذمے داری تمہاری۔ میں نہیں دوں گا امتحان اور دیکھوں گا کہ تم سے ملنے سے کون روکتا ہے مجھے۔"

وکیل صاحب ہنسنے لگے "بہت جذباتی ہو تم۔ بھئی روک کون سکتا ہے تمہیں۔ اچھا اب تم گھر جاؤ۔ میں کوشش کرتا ہوں کسی طرح شاہ جی سے رابطہ ہو اور شام کو اسے آفس میں بلا لوں' فون پر اس سے بات نہیں ہو سکی۔"

شاہد نے کہا "وہ دن میں گھر پر کہاں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ کہیں تو ہم اسے پیغام پہنچا دیں؟"

"تم خود... نہیں۔"

"ہم گزرتے ہوئے اس کے ایک دو خاص بندوں سے کہہ سکتے ہیں یا پھر آپ تھانے میں بات کر لیں۔ اکبری منڈی میں تھانے دار غلام محمد ہے" میں نے بتایا۔

انہوں نے سر ہلایا "میں اس سے کہتا ہوں۔ تم کو نظر آئے کوئی تو میرا کارڈ دے کر کہہ دینا کہ یہ فوراً شاہ جی کو پہنچا دے مگر یہ خیال رکھنا کہیں خود نہ پھنس جاؤ۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کوئی آپ کی گاڑی کا نمبر دیکھ لے۔ میرے ساتھ گاڑی میں شاہد کو بھی دیکھ لے اور بتا دے شاہ جی کو۔ اسے پتا چل جائے کہ ہم آپ کے ساتھ آپ کی کوٹھی میں رہتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ بولے "اس کی بدمعاشی کے غبارے سے پہلے ہی ہوا نکل جائے گی۔ اچھا بھئی' مجھے اب جانا ہے اپنے چیمبر۔ تم دونوں گھر جا کے آرام کرو۔ اِدھر اُدھر مت پھرنا ابھی اور کہیں جانا ہو تو شوفر سے کہہ دینا' وہ تمہیں لے جائے گا۔ رات کو ملاقات ہو گی تم سے۔"

شوفر نے ہاشمی صاحب کو ان کے چیمبر میں چھوڑا۔ ان کی لیگل فرم ہاشمی اینڈ فاروقی لا ایسوسی ایٹس کا دفتر کورٹ روڈ پر ایک پرانی عمارت کے فرسٹ فلور پر تھا۔ ابھی دو بجے تھے اور مجھ سے زیادہ شاہد کو اندازہ تھا کہ اس وقت کون کہاں ملے گا۔ اگر ہم چاہتے تو شاہ جی کو بھی تلاش کر سکتے تھے مگر میں ضمانت ہونے سے پہلے شہادت ہونے کی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا۔

شوفر حمزہ خان صوبہ سرحد کا پٹھان تھا اور اس کی عمر بھی ہاشمی صاحب کے برابر ہی ہو گی مگر خوش حالی اور ذہنی آسودگی سے حاصل ہونے والی صحت کے باعث ہاشمی صاحب اپنی عمر سے دس سال کم کے نظر آتے تھے تو وہ دس سال زیادہ کا لگتا تھا۔ وہ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔

ہاشمی صاحب نے جاتے ہوئے کہا "بھئی شاہدہ پروین' گاڑی اب تمہارے ڈسپوزل پر ہے' جہاں چاہے لے جاؤ اور دیکھو خان' بیگم صاحبہ کا خاص خیال رکھنا۔"

شاہد نے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار انگلش میں کیا "تھینکس ہاشمی صاحب!"

"HAVE A NICE TIME" وہ بولے اور پھر اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے "یہ رکھ لو' اگر شاپنگ کرنی ہو... دس ہزار ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ہاشمی صاحب کا رویہ الٹا میرے دل میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ شاید میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میں نے سوچا۔ وہ ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے وکیل ہیں کہ ان کے موکل عام لوگ نہیں ہو سکتے۔ وہ عام کیس لیتے ہی نہیں مگر ہمارے کیس میں وہ اتنی دلچسپی لے رہے ہیں جیسے یہ ان کا ذاتی معاملہ ہو۔ ایسے محسن کے لیے تشکر کے بجائے حسد اور رقابت کے جذبات رکھنا واقعی دیوانگی ہے۔ وہ جو بھی کر رہے تھے نیک نیتی سے کر رہے تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کا شاہد کو "شاہدہ پروین" کہنا' ڈرائیور کو ہدایت کرنا کہ "بیگم صاحبہ" کا خاص خیال رکھے جب کہ یہی بات وہ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ ان کا خیال رکھنا۔ گاڑی بھی انہوں نے شاہدہ پروین کے ڈسپوزل پر چھوڑی تھی۔ یوں جیسے میرا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور پھر ان کا شاہد کو شاپنگ کے لیے دس ہزار دینا۔ ان سب باتوں سے میں نے اپنی تذلیل کو شدت سے محسوس کیا۔ مجھے شاہد کا رویہ بھی بُرا لگا۔

اس وقت میں خاموش رہا مگر چند منٹ بعد ہی مجھے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ حمزہ خان اجازت لے کر نماز پڑھنے گیا اور گاڑی کو ایک مسجد کے قریب پارک کر گیا۔

میں شاہد پر برس پڑا "تم نے کیوں لیے اس سے دس ہزار۔"

شاہد کا رنگ کچھ پھیکا پڑا "کیا کرتی میں' اتنی محبت سے کوئی کہے تو..."

"محبت" میں نے تلخی سے کہا "محبت تمہیں مجھ سے ہے یا اس سے؟ میرے جذبات کا تمہیں کوئی احساس نہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ بتاؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتا' محسوس نہیں ہوتا" میں نے بگڑ کے کہا "تمہیں کہتا ہے شاہدہ روبین بیگم صاحب۔"

"اور کیا کہے شاہدو کے؟"

"کیوں؟ بہت محبت جتاتی ہے تو بیٹی نہیں کہہ سکتا اور محبت کے اور شفقت کے سارے جذبات تمہارے لئے ہی کیوں امڈے پڑ رہے ہیں آخر؟ گاڑی اب تمہارے ڈسپوزل پر ہے" میں نے اس کی نقل اتاری "جہاں چاہو لے جاؤ۔ ہیو اے نائس ٹائم۔ الو کا پٹھا۔ خبیث بڈھا۔ وہ کیا سمجھتا ہے میں الو ہوں۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ اس کا لہجہ کیا ہے' اس کے جذبات کیا ہیں۔"

"مت کرو ایسی ــــ جاہلوں جیسی باتیں۔ حد ہوتی ہے آدمی کے کمینے پن کی" شاہدو کا چہرہ لال ہو گیا۔

"کمینہ میں ہوں یا وہ ہے۔ وہ کون ہوتا ہے مجھے تم سے ملنے سے روکنے والا۔ خدائی فوج دار کی اولاد۔"

"وہ تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"بھاڑ میں گئی ایسی بھلائی۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ خود تمہارا رویہ غلط ہے۔" میں نے چلا کے کہا "وہ صاف نظرانداز کرتا ہے مجھے۔ ذلت محسوس ہوتی ہے مجھے۔"

"اس میں وکیل صاحب کا کیا قصور ہے۔ یہ تمہارا احساس کمتری ہے۔"

"پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ دس ہزار کی شاپنگ کرنی ہے تمہیں تو چلو میرے ساتھ۔ کیا لینا ہے تمہیں۔ تمہارا رویہ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ اس کی کوٹھی' اس کی کار' اس کی شرافت' یہاں تک کہ ملازموں تک کی تعریف کرو گی تو وہ کیا سمجھے گا۔"

"پھر میں کیا کروں ــــ برائی کروں ہر چیز کی؟ جو اچھا ہے اسے اچھا بھی نہ کہوں بس تمہارے گن گاتی رہوں۔ اچھے ایک تم ہو اور کوئی نہیں۔" وہ چلانے لگی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "شاہدو۔ مجھے شک ہوتا ہے اس کی نیت پر۔ اس کے عزائم ٹھیک نہیں لگتے مجھے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے ناصر۔ ایسی باتیں کرو گے تو میں نہیں ملوں گی تم سے۔ تم وکیل صاحب پر نہیں' مجھ پر شک کر رہے ہو" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

میں نے ندامت سے کہا "میں تم پر شک کر سکتا ہوں ــــ؟"

"یہ شک نہیں تو اور کیا ہے۔ تم کو ایسا لگتا ہے کہ میں اس کی دولت پر ریجھ گئی ہوں۔ اس کی کوٹھی اور کار' اس کے شریفانہ رویے اور اس کی حیثیت دیکھ کے میرے جذبات بدل گئے ہیں" وہ رونے لگی۔

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ مسجد سے نمازی نکل رہے تھے اور ہمیں عجیب سی شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک تو مسجد کے سامنے کار میں بیٹھے ہو' نماز پڑھنے کی توفیق نہیں۔ محبت کے چونچلوں کے لیے اچھی جگہ منتخب کی ہے پھر حمزہ خان نے یہ منظر دیکھا مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ گیا۔

"ابی کدر جانا ہے بیگم صاب!" اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

میں نے کہا "جہانگیر کے مقبرے چلو۔"

"نہیں' گھر چلو" شاہدہ نے آنسو پونچھ کے گلوگیر لہجے میں کہا۔

حمزہ خان نے سر ہلایا "جی بیگم صاب۔"

مجھے پھر طیش آیا مگر صورتِ حال کو مزید خراب کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہاشمی صاحب نے اسے "بیگم صاحب" کا خیال رکھنے کو کہا تھا' میرا نہیں۔ وہ میرا کہنا ماننے کا پابند نہیں تھا۔

اچانک شاہدو نے کہا "اچھا جہانگیر کے مقبرے چلو۔"

ڈرائیور نے اسی لہجے میں کہا "جی بیگم صاب۔"

شاہدو نے میری طرف شکایتی ہزملامت اور روٹھی نظروں سے دیکھا۔ آنسو اس وقت بھی شاہدو کی پلکوں پر جھلملا رہے تھے۔ اس وقت میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے چوم لیتا تو سارے گلے شکوے' غلط فہمی اور ناراضی ختم ہونے میں دیر نہ لگتی مگر میں ڈر گیا کہ کہیں اس کا نتیجہ برعکس نہ نکلے۔ شاہدو مجھے کھپڑ نہ مارے اور اس کا "خاص خیال" رکھنے کے چکر میں ڈرائیور مجھے بے عزت نہ کر دے۔ میں اپنی ناراضی کا اظہار کرتا اور ڈرائیور سے کہتا کہ دفع کرو۔ کہیں نہیں جانا' تم گھر چلو۔ تو یہ حکم بھی وہ بیگم صاحبہ کی مرضی کے بغیر نہ مانتا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ خاموش اور بے نیاز رہوں۔

داتا صاحب کے مزار اور بادشاہی مسجد کے پاس شاہدو کے کارندے موجود تھے۔

"جاؤ' کہہ دو کسی سے ــــ وکیل صاحب ملنا چاہتے ہیں شاہ جی سے" شاہدو نے کہا۔

میں نے کھڑکی کا سیاہ شیشہ نیچے اتار کے باہر دیکھا

"ڈرائیور سے کہو آہستہ آہستہ چلتا جائے۔ کوئی نظر آیا تو میں کہہ دوں گا" پھر ایک جگہ مجھے آٹھ دس فقیر نظر آئے تو میں نے کہا "یہاں روک لو گاڑی۔"

فقیر ایک شاندار گاڑی دیکھ کے ایک ساتھ حملہ آور ہوئے اور انہوں نے دونوں جانب سے کار کو گھیر لیا۔ مجھے اور شاہدو کو دیکھتے ہی ان کو حیرت سے بجلی کے چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا۔ وہ اپنی غلیظ صورتوں' میلی آنکھوں اور گندے ہاتھوں کے ساتھ منجمد ہو گئے اور ہمیں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہے۔

میں نے کہا "دیکھو' یہ کارڈ لو۔ شاہ جی کو دے دینا اوے ــــ"

ایک مشٹنڈے فقیر نے کہا "اوئے' تو وہی ہے نا ــــ ناصر ــــ؟"

دوسرے نے خوشامدانہ انداز میں ہاتھ اٹھایا "آپا جی سلام۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب سے آج ہی مل لے وہ ورنہ اس کی خیر نہیں اور اگر یہ پیغام نہ پہنچایا اسے تو تمہاری خیر نہیں۔"

میرے سخت لہجے سے وہ بھی سنبھل گیا جو مجھے پہچان کے بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نظر شاہدو پر' گاڑی پر اور شوفر پر ڈالی اور کارڈ لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بڑی مصنوعی رعونت سے پاور ونڈو کا سیاہ شیشہ چڑھایا اور جب گاڑی آگے بڑھی تو ان سب کی صورتوں پر نظر آنے والے بے یقینی کے جذبات دیکھ کر خوش ہوا جو مجھے بھی اپنے جیسا ہی سمجھتے تھے۔

بادشاہی مسجد کے موڑ پر اچانک مجھے شاہ جی نظر آ گیا۔ وہ اپنی گاڑی لاک کر کے چند قدم آگے بڑھا تھا کہ میں نے شاہدو سے کہا "گاڑی روکو۔"

"تم ــــ خود بات کرو گے اس سے۔"

"ہاں۔ وہ کیا بگاڑ سکتا ہے میرا!" میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔"

گاڑی سے اتر کے میں نے سڑک پار کی اور شاہ جی کے پیچھے پیچھے تیز قدم اٹھاتا ہوا گیا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ ایک جھٹکے سے رک کر پلٹا۔ وہ پریشان اور متفکر لگتا تھا مگر مجھے دیکھتے ہی اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے "تم ــــ؟" وہ دانت پیس کے بولا۔

میں نے سینہ تان کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہاں ــــ میں ــــ شاہ جی اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔"

"کیڈر کی موت لاتی ہے اسے شہر کی طرف ــــ" وہ میری طرف بڑھا۔

"ہاں۔ تجھے لے آئی میرے سامنے" میں نے ہاشمی صاحب کا دیا ہوا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا "یہ تمہارا باپ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

اس نے رک کے کارڈ دیکھا اور جیب میں رکھ لیا "اس سے تو بعد میں نمٹوں گا میں۔ اس دن تو بچ کے نکل گیا تھا اس لیے بول رہا ہے آج۔"

"اس دن تو بچ گیا تھا سؤر کے بچے۔ حرام کھانے والے گدھ۔ آج میں لحاظ نہیں کروں گا۔" میں نے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا۔

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ریوالور میری جیب میں نہیں ہے۔ یہ بے وقوفی کی انتہا تھی۔ ایک ریوالور کا وزن اتنا کم نہیں ہوتا کہ محسوس نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ریوالور میرے پاس تھا پھر وہ کہاں گیا؟ گاڑی کی سیٹ پر گر گیا یا شاہدو نے نکال لیا۔

سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں پیچھے ہٹا اور پلٹ کے بھاگا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈرائیور حمزہ خان ضرور مسلح ہو گا۔ گاڑی سڑک کے پار مجھ سے پچاس گز دور ہو گی لیکن گاڑی وہاں نہیں تھی ــــ میری آنکھوں کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ سڑک کے کنارے وہاں صرف ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ شاہ جی اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔

○☆○

ڈرائیور بابر علی کے عزائم کا اظہار صرف ریوالور سے ہی نہیں' اس کی صورت سے بھی ہوتا تھا۔ "کیا اچانک بہرے ہو گئے ہو تم؟ میں نے پوچھا تھا کہ ادھر کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

اس نے گاڑی روک دی۔ وہ ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے مسکرانے لگا "سر جی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"غلام کو جو کر بھی کہتے ہیں۔ تم اچھے جوکر ہو۔ صورت سے بھی جوکری لگتے ہو مگر یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا" میں نے کہا اور اپنے آس پاس دیکھا مگر وہاں رات کی ویرانی کا راج تھا۔

"آجائے گا سمجھ میں سر جی۔ سر سلامت رہنا چاہیے۔" اس کا لہجہ اب بدل گیا تھا "کیا ٹائم ہوا ہے آپ کی گھڑی میں خیر سے۔ ذرا یاد فرمائیں کہ اس وقت آپ کو کس سے ملنا تھا۔ گاڑی میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا آپ کو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "ہے۔ مجھے اپنے پیٹ میں کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوتی ہے' پانچواں مہینہ ہے نا۔ میرا مطلب ہے مئی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میرا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ کیا میں باہر آ کے ٹہل سکتا ہوں تھوڑی دیر۔"

اس نے خباثت سے مونچھوں کو ہلایا "سر جی۔ ابھی پچھلے سال ایک بندہ ایسے ہی ضائع ہو گیا تھا۔ اس نے چالاکی دکھائی اور ایسی ایکٹنگ کی جیسے ہارٹ اٹیک سے مرنے والا ہے۔ لوجی ہم نے اسے آرام سے لٹایا اور پانی وانی دوا پینے کے لیے۔ اس نے سمجھا کہ بابر علی کے پاس صرف مونچھیں ہیں' عقل نہیں ہے۔ اس نے پانی کا گلاس مارا میرے منہ پر اور بس۔۔۔ ضائع ہو گیا۔"

"اس سے پہلے بھی قتل کیے ہوں گے تم نے؟"

اس نے سہلایا "مجبوری میں سب کرنا پڑتا ہے جی۔ شوق کی بات نہیں ہے۔ ابھی آپ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہے ہو تاکہ آپ کو موقع مل جائے تو آپ یہ ریوالور چھین لو مجھ سے۔ مجھے سب پتا ہے۔ میری ایک چیز جا سکتی ہے یا جان ورنہ نوکری' میں ورنہ کو بچاؤں گا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ بابر۔ بہت سمجھ دار آدمی ہو تم۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے نوکر ہو' کون ہے تمہارا مالک؟"

اس نے اوپر دیکھا "جو سب دنیا کا مالک ہے لیکن سر جی' نوکر ہم اس کے جو تنخواہ دے۔"

"تمہیں آج کل تنخواہ کون دیتا ہے' پرنس یا ٹائیگر؟"

وہ گاڑی کے باہر ایسے کھڑا تھا کہ ریوالور نظر بھی نہیں آ رہا تھا اور بہت پُرسکون تھا مگر اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی تذبذب کے بغیر مجھے گولی مار سکتا ہے مگر میری جان نہیں لے سکتا۔ وہ میرے قتل پر مامور نہیں تھا۔ اسے صرف مجھے یہاں لے کر آنا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اس کی کامیابی کو چند سیکنڈ میں آسانی سے ناکامی میں بدل سکتا تھا۔ وہ مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ شاہ عالم ایک سیاست داں تھا۔ اس کے پاس عقل تھی اور ذہانت تھی۔ عقل اور ذہانت کے کم زیادہ ہونے سے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ اصل کمال ہے اس کو ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کی صلاحیت۔ جیسے ریوالور خود کچھ نہیں' اصل چیز ہے اسے مہارت سے استعمال کرنے کی صلاحیت۔

شاہ عالم نے اپنی ہر صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا تھا چنانچہ وہ لیڈر بن گیا تھا۔ لیڈر یعنی لیڈ کرنے والا۔ آگے چلنے والا۔ اس کے پیچھے چلنے والے عام لوگوں میں بھی نہ جانے کتنے عقل اور ذہانت میں اس سے برتر اور بہتر ہوں گے مگر انہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا اور ان کی عقل اور ذہانت ان کے لیے بے کار تھی چنانچہ وہ عوام کہلاتے تھے۔ بے وقوفوں کے ایک جم غفیر کو انسانی جیسا نظر آنے والا کوئی شخص صرف اپنے الفاظ کی طاقت سے جدھر چاہتا ہے ہانک دیتا ہے۔ کسی فوج کے پاس جدید ترین اسلحہ ہو مگر اس کا استعمال کسی کو نہ آتا ہو تو دشمن کا ایک آدمی معمولی ریوالور سے ان کے ساتھ وہی سلوک کر سکتا ہے جو چرواہا اپنی بھیڑوں کے ساتھ کرتا ہے۔

شاہ عالم لیڈر بن گیا تھا اور وہ ترقی کر رہا تھا۔ سیاست کے سارے داؤ پیچ جان لینے کے بعد وہ کامیابی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔ پہلے وہ معمولی سیاسی کارکن تھا پھر مقامی سطح کا لیڈر بنا۔ اب صفِ اول کا نہ سہی نمودہ سیاست کا ایک معروف نام بن گیا تھا۔ زندہ رہتا تو شاید اس کا نام بالآخر پورے ملک میں ہر شخص ایسے ہی لیتا جیسے آج بے نظیر۔۔۔ یا نواز شریف۔ ولی خان' جتوئی اور نواب زادہ نصراللہ کا لیتا ہے مگر خوش قسمتی کا راستہ دکھانے والا سورج ہر شخص کی زندگی میں کامیابی کے آدھے افق تک روشن نہیں رہتا چنانچہ شاہ عالم بھی گمنامی اور موت کے اندھیرے میں گم ہو گیا تھا اور اقتدار کے خواب کی تعبیر مرگِ ناگہاں ہو گئی تھی۔

تاہم تقدیر کا یہ کھیل پس پردہ اتنی خاموشی سے ہوا تھا کہ جب پردہ اٹھا تو تماشہ دیکھنے والوں کو احساس بھی نہ ہوا کہ ایکٹر بدل گئے ہیں۔ جو مجھے شاہ عالم سمجھ رہے تھے وہ کیسے اندازہ کر سکتے تھے کہ میں صرف چالاکی اور مکاری' موقع پرستی اور مکر و فریب کے سیاسی داؤ پیچ ہی نہیں جانتا' اچانک مجھے ایک ایسی صلاحیت بھی حاصل ہو گئی ہے جس کا مظاہرہ شاہ عالم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ رکھتا تھا اور مسلح پھرتا تھا۔ میں بے خبری میں چار چھ مسلح افراد کا اپنے خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے پر قادر تھا اور یہ ناممکن نہیں تھا کہ ہوش آئے تو وہ سب غیر مسلح ہوں اور مغلوب ہو چکے ہوں۔

ابھی بابر علی اکیلا تھا۔ میں اسے آسانی سے ناک آؤٹ کر کے چلا جاتا تو بہت سے سوالات میرے ذہن میں جواب طلب رہ جاتے۔ میں نے ابھی تک شاہ عالم کی زندگی کا ایک ہی رخ دیکھا تھا اور اسے میں اپنی کم عقلی یا کوتاہ بینی کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اپنے ماحول اور ملک کی سیاست کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ صدیوں پہلے غالب نے کہا تھا کہ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر

کھلا اور آج کا شاعر کہتا ہے۔ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم کا وہی ایک چہرہ ہو جو سب کے سامنے نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی کے سیاسی اور نجی رخ کے علاوہ بھی کئی خفیہ گوشے ہوں گے جن کو کسی کی نگاہ نہیں دیکھ پاتی ہو گی۔ ان کا تعلق شاہ عالم کی کاروباری زندگی سے یقیناً ہو گا اور کئی کاروبار بھی خفیہ ہوں گے جو کھلے بندوں جاری رہنے والے ہر کاروبار سے بالکل مختلف اور الگ ہوں گے۔ شاہ عالم کی سیاست میں مجھے زبردستی کھینچا گیا تھا اور یہی شاہ عالم کی وہ غلطی تھی جس کا کفارہ اسے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑا تھا مگر میری غلطی کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ شاہ عالم کے مرنے کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میری جان بچ گئی مگر صورتِ حال اس کے برعکس ثابت ہو رہی تھی۔ میری جان اب ایسے عذاب میں پھنسی تھی جس سے چھٹکارا میرے اختیار کی بات ہی نہ تھی۔ یہ اختیار کچھ اور لوگ اپنے پاس رکھتے تھے یا کم سے کم ایسا سمجھتے تھے۔

میں ان لوگوں کو جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے ان سے ملنا ضروری تھا۔

دس منٹ کے بعد ایک گاڑی نمودار ہوئی جو ہمارے پاس آ کے رک گئی۔ اس سے پہلے جو اکا دکا گاڑیاں گزری تھیں' ان میں سے کسی نے بھی رک کر یہ پوچھنا تو درکنار کہ ہمیں مدد کی ضرورت تو نہیں ہے' ہم پر ایک نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہ کوئی افسوس ناک بات نہیں رہی کہ لوگ کمینگی کی حد تک خود غرض اور بزدل ہو گئے ہیں۔ اچھا ہو یا بُرا' کوئی بھی کسی کے معاملے میں پڑتا ہی نہیں۔ سرِ راہ کسی کا قتل بھی ہو رہا ہو تو لوگ منہ پھیر لیتے ہیں کہ خدا نخواستہ بعد میں گواہی دینی ہی پڑے تو ان کا حلف سچا ہو۔ ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

دوسری عام سی کار تھی۔ خاص کار ہو تو لوگوں کی نظر میں آ جاتی ہے جیسے میری لینڈ کروزر تھی۔ دوسری گاڑی میں پیچھے ایک ہی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص مسکراتا ہوا نیچے اترا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے نیچے اتر کے مصافحہ کیا۔ میرا اپنا نمک حرام ڈرائیور دو قدم پیچھے ہو گیا تھا مگر پوری طرح مستعد تھا۔

اس نے کہا "کیا حال ہے آپ کا؟"

میں نے بھی کہا "کیا حال ہے آپ کا؟"

جیسے اس نے فرض کر لیا تھا کہ پرانے جاننے والے ملتے ہیں تو تعارف نہیں کراتے ایسے ہی میں نے بھی فرض کر لیا کہ وہ ٹائیگر ہو گا۔ پرنس زیادہ عالی شان اور معزز لقب تھا۔ ٹائیگر کیسا بھی ہو جنگل کا جانور ہوتا ہے اور آدمی اس پر اتنا اختیار رکھتا ہے کہ جب چاہے اسے پکڑ کے چڑیا گھر یا سرکس کے پنجرے میں بند کروا دے یا گولی مروا دے۔

اس نے میرے لیے پیچھے کا دروازہ کھولا اور میں بیٹھ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا' وہ بھی مجھے عام سا آدمی لگا۔ دھاری دار قمیص اور گہرے سیاہی مائل نیلے رنگ کی پتلون۔ سنہرے فریم والی عینک اور سنہری کلائی کی گھڑی۔ وہ چالیس سال کا ضرور تھا' قدرے فربہ بدن اور گندمی رنگ کا مالک تھا اور اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ اپنی صورت سے بھی وہ شریف آدمی ہی لگتا تھا۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے خیریت پوچھی اور خیریت نہ ہونے کے باوجود میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے اور آپ کی دعا چاہیے۔ یوں جیسے یہ سب پہلے سے طے تھا اور اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں گفتگو کا سلسلہ کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ وہ مجھے اجنبی سمجھ ہی نہیں سکتے تھے مگر میرے لیے وہ مرغ سے اتری ہوئی مخلوق کی طرح تھے۔

بالآخر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "تمہاری ناراضی بجا ہے۔ آئی ایم سوری کہ مجھے ملاقات کے لیے یہاں آنا پڑا۔"

"آنا پڑا یا مجھے لانا پڑا؟" میں نے ظاہر کیا کہ میں واقعی ناراض ہوں۔

"لک بیٹر مسٹر شاہ۔ اگر تم مصروف ہو تو میں بھی فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔ ہر شخص کلاک کی سوئیوں کی طرح وقت کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس کی زندگی کو چلانے والی مشین ایک ہی ہے۔"

میں نے محتاط رہتے ہوئے کہا "اگر تم نے مجھے ایک سوئی فرض کر لیا ہے اور دوسری سوئی۔"

وہ مسکرانے لگا "تمہیں چھوٹی سوئی کبھی نہیں سمجھا میں نے۔"

میں نے کہا "مگر میں چھوٹی سوئی ہوں۔ بڑی سوئی نہ ہو تو گھڑی بالکل بے کار چیز نہیں ہوتی۔"

میری بات کا کوئی سر پیر نہیں تھا مگر وہ اس سے کوئی مطلب اخذ کر رہا تھا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے لوگ مجذوب کی بڑ میں رمز اور الہام کے معانی تلاش کر لیتے ہیں تاہم یہ سلسلہ غیر معینہ عرصے تک نہیں چل سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسا ہونا عملاً ناممکن ہے" اس نے نرمی سے مگر سفاک لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "ناممکن کا لفظ میں نے اپنی ڈکشنری سے خارج کردیا ہے۔"

پتا نہیں کیوں اس کے چہرے کا رنگ ہی نہیں لہجہ بھی بدل گیا "اوکے' اوکے۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں گے۔"

"آج کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔"

"پلیز مسٹر شاہ۔ یہ سب ناپسندیدہ تھا میرے لیے بھی مگر ناگزیر بھی۔ میں نے اسی لیے سوری کہہ دیا۔ ناؤ لیٹ اٹ بی۔" اس نے سر کی خفیف سی حرکت اور آنکھوں کے اشارے سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی موجودگی کا احساس دلا کے مجھے خاموش کردیا۔

اب میں پہلے کی نسبت کچھ پُرسکون تھا۔ اس خبیث ڈرائیور بابر علی نے ضرور مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لا کے خطرناک صورتِ حال سے دوچار کرایا تھا مگر اب ایسا لگتا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ فلمی ڈرگ مافیا یا جرائم کی دنیا کے ڈان ٹائپ لوگ نہیں تھے اور اگر تھے تو اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ مجھے اغوا کر کے کہیں قید کرنا چاہتے ہوں یا میری جان کے درپے ہوں۔ ان کا شاہ عالم کے کسی غیر قانونی کاروبار میں اشتراک ہوسکتا تھا اور وہ مجھ سے محض کاروباری بات کرنا چاہتے تھے جبکہ مجھے نہ کاروبار کی نوعیت کا پتا تھا اور نہ اشتراک کی صورت کا۔

اپنے اعتماد کا مظاہرہ کرنے کے لیے میں نے جیب میں سے اپنا فون نکالا اور رخشی سے بات کی "مجھے ذرا دیر ہوجائے گی۔"

"ہوجائے گی کیا مطلب۔ اتنی دیر ہوچکی ہے پہلے ہی" وہ بولی۔

میں نے کہا "اوہ ڈارلنگ۔ جب اتنا عرصہ کوئی باہر گزار کے آئے تو یہاں کے معاملات بھی نمٹانے پڑتے ہیں۔ تم نے کھانا کھالیا ہے نا؟"

اس نے چند سیکنڈ کے بعد کہا "ہاں۔ پہلے بھی میں انتظار نہیں کرتی تھی کیونکہ یہ سوال بھی مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔"

"اچھا تم سوجاؤ۔ میں نے باہر سے گارڈ بلا دیئے ہیں۔ اگر تمہیں ضرورت محسوس ہو تو اشرف سے کہہ دینا۔ ویسے پولیس موجود ہے۔"

"مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ گھر میں بہت سی ناکارہ چیزوں کی طرح ہوں میں بھی۔ جو ڈاکو نہیں لے جاتے' مسجد میں بھی نئے جوتے چوری ہوتے ہیں۔ پرانے' بدصورت چپل نہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

اس کی بڑبڑاہٹ سنی نے مجھے چوکنا کردیا "کیا بات ہے رخشی۔۔۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ پھر اسی طرح ہنسی "یہ تم پوچھ رہے ہو؟ سچ بتاؤ کس کے ساتھ ہو اس وقت تم؟ اپنی اسی چندا کے ساتھ۔ مس خان' کرنل خان کی چاندنی سے زیادہ حسین بیٹی۔ الو کی پٹھی' یہاں آئے گی نا تمہاری سیکریٹری بن کے تو میں دماغ درست کردوں گی اس کا۔ ایسا ذلیل کروں گی سب کے سامنے۔۔۔ اور تم مجھے روک نہیں سکو گے" وہ ہنسنے لگی۔

میں نے فون بند کردیا۔ رخشی یقیناً نشے میں تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شراب کو بھی حرام نہیں سمجھتی۔ وہ ضرور پہلے سے اپنے دکھ کا مداوا اسی طرح کرنے کی عادی ہوگی۔ عادت بھی ایک دن میں نہیں بنتی۔ وہ سکون آور گولیاں بھی کھاتی تھی۔ ممکن ہے کسی نے' شاید خود شاہ عالم نے۔۔ اسے کہا ہو کہ شراب بھی علاجِ غم ہے' اعصاب کو سکون پہنچاتی ہے۔ سکون آور گولیوں کے ساتھ شراب پی جائے تو نتائج ہلاکت خیز بھی ہوجاتے ہیں۔ یہ بات عام لوگ نہیں جانتے تو رخشی کو کہاں معلوم ہوگی۔ شاہ عالم نے اسے جانتے بوجھتے ایک خطرناک کھائی میں نہ ختم ہونے والے تاریک راستے پر ڈال دیا تھا کہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتی جاؤ۔ سارے غم اور فکرات بھلا دو۔

"میں بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں" میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بولا۔

"وقت کے ساتھ تبدیلی آتی ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔"

وہ مزید حیران ہوا۔ "بڑا مشکل شعر پڑھ دیا آج تو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی بیوی کا اتنا خیال رکھنے لگے ہو۔"

میں معنی خیز انداز میں مسکرایا "بہت کچھ کرنا پڑتا ہے بھائی۔"

اس نے اچانک کہا "ٹائیگر۔ واٹ از دس؟ کدھر جارہے ہیں ہم؟"

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بولا "سوری پرنس۔ ادھر رات کے وقت سڑک بند کر کے کام شروع ہوا ہے کچھ۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ اللہ نے میری مشکل آسان کردی تھی۔ میں نے کہا "پرنس۔۔۔ ہم راستے میں بات

کرلیتے تو اچھا تھا۔ تم نہیں جانتے کہ میرا شیڈول کتنا ٹائٹ ہے۔"

"یہ معاملہ پہلے ہی بہت DELAY ہوگیا تھا۔ تم نے بہت وقت لگادیا پہلے بانگ کانگ میں' پھر سنگاپور میں اور یہاں جو گڑبڑ پھیلی اس نے مجھے پریشان کردیا تھا۔"

"اس میں میرا قصور نہیں تھا" میں نے کہا۔

"کون تھا وہ؟" پرنس بولا۔

میں نے کہا "میں اس پر دوبارہ کیا بات کروں۔ تم نے اخبار میں سب پڑھا ہوگا۔ سیاست میں سب ہوتا ہے۔"

"خیر اب تو ختم ہوگیا وہ چکر" پرنس نے کہا اور گاڑی ایک گیٹ کے سامنے رک کے چند سیکنڈ بعد اندر داخل ہوگئی۔

وہ پرانی کوٹھی ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں تھی جس کے سامنے والا حصہ توڑ کے اسے جدید شکل دی جارہی تھی۔ لان کے آگے اینٹوں کا ڈھیر تھا اور دو منزلوں کی بلندی تک رومن طرز کے ستونوں پر محراب بنانے کے لیے شٹرنگ لگادی گئی تھی۔ دائیں اور بائیں جانب کی کھڑکیوں کو بھی نکال دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے سامنے کا حصہ تاریک نظر آتا تھا۔

میں نے ظاہری بے نیازی سے کہا "کب تک چلے گا یہ کام آخر؟"

وہ چونک کے بولا "تم نے یہ جگہ پہلے کب دیکھی؟"

میں مسکرایا "دیکھی تو نہیں۔ ایسے ہی پوچھا تھا۔ آج کل بڑا شوق ہوگیا ہے لوگوں کو۔ پرانی چیز کو نیا بنانے کا۔"

وہ مجھے اوپر کی منزل پر لے گیا۔ لاؤنج میں روشنی تھی اور زینے پر بھی۔ پرانا قالین تھا جو تعمیراتی کام کی وجہ سے مٹی دھول میں میلا نظر آرہا تھا۔ ہم ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

"کیا پیو گے تم؟" وہ بولا۔

"ابھی کھانا ہی نہیں کھایا ہے میں نے۔"

"اوہ۔ میں کرتا ہوں کچھ۔ بازار سے ہی لانا پڑے گا" اس نے ایک فون اٹھایا "ٹائیگر۔۔۔ دیکھو گاڑی لے کر کاشی تک چلے جاؤ۔ بروسٹ لے آؤ اور جو ملے' روغنی نان۔۔۔ ہاں' مسٹر شاہ کے لیے۔"

مجھے اس خیال سے وحشت ہورہی تھی کہ آخر میں کب تک انشائے راز سے بچنے کے لیے اس کھیل کو جاری رکھ سکتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ پرنس اور شاہ عالم مل کے کیا کرتے تھے۔ منشیات کی اسمگلنگ' ہیرے جواہرات یا بانگ کانگ اور سنگاپور سے عام الیکٹرانکس کی تجارت۔ کرنسی کا کاروبار یا شیئرز کی خرید و فروخت۔ میں اس سے کیسے پوچھ سکتا ہوں کہ پرنس' میں بانگ کانگ کیوں گیا تھا؟ وہاں کس سے ملا تھا اور تمہارے ساتھ میری کس قسم کی ڈیل ہے؟

کوٹھی میں کچھ پُراسرار سی خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی یہاں کوئی بھی رہائش پذیر نہیں۔ شاید RENOVATION کے کام کی وجہ سے یہاں رہنے والے شفٹ کرگئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پرنس نے کوٹھی خریدی ہو اور مکمل طور پر نیا بنانے اور اس کی آرائش کا کام ختم ہونے کے بعد وہ یہاں رہنے کے لیے آئے۔

گیٹ پر مجھے ایک چوکیدار نظر آیا تھا۔ وہ مسلح تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں کسی کے موجود ہونے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والوں میں سے ٹائیگر گاڑی لے کر جاچکا تھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ گیا تھا یا نہیں' یہ معلوم ہونا مشکل تھا۔

پرنس میری طرف سے بے فکر تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ اس کا بزنس پارٹنر کسی طرح بھی اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ مجھے وہ زبردستی لایا تھا مگر معمولی سی تلخی اور پھر معذرت کے بعد وہ بات ختم ہوچکی تھی۔ اب وہ اندر چلا گیا تھا تو مجھے سوچنے سمجھنے کی تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔

اچانک باہر سے میں نے گاڑی کے آنے کی آواز سنی۔ یہ میری گاڑی تھی۔ لینڈ کروزر کے انجن کی آواز رات کی خاموشی میں پہچانی جاسکتی تھی۔ غالباً بابر علی اب پہنچا تھا اور گاڑی اندر لے آیا تھا تاکہ میں اسی میں واپس جاسکوں۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ پرنس کے علاوہ اب دو افراد میری راہ میں حائل ہوسکتے تھے۔ گیٹ پر کلاشنکوف اٹھائے کھڑا رہنے والا گارڈ اور بابر علی۔

پرنس ہاتھ صاف کرتا ہوا ایک کرسٹل گلاس کے ساتھ اندر آیا۔ اس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب تھا جو شربتِ روح افزا نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھ کے اس نے کہا۔ "اب بتاؤ تمہارا دورہ کیسا رہا؟"

میں نے کہا "اچھا رہا۔ کیا میری گاڑی آگئی ہے؟"

وہ مسکرایا "ہاں مگر واپسی میں تمہیں خود ڈرائیونگ کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "واپسی میں وہ باسٹرڈ ساتھ جاتا تو میں اسے چھوڑتا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے کہا "تم جیسے شخص سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ۔۔۔"

"کیا اُمید نہیں تھی" میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں۔

"تم سیکیورٹی کے معاملے میں بہت محتاط رہتے ہو۔ ایک نئے ڈرائیور کو دیکھو گے تو شاید اس کے ساتھ نہ جاؤ" اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔

میں نے کہا "آج تو میں پریشانی میں سب بھول گیا۔ ریوالور ساتھ نہیں لیا اور اب سگریٹ بھی نہیں ہیں۔"

"تم سگریٹ بھی پینے لگے ہو۔۔۔ کب سے؟"

میں نے کہا "فرض کرو ابھی سے۔ کوئی اعتراض ہے تمہیں؟"

وہ ہنسا "ٹائیگر رکھتا ہے" اس وقت کہتے۔"

میں نے کہا "اور کوئی نہیں پیتا' بابر علی یا تمہارا گارڈ؟"

"پوچھتا ہوں گارڈ سے۔ اس کا برانڈ چلے گا؟" وہ گلاس کو آدھا خالی کر کے اٹھا "کوئی فضول سی سگریٹ ہوگی۔"

"گزارا کرنا ہے ابھی" میں نے کہا "بس ایک سگریٹ لے لو اور ہاں' میری گاڑی کی چابی۔"

"میں لاتا ہوں" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

اب مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس چند منٹ ہیں۔ میں نے دروازے کو بند کیا اور اس کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ اپنا سانس روکے میں پرنس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مزید وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ ابھی تک میں نے گول مول جواب دے کر پرنس کو شک نہیں ہونے دیا تھا مگر قطعی بات کو ایسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر کسی نے دروازے کو دھکیلا اور اندر آ گیا۔ یہ پرنس نہیں خود گارڈ تھا جو ایک ہاتھ میں کلاشنکوف لٹکائے اور دوسرے میں سگریٹ کا پیکٹ لیے حیرانی سے خالی کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ پرنس اس کے پیچھے ہوتا تو اتنی دیر میں ضرور اندر آ جاتا۔

گارڈ نے مڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی گدی پر کان کے قریب کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اس وقت تک وہ پلٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی سے زیادہ دہشت کا عکس نمودار ہوا پھر وہ آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے اس کی کلاشنکوف قبضے میں کی اور اسے دروازے سے دور کھینچ لیا۔ اس وقت میں نے زینے پر چڑھتے قدموں کی آواز سنی۔

میں نے دروازہ پھر بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ دروازے سے اندر آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں کلاشنکوف دیکھی پھر قالین پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے گارڈ کو دیکھا۔ میں نے اسے آواز نکالنے کا موقع نہیں دیا اور بکلا شنکوف کا دستہ گھما کے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ جیسی کراہ بلند ہوئی۔ یہ آواز خالی کوٹھی میں گونجی۔ میں نے بابر علی کو بھی اندر گھسیٹ لیا۔

اب مجھے پرنس کا انتظار تھا۔

میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو مجھے پرنس کی آواز سنائی دی۔ لاؤنج کے دائیں طرف دو دروازے بند تھے۔ ان کے نیچے روشنی کی لکیر بھی نہیں تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یا وہ پرنس کی فیملی کے بیڈ روم تھے اور..... وہ شاید خالی تھے..... لمبائی کے رخ پر سامنے والے حصے میں ایک دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اس کمرے میں روشنی تھی۔ میں نے غور سے سنا' پرنس کی آواز اسی دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

درمیانی فاصلہ تقریباً تیس فٹ تھا۔ وہ نارمل آواز میں بات کرتا تو مکمل خاموشی میں اس کی گفتگو کا ہر لفظ میرے کان واضح طور پر سن سکتے تھے لیکن وہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی کے مقابلے میں کچھ بلند تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ رازداری برت رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کچھ سنوں۔

اوپر یا نیچے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے درمیانی فاصلے کو دیکھا اور پھر اپنے پیچھے قالین پر بے سُدھ پڑے ہوئے پرنس کے جانثاروں کو۔ ان میں ایک باہر تھا تو دوسرا رکھوالی کرنے والا کتا تھا۔ ابھی ان کے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا اور غالباً پرنس اب اکیلا رہ گیا تھا۔

میں کلاشنکوف کے ساتھ ہی باہر آیا۔ لاؤنج میں ایک کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد بارہ کرسیاں تھیں اور ایک فانوس اس کے اوپر عین وسط میں روشنی پھیلا رہا تھا۔ دوسرا فانوس مساوی فاصلے پر دس فٹ دور تھا۔ وہاں تین طرف صوفے لگے ہوئے تھے۔ چوتھی سمت میں کھلے دروازے کے ساتھ شیشے کی خوب صورت ٹرالی پر انتیس انچ کا بڑا ٹی وی اس وقت بند تھا۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں ڈش ریسیور اور وی سی آر نظر آ رہے تھے۔

کھانے کی میز تک پہنچ کے میں نے کلاشنکوف صوفوں کے پیچھے رکھ دی اور خود بھی بیٹھ کے چاروں ہاتھوں پیروں پر

جانوروں کی سی پھرتی اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھا۔ قالین پر میرے چلنے سے معمولی سی آہٹ بھی نہیں پیدا ہوئی۔

دروازے کے بالکل نزدیک پہنچ کے دس فٹ کی دوری سے میں نے اپنے کان آواز پر لگائے۔ معلوم نہیں اچانک اسے کس سے اتنی لمبی بات کرنے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ شاید وہ کسی کو بتانا چاہتا تھا کہ بالآخر میں مل گیا ہوں اور اس نے مجھے مذاکرات کے لیے ایک محفوظ مقام پر بلوا لیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد کوئی بحث چھڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "او میرے یار' پھر وہی بات۔ ہاں یہ بھی ضروری ہے مگر پہلے مجھے بات کرنے دو۔ کیوں۔۔۔ ہاں ہاں تمہاری اہمیت اپنی جگہ۔ میں بتا دوں گا صحیح۔۔۔ نہیں یار' ابھی تو مشکل ہے۔۔۔ ڈرائیور ہے لیکن وہ تمہیں لینے آئے گا اور تمہارے آنے تک ایک گھنٹے میں خاموش بیٹھا رہوں۔ عثمان صاحب' اب ایسا بھی نہیں کہ بات کرنا صرف آپ کو آتا ہے۔ خادم نے کوریا جا کے سام سنگ والوں کو قائل کیا تھا۔ دلائل سے۔۔۔ رشوت سے نہیں۔ میرے ساتھ جانے والے سرکاری ارکان گدھے تھے۔ وہ صرف سیر سپاٹے کرنے گئے تھے۔ تم بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو۔ "ہونڈائے" اور "ڈائیو" والے اگر تمہیں لائسنس دینے پر راضی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اور تم ایک دوسرے کے حریف ہو جائیں گے۔ سام سنگ کے ساتھ میں بھی گولڈ اسٹار کو رکھنا چاہتا ہوں مگر یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ بعد میں طے ہو سکتا ہے۔ اس وقت۔۔۔ یار عثمان' یہ تمہارے دل کا چور ہے۔ نہیں' اس وقت نہ میں تم کو ایڈریس سمجھا سکتا ہوں' نہیں فون نمبر بھی نہیں ہے دوسرا۔ نہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ دو فون ہوتے یہاں تو ہم ایک ساتھ گفتگو کر سکتے تھے مگر صرف موبائل فون ہے میرے پاس۔ اچھا یار' تم غصے میں ہو اس وقت۔ جتنی زیادہ بات کریں گے اتنی لمبی ہوتی جائے گی اور تلخی بڑھے گی اور کیا کروں میں عثمان صاحب' پندرہ منٹ ہو گئے۔ میرا نہیں تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے اس وقت۔ نہیں' دھمکی مت دو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم پر نشہ غالب ہے۔ بس اب صبح بات کریں گے۔ گڈ نائٹ۔ نہیں میں وہاں نہیں آ سکتا۔ کیولری گراؤنڈ بہت دور ہے یہاں سے اور وہ ساری رات یہاں نہیں رکے گا۔ اس نے بات کی تھی اپنی بیوی سے۔ نہیں' نام تو نہیں لیا میرا' مگر اتنی دیر میں اس نے بتا دیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ پاگل ہو گئے ہو تم؟ میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہوں؟ فون کیسے چھین لینا۔ ہاں' اسلحہ نہیں ہے اس کے پاس۔ اتفاق ہے۔ ہوتا تب بھی میں لے نہیں سکتا تھا۔ وہ مہمان ہے' قیدی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جا سکتا جو حوالات پہنچنے پر مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ بے وقوف آدمی' یہ آخری بار نہیں ہے۔ آئندہ کی سوچو' کل ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اوہو' اپوزیشن بھی کیا کم ہوتی ہے حکومت سے۔ سیاسی اثر رسوخ کے بغیر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں تو باری کا کھیل ہے حکومت بھی۔"

اس کی باتیں میرے لیے ٹانک سے کم نہ تھیں۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ پرنس کہلانے والا یہ شخص شاہ عالم کا ایک کاروباری ساتھی تھا۔ دوسرا کوئی عثمان نام کا شخص تھا اور بظاہر وہ الیکٹرانکس کی صنعت میں سرمایہ کاری کے مشترکہ منصوبے رکھتے تھے مگر ایک دوسرے کے اعتماد سے محروم تھے۔ پرنس نے خود کو خادم کہا تھا۔ یہ اس کا نام بھی ہو سکتا تھا اور محض انکسار آمیز طنزیہ انداز بیاں بھی۔ شاہ عالم یقیناً اپنے سیاسی اثر رسوخ سے ان کے وہ کام کراتا تھا جو صرف سفارش سے ہو سکتے تھے۔ رشوت سے ہر شخص کا کوئی بھی کام ہو سکتا ہے۔ ایک فائل دبانے کا یا ایک ایف آئی آر دبانے کا۔ کسی ایمان دار اور فرض شناس افسر کو دبانے کا ہو یا بلیک میلنگ کرنے والی داشتہ کو زمین میں دبانے کا۔ جیسا کام ویسے دام مگر بہت سے کام دہری طاقت استعمال کیے بغیر نہیں ہوتے جیسے کوئٹہ جانے والی گاڑی کو ایک انجن نہیں کھینچ سکتا تو دوسرا پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ دروغ بر گردن راوی۔ ایک منتخب وزیر اعظم نے اپنے کسی خاص بندے کو بطور خاص کسٹم میں ایک خاص آسامی پر تقرری کے لیے وزیر خاص کے پاس بھیجا جو عوام کے ووٹ لے کر بڑی شان سے پھر اسمبلی میں رونق افروز ہو گیا تھا۔ ممبری اور وزارت جن کے گھر کی خاندانی لونڈی تھی' وہ پہلی بار اپنے ہی علاقے میں ضمانت بھی ضبط کروا بیٹھے تھے اور عوام بغلیں بجا رہے تھے کہ اسے کہتے ہیں جمہوریت۔ اب پتا چلے گا عوام کی طاقت کا جب عوامی نمایندوں کی منتخب حکومت میں عام لوگ بالآخر سکھ کا سانس لیں گے۔ خاص بندہ جب خاص نوکری کے لیے وزیر خاص کے پاس پہنچا اور اسے وزیر اعظم کے دست خاص سے لکھے ہوئے احکامات پیش کیے تو وزیر خاص نے کہا کہ چشم روشن دل ماشاء۔ سرکاری حکم ہے تو ہم پر تعمیل فرض ہے۔ کل چار لاکھ لے آؤ اور پرسوں ڈیوٹی پر پہنچ جاؤ۔ خاص بندہ بڑا جز بز ہوا کہ مجھ سے رشوت مانگتا ہے؟ وزیر اعظم کے واضح احکامات کے باوجود؟ وہ صدر مملکت کی خدمت میں حاضر ہوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور یہ ظلم کی داستان یہ چشم نم دیرد ناک الفاظ اور غم ناک لہجے میں بیان کی۔ صدر محترم نے تبسم فرمایا اور کہا 'نادان! یہ خاص اسامی ہے لیکن تو عام آدمی نہیں' وزیر اعظم کا خاص بندہ ہے اس لیے وزیر خاص نے فوراً تقرری کے احکامات جاری کردیے مگر چار لاکھ تو اس کا حق بنتے ہیں۔ اس نے منتخب ہوکے اسمبلی تک پہنچنے اور وزیر خاص بننے کے لیے دو کروڑ سے زیادہ خرچ کیے تھے۔ دو کروڑ لگانے والا دو کروڑ کمائے گا بھی ضرور۔ سادے کاغذوں کی تحریر پر خاص عہدے تقسیم کرے گا تو یہ سب کیسے ہوگا اور تم جو بڑے مظلوم بن کے آئے ہو' تم اس خاص اسامی کے لیے اتنی تگ ودو کیوں کررہے ہو؟ ملک اور قوم کی خدمت کے لیے ہم کافی ہیں۔ خدمت خلق کرنی ہے تو ستار ایدھی سے رجوع کرو۔ اسلام کی خدمت مقصود ہے تو خالص اسلامی نام کی کسی جماعت میں یا سپاہ میں شامل ہوجاؤ اور نوکری ہی کرنی ہے تو پھر اطلاعات' مذہبی امور یا سیاحت جیسے محکموں میں کیا خرابی ہے۔ خاص بندہ شرمندہ تو خیر نہیں ہوا مگر لاجواب ہوا۔ اس خاص اسامی میں چار لاکھ تو گویا ہاتھ کا میل تھے۔ پورے بدن کے میل کا سوچ کے اس نے ایک اسٹگر سے چار لاکھ روپے لیے۔ اس وعدے پر کہ موقع ملتے ہی وہ اس کو کسٹم ڈیوٹی میں آٹھ لاکھ کمانے کا موقع فراہم کرے گا لیکن جب وہ خاص بندہ اس خاص اسامی پر تقرری کے لیے شہر خاص' اسلام کے قلعے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اسلام آباد میں وزیر خاص کے پاس پہنچا تو اسے اندازہ ہوا کہ دیر آید درست آید والا محاورہ بھی غلط ہوچکا۔ کوئی فوراً پانچ لاکھ دے کے اس اسامی کو خرید چکا تھا۔

یہ واقعہ یاد کرکے اور خادم کی گفتگو سن کے میرا حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ میں لوٹ کے اسی کمرے میں آگیا جہاں دو افراد محو استراحت تھے۔ ان کو میں نے فوراً صوفے کے پیچھے ڈال دیا اور پھر ایسے بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چند منٹ بعد خادم آیا تو میں ایک فیشن میگزین کے صفحات میں رنگین تصاویر پر غور کررہا تھا۔

"معاف کرنا مسٹر شاہ۔ ایک ارجنٹ کال آگئی۔"

"تم سگریٹ لینے گئے تھے" میں نے رسالہ رکھ دیا۔

"اوہ۔ سگریٹ لایا نہیں؟ میں لاتا ہوں۔" وہ پلٹا۔

"اب چھوڑو۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "میں یہاں ساری رات نہیں بیٹھ سکتا' مجھے اور بھی ضروری کام ہیں۔"

"میرے لیے یہ کام ضروری تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ تم بات کرنا نہیں چاہتے" وہ بیٹھ گیا۔

"عثمان صاحب کا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ فرمارہے تھے کہ میں AVOID کررہا ہوں۔ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ میں مصروف تھا۔"

پرنس نے کہا "تم لاپتا تھے۔ فون پر بھی بات نہیں کی تھی تم نے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس قسم کے حالات سے دوچار تھا۔ میں سامنے نہیں آسکتا تھا۔"

"مگر تم ہمارے پاس آسکتے تھے۔ ہم تمہاری مدد کرسکتے تھے۔ ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا تمہارا جسے تم نے بلاوجہ اتنا مشکل بنالیا۔ تمہاری شناخت کی گواہی دینے والے ہم بھی تھے۔"

"وہ میرے معاملات تھے جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ RISK بھی سب میرے تھے۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں بے وقوف ہوں۔"

"اوکے" اوکے۔ مسٹر شاہ چلّانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "بہتر ہے کہ ہم آج کی گفتگو میں عثمان کو بھی شامل کریں۔ ورنہ اس کے سامنے مجھے الگ وضاحت کرنی پڑے گی۔"

"اسے میں بتادوں گا۔"

"تم کیوں بتاؤ گے؟ کیا میں نے تمہیں اپنی ترجمانی کا اختیار دے رکھا ہے؟ کیا مجھ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ میں اپنی بات خود کرسکوں اور تم اس کام کے ماہر ہو۔"

"وہ مصروف ہے۔ اس وقت نہیں آسکتا" خادم چلّا کے بولا۔

میں کھڑا ہوگیا۔ "میں زیادہ مصروف ہوں۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس کہ پہلے ایک بے وقوف کو قائل کرنے میں دماغ سوزی کروں پھر دوسرے کو سمجھاؤں۔"

وہ حیرت اور غصے میں گلاس کی ساری شراب چڑھا گیا "کیا واقعی تم ایسا سمجھتے ہو کہ اپنی مرضی سے جاسکتے ہو؟"

میں نے کہا "کیا میں تمہاری قید میں ہوں؟ بدمعاشی کے زور پر تم نے مجھے یہاں بلالیا۔ میں صرف اس لیے آگیا کہ میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ بھی واضح کرنا چاہتا تھا تم پر کہ اب بات کو ختم سمجھو ہمیشہ کے لیے۔"

"تمہیں معلوم ہے' تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"نشے میں تم ہوسکتے ہو۔ میں نے تو یہاں پانی تک نہیں پیا ہے۔ میری بات سمجھ میں نہیں آئی تو پھر سن لو۔ میں آئندہ تم سے کسی قسم کا کوئی کاروباری معاملہ نہیں رکھنا چاہتا۔"

"اچھا!" وہ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

"اس حرکت کے بعد جو تم نے آج کی' یہ ناممکن ہے کہ میں تم سے تعلق رکھوں۔ آخر کیا سمجھ کے مجھے اغوا کرالیا تھا تم نے؟ میں کوئی ایرا غیرا ہوں اور تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔ قانون سے بالاتر ہو اور کچھ بھی کرسکتے ہو؟ آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟" میں نے میز کو لات مار کے الٹ دیا۔

وہ آگ بگولا ہوگیا "تم آپے سے باہر ہورہے ہو۔"

"شٹ اَپ۔ تم نہ میرے باپ ہو اور نہ باس۔" میں نے دہاڑ کے کہا "جو اپنی گلی میں شیر ہو' وہ کتا ہوتا ہے۔ میں یہاں تمہارے گھر میں تم کو بتارہا ہوں کہ میرا اور تمہارا کاروباری تعلق ختم۔"

وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا "تم جانتے ہو کہ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے سائڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔ وہ درمیان سے ٹوٹ گئی "جو پہلے ناممکن تھا وہ اب ممکن ہوگا۔ یہ تم بھی دیکھو گے' میں اب جارہا ہوں۔"

وہ بے یقینی سے میز کو دیکھتا رہا اور پھر چلّانے لگا "بابے۔ بابے۔ کہاں مرگیا الو کے پٹھے۔ گارڈز!"

میں نے مسکرا کے کہا "کیا بات ہے۔ سب بہرے ہوگئے ہیں یا تمہاری آواز میں اثر نہیں رہا۔"

اس وقت ایک گاڑی اندر آئی۔ یہ غالباً ٹائیگر تھا جو میرے لیے کھانا لے کر واپس آیا تھا۔ خادم کے چہرے پر اُمید کے ساتھ حقارت اور نفرت کے جذبات عیاں ہوگئے۔ "یہ آخری موقع ہے تمہارے لیے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور شرافت سے کام کی بات کرو۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ٹائیگر کو میرا صرف ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "پھر وہ کیا کرتا ہے؟ چربھاڑ کے آدمی کو پاجامہ بنادیتا ہے۔ پاجامے کو نگٹ۔"

ٹائیگر ایک شاپنگ بیگ لٹکائے اندر آیا۔ "بڑی دور جانا پڑا مجھے پرنس کمپنی۔" بات کرتے کرتے اس نے رک کر غور سے میری اور پرنس کی صورتوں کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ.... دال میں کچھ کالا ہے۔

میں نے کہا "کیوں بے۔ تو کون سا کتا ہے؟ گلی کا یا دھوبی کا؟ نام ٹائیگر رکھنے سے نسل تو نہیں بدل سکتی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "بہت پی لی ہے آپ نے سر۔ خالی پیٹ۔"

میں کسی بیلے ڈانسر کی طرح ایک پاؤں کی ایڑی پر پورا گھوم گیا۔ میرا دوسرا پیر آخری وقت میں اوپر اٹھا اور یوں ٹائیگر کے پیٹ پر لگا جیسے کسی گھومتے ہوئے بہت بڑے پنکھے کا پر۔ وہ منہ کھول کے اور ہاتھ اوپر اٹھا کے پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرایا۔ عادت کے مطابق اس نے ایک گالی دی۔

"میں شراب نہیں پیتا" میں نے کہا "آئندہ یاد رکھنا اور یہ گالی تم نے کس کو دی تھی ابھی۔"

خادم نے کہا "ٹائیگر۔ اس کا دماغ خراب ہورہا ہے۔"

ٹائیگر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے مجھے مرکھنے بیل کی طرح گھور رہا تھا۔ "اچھا! پھر ٹھیک کردوں باس؟" وہ آہستہ

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | مجموعی تعداد 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

الرفاقی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ٹائیگر خود کو پروفیشنل بدمعاش سمجھتا ہوگا اور شاید ٹارزن بھی۔ اس کا قد مجھ سے ایک دو انچ زیادہ ہی تھا اور اپنے ڈیل ڈول سے بھی وہ فری اسٹائل فائٹر نظر آتا تھا۔ اس کی ٹائٹ شرٹ سے سینے کی چوڑائی اور بازوؤں کے مسلز کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ٹائیگر کے چہرے پر زخموں کے نشانات ان بہادری کے کارناموں کے میڈل کی طرح تھے جو وہ اس سے پہلے اپنے آقاؤں کے لیے سرانجام دے چکا تھا۔ اپنے موجودہ اَن داتا کا اشارہ ملتے ہی اس کی حالت کسی سفاک اور خونخوار درندے جیسی ہوگئی اور وہ غراتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں نے محسوس کیا کہ خادم پریشان ہے اور ٹائیگر میری طرف بڑھتے ہوئے محتاط رہنا چاہتا ہے۔ میں نے جو لات اسے رسید کی تھی' وہ خالص پیشہ ورانہ مہارت کا بہترین نمونہ تھی۔ اصل شاہ عالم نے مارشل آرٹ کا صرف نام سنا ہوگا جبکہ مجھے خان اعظم نے ایسی بے مثل عملی تربیت دی تھی کہ اگر میں چاہتا تو مارشل آرٹ کی کسی بھی عالمی ایسوسی ایشن سے اعلیٰ ترین سند حاصل کرلیتا۔ میں نے ملک کے ہر شہر میں جوڈو کراٹے' تائی کوانڈو' کنگ فو اور نن چکو جیسے مارشل آرٹ سکھانے والے بہت سے اداروں کے اشتہار دیکھے تھے جو صرف پیسہ کمارہے تھے اور خود ساختہ جعلی اسناد تقسیم کرکے لوگوں کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ میں نے ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے ماہرین کا کمال بھی دیکھا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ بین الاقوامی رنگ پر ان میں سے ایک بھی حقیقی سند کے لیے کوالیفائی نہیں کرسکتا تھا۔ برسوں خان اعظم سے سخت ٹریننگ حاصل کرکے میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مجھ سے مقابلہ ہو تو ان سب کو اندازہ ہوجائے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ یہ صرف میرا شوق تھا جس کو چندا کے عشق نے جنون بنا دیا تھا۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے اس شوق کو کسی پیشہ ورانہ ضرورت کے لیے استعمال کروں گا۔ کسی مقابلے میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات میں کبھی شوق کو پیشہ بنانے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ میرے لیے وہ سب ایک کھیل کی طرح تھا جس میں اپنی صلاحیت اور مہارت کے بارے میں میرا اندازہ کبھی غلط نہیں یا خوش فہمی پر مبنی نہیں تھا۔ میں نے اپنا موازنہ کبھی کسی سے کیا تھا تو وہ چندا تھی جو تکنیک میں مجھ سے بہتر تھی۔ جسمانی طاقت کے استعمال والے زیادہ خطرناک داؤ پیچ کا مقابلہ ہم نہیں کرتے تھے کیونکہ اس میں چندا کا مقابلہ کوئی دوسری چندا ہی کرسکتی تھی مگر چندا دنیا میں صرف ایک ہی تھی۔

ٹائیگر کو اپنی طاقت پر جتنا غرور تھا شاید اتنا ہی ناز اپنی لڑنے بھڑنے کی صلاحیت پر ہوگا۔ وہ کک مار کے مخالف کے جبڑے اور سر کی ٹکر سے اس کی پسلیاں توڑ دیتا ہوگا۔ لاتیں مار کے اور اٹھا پٹخ کرکے اس کا بھرکس نکال دیتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ ڈنڈے سے اور لاٹھیوں سے کبھی نہ ڈرتا ہو اور سائیکل کی چین یا لوہے کے سریے سے مخالفوں کو لہولہان کردیتا ہو اور خود بھی زخمی ہوجاتا ہو۔ اسی لیے وہ ٹائیگر مشہور تھا اور اس جیسے شخص کی جسمانی طاقت کا مقابلہ شاہ عالم جیسے کسی عام آدمی کے بس کی بات ہی نہ تھی۔

اسے یہ اندازہ کیسے ہوسکتا تھا کہ آج اس کے مقابل کوئی اور شاہ عالم ہے۔

میں نے اسے مشتعل کیا اور پھر حملے کا پورا موقع دیا۔ میں نے اسے یہ تاثر بھی دیا کہ میرا مقابلہ دفاعی نوعیت کا ہوگا اور میں اب خود کو بچانے کی فکر میں ہوں کیونکہ ٹائیگر کا مقابلہ بلی نہیں کرسکتی خواہ وہ شیر کی خالہ کہلاتی ہو۔

وہ مجھے دبوچنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا کے آگے آیا تو میں آخری وقت میں غوطہ مار کے دوسری طرف ہوگیا۔ وہ پلٹا اور جست لگا کے اس نے کوشش کی کہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ مجھے دیوار پر مار کے چٹنا کردے۔ وہ سر تھوڑا سا جھکا کے اور ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کے کسی بلڈوزر کی طرح بڑھا اور دانت پیس کے اس نے مجھے ایک گالی دی۔

میں بڑی پھرتی سے بیٹھا اور میرا دایاں ہاتھ مکان کے اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ کراہ کے تھوڑا سا اچھلا تو میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر اٹھالیا۔ وہ اپنی پیش قدمی کی طاقت میں خود ہی اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اسے بڑی صفائی اور مہارت کے ساتھ اپنے سر کے اوپر سے گزارا اور پھر کھڑا ہوا تو وہ پلٹ کر پوری طاقت کے ساتھ دیوار سے یوں لگا کہ اس کا سر نیچے تھا اور ٹانگیں اوپر۔ وہ آدمی جاندار تھا کہ دیوار دھماکے سے لرز گئی مگر وہ گرتے ہی پھر کھڑا ہوگیا۔

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا سیلاب امنڈ آیا مگر میں کھڑا مسکراتا رہا۔ "ٹائیگر ہو تو کتے کے پلے کی طرح چیاؤں چیاؤں کیوں کررہے ہو؟" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ یہ سب خادم کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ پک جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ شاہ عالم اس طرح ٹائیگر کے سامنے شیر بن کے

کھڑا ہوجائے گا۔

ٹائیگر کا دماغ بھی گھوم گیا تھا۔ ذہنی صدمے سے بھی کہ شاہ عالم اچانک ٹارزن کیسے بن گیا اور جسمانی صدمے سے بھی۔ اس کے باوجود وہ پھر مجھ پر وحشیانہ انداز میں حملہ آور ہوا۔

اس کے لڑنے کا انداز سائنٹیفک نہیں تھا۔ گلی محلوں میں جسمانی طاقت کے بل پر اپنے سے کمزور لڑکوں سے مارپیٹ کرکے اور لڑنے بھڑنے کی عادت کے باعث جوان ہونے تک بدمعاش کہلا کے خوش ہونے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ بس وہ دو سروں کے مقابلے میں چوٹ لگنے یا زخمی ہوجانے کے خیال سے نہیں ڈرتے۔ زبانِ خلق اور قانون کے بارے میں سوچتے ہی نہیں اور زندگی وفا کرے تو سمجھنے لگتے ہیں کہ موت انہیں شکست نہیں دے سکتی۔

مارشل آرٹ میں معمولی سی تربیت رکھنے والا کمزور سا لڑکا بھی ٹائیگر صاحب کا حشر نشر کرسکتا تھا۔ ہر شعبے میں تربیت ہی اصل چیز ہے جو آدمی کی صلاحیت کو منظم کرتی ہے' اسے ابھارتی ہے اور اس کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔ میں نے ایک ماہر فن سے یہ تربیت برسوں میں حاصل کی تھی اور اس کی مشق جاری رکھی تھی۔ ٹائیگر محض نام کا ٹائیگر تھا اور شاید آج کل صرف نام کی دہشت اور پرنس کی پشت پناہی سے اس کا روزگار چل رہا تھا۔

وہ پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا۔ اس نے میرے سر پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور بازو کو موڑا تو وہ خود بخود گھوم کے میرے سامنے آگیا۔ اس کا شانہ اترگیا تھا اور وہ درد سے بلبلا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔

"اسنیپ دس مسٹر شاہ" پرنس نے بالآخر ریوالور نکال لیا۔

میں نے دوسرے بازو سے ٹائیگر کی گردن جکڑلی "بہت دیر میں خیال آیا تمہیں کہ جیب میں توپ بھی ہے۔"

ٹائیگر اب ڈھال کی طرح میرے سامنے تھا۔ پرنس مجھ پر گولی کیسے چلاتا "اسے چھوڑ دو ورنہ میں بابر کو اور گارڈ کو بلالوں گا۔"

"تم نے پہلے بھی بلایا تھا انہیں مگر وہ نہیں آئے تھے۔ ایک بار پھر کوشش کرو بلکہ خود جاکے انہیں پکڑلاؤ۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیا فائدہ اس مارپیٹ کا۔ میں نے تمہیں صرف بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

"بلایا تھا یا بلوایا تھا" میں نے کہا "یہ تمہیں اور تمہارے اس کتے کو پہلے سوچنا تھا کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ ایسے بات کرنے میں نقصان بھی ہوسکتا ہے۔"

"اوکے' آئی ایم سوری۔ ویری سوری مسٹر شاہ۔"

"میں بے عزتی برداشت نہیں کرتا اور غلطی کو معاف کرسکتا ہوں' بدمعاشی کو نہیں۔ کیا خیال ہے اس سانڈ کی گردن توڑ دوں؟"

ٹائیگر نے اپنی ہار مان لی تھی اور مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ اس پوزیشن میں وہ حرکت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو آزاد کیا اور اس کی پتلون کی بائیں جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

"کیا نالی کے اس مظاہرے کے بعد بھی تم ٹائیگر پر بھروسا کرو گے؟" میں نے ریوالور کی نال ٹائیگر کی گدی پر رکھ دی "گھوڑا ریس کے قابل نہ رہے اور کتا پاگل ہوجائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔"

ٹائیگر ہانپ بھی رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ اس کی ایسی ذلت شاید کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک دم آگے دھکیل دیا۔ اس نے بریک فیل ہوجانے والی گاڑی کی طرح پرنس کو ٹکر ماری۔ نہ ٹائیگر اپنی رفتار پر قابو پاسکا' نہ پرنس کو اس سے بچنے کی مہلت ملی۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے۔

میں نے پرنس کا فرش پر پھیلا ہوا ہاتھ اپنے جوتے سے دبالیا۔ ٹائیگر اٹھ کے مجھ سے چند قدم دور کھڑا ہوگیا اور اپنا شانہ دبانے لگا۔ اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر اس سے زیادہ شرمندگی اور بے بسی کی ذلت کے باعث وہ پرنس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

پرنس نے ریوالور چھوڑ دیا اور درد سے کراہنے لگا "مسٹر شاہ۔ کیا ہوگیا ہے آخر تمہیں۔ تم پاگل ہوگئے ہو؟"

میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا۔ "تم شاید اپنی اوقات بھول گئے تھے۔ مجھ پر حکم چلانے لگے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ ساخت کے اعتبار سے تمہارا اور ٹائیگر کا ریوالور ایک ہی ہے۔ فرض کرو' میں اس کے ریوالور سے ٹائیگر کو بھی شوٹ کردوں' بابر علی کو بھی اور تمہارے گارڈ کو بھی۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں' وہ اسی کمرے میں موجود ہیں۔ صوفے کے پیچھے پڑے ہیں۔ گارڈ میرے لیے سگریٹ لایا تھا اور بابر اس کے پیچھے آیا تھا۔"

پرنس غصے اور ذلت کے احساس سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"تمہارے تین جانثاروں کو مارنے کے بعد" میں نے کہا۔ "میں تمہارے ریوالور میں سے تین گولیاں نکال کے جیب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ڈال لوں یا باہر پھینک دوں۔ ریوالور پر تمہارے فنگر پرنٹ ہیں۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اس کے بعد تم پولیس کو بلا سکتے ہو۔ وہ مجھے تین افراد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیں گے۔"

"ہاں۔ تمہیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد میں رخشی کو فون پر بتا سکتا ہوں کہ وہ پولیس کے ساتھ یہاں پہنچ جائے۔ مجھے کچھ بدمعاش زبردستی یہاں اغوا کرلائے ہیں۔ اغوا بھی سنگین جرم ہے۔"

وہ مسکرانے لگا "یہ ایک بچکانا اسٹوری ہے۔"

"پولیس میرے جیسے سیاست داں کے بیان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ میں کہوں گا کہ تم نے تینوں حکم کے غلاموں کو نابلی کی سزا دی ہے۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس کے بعد پولیس زیادہ باریکی میں نہیں جائے گی مثلاً یہ کہ گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی ہیں یا کسی اور دوسرے ریوالور سے۔ وہ رپورٹ بھی حاصل کرلیں گے کہ فائر اسی ریوالور سے تم نے کیے۔ تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔ باقی ثبوت اور تمہارا اعترافِ جرم وہ عدالت میں پیش کرسکتے ہیں۔ میرے جیسا ہر سیاست داں بہت معتبر ہوتا ہے۔ اغوا اور تین قتل کرنے کے جرم کی رپورٹ میں لکھواؤں گا تو انشاء اللہ تمہیں پھانسی ہوگی اور بہت جلد۔"

"لیکن تم یہ سب نہیں کرو گے؟"

"ہاں۔ اس سے کہیں آسان یہ ہوگا کہ میں تمہیں بھی مار کے نکل جاؤں۔ کون ہوگا میرے جرم کا گواہ۔ نہ مجھے کسی نے یہاں آتے دیکھا اور نہ جاتے وقت دیکھے گا۔ پولیس یہ معما حل کرتی رہے کہ کس نے کس کو مارا اور کیوں مارا۔ میری پارٹی کے بہت سے عہدے دار گواہ ہوں گے کہ میں اس وقت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت میں مصروف تھا جب یہ واردات ہوئی۔"

اس کا رنگ زرد پڑ گیا "تم۔ ایسا نہیں کرسکتے۔ پلیز مسٹر شاہ عالم۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تو پھر چلو ذرا عثمان صاحب سے مل لیں۔ ہمارے کاروباری معاملات آج رات ہی طے ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

پرنس انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ گاڑی میری تھی۔ ڈرائیونگ ٹائیگر نے کی۔ میں اور پرنس پچھلی سیٹ پر ایک ساتھ بیٹھے رہے۔ میں نے اسے راستے میں سمجھایا کہ عثمان کو کچھ نہ بتانے میں ہی سب کا بھلا ہے اور بتانے میں صرف پرنس کی بے عزتی ہے۔

"تم اس کاروبار سے الگ ہونا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم شاہ عالم کو بھول جاؤ جیسے وہ کبھی تمہارا بزنس پارٹنر تھا ہی نہیں۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے مسٹر شاہ عالم۔ جو بات سب جانتے ہیں' میرے اور عثمان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کہ تم ہی ان کو بھی یہ بات سمجھا دو ورنہ زیادہ خرابی ہوگی۔"

"خرابی تو بہت ہوگی" وہ بولا "تمہیں اس کا اندازہ ہے پھر بھی تم ایسی بات کر رہے ہو؟"

"ہر خرابی دور کی جاسکتی ہے۔ خرابی خود کوئی چیز نہیں لوگ خراب ہوتے ہیں۔ ان کا کاروبار یا کردار خراب ہوتا ہے۔ عادت خراب ہوتی ہے یا دماغ خراب ہوتا ہے۔ درست کردیا جائے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ساری ارادے اور نیت کی ہے۔"

وہ کچھ بولا نہیں مگر اس کے لبوں کی طنزیہ مسکراہٹ صاف کہتی محسوس ہوتی تھی کہ مسٹر شاہ عالم۔ ایسی خیال و محال است و جنوں۔ بہت جلد تم پر واضح ہو جائے گا تمہارے ارادے اور نیت پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے۔

ابھی تک میں شاہ عالم کی شخصیت کی نقاب میں اداکاری سے کامیاب تھا لیکن یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا کہ خادم عرف پرنس اور عثمان کے ساتھ اس کے کاروباری کی نوعیت کیا تھی۔ کوریا کی سام سنگ یا گولڈ اسٹار الیکٹرانکس مصنوعات کی درآمد یا تیاری میں کوئی بھی بات قانونی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اسمگلنگ کرتے تھے موجودہ حالات میں کوئی جرم ہی نہیں رہا تھا۔ لاکھوں ہانگ کانگ' سنگاپور' بنکاک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک سے قسم کی اشیا سمندر کے راستے ہوائی جہاز سے اور ہوائی لا رہے تھے۔ ہر مارکیٹ میں اسمگل کی جانے والی غیر ملکی کی بھرمار نے ملکی انڈسٹری کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ کپڑے میک اپ کے سامان سے ٹائر اور مشینری تک کھلے عام جا رہی تھی۔ ملائشیا' تائیوان' چین اور جاپان کی مصنوعا عام تھیں مگر انتہا یہ تھی کہ بھارت جیسے دشمن ملک سے پاکستان کی مارکیٹ میں پہنچ رہی تھی۔ افغان ٹرانز کے بہانے وسطی ایشیائی ریاستوں' روس اور ایران آ رہا تھا۔ پاکستان ہر ملک کے سامان کی ایسی منڈی بنا جہاں ہر قسم کے قاعدے قانون صرف ان کتابوں تک

تھے جن کو رشوت خوری نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا۔ اخلاقی معیار کا پھر کیا سوال۔

اس کے باوجود کچھ کاروبار خطرناک حد تک غیر قانونی تھے چنانچہ ہر ایرا غیرا اس میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بڑے کام تھے جن میں منافع بھی بڑا تھا اور اس کے لیے بڑے اثر رسوخ اور وسائل کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہر ملک کی طرح یہاں بھی کرنسی' سونے یا اسلحے کی اسمگلنگ جیسے کام گروہ کرتے تھے جن میں معمولی کارندے سے سربراہ تک سب کی اپنی اپنی ذمے داری تھی اور اسی تناسب سے منافع میں حصے داری تھی۔ ان کے ساتھی سرکاری اہلکاروں میں نچلی سطح کے کلرک یا سپاہی سے لے کر اوپر کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز سرکاری افسران' سیاست داں اور وزیر تک ہوتے تھے۔

میں براہِ راست پرنس سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ شاہ عالم سے وہ کیا کام لیتے تھے اور اس کے بدلے میں شاہ عالم کو کیا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ شاہ عالم کی زندگی کے اَن گنت پہلو ایسے تھے جن سے میری کوئی آشنائی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے صرف اپنی جان بچائی تھی اور اس سے پہلے کہ شاہ عالم مجھے ٹھکانے لگاتا' میں نے اس کی حادثاتی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ عالم کی جگہ لے لی تھی۔ اب وہ سیاست کے علاوہ کیا کرتا تھا' کس سے ملتا تھا' کہاں جاتا تھا اور کہاں نہیں جاتا تھا؟ اس کے دوست کون تھے اور دشمن کون؟ کتنی عورتوں سے اس کے کہاں کہاں تعلقات تھے اور ان کی نوعیت جذباتی تھی یا کاروباری؟ یہ سب مجھے معلوم کرنا تھا۔ ایسے کہ کسی کو میرے معلوم کرنے سے شک نہ ہو کہ میں کوئی اور ہوں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ میری اداکاری فلاپ ہو سکتی تھی اور میرے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کے باوجود ناصر عظیم کی شخصیت بے نقاب ہو سکتی تھی۔ شاہ عالم بننا کتنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا جب میرے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

ایک غلطی میں کر چکا تھا۔ اسے غلطی سمجھنا بھی غلط تھا۔ میں نے اپنا دفاع کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو پرنس اغوا کرانے کے بعد میرے ساتھ مزید ذلت آمیز سلوک کرتا۔ شاہ عالم مارشل آرٹ سے ناواقف تھا اور میں نے پرنس کے سامنے اس کا بدترین مظاہرہ کیا تھا۔ کلاشنکوف اور سائلنسر والے آٹومیٹک ریوالورز۔ سب مشین گن اور دستی بموں کی لڑائی کا زمانہ تھا۔ میرے مارشل آرٹ کی مہارت سے پرنس جیسے لوگ خوف زدہ ہونے والے نہیں تھے۔ بے خبری میں باہر اور ایک سیکیورٹی گارڈ مار کھا گئے تھے مگر آج کے بعد خالی ہاتھ میرے سامنے آنے کی غلطی کوئی نہیں دہرائے گا۔ خیر' یوں ہے تو پھر یوں ہی سہی۔ آتشیں اسلحہ میں بھی حاصل کر سکتا ہوں پھر یہ مقابلہ برابر کا ہوگا مگر خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کی اضافی صلاحیت صرف میرے پاس ہوگی۔ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

دس منٹ بعد پرنس نے کسی خیال سے سر اٹھا کے اچانک مجھ سے پوچھ لیا "یہ مارشل آرٹ کب سیکھا تم نے؟"

میں نے عاجزانہ بے نیازی سے کہا "بس۔ سیکھ لیا تھوڑا بہت شوق میں۔"

"تھوڑا بہت؟ تمہارے سامنے کوئی بلیک بیلٹ نہیں ٹھہر سکتا۔"

میں نے کہا "مجھے ایسی غلط فہمی میں مبتلا مت کرو جو مجھے مہنگا پڑے" میں نے کہا۔

"بہت عرصے میں آتی ہے یہ مہارت۔"

"ہاں۔ میں شوقیہ سیکھ رہا تھا۔ ایک جاپانی سے۔۔۔ دو سال ہو گئے۔ وہ گھر آتا تھا مجھے پریکٹس کرانے کے لیے۔"

"کمال ہے۔ نہ کسی نے دیکھا نہ تم نے کسی کو بتایا۔"

"ہر بات ہر شخص کو کیسے بتائی جاسکتی ہے" میں نے کہا "تم بھی بہت کچھ کرتے ہو گے جس کا کسی کو علم نہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے عثمان کو فون کردیا تھا کہ شاہ عالم کی خواہش کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب مل کر بیٹھ جائیں اور تمام معاملات طے کرلیں۔ خود عثمان یہی چاہتا تھا۔ وہ ہمارے لیے چشم براہ تھا اور اپنی کوٹھی کے گیٹ پر موجود تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مول آدمی تھا جس کو بے وجہ ہنسنے کی عادت تھی۔ اس کی دوسری عادتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

"آیئے' آیئے حضور!" وہ ہنسا "دیکھو جی' ہم آپ کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں' آدھی رات کے وقت بھی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم تو ایسے سوکھ گئے ہو یار کہ آم سے اچورن بن گئے ہو۔ مجھے آج فرصت ملی تو میں نے سوچا کہ خادم سے اور تم سے بات کرلوں' حساب ہو جائے۔"

"دیکھو جی' وہ کس نے کہا ہے' حساب دوستاں در دل" وہ ہنسا۔

پرنس کا موڈ خراب تھا "بھول جاؤ دوستی کو بھی اور کاروبار کو بھی۔"

"یار شہزادے۔ تم ابھی تک ناراض ہو۔ ہم نے کون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی غلط بات کہی تھی" وہ بولا اور پھر ہنس پڑا "اکیلے اکیلے بات کرنے سے اچھا ہے مل کے بات کرلیں۔ وہ کیا ہے' ہم بھی ہیں تم بھی ہو آمنے سامنے۔"

"میں شاہ جی کی بات کررہا تھا۔ یہ الگ ہونے کا فیصلہ کرچکے ہیں' ہم سے بھی اور ہمارے بزنس سے بھی۔"

وہ ہنسنے لگا "چھوڑو جی۔ مذاق کی عادت ہے ان کی۔ آؤ اندر آؤ۔"

میں نے کہا "عثمان۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کہیں اور بیٹھ کے بات کریں گے۔ نہ میرا گھر نہ پرنس کا اور نہ تمہارا۔"

وہ فوراً مان گیا "اوجی دل کرے تو مال روڈ کے بیچ میں بیٹھ کے بات کرو۔ بادشاہی مسجد کے مینار پر چلو۔"

میں نے کہا "ہائیڈے ان چلتے ہیں لیکن پہلے میں رخشی کو بتادوں۔"

پرنس نے حیرانی اور طنز سے کہا "بڑی تبدیلی آگئی ہے شاہ جی میں۔ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہیں۔"

"ہر شریف آدمی خدا کے بعد بیوی سے ڈرتا ہے" میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور چند قدم دور چلا گیا۔

عثمان کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا "دیکھو جی رب کی قدرت۔ مسٹر شاہ بھی شریف آدمی ہوگئے۔ قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔"

میں نے رخشی کا نمبر ملایا تو وہ خفا ہونے لگا "اے یار تو آدمی ہے کہ بھوت' کہاں غائب ہوگیا تھا۔"

میں نے کہا "میں کہاں جاسکتا ہوں یار۔"

"میں کب سے تجھے فون کررہا ہوں۔ وہ تیری گھر والی مجھے دوبار ڈانٹ چکی ہے۔ سالی نشے میں ہے" وہ بولا۔

"یار نیند میں ہوگی" میں نے کہا۔

"پیارے اب ایسے بھی نہیں ہیں ہم کہ کوئی نشے میں بول رہا ہے یا نیند میں' یہ بھی نہ پہچانیں۔ ابے ہم تو فون پر آواز سن کے بتادیں کہ وہسکی پی ہے یا ولایتی اور ولایتی کون سی۔"

"اچھا' یہ بکواس بند کر۔ تُو نے وہ کام کردیا؟"

"کردیا یار۔ ابھی تو آیا ہوں واپس لوٹ کے۔ تیری بھابی بہت خفا ہورہی ہے۔ گالیاں دے رہی ہے تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

"میں سن رہا ہوں سب" میں نے کہا "یار' اسے سنانا کیا مشکل ہے تیرے لیے۔ ایسی روز آتی ہیں اور جاتی ہیں لیکن تیری میری دوستی آنی جانی چیز نہیں ہے۔"

"یہ تو قسم اللہ کی سچ ہے" وہ فوراً جذباتی ہوگیا۔

"اسی لیے میں ایک تکلیف دے رہا ہوں تجھے" میں نے عیاری سے کہا۔

وہ چلانے لگا "اس وقت' آدھی رات کے بعد تکلیف۔ ابے لعنت اس دوستی پر۔ بھاڑ میں جاتو۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ تجھے میری قسم ہے۔"

"ابے یہ حرامی پن ہے۔ تو اپنی قسم دیتا ہے۔ قسم اللہ کی اپن کسی سالے کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوتے مگر تو ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ بول کیا کام ہے۔"

میں نے اسے اشرف کی کوٹھی کا پتا سمجھایا "اس وقت میں یہاں ہوں۔ یہاں سے ہم جائیں گے ہائیڈے ان کی طرف۔ پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔ پانچ منٹ بعد تو مجھے فون کر اور میں کچھ بھی کہوں' تو بس سنتا رہ۔ بات ختم کرتے ہی میں اپنی گاڑی میں اپنے گھر جاؤں گا۔ گاڑی میں ایک ڈرائیور ہے اور دو مہمان ہیں پھر گاڑی انہیں واپس یہاں لائے گی۔ پہلے ایک کو اس کے گھر چھوڑے گی اور پھر دوسرے کو مگر میرے اترجانے کے بعد تو اس گاڑی کو کسی بھی جگہ روک لے میرے گھر سے کافی فاصلے پر۔ یہ کام تو آسانی سے کرسکتا ہے' جہاں کوئی نہ دیکھے۔"

"اچھا لیکچر مت دے۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔ یہ بتا اس کے بعد کیا کرنا ہے" وہ بولا۔

"ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جا۔ آج کی رات مہمان بنا کے رکھ۔ انہیں پتا نہ چلے کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کے بارے میں کل تفصیل سے بتاؤں گا۔ کل صبح' بس ایک گھنٹے کا کام ہے۔"

"ابے ایک گھنٹے میں تو صبح ہوجائے گی۔ قسم اللہ کی رات ضائع گئی آج کی۔ تو چپ کر الو کی پٹھی۔ کیا بولے جارہی ہے اتنی دیر سے۔ کان الگ خراب کردیے۔ دماغ الگ خراب کردیا۔ یار کی یاری چھوڑوں۔ قسم اللہ کی تیرے جیسی ایک سو ایک اپنے یار کی جوتی کے برابر نہیں۔"

باقی باتیں اس نے اپنی تازہ ترین محبوبہ اور منگیتر سے کی تھیں جو ہماری گفتگو کے دوران میں مسلسل بول رہی تھی اور رئیس جیسے عاشق سے زیادہ اس کے دوستوں کو بُرا بھلا کہنے میں مصروف تھی۔ یہ اس کی تیرہویں منگیتر تھی۔ تیرہ کا عدد ہی منحوس ہوتا ہے۔ لیکن منگیتر نمبر گیارہ بارہ اور اس سے پہلے ہر صحت مند اور جاندار حسینہ کون سی مبارک تھی۔ سب نے شادی کی منزل آنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

خادم عرف پرنس کی نظر مجھ پر تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے

میری اس پر۔ وہ میری باتیں سننا چاہتا تھا مگر عثمان نے اسے اپنی باتوں میں الجھا رکھا تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا' اس کی آواز پتلی مگر تیز تھی۔ ایسے ہی اس کی ہنسی تھی جو باتوں کے درمیانی وقفے میں یوں سنائی دیتی تھی جیسے آندھی اور بارش کے شور میں بادلوں کی گرج۔ خود میں بھی آہستہ آواز میں بات کررہا تھا اور ایک کان میں نے رئیس کی باتوں کے لیے وقف کردیا تھا تو دوسرے سے عثمان کی آواز کا سگنل ریسیو کررہا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ پرنس اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے حیرت ناک اور دردناک واقعات سنا کے خبردار کرنا چاہتا ہے تو میں فوراً اپنا پلان بدل دیتا پھر رئیس یہاں پہنچتا تو اسے کچھ نہ کرنا پڑتا۔ وہ اپنی گاڑی میرے حوالے کرتا اور میری گاڑی لے جاتا۔ اس میں لاش کی طرح بے ہوش پڑے ہوئے تین افراد کی آنکھ رئیس کے مہمان خانے میں کھلتی۔

میں نے کہا "سوری فرینڈز۔ رخشی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بھیج دیا ہے لیکن میں بھی زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتا۔"

عثمان ہنسا "دیکھو جی چنگا بھلا بندہ کیسے اچانک شوہر ہوجاتا ہے" اس نے تعزیتی لہجے میں کہا۔

ٹائیگر اپنے باس کی وجہ سے بھی خاموش تھا اور مزید بے عزتی کے خوف سے بھی مگر اس کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ اندر ہی اندر وہ کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے اور شاید اپنے باس کے بزدلانہ رویے سے بھی ناخوش ہے اور یا سوچ رہا ہے کہ آج کا بدلہ کل کیسے لیا جائے۔ آج تو حد ہی ہوگئی تھی کہ باہر کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی کچھ نہیں کرسکا جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف جیسا مہلک اور مؤثر ہتھیار تھا۔ چھلنی کیوں نہیں کردیا اس نے مجھے آخر۔ کیا واقعی پرنس کی ایک معمولی سیاست داں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں؟

وہ گاڑی چلاتا رہا اور ہم تینوں نے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھتے ہی کاروباری رشتوں کے مستقبل پر بحث شروع کردی۔

میں نے پھر اپنے عزم کا اعادہ کیا کہ میں ان کے کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔

عثمان نے کہا "دیکھو جی۔ کوئی بات ہے تو بتاؤ ہمیں۔ ایسے کھڑے کھڑے تین لفظوں میں طلاق دینے کی وجہ۔"

میں نے کہا "وجہ بتانا ضروری تو نہیں مگر صاف بات ہے۔ اب میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"سارا رسک تو ہمارا ہے" پرنس بولا۔

"اس تعلق میں بھی تو رسک ہے" میں نے کہا "مجھے اپنے سیاسی مستقبل کی فکر ہے۔"

"دیکھو جی' سیاست کی گاڑی بھی چلتی تو دولت کے پہیوں پر ہے۔ لٹانے کو مال نہ ہو لیڈر کے پاس تو اس کا ساتھ کون دے گا؟ نعرے لگانے والے ہوں یا پیسہ لگانے والے۔"

میں نے کہا "اس کی فکر تم مت کرو۔ پچاس سال ہونے والے ہیں۔ دو ٹرابھی تک انہی نعروں اور جھوٹے وعدوں پر ساتھ دے رہے ہیں لیڈروں کا یا نہیں؟"

پرنس بولا "میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ناممکن ہوگا ان کے لیے۔"

میں نے غرا کے کہا "مجھے یقین ہے کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرو گے تم۔"

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ غلطی کس کی تھی۔"

میں نے کہا "میں یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں۔ خواہ کام دلیل سے ہوا۔ کسی اور طریقے سے۔"

"دیکھو جی۔ کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔" عثمان بولا مگر اب وہ ہنسنا بھول چکا تھا۔ "بندہ جب تک دلدل میں نہ اترے پاک صاف رہتا ہے اور نظر بھی آتا ہے لیکن دلدل سے باہر آنے والا کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیچڑ سے کوئی تعلق نہیں اور وہ تو جانتا ہی نہیں کہ کیچڑ کے کیتے ہیں اور اس پر تو کیچڑ کا ایک داغ نہیں۔"

میں نے کہا "عثمان۔ کیچڑ میرے جسم پر ہے تو یہ بھی میری پرابلم ہوگی۔"

"صرف تمہاری پرابلم ہوتی تو ہم کہتے بھاڑ... میں جاؤ۔ آج اچانک تمہارے ضمیر صاحب جاگ اٹھے ہیں۔ کل تم پبلک کے سامنے پاک صاف نظر آنے کے لیے ہمیں کیچڑ کی طرح صاف کرسکتے ہو" پرنس بھڑک اٹھا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ حساب کتاب' لینا دینا کرلو اور بات ختم" میں نے کہا۔

"یار عثمان' سمجھاؤ اس پاگل کو۔ ایسا ہوسکتا ہے؟"

عثمان متفکر ہوگیا تھا "مسٹر شاہ جی۔ ایسا ظلم مت کرو۔ ایسے کہیں نہیں ہوتا۔ خطرناک عمارت گرانے والے بھی نوٹس دیتے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ متبادل انتظامات کیے بغیر ملبہ کردیں۔"

میں نے کہا "میں کیا متبادل انتظام کروں؟"

"انتظام تو ہم کرلیں گے لیکن اس میں وقت لگے گا۔ نیا پل بنانے سے پہلے ہی پرانا پل گرادینے کی احمقانہ بات مت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرو۔"

اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ان کے کاروبار کی نوعیت کا اندازہ نہ کرسکا۔ پرنس کی بات غلط نہیں تھی۔ شاہ عالم ان کے اور باہر کے کچھ لوگوں کے درمیان ایک رابطے کا کام کرتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اچانک ہی رابطہ ٹوٹ سکتا ہے۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی کون مارتا ہے۔

شاہ عالم کی ناگہانی موت کی خبر ان کے حواس پر بجلی بن کے گری ہوگی۔ انہیں ایک صدمہ مالی نقصان کا ہوگا۔ شاہ عالم اتنا عرصہ باہر صرف تفریح نہیں کررہا تھا۔ اس نے نئے سودے بھی کیے ہوں گے اور پرانے سودوں کا حساب بھی کیا ہوگا۔ وہ لاکھوں یا شاید کروڑوں وصول کرکے لا رہا ہوگا مگر وہ رقم اس کے ساتھ ہی ڈوب گئی تھی۔ اگر وہ خیر وعافیت سے گھر پہنچ جانے میں کامیاب ہوجاتا تو شاید رقم کا سراغ اس کی بیوی دیتی یا وہ خود گھر سے برآمد کرلیتے مگر وہ راہ میں ہی مار دیا گیا تھا چنانچہ اب یہ پتا چلانا ناممکن تھا کہ رقم کا کیا ہوا۔

دوسرا زیادہ پریشان کرنے والا خیال یہ ہوگا کہ اب کاروبار کیسے چلے گا؟ وہ رابطے کیسے بحال ہوں گے جن کو شاہ عالم اپنی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانے کے لیے خفیہ رکھتا ہوگا۔ وہ ایک اچھا سیلز مین اور کمیشن ایجنٹ ہوگا۔ اُدھر کا مال اِدھر لے جاتا ہوگا۔ مال کی قیمت وصول کرکے اپنا کمیشن پہلے رکھتا ہوگا پھر باقی رقم ایمانداری سے انہیں پہنچادیتا ہوگا چنانچہ باہمی مفاد میں سب کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ شاہ عالم کو سیاسی مخالفین نے قتل کردیا۔ پہلے پتا چلا کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا کوئی جعلساز تھا۔ انہوں نے ابھی سکھ کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ یہ خبر غلط ثابت ہوگئی۔ خوشی کے شادانے بجنے سے پہلے ہی خاموش ہوگئے۔ جب تیسری بار زندگی اور موت کے اس سنسنی خیز ڈرامے کو تقدیر نے نیا موڑ دیا اور عدالت میں ثبوت پیش کردیا گیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا بلکہ اس جیسا کوئی تھا تو پرنس ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن کی مردہ امیدوں میں پھر جان پڑ گئی۔

وہ انتظار کرتے رہتے کہ اپنا شاہ عالم زندہ ہے تو کب تک سامنے نہیں آئے گا۔ بالآخر وہ ان سے رابطہ کرے گا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے تھا لیکن میں نے قانونی طور پر شاہ عالم ہونے کا حتمی فیصلہ حاصل کرنے اور اپنے سیاسی مخالفین کی سازش کو ناکام بنانے کے بعد بھی اپنے کاروباری حلیفوں سے رابطہ نہیں کیا تو ان کی پریشانی ناقابلِ برداشت تشویش میں ڈھل گئی۔ یہاں تک کہ وہ مجھے زبردستی بلانے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے ذہن میں اگر یہ خیال تھا کہ میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے خود کی ہے۔ غبن کیا ہے یا ہیرا پھیری کی ہے تو غلط نہیں تھا۔ عالم ہر کاروباری دورے سے واپس آنے کے بعد پہلی فرصت میں ان سے مل کے حساب برابر کرتا ہوگا۔

میری کاروبار سے علیحدگی کے نوٹس کا مطلب بھی انہوں نے غلط لیا۔ عثمان نے کہا "دیکھو جی شاہ صاحب' اگر تو معاملہ ہے پیسے کا' غلطی سے پانچ دس لاکھ اوپر نیچے یا اِدھر اُدھر ہوگئے ہیں تو یہ کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ دس بیس لاکھ کیا چیز ہیں میرے لیے عثمان۔ تم جانتے ہو۔"

وہ جلدی سے بولا "ہاں جی۔ سب جانتے ہیں ہم۔ کروڑ دو کروڑ بھی ہوں تو تمہاری حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس گڑبڑ میں غائب ہوگئے ہوں تب بھی تم ادا کرسکتے ہو۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

پرنس بولا "یار' یہ اپنا حصہ بڑھانے کے طریقے ہیں لیکن ہم نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ بیس فیصد سے آگے بات نہیں ہوگی۔"

"ہنسنا ہے تمہارے بیس فیصد پر۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا بات ہے۔ دیکھو جی گرما گرمی سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ہم ایک آخری حل پیش کرتے ہیں' پچیس فیصد۔"

"ہرگز نہیں' پھر چھ مہینے نہیں گزریں گے کہ مسٹر شاہ عالم کو یہ بھی کم لگیں گے۔ یہ ہمارے برابر کے حصے دار ہرگز نہیں ہوسکتے۔ یار مال ہمارا ہے' نفع نقصان ہمارا ہے۔ جیل جانے کا سارا رسک ہمارا ہے۔ یہ کیا کرتے ہیں سوائے یار کی سے سودا کرانے اور وصولی کرنے کے اور کون لیتا ہے پچیس فیصد کمیشن۔۔۔ کسی بھی کاروبار میں۔"

"سنو یار خادم۔ ایک چانس ہے آخری۔ اگر بات بن جائے تو اچھا ہے۔ ہاں اگلی بار کی نوبت آنے سے پہلے ہم کچھ اور انتظام کرلیں گے۔ دنیا کا سارا کاروبار ایک آسرے پر تو نہیں چلتا بیٹھ۔"

میں نے کہا "یو آر ویری رائٹ۔ سمجھ لو کہ میرا کوئی آسرا نہیں رہا۔ اب تم اور پرنس جیسے چاہو اپنا کاروبار چلاؤ' میں دخل نہیں دوں گا اور کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

پرنس تلخی سے ہنسا "چھوڑو مسٹر شاہ۔ کیا ہم جانتے نہیں تمہیں' اتنے بے وقوف ہیں ہم کہ اعتبار کرلیں تم پر؟"

"نہیں کرتے تو جہنم میں جاؤ۔" میں نے غرا کے کہا۔

عثمان نے بہر صورت حال کو سنبھالا "دیکھو جی۔ ایسا ہی

کرنا ہے تو پھر۔ کچھ ٹائم دو۔ میرا مطلب ہے' ہمیں ان سے ملوادو جن سے تم سودے کراتے تھے۔ وہ بھی ہماری ہی فیلڈ کے آدمی ہیں۔ انہیں ہم سے یا ہمیں ان سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔"

"یہی تو ایک ترپ کا پتا ہے مسٹر شاہ کے ہاتھ میں۔"

میری جیب میں موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے فون نکالا اور کہا "ہیلو' رخشی۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ابے رخشی نہیں' رئیس ہوں میں۔ قسم اللہ کی خوار کروایا تو نے۔"

میں نے کہا "اوہو۔ تم بلاوجہ پریشان ہو۔ ہارٹ اٹیک کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ پاگل ہوگئی ہو۔ دیکھو میرے آنے تک مت مرنا۔ مرنا تو میں ہوں تم پر۔ اُف' کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ ڈاکٹر کو بلایا؟ اچھا' اچھا۔ میں آتا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں آرہا ہوں۔"

عثمان بولا "کیا ہوگیا بیگم صاحب کو۔ وہم؟"

میں نے تشویش زدہ صورت بنائی "نہیں عثمان۔ اسے واقعی ہارٹ پرابلم ہے۔ میں تو ڈاکٹروں کے ساتھ مل کے اس کو پتا نہیں چلنے دیتا مگر انجائنا کو وہم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اوئے چیتے' گاڑی موڑو میرے گھر کی طرف۔"

ٹائیگر نے غصے میں مجھے پلٹ کے دیکھا پھر عثمان اور پرنس کی طرف۔ میں نے دھاڑ کے کہا "گدھے کے بچے۔ سنا نہیں میں نے کیا کہا؟"

ٹائیگر نے گاڑی کی رفتار کم کی اور ایک کٹ سے واپسی کی سڑک پر آگیا۔ وہ آدمی کینہ پرور اور سفاک تھا۔

عثمان مایوسی سے بولا "یار آدھے گھنٹے میں کچھ نہیں ہوتا۔"

"آدھا گھنٹا تو بہت ہوتا ہے۔ آدھے منٹ میں زلزلہ ایک شہر کو کھنڈر کردیتا ہے۔ ایٹم بم نے ایک لاکھ لوگوں کو موت کی نیند سلادیا تھا۔"

پرنس تلخی سے بولا "بھئی یہ دل کا معاملہ ہے عثمان۔ دماغ کا نہیں۔ خدانخواستہ ان کی جان سے پیاری بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی تو مسٹر شاہ عالم ایسے وفادار اور محبت کرنے والے شوہر ہیں کہ خود بھی جان دے دیں گے۔"

"مگر تمہاری جان لینے کے بعد" میں نے کہا "یہ یاد رکھنا۔"

عثمان نے سرہلایا "دیکھو جی' بُرا ماننے کی بات نہیں۔ پہلے تم نے کبھی پروا نہیں کی۔ گھر والی کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہیں سمجھا' باہر والی۔"

"پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔"

پرنس نے سرہلایا "بالکل یقین نہیں آتا کہ تم وہی شاہ عالم ہو یا تو تم پر باہر کسی مداری نے جمپ موپھیر کے سب بدل دیا ہے یا پھر عدالت سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "دونوں ہی باتیں ہوگئی ہیں میرے ساتھ۔ تم بھی پہلے خادم تھے' یعنی نوکر۔ ملازم۔ تم کسی شاہ کی اولاد نہیں تھے مگر بن گئے شاہزادے' یہ تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کتنے بڑے حرام زادے ہو۔"

عثمان نے پھر مداخلت کی "دیکھو شاہ جی۔ بات کرو آگے کی۔ کون کیا تھا اور اب کیا ہے' یہ فضول بحث ہے۔"

"ہر بحث فضول ہوتی ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اس سے تلخی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی بحث میں تم مجھ سے نہیں جیت سکتے۔ سیاست داں میں ہوں' تم نہیں۔"

"جلدی میں فیصلہ مت کرو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بہت وقت ملا تھا مجھے اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے۔ اتنا کہ یہ شہزادہ تو ناراض ہوگیا تھا مجھ سے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکے کورنش بجالانے میں اتنی دیر کی کہ انہیں اپنے سپہ سالار کو حکم دینا پڑا۔ جاؤ اور اس سرکش باغی کو دست وپابستہ ہمارے حضور پیش کرو۔ وفادار چیتے' شہزادے ہم ہیں۔ وہ خود کو شاہ عالم کیسے کہتا ہے' دنیا کا بادشاہ۔ ایسے تو ہمارا باپ ہوگیا وہ۔ ہمارا کوئی باپ کیسے ہوسکتا ہے۔"

ٹائیگر اور پرنس خاموش رہنے پر مجبور تھے مگر میری بات نے عثمان کو سخت حیران کیا "مجھے بھی پرنس کی بات اب ٹھیک لگتی ہے۔ تم ایسے بات نہیں کرتے تھے۔ تمہارا لب ولہجہ اور انداز سب بدل گیا ہے۔"

مجھے پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ شاہ عالم کو ناصر عظیم کے لہجے میں نہیں بولنا چاہیے۔ شاہ عالم ہاؤس کے گیٹ پر گاڑی رک گئی تھی۔ وہاں اس وقت بھی اسلحہ بردار پولیس والے گاڑی میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھتے ہی مستعد نظر آنے لگے تھے۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے فاتح عالم فورس کے غنڈہ گردی کرنے والے محافظوں کو میں نے خود ہٹادیا تھا۔ اب وہاں ایک پولیس مین گوروں کے دور کی راکفل کے سہارے یوں کھڑا تھا کہ لگتا تھا ہوا کے جھونکے سے یا ہاتھ لگاتے ہی گر جائے گا۔ اس نے بھی انیس ثمن کی پوزیشن میں آنے کی واجبی سی کوشش کی۔

پولیس وین کے اگلے حصے میں ایک سب انسپکٹر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہلایا تو وہ چونکا "تھانے دار صاحب' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگے "حکم کرو عالی جاہ۔"

میں نے کہا "اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے کہو کہ میری گاڑی لے جائے۔ تینوں مہمانوں کو گھر چھوڑے اور گاڑی واپس لے آئے۔"

وہ یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے میرے مطالبے سے آئین کی سنگین خلاف ورزی کا احتمال ہے "سر جی' ہماری سیکیورٹی ڈیوٹی ہے۔"

"یہ بھی سیکیورٹی ہے" میں نے کہا "یا یہ بات تمہیں کوئی ایس پی سمجھائے پھر سمجھ میں آئے گی؟"

اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو حکم دیا "چل بھئی جا' نوکری تو نے بھی کرنی ہے اور ہم نے بھی۔"

خادم عرف پرنس اور ٹائیگر کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے خوش دلی سے ان کو خدا حافظ کہا اور اندر چلا گیا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں نے رخشی کے بیڈ روم کی طرف جانے سے گریز کیا۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو گاڑی کی آواز پر ہی باہر آجاتی۔ ٹائیگر صاحب کا لایا ہوا کھانا چکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ میرا بھوک اور تھکن سے بُرا حال تھا۔ یہ تھکن جسمانی کم اور اعصابی زیادہ تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں بیڈ پر گرتے ہی آنکھیں بند کروں اور چھ آٹھ گھنٹے سارے تفکرات سے آزاد ہو کے گہری نیند سوتا رہوں مگر فکروں کے آسیب اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

میں نے فریج کھول کے دیکھا اور پھر کچن میں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں گلاب چنبیلی یک جان دو قالب ہوئے پڑے ہوں گے۔ وہ کچن ہی کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے حالانکہ سرونٹ کوارٹر انہیں زیادہ آسائش اور بہتر خلوت فراہم کرنے کے لیے موجود تھا مگر۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' چنبیلی وہاں اکیلے رہتے ہوئے ڈرتی تھی یا شاید اسے گلاب سے ایک لمحے کی جدائی گوارا نہ تھی۔

جناب ابوبکر آزاد اس بارے میں ایک منفرد نظریہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار "محبت کے انجن کی زندگی" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میاں صاحب زادے۔ یہ جو چینی ہیں اپنے پڑوس میں' ان کا قول ہے گویا کہ آدمی کے رزق کی مقدار سب کے لیے ایک ہی ہوتی ہے جو تھوڑا تھوڑا کر کے کھاتے ہیں' سو سال جی لیتے ہیں اور بھئی دگنی مقدار کھا کے کوئی پچاس سال گزار لیتا ہے تو چار گنا کھا کے کتنا جیے گا؟ غالباً پچیس سال۔ حساب کی رو تو کچھ ایسا ہی کلیہ ہے گویا ہر چیز کی زندگی کا' کیا سمجھے؟ گاڑی انجن ایک لاکھ میل چلتا ہو تو عزیزم' دس میل روز چلا دس ہزار دن گزارو ہنسی خوشی اور ہزار میل دوڑا لو سو دن بعد دم توڑ دے گا مظلوم۔ بس میاں محبت کے انجن کا احوال بھی گویا یہی ہے۔ حسنِ جاناں کے دیدار میں لطف ہے بقول شاعر۔ ایک ساعتِ نایاب کا۔ ورنہ عاشق شریعت میں جب آجاتی ہے تو محبت کا انجن کتنا چل سکتا آخر؟ حساب کی رو سے۔ جذبات کی عمر ہو ایک لاکھ گھنٹے چوبیس گھنٹے جو نظر کے سامنے ہو' اسے دیکھا جا سکتا ہے ہزار ایک سو چھیاسٹھ دن۔ تقریباً دس سال گویا۔ صبح کا گیا کو لوٹ کے گھر آنے والا کلرک بیس سال برداشت کر ہے۔"

کافی پیتے ہوئے مجھے یہ بات یاد کر کے ہنسی نہیں آئی مجھے چندا کی یاد آئی جسے میں نے گزرے ہوئے آٹھ برس میں ہر گھڑی' ہر لمحہ اپنے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ سا نہیں ہوتی تھی تو اس کا تصور ساتھ ہوتا تھا۔ وہ خوابوں سفر میں ہم سفر تھی اور خیالوں میں شریک تھی۔ اس وقت دید کی ساعتِ نایاب کا کوئی مسئلہ نہ تھا تو گویا محبت کا انجن روانی میں تھا۔

اچانک اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ نہیں' میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کا تصور اور اس کا خیال بھی اجنبی ہو گیا تھا۔ دل تمام عمر دھڑکتا ہے اور زندگی کے احساس فراوانی میں کمی نہیں آتی مگر اچانک درد کی ایک لہر اٹھتی تو اپنا دل ہی اپنا دشمن محسوس ہوتا ہے۔ کم بخت جان لے چاہتا ہے۔ دغا باز' ایک عمر بھروسا کیا تجھ پر' تو نے بھی دھوکا دیا۔

چندا کا نام دل میں اٹھنے والی ٹیس کی طرح تھا۔ اسے برداشت کیے بنا چارہ نہ تھا۔ اس میں بھی ہارٹ اٹیک کی قوت اور دہشت ناکی تھی۔ کیا واقعی یہ اختتام ہے۔ اس نے جو کیا وہی سچ تھا؟ نہیں' یہ جتنا میرے لیے ناممکن ہے اتنا چندا کے لیے ہوگا۔ لفظ کوئی معانی نہیں رکھتے۔ لفظ دو طلے ہوتے ہیں۔ سچے جذبات؟ مائی فٹ۔ سابق ناصر عظیم صاحب آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ ابھی جا سکتے ہو تو لوٹ جاؤ اس پاس۔ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے تمہارے لیے۔ لکڑی جل جا کوئلہ اور کوئلہ جل بھی راکھ۔ اب راکھ پھر کوئلہ نہیں ہو سکتی اور کوئلہ پھر لکڑی نہیں بن سکتا۔ دو چار یا آٹھ دس سال بعد یہ ہو سکتا ہے کہ تم کینیڈا' لندن یا لندن

کسی فلائٹ پر یا سبزی منڈی میں ایسے ملو کہ تمہارے ہم رکاب کوئی مونث ہو اور اس کے ساتھ ایک مذکر اور تم کہو کہ یہ چار میری پروڈکشن ہیں اور یہ ان کی پروڈیوسر۔ تو جواب میں وہ کہے کہ ماشاء اللہ یہ سب ہیں میرے لواحقین یعنی میرے جگر کے ٹکڑے اور سرتاج تم سلامت باشد وغیرہ۔

میں نے سر کو جھٹکا اور سوچا کہ ایک خواب آور گولی میرے دماغی انتشار کا مناسب علاج کر سکتی ہے مگر میں شاہ عالم کے گھر شاہ عالم ہاؤس میں تھا اور شاہ عالم ہونے کے باوجود شاہ عالم نہیں تھا چنانچہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ضرورت کی کون سی چیز کہاں ہوگی۔ آٹھ سال ایک گھر میں گزارنے کے بعد چندا مجھ سے کہتی تھی کہ انگوٹھی نہ جانے کہاں رکھ دی ہے میں نے تو میں دو منٹ میں لے آتا تھا۔ یہ آپ نے کل وضو کرنے سے پہلے اتاری تھی اور کچن کیبنٹ میں رکھی تھی۔

پھر چندا۔ فار گیٹ چندا مسز شاہ عالم۔ جب تم ناصر عظیم نہیں ہو تو پھر اس دہری شخصیت کے برزخ میں کب تک رہو گے۔ جنت سے نکالا جانے والا انسان پھر جنت میں جا سکتا ہے مگر شرط ہے اعمال کی اور قیامت تک انتظار کی۔ تب تک اس زمین پر جینے کی سزا تمہارا مقدر ہے جس پر تم پھینکے گئے۔

گیسٹ بیڈ میں اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے آنے والے بلکہ آجانے والے دن کے بارے میں سوچا۔ صبح پی جے ایف کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوگا۔ خس اور قریشی کا پتا صاف ہو جائے گا۔ مجھے پارٹی کی تنظیم نو کرنی ہوگی اور تمام معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرنی ہوگی۔ یہ ہے پرابلم نمبر ون۔ پرابلم نمبر دو ہے شبنم' نہیں' پرابلم وہ ضرور ہے مگر اتنی بڑی نہیں کہ اسے دیگر مسائل کے مقابلے میں سرفہرست رکھا جائے۔ تیسری پرابلم ہے اس ڈرامے کے پلاٹ سے اپنا کردار ختم کرنا جس کے کچھ کرداروں سے میری پہلی ملاقات ہی مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ پرنس' ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن کا کیا کاروبار ہے' میرا اس میں کس حد تک دخل تھا۔ اپنا حساب برابر کرنے کے لیے مجھے ان کو کیا لینا پڑے گا؟ اپنی جان نہ چھوڑنے والے کیل سے جان چھڑانے اور پھر جان بچانے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔ شبنم کی پرابلم اس کے بعد اور ان سب سے الگ ہوگی' اپنی پرانی شناخت کے ساتھ پرانے رشتوں کو استوار رکھنے کی پرابلم۔

کیا میرے لیے یہ ممکن ہوگا کہ میں ناصر عظیم کے سب رشتوں کو توڑ کے صرف شاہ عالم بن جاؤں۔ سارے رشتے جذبات کے ہوتے ہیں۔ کیا میرے جذبات بدل جائیں گے۔ وہ احترام اور عقیدت کے جذبات جو خان اعظم کے لیے ہیں۔ محبت جو مجھے چندا سے ہے۔ جتنا پیار میں تمر سے کرتا ہوں اور جیسے ڈاکٹر کمال فاروقی کو چاہتا ہوں۔ کیا وقت کے ساتھ جذبات اپنی قیمت کھو دیں گے اور شاہ عالم کی عزت' شہرت اور دولت کے خوابوں کی کشش غالب آجائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ کہنے کو چند لاکھ کے کہ میں ناصر عظیم نہیں رہا تو اس کے لیے غیر اہم ہو گیا' نقش ماضی ہو گیا۔ فرما لاکھ سمجھے کہ ایک بھائی ناصر عظیم تھا وہ نہیں رہا۔ خان اعظم یا ڈاکٹر فاروقی دل پر جبر کر کے لاتعلقی کا اظہار کرتے رہیں مگر ایسی خود فریبی کا کھیل انہیں بھی بہت دکھ دے گا۔ جو محبت کرتے ہیں وہی دکھ بھی جھیلتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ میں نے صرف نام بدلا ہے۔ بالآخر انہیں یقین آجائے گا کہ میں ناصر عظیم ہی ہوں۔ زندگی کے راستے خواہ کتنی بار بدلیں' میری منزل کچھ بھی ہو اور وقت کا بہاؤ مجھے جدھر چاہے لے جائے مگر ان کے لیے میرے اور میرے لیے ان کے جذبات اسی طرح رہیں گے جیسے زمین پر موسم بدلتے ہیں۔ رات اور دن بدلتے ہیں مگر زمین تو وہی رہتی ہے۔ زمین کا آسمان اور اس کے چاند سورج اور ستارے وہی رہتے ہیں۔

چنانچہ برحق ہے فلمی شاعر کا فرمایا ہوا کہ میں ترا چاند تو مری چاندنی اور چاند سورج کی جوڑی کی جو مثال دینا پڑتی ہے وہ ہم ہی ہو گیا۔ چشم بد دور۔ آپ لاکھ کو اس فرمائیں مس چندا مگر یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ میرا نام شاہ عالم ہو یا ناصر عظیم' فرق مجھے پڑتا ہے اور نہ تمہیں۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ محبت' عشق' پیار اور پریم۔ اسے جو چاہو کہو' اس کے وجود سے انکار محض خود فریبی کی دیوانگی۔

خیال کو کنٹرول کرو۔ خان اعظم ہمیشہ کہتے تھے۔ خیال سے ہی عمل ہے۔ خیالات میں انتشار ہو' نظم و ضبط نہ ہو تو اعمال کیسے درست ہو سکتے ہیں۔ خیالات کی یلغار ہو تو ان سب کو لائن اپ کرو۔ اٹین شن کرو پھر ایک ترتیب میں لاؤ۔ کیا سب سے زیادہ اہم ہے' اسے آگے لاؤ جو غیر اہم ہے وہ پیچھے۔ فوراً کیا کرنا ہے' اسے ذہن میں آگے رکھو۔

صبح کے چار بجے تک میں خاصا پُرسکون اور پُراعتماد ہو چکا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ تین چار گھنٹے سولوں مگر خیالات کی سیاہ آنکھیں بند کرتے ہی یوں بے قابو ہو جاتی تھی جیسے اسکول میں ٹیچر کے جاتے ہی کلاس کے لڑکے ہڑبونگ مچاتے ہیں اور کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں کھلی آنکھوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھت پر کوئی فلم دیکھ رہا ہوں یا فلم کے ٹوٹے چل رہے ہیں۔ ایک فلم میں چندا یا قمر نظر آتی تھی 'اداس اور خفا۔ مجھے تو معلوم تھا کہ تم نہیں سدھرو گے۔ چندا کہتی تھی اور قمر رونے لگتی تھی۔ بھائی اگر اتنا عرصہ یہ رشتہ نبھانا نہ ہوتا تو میں اتنی دکھی نہ ہوتی آج پھر اچانک چیتے کی طرح عیار اور سفاک پرنس نمودار ہو جاتا تھا۔ تم کیا بچوں کا کھیل سمجھتے ہو کاروبار کو؟ اور کیا یہ اتنا آسان ہے کہ کوئی جب چاہے اس کھیل میں شریک ہو جائے اور جب اندر کے سارے راز جان لے اور سب کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا سیکھ لے تو خطرہ بن کے سر پر منڈلانے لگے۔ مجسم کا اداس' بیمار اور ویران آنکھوں والا چہرہ اپنی خاموشی اور مظلومیت کے ساتھ سوال کرتا تھا۔ تم شاہ عالم کو قتل کر کے شاہ عالم بنے ہو نا؟ ایک دن میں ثابت بھی کر دوں گی۔ قریشی اور شمس نعرے لگاتے نمودار ہوتے تھے۔ دھوکے بازی نہیں چلے گی' جعلسازی نہیں چلے گی۔

میں سوچکا تھا یا سونے والا تھا کہ میں نے باہر سے فائرنگ کی آواز سنی۔ ایک آواز کلاشنکوف کے برسٹ کی تھی جس کے جواب میں دوسرا برسٹ فائر ہوا پھر ریوالور کی گولیاں چلائی گئیں۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میں نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور اپنا ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔

باہر نہ جانے کس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ تمام فائرنگ شاہ عالم ہاؤس کے باہر گیٹ کے قریب ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں حملہ آور کون تھے۔ میں نے پولیس کے ڈی ایس پی کو چلا کے حکم دیتے سنا "دیکھو سامنے مت جاؤ۔ دیوار کے پیچھے رہو۔" پھر ایک چھناکا ہوا۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ بکھر گیا۔ کسی نے کہا "سرچ لائٹ توڑ دی ہے انہوں نے سر!"

فائرنگ میں ایک بار پھر شدت آگئی۔ شاید حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے اور بہتر طور پر مسلح تھے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے خود ہی گیٹ پر متعین ایف اے ایف کے جوانوں کو ہٹوا دیا تھا اور اب حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے والے صرف پولیس کے چار جوان تھے۔

اچانک کمرا تاریک ہو گیا۔ باہر بھی ہر لائٹ بجھ گئی۔ غالباً انہوں نے فائرنگ سے مین لائن اڑا دی تھی۔ میں ایک دم دروازے کی طرف لپکا۔ اتنی ہی تیزی سے اندر آنے والی رخشی مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ وہ بُری طرح لرز رہی تھی "یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ "تم ابھی تک یہاں کھڑے ہو۔ نیچے چلو" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اندر کے راستوں سے زیادہ واقف تھی اور اندھیرے میں بھی نظر آرہا تھا۔ میں اس کے ساتھ سا دوڑتا رہا۔ "یہ۔ کون لوگ ہیں؟" رخشی نے کانپتی آواز پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ شاہ عالم کے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔"

"انہوں نے بجلی کا مین فیوز اڑا دیا ہے۔" وہ ایک دوسرے کمرے میں گزرتی جارہی تھی "شاید ٹیلی فون تاریں بھی کاٹ دی ہوں۔"

"کوئی جنریٹر نہیں ہے یہاں؟ اسٹینڈ بائی۔ جو خود آن ہو جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو سہی" وہ بولی اور ایک مختصر سے اسٹور جیسے کمرے میں گھس گئی۔ اب میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ شب خوابی کے لباس میں ہے اور اس کے بدن پر پسینہ بہہ رہا ہے۔ اس کا سارا وجود ٹھنڈا تھا اور میں تاریک اسٹور روم میں اس کے قرب کی ساری خوشبو کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے اشارہ کیا۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ فرش سطح کے برابر ایک لوہے کا ڈھکنا تھا۔ یہ انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ پورا کھل گیا۔ رخشی اس کے اندر اتر گئی۔ نیچے سیمنٹ کا ایک زینہ جارہا تھا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور اوپر ڈھکنے کو کسی آواز کے بغیر برابر کر دیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا جس میں سچ مچ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک موڑ کے بعد رخشی غائب ہو گئی تھی۔ میں نے کہا "رخشندہ' کہاں ہو تم؟"

اس کی آواز نیچے سے آئی "وہیں کھڑے رہو۔ میں لائٹ جلاتی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی زینہ روشن ہو گیا۔

اوپر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ نامعلوم حملہ آور پسپا ہو گئے تھے یا پولیس کی حفاظتی نفری کو مغلوب کر کے اندر گھس چکے تھے۔ وہ یقیناً بڑی طاقت کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ گیٹ پر پولیس کے گارڈ موجود ہیں لیکن وہ مقابلے کے لیے تیار تھے۔

زینے کا اختتام ایک دروازے پر ہوا۔ کھلے دروازے کے روشن چوکھٹے میں مجھے رخشی نظر آئی۔ ہلکے زرد رنگ کے نائٹ سوٹ میں اس کا اپنا رنگ زیادہ پیلا نظر آرہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے مگر مجھے حیران پریشان دیکھ کر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ

شاید خود میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ ہو' اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔

میں نے اندر جاتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک وسیع بیڈ روم تھا جس کا نصف حصہ آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بیڈ روم والے حصے میں ایک فریج تھا اور ٹرالی پر ٹی وی نظر آرہا تھا۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں وی سی آر کے ساتھ ڈش ریسیور تھا۔ بیڈ کے سرہانے ایک خوب صورت آرائشی قسم کا ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ آفس والے حصے میں چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی شاندار میز پر دائیں جانب کمپیوٹر لگا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ پر فیکس مشین تھی جو فون اور کاپیز کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی تھی۔ فرش کے قالین سے پردوں تک ہر چیز خوب صورت اور بیش قیمت تھی۔

"تم نے اوپر کا راستہ بند کر دیا تھا نا؟"

"اور کیا کھلا چھوڑ آتا" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا اندر نیچے سے لاک کیا یا نہیں۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "لاک۔۔۔ نہیں۔"

"حد کرتے ہو تم بھی؟" وہ اوپر کی طرف لپکی مگر میں نے اسے روک لیا۔

اوپر آخری زینے پر جا کے میں نے لاک کرنے کا نظام دیکھا۔ ڈھکن کے نچلے حصے میں ایک گھومنے والی فولادی پٹی تھی' یہ چوتھائی انچ موٹی پٹی..... چھت میں دونوں طرف لگے ہوئے کھانچوں میں پھنس جاتی تھی۔ اوپر سے کوئی چھت توڑے بغیر یا ڈھکن کاٹے بغیر اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ شاہ عالم نے اپنی حفاظت کے لیے جو ہنگامی انتظامات کر رکھے تھے' یقیناً قابل تعریف تھے۔

میں واپس نیچے آیا تو رخشی بیڈ کے کنارے پر ٹکی ہوئی پانی کے ساتھ کوئی گولی نگل رہی تھی۔ میں نے اس سے گلاس لے کر باقی پانی پی لیا اور بیڈ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چھت کے ایک گوشے میں نصب اے سی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

"او مائی گاڈ۔ یہ کون لوگ تھے آخر؟" رخشی نے ایک گہری سانس لے کر اپنے بکھرے بال سمیٹے اور لباس کو درست کیا۔

میں نے کہا "اس بارے میں جتنا تم جانتی ہو' اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔"

"یہ تمہارے دشمن تھے؟"

"ظاہر ہے دوست قاتلانہ حملہ نہیں کرتے۔"

وہ بولی "میرا مطلب تھا کہ۔ شاہ عالم کے سیاسی مخالف بہت تھے لیکن ایسے دشمن نہیں تھے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے جان سکتی تھیں۔ تم شاہ عالم سے بہت کم واقف تھیں۔ آخر یہ سب حفاظتی انتظامات اس نے کیوں کر رکھے تھے؟ وہ تمہارا شوہر بھی بہت کم تھا۔ شاید اپنے کُل کا دس فیصد۔ تیس فیصد سیاست داں تھا' ساٹھ فیصد اور بہت کچھ تھا۔ بزنس مین' بدمعاش۔ انڈر گراؤنڈ ورلڈ کا آدمی۔"

اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "ٹھیک کہتے ہو تم۔ وہ ہمیشہ ایک پُراسرار اجنبی رہا۔"

میں نے کہا "کیا یہ فون بھی ڈیڈ ہو گا۔"

"نہیں۔ اس کی لائن دیواروں میں محفوظ ہے اور پچھلی طرف کے ایک کیبنٹ سے زیر زمین لائی گئی ہے۔"

"بجلی بھی؟"

"بجلی بھی۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں تم ایک مہینہ روپوش رہ سکتے ہو۔"

"شاہ عالم نے کبھی بتایا تمہیں کہ اس پناہ گاہ کے بنانے کا مقصد کیا تھا؟"

وہ سامنے دیکھتی رہی "ایک مقصد کا مجھے علم تھا۔ اس کے ثبوت یہاں اکثر مل جاتے تھے۔ تم بھی دیکھ سکتے ہو۔ باتھ روم میں کوئی زنانہ سوٹ ہے تو وہ میرا نہیں۔ شاید کوئی نائٹی بھی ہو۔ اس کی خوشبو میری نہیں ہو گی۔ شاید اسی بیڈ پر کوئی بال مل جائے بھورے رنگ کا یا مل کھایا ہوا۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے بال کالے ہیں اور سیدھے۔ مگر مجھے شاہ عالم نے بہت مناسب جواب دیا تھا۔ ذلترلے اور بمباری سے محفوظ پناہ گاہیں اور بنکر ضرور ہونے چاہئیں ہر کوٹھی میں۔ سول ڈیفنس کی ٹریننگ کے اصولوں کے مطابق۔"

میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ میں نے ایف اے ایف کے محافظوں کو بے عزت کر کے رخصت کر دیا تھا۔"

"یہ ان کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے؟"

"ناممکن کچھ بھی نہیں مگر میں ان سے ایسے شدید ردعمل کی توقع نہیں رکھتا۔ میرے دشمن بھی اتنی جلدی وار نہیں کر سکتے۔"

"تمہارے اپنے دشمن؟"

"شاہ عالم کے دشمن۔" میں نے کہا "یہ مجھے اپنے دوستوں کی مہربانی لگتی ہے۔ خیر' معلوم ہو جائے گا۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

میں نے آفس ٹیبل کی درازوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ سب مقفل تھیں۔ میرا خیال تھا وہاں کوئی ٹیلی فون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈائری ضرور مل جائے گی جس میں پولیس کے اعلیٰ افسران کے نمبر بھی ہوں گے۔ شاہ عالم کے کاروباری دوستوں کے نام پتے اور فون نمبر۔ اس کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات' چیک بکس اور ڈائریاں۔ سب کا اس محفوظ جگہ پر مل جانا عین قرینِ قیاس تھا۔

ایمرجنسی کے لیے پولیس کا نمبر مجھے یاد تھا۔ بہت دیر بعد کسی نے ریسیور اٹھا کے خوابیدہ بیزار لہجے میں کہا "سلاواں لیکم۔ اپنے ایس آئی غلام نبی پولیس ایمرجنسی۔۔۔"

میں نے کہا "میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"کدھر سے۔ کون شاہ عالم؟ کیا ہو گیا سویرے سویرے؟"

میں نے کہا "میں چیئرمین پی جے ایف۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو؟" "پیس جسٹس اینڈ فرینڈ شپ پارٹی۔"

"سرجی حکم کریں" وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔

میں نے کہا "میرے گھر پر کچھ لوگوں نے مسلح حملہ کیا ہے۔ بہت فائرنگ ہوئی تھی۔"

"اچھا جی' کوئی بندہ تو نہیں ٹھنڈا ہوا؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں وہاں سے نکل گیا تھا۔ ایک پولیس کی گاڑی میں مسلح نفری گیٹ پر موجود تھی۔ ان سے رابطہ کر کے دیکھو۔ میں تم سے دس منٹ بعد پھر بات کرتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ نمبر پوچھتا' میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ نمبر کیا ہے اور یہ خفیہ فون نمبر کسی کو بتانا کوئی عقلمندی کی بات بھی نہ ہوتی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے" رخشی نے کہا "شاہ عالم کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کی زندگی ہی کتنی چلی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ وہ بچا رہا۔ وہ زندہ ہوتا تو یہ سب اسی کے ساتھ ہوتا۔ آگے بھی بہت کچھ ہو گا جو پہلے نہیں ہوا۔ ناؤ ٹیک اٹ ایزی۔ صبح ہونے والی ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

میں نے سوچ کے جواب دیا "ہاں۔ ہر بات ہر شخص کو بتانے کی نہیں ہوتی اور کوئی نہیں بتاتا۔ تمہارا اور میرا تعلق بدبختی کی پیداوار ہے۔ حادثات کا نتیجہ ہے۔ اس میں نہ میری خواہش اور کوشش کا دخل تھا اور نہ تمہاری۔ بس ہم نے اپنے اپنے خود غرضانہ مفادات کی خاطر ایک دوسرے کو سہارا دیا اور زندہ رہنے کے لیے ہم ایک جھوٹ کو سچ بناتے رہے پھر یہ تعلق بھی عارضی ہے۔ بالآخر میرے اور تمہارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔۔۔" وہ سر جھکا کے بولی "مگر کیا ہم اچھے دوست بن کے نہیں رہ سکتے۔"

"نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم نے دشمنی اور نفرت کے سفر کا آغاز کیا تھا اور پھر مجبوری نے ہمیں دنیا کے سامنے ایک کر دیا۔ اس رشتے کی بنیاد ہی جھوٹ اور خود غرضی پر ہے۔ ہمارے درمیان جو تھوڑا بہت نیک خواہشات کا جذبہ ہے' وہ بھی اسی اصول پر مبنی ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ تمہیں بھی شاہ عالم سے نفرت تھی اور مجھے بھی۔ جب میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹایا تو تم نے صرف خاموش رہ کے میری مدد کی۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور مجھے تم پر پھر دوستی کیسی' اس کے علاوہ۔۔۔"

"کہہ دو جو دل میں ہے" وہ تلخی سے بولی۔

"ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک حسین عورت اور جوان مرد صرف دوست بن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آگ اور پیٹرول کی کیا دوستی۔ یہ تو ایک شرع کی دیوار ہے جو ہمارے درمیان حائل ہے۔ تم کو چار ماہ اور دس دن کی قیدِ تنہائی کاٹنی ہے پھر تم آزاد ہو جاؤ گی۔ اس سے پہلے ہی یہ تعلق ختم ہو جانا چاہیے۔"

"تم ڈرتے ہو کہ۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں دنیا سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتا ہوں کیونکہ میں فرشتہ نہیں۔ دانۂ گندم کھانے والے آدم کا بیٹا ہوں اور ہمارا مشترک دشمن شیطان ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ یہاں کچھ چائے وغیرہ کا انتظام بھی ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ ہم یہاں ایک مہینہ چھپ کے گزار سکتے ہیں۔ یہ بات مجھ سے شاہ عالم نے کہی تھی۔ اب معلوم نہیں اس میں کتنا سچ تھا۔ میں اس کی زندگی میں کبھی یہاں نہیں آئی۔ اس کی اجازت ہی نہیں تھی مجھے۔"

"ایک مہینہ تو نہیں مگر ایک گھنٹا شاید گزارنا پڑے یہاں۔"

"میں دیکھتی ہوں" وہ اٹھی اور ایک دروازے کی طرف بڑھی۔

کچن میں سوائے چائے کافی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ فرج میں بھی پانی تھا یا پھر بیئر کی بوتلیں۔ یہ جگہ شاہ عالم کے لیے اپنے ہی گھر میں عیاشی کا ایک خفیہ اور محفوظ ٹھکانا تھی یا پھر ایک ایسی جگہ جہاں وہ کچھ بھی رکھ سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک کمرا نہیں' ایک بہت بڑی مدفون تجوری تھی۔ یہاں کسی کی رسائی نہیں تھی اور وہ اپنا خفیہ ریکارڈ یہاں بے خوف و خطر رکھ سکتا تھا۔ اس جگہ کی دریافت سے مجھے شاہ عالم کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہونے کی امید تھی۔

"چائے میں ملک پاؤڈر استعمال کرنا پڑے گا" رخشی نے کچن میں سے کہا۔

میں نے کہا "مجھے ضرورت نہیں' تم کرو۔"

دس منٹ بعد میں نے پھر پولیس ایمرجنسی کا نمبر ملایا۔ اسی سب انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ ایس پی غلام محمد صاحب خود پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس گئے ہیں۔

"انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دیا جائے۔ یہ بھی بولا تھا کہ آپ ان سے موبائل فون پر بات کریں" اس نے مجھے نمبر بتایا مگر میرے پاس اس وقت لکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے زبانی یاد کر لیا۔

رخشی نے بلیک ٹی کا مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ جگہ نہ ہوتی اور آنکھ نہ کھلتی تو اس وقت ہماری لاشیں پڑی ہوتیں اوپر۔"

میں نے کہا "میں جاگ رہا تھا۔"

"کس وقت آئے تھے تم۔ دو بجے تک میں بھی نہیں سوئی تھی۔ تمہارے انتظار میں نہیں' مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہے۔"

"میں نے گلاب اور چنبیلی کی آواز نہیں سنی۔"

"وہ چمپت ہو گئے کہیں یا بے ہوش پڑے ہوں گے دہشت سے' بہت بزدل ہیں۔"

میں نے کہا "میز کی درازوں کی چابیاں کہاں ہیں؟"

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی "مجھے نہیں معلوم۔ تم بھی تو یہی سمجھتے ہو کہ ہر بات ہر شخص کو نہیں بتائی جا سکتی۔ میرے جیسی بے وقعت بیوی تو ہر شخص سے بھی کم تر ہے اس کے لیے۔"

"راز تالوں میں بند نہیں رکھے جا سکتے بیٹھ۔"

"ویسے بھی تالے ہوتے ہیں شریف لوگوں کے لیے" وہ بولی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ شریف آدمی نہ شاہ عالم تھا اور نہ میں ہوں۔ مرحوم کو سمجھنے کے لیے مجھے وہ سب در کھولنے پڑیں گے جو مقفل ہیں۔ ایک دروازہ تم بھی ہو' سب سے اہم دروازہ۔"

"میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔"

"لیکن بہت کچھ ہے جو میں نے پوچھا نہیں اور تم نے بتایا نہیں۔ پہلے مجھے شک تھا لیکن اب یقین آ گیا ہے کہ شاہ عالم کے دشمن اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ تیسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ ایک کوشش کراچی سے لاہور پہنچتے ہی کی گئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہی اسے گولی ماردی جاتی مگر وہ بچ گیا تھا۔ دوسری جگہ اسے واقعی ماردیا گیا تھا اور قتل کرنے والے خوش تھے کہ الزام ایک مشتعل ہجوم پر آیا' کسی فرد پر نہیں لیکن شاہ عالم مر کے پھر زندہ ہو گیا۔ دفن ہو جانے کے بعد پھر نمودار ہو گیا۔ اب یہ تیسرا حملہ بہت منظم طریقے سے کیا گیا تھا۔ شاید اس سے اگلا وار خالی نہ جائے۔"

"اب تو تمہیں اندازہ ہو گیا کہ شاہ عالم کی زندگی جینا کتنا مشکل اور خطرناک ہو گا۔ کیا اس کے بعد بھی۔۔۔؟"

"ہاں۔ اپنی زندگی میں پیچھے چھوڑ آیا۔ یہی زندگی ہے اب میری۔ اس کے بعد تیری زندگی کی نہ گنجائش ہے نہ مجھے ضرورت۔ مجھے ایسے ہی جینا ہے اور میں جیوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں جینا ہی چاہیے" اس نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے ایس پی کا نمبر ملایا اور مجھے فوراً جواب ملا۔

"آپ کہاں ہیں سرجی" غلام محمد نے بڑی تشویش سے کہا۔

"جہاں بھی ہوں' خیریت سے ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا۔" شاید خوشامد پرستی اس کی عادت تھی۔

میں نے کہا "کیا صورتِ حال ہے شاہ عالم ہاؤس میں۔"

"باہر دو بندے پڑے ہیں۔ پولیس کا ایک جوان اسپتال میں ہے۔ اسے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ باہر سے دیواروں پر اور گیٹ پر گولیوں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ ہم نے ہر طرف سے محاصرہ کر لیا ہے کوئی کا۔ آپ فوراً آ جائیں۔"

"تم نے اندر دیکھا؟"

"اندر بھی دیکھ لیں گے' آپ کے آتے ہی۔ آپ تو جانتے ہیں سر کہ ہم کسی کی مدد کے لیے بھی گھر میں داخل ہوں اور وارنٹ نہ ہو تو مشکل پڑ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "سب کی بات مت کرو۔ یہ کہو کہ کسی وی آئی پی کے معاملے میں سیاسی بیان سے ڈرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور اندر سے کوئی مجھے شوٹ کر دے یا اندر کوئی بم رکھ گیا ہو۔"

"اندر کوئی داخل نہیں ہوا جناب عالی! پولیس کی جوابی فائرنگ نے ان کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو بندے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مارے گئے تھے ان کے۔ آپ آجاؤ جی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ رخشی نے میری باتوں سے گفتگو کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس نے اے سی بند کیا لیکن لائٹ جلتی چھوڑ دی۔ میں نے زینے کے اوپر والے راستے کو کھولا اور ہم زمین کی اسی سطح پر آگئے جہاں زندہ انسان اپنی اپنی زندگی کے نئے دن کا آغاز روز کے معمولات سے کر چکے تھے۔

میں نے دیکھا کہ وہ جگہ جہاں سے ہم نیچے اترے تھے' ایک گیراج میں تھی اور گیراج کا دروازہ اسٹور میں کھلتا تھا۔ گیراج میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی کی جاسکتی تھیں مگر اس وقت ایک ہی موجود تھی۔ رخشی نے مجھے بتایا کہ عام طور پر یہ ڈھکنا آگے والی گاڑی کے نیچے رہتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ میں نے گیراج میں کھڑی ہوئی شیراڈ کو دھکیلا اور اس ڈھکنے کے اوپر لے آیا۔

رخشی کچن کی طرف چلی گئی اور میں نے باہر کا رخ کیا۔ اندر والے حصے میں ہر چیز اپنی جگہ تھی اور ایس پی غلام محمد کے بیان کی تائید کرتی تھی کہ کسی حملہ آور کو کوٹھی میں داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ کوٹھی کی بیرونی دیواروں پر بھی گولیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ ایک گولی پجیرو کی سائیڈ میں لگی تھی اور دوسری نے ٹائر برسٹ کردیا تھا۔ ایک اور گولی کھڑکی کے فریم پر لگنے سے شیشہ بکھر گیا تھا۔

باہر کچھ فاصلے سے کافی تماشائی پُرتجسس' حیرانی اور افسوس ناک لاتعلقی کی جذباتی بے حسی کے ساتھ لاشوں کو جم کر سیاہ ہوجانے والے خون کو اور ضابطے کی کارروائی کو محض وقت گزاری کے لیے دیکھ رہے تھے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا ورنہ ان کا واردات سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

ایس پی غلام محمد نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سید حالا شوں کے پاس لے گیا۔ "ذرا غور سے دیکھ کر بتائیں کہ ان میں سے آپ نے کسی کو پہلے دیکھا ہے۔ کسی کو پہچان سکتے ہیں۔"

میں نے لاشوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ چوبیس اور اٹھائیس سال کے دو تندرست جوان تھے۔ سانولے رنگ اور کلین شیو چہروں والے۔ ایک کے بال لمبے تھے۔ دوسرے نے سر صاف کرادیا تھا مگر داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ وہ عام سے شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔

میں نے نفی میں سرہلایا "میں کسی کو نہیں جانتا مگر میرا خیال ہے کہ میری پارٹی کے نائب صدر تیمور سے بھی شناخت کرالی جائے۔ میرے مقابلے میں ان کا رابطہ زیادہ لوگوں سے رہتا ہے۔"

"ویسے تو سرجی' دشمن ہر بندے کے ہوتے ہیں۔ سیاست تو ہے ہی نفرت کا کھیل۔"

"سیاست کا کھیل۔ نفرت ہو تو محبت نظر آتی ہے۔ عداوت ہو تو دوستی۔"

"میرا مطلب تھا کہ۔ آج کل میں ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "آج کل میں بہت کچھ ہوا ہے میرے ساتھ۔ سب جانتے ہیں۔ یہ مجھ پر تیسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ ایک میں تو مار ہی دیا گیا تھا مجھے۔ اور جنازہ نکال کے مجھے گاڑ بھی چکے تھے لوگ۔"

اس نے افسوس سے سرہلایا "کیسی عجیب سیاست ہوگئی ہے سرجی' زندہ رہنے والوں کے لیے موت کا کھیل۔ انتظار کی اور ہوس کی جنگ۔"

"کیا کسی نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا؟"

"ضرور دیکھا ہوگا جی۔ دس منٹ تک ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی ہے مگر سب گھروں کے اندر دبکے پڑے تھے۔ کوئی گواہ نہیں۔ سب کہتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں سنا۔ ہم سو رہے تھے۔ ہر گیٹ پر ایک چوکیدار تو ہوتا ہے ناجی۔ وہ سب بھی انکاری ہیں۔ سارے نمازی بن گئے ہیں۔ ایک ساتھ فجر کی نماز پڑھنے چلے گئے تھے مسجد میں۔ اچھی طرح معلوم ہے مجھے کہ وہ کتنے نمازی ہیں اور ان کے مالک۔ انہیں پتا چلے کہ رات کو چوکیدار ایک منٹ کے لیے پھر اِدھر اُدھر گیا تھا تو اس کی چھٹی کردیں گھر وہ بھی حمایت میں بیان دے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب اس لیے کہ تم لوگوں نے گواہ کے ساتھ مجرم جیسا سلوک کرنے کی روایت ڈالی۔ بولنے والوں کو ہی سزا ملتی ہے تھانوں میں۔ اصل مجرم جھوٹ بول کر نکل جاتے ہیں۔"

اس نے فوراً موضوع بدل دیا "مجرم سفید رنگ کی ٹویوٹا پک اپ میں سوار ہو کے آئے تھے۔ ڈبل کیبن والی پک اپ تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ اس میں کم سے کم بھی چار آدمی تھے۔ یہ ڈرائیور تھا جو مارا گیا۔ دوسرا اس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ اس نے کلاشنکوف سے گولیاں برسائیں۔ ایک ہمارے کانسٹیبل کو لگی۔ باقی دو پیچھے تھے۔ وہ اندر جانا چاہتے تھے مگر پولیس نے موقع نہیں دیا۔ وہ بھاگ گئے گاڑی لے کر۔"

میں نے کہا "کیسے بھاگ گئے۔ اگر وہ پیچھے تھے تو گاڑی چلانے کے لیے کوئی آگے آیا ہوگا۔ دروازہ کھول کے یا کھلے دروازے سے اندر گیا ہوگا اور ڈرائیور اگر سامنے بیٹھا ہوا

تھا اس لیے نشانہ بنا تو سیٹ پر ہی مرگیا ہوگا۔ کیا فرار ہونے والوں نے اس کی لاش باہر گرائی تھی۔ اس کا دوسرا ساتھی۔"

"او سرجی' آپ نے تو پوری انکوائری شروع کردی۔ سوالات کا برسٹ ماردیا۔ ان کا جواب تفتیش سے حاصل ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری اسٹوری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایس پی صاحب' اگر تم کہتے کہ جو گاڑی میں آگے بیٹھے تھے وہ نکل گئے تو اور بات تھی مگر ان کی لاشیں یہاں پڑی ہیں اور فائرنگ کرنے والے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہوگئے۔ ان کو گولی کیوں نہیں لگی۔ تمہارے جوانوں نے گاڑی کو ناکارہ کیوں نہیں کیا پہلے۔ اس کے چاروں ٹائر کیوں نہیں پھاڑ دیے تاکہ وہ بھاگنا چاہیں تب بھی یہ ناممکن ہو اور جب وہ فرار ہوئے اس وقت کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گاڑی آپ لوگوں کے پاس بھی تھی۔ آپ یہیں کھڑے رہے۔ تو سر' مجھے اس میں بہت گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟ آپ کا مطلب ہے جانتے بوجھتے پولیس نے انہیں موقع فراہم کیا؟"

"یس۔ یہی ہے میرا مطلب۔"

"آپ کسی ثبوت کے بغیر الزام لگا رہے ہیں؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"ثبوت سامنے آجائے گا۔ فی الحال حقائق خود ایک ثبوت ہیں جن سے اخبار والے خود ایک سمجھ میں آنے والی کہانی بنالیں گے۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب آپ یہ ضابطے کی کارروائی جلد از جلد ختم کریں۔ لاشیں اٹھوائیں یہاں سے اور پوسٹ مارٹم کے لیے مردہ خانے بھیج دیں۔ اس سے پہلے کہ میرے مشتعل کارکن یہاں جمع ہوں' آپ سب صاف کرادیں۔"

"مجھے آپ کا بیان تو لینا ہوگا اور بیگم صاحب کا۔"

"بیان کی کیا جلدی ہے۔ میں خود تمہیں ٹائم دوں گا اس وقت آنا۔ ابھی اور بھی معصوفیات زیادہ اہم ہیں۔"

صبح ساڑھے چھ بجے میں نے ایک کالی پی' رخشی اب پُرسکون ہوگئی تھی اور اس نے لباس بھی بدل لیا تھا۔ گلاب اور چنبیلی کے بارے میں اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ جل تو جلال تو پڑھتے ہوئے لانڈری جانے والے میلے کپڑوں کو اپنے اوپر ڈال کے روپوش ہوگئے تھے اور اس وقت باہر آئے تھے جب انہوں نے محسوس کیا کہ رخشی کچن میں موجود ہے۔ رخشی کی جھاڑو خاموشی سے سنتے رہے۔

میں نے اسٹڈی میں جا کے موبائل فون پر رئیس سے رابطہ کیا "رئیس اعظم' کیا حال ہے آپ کا؟"

"اجی بھاڑ میں گئے رئیس اعظم۔ ہم فقیری بھلے تھے۔ قسم اللہ کی تیری یاری نے جان سولی پر چڑھادی ہماری۔" وہ سخت جلا بھنا بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "کیا تیری بیوی ویٹ منگیتر نمبر تیرہ بھی تیری منحوس شکل پر لعنت بھیج کے چلی گئی؟"

"ابے شکل دیکھی جاتی ہے چھوکرے کی۔ مرد کی دیکھی جاتی ہے عقل یا پھر۔ مروا گی۔۔۔ ہاں' وہ بھی گئی تیری وجہ سے سالے۔ اتنی مشکل سے اس کو لایا تھا پٹا کے۔ تو نے ٹانگ اڑادی بیچ میں۔ وہ ناراض نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ کہنے لگی تمہیں فرصت کہاں مجھ سے بات کرنے کی۔ ابھی پھر آجائے گا تمہارے یار کا فون۔"

"تو نے بلاوجہ اسے گرمی دکھائی تھی۔"

"اب یہ کیسے ہوسکتا ہے پیارے کہ وہ رئیس کے یار کو بُرا بھلا کہنا شروع کردے۔ ابے لونڈیاں بہت ملتی ہیں یار کہاں ملتے ہیں۔ خیر تو سنا' ان مہمانوں کا کیا کروں' گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔"

میں نے کہا "دیکھ لی تھی میں نے۔ مہمان ذرا اونچے لوگ ہیں۔ معزز بھی کہلاتے ہیں لیکن بدمعاشی میں کم نہیں۔"

"ابے ہاں یار' بہت شور کررہے تھے کہ جانتا نہیں ہم کون ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے باپ تو ہو نہیں اور کسی کی ہم پروا نہیں کرتے۔ چپ بیٹھو آرام سے۔ شور ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"ان سے معلوم کرنا ہے کہ شاہ عالم کے ساتھ مل کر یہ کیا کاروبار کرتے تھے۔ کس کا کتنا سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ شاہ عالم کی حیثیت کیا تھی۔ ان کے اور کتنے ساتھی ہیں اور کہاں ہیں۔"

"ایک منٹ یار' تو نے بڑا لمبا پروگرام دے دیا۔ ذرا میں لکھ لوں ورنہ یاد نہیں رہے گا۔" وہ بولا "ہاں پھر سے بول ذرا۔"

میں نے اپنی بات دہرائی "اصل مسئلہ یہ ہے کہ اب میں خود کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سب میرے بس کی بات نہیں جو شاہ عالم کرتا تھا۔ میں اس چکر میں پڑوں گا تو مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا اور مجھے کیا پتا پہلے کیا ہوتا رہا ہے۔ میرا راز کھل جائے گا۔"

"پیارے یہ تو ٹھیک سوچا تو نے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مگر میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا رئیس۔ یہ لوگ مجھے چھوڑنے پر راضی نہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ میں کسی مرحلے پر ان کو بلیک میل کروں گا یا پکڑوا دوں گا۔ انہیں شرافت سے سمجھا۔"

"شرافت۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے" وہ ہنسا۔

"ان کو بتادے کہ شاہ عالم اگر کاروبار نہیں کرنا چاہتا ان کے ساتھ تو حساب کرلیں۔ کیا لینا ہے کیا دینا ہے۔ لے دے کے برابر کریں اور بات ختم۔ شاہ عالم کچھ نہیں کرے گا۔ وہ بھی کچھ نہ کریں۔ اگر انہوں نے حرامی پن کیا تو پھر ان کی بھی خیر نہیں۔"

"میں انہیں راضی کرلوں گا مگر آگے کی کیا ضمانت؟ ابھی وہ میرے کہنے سے مان جائیں گے۔ بعد میں پھر گئے اپنی بات سے تو۔"

میں نے کہا "دیکھو یہ کام ہے عقل کا۔ تو ایسے سوال کر ان سے۔"

رئیس نے کہا "جیسے انجیلی نٹس والے کرتے ہیں۔"

"انجیلی جنس والے" میں نے تصحیح کی۔

"ابے ہاں وہی۔"

"باتوں باتوں میں سب پوچھ لے کہ کاروبار کیا ہے اور کب سے چل رہا ہے۔ مال کیا باہر جاتا ہے اور کیا اندر آتا ہے۔ خریدار کون ہیں۔ منافع کتنا ہوجاتا ہے۔ پارٹنر کتنے ہیں۔ جو بھی وہ بتائیں' سب کو ٹیپ پر ریکارڈ کرلے' خفیہ طور پر۔ ان سے کہہ کہ سارا حساب کتاب لکھ دیں۔"

"وہ شک میں پڑجائیں گے۔"

"چل انہیں کہہ کہ تجھے سمجھادیں۔ وہ بھی ریکارڈ ہوجائے گا۔ بعد میں انہیں ٹیپ چلا کے سنادینا یا میری موجودگی میں سنانا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کام میں دیر لگے۔ وہ آسانی سے کچھ نہ بتائیں یا سب کچھ نہ بتائیں' میری طرف سے اجازت ہے مشکل طریقہ اختیار کرنے کی لیکن اس وقت جب کام آسان نہ ہو۔ جلدی کوئی نہیں۔ ایک دن لگے' ایک ہفتہ یا ایک مہینہ۔ معلومات پوری ہونی چاہئیں۔"

"بس اب تو ہم پر چھوڑ دے یہ معاملہ۔"

میں نے کہا "شمس اور قریشی کو میرے احکامات وصول کرادیے تھے نا۔"

"ہاں پیارے۔ بڑے پریم سے دستخط بھی لے لیے تھے" وہ ہنسا۔

"آج صبح یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی رئیس۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

میں نے کہا "کچھ مسلح افراد آئے تھے ایک گاڑی میں۔ انہوں نے کلاشنکوف سے فائرنگ کی۔ گیٹ پر پولیس کا سپرا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جوابی فائرنگ سے دو ہلاک ہوگئے اور دو بھاگ گئے مگر میرا خیال ہے کہ جو بچ گئے تھے انہوں نے فوراً جان بچانے کا سودا کرلیا۔ دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا اور شاید قیمت بھی انہوں نے اتنی بڑی ادا کردی ہوگی کہ خیر۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون تھے؟" رئیس بولا "قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا "ابھی قسم مت کھا۔ میں صرف قیاس آرائی کرسکتا ہوں۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ان کے نامہ بر بھی ہوسکتے ہیں جن کو تو نے کل رات میرا ایک پیغام پہنچایا تھا۔ ناکام سازشی لوگ' ممکن ہے انہوں نے ایف اے ایف کو استعمال کیا ہو۔"

"یار' یہ ایف اے بی اے مت کر ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایف اے ایف کا مطلب ہے فاتح عالم فورس۔ ہماری سیاسی جماعت کے نوجوانوں کی تنظیم جو کہنے کو رضاکار ہیں اور درکر ہیں مگر درحقیقت وہ مسلح جذباتی نوجوانوں پر مشتمل ٹولہ ہے جن کو دہشت گردی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جو تیرے پاس دو مہمان ہیں' ان کے گروہ کی صحیح طاقت کا ابھی مجھے اندازہ نہیں۔"

"ہم نمٹ لیں گے ان سے پیارے۔ اپنا گردہ کیا کم ہے کسی سے۔ ویسے یار' ایک وقت میں سب سے پنگا مت لے۔ تیرے اپنے فائدے کی بات کہہ رہا ہوں۔" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"تو فکر مت کر۔ پنگا ان سب نے ایک ہی وقت میں لیا ہے مجھ سے تو میں کیا کروں؟" میں نے کہا۔

میرا موبائل فون رات بھر بند رہا تھا اور اس وقت بھی رئیس سے بات ختم کرتے ہی میں نے اسے آف کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شمس اور قریشی اخبارات میں شائع ہونے والی اپنی متطلبی کی خبروں سے سخت چراغ پا ہوں گے اور فوراً مجھے فون کریں گے۔ یہ شاہ عالم کا انتظام تھا کہ سیاسی اور پارٹی کے معاملات پر بات کرنے کے لیے کوئی گھر کا فون نمبر نہیں گھماتا تھا' اس کے لیے پارٹی آفس تھا جہاں اشرف علی باقاعدگی سے بیٹھتا تھا یا پھر شاہ عالم کے موبائل فون کا نمبر تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے بھی میرا ذہن بہت سی الجھنوں میں مبتلا رہا۔ مجھے اندیشہ ہی نہیں یقین تھا کہ پرنس کا پاڈی گارڈ اب تک ہوش میں آگیا ہوگا اور بابر علی بھی۔ انہیں جتنی

ندامت اپنی درگت پر ہوگی' اس سے زیادہ پریشانی اپنے انجام کے خیال سے ہوگی۔ انہیں حفاظت اور خطرات سے نمٹنے کے لیے رکھا گیا تھا مگر جب وقت آیا تو وہ ان کے لیے ناقابل ثابت ہوئے۔ پرنس اور ٹائیگر کو غائب پاکے انہیں یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ سارا کھیل الٹا ہوگیا۔ شیر نے شکاری کو شکار کرلیا۔ جسے انہوں نے مچھلی سمجھ کے پکڑلیا تھا وہ مگرمچھ تھا جو جال پھیلانے والوں کو ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہی کیا ہوگا جو وہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے پرنس کے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کیا ہوگا۔ ان میں ایک عثمان بھی تھا اور انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ صرف پرنس اور ٹائیگر ہی نہیں' عثمان بھی رات سے لاپتا ہے۔ ممکن ہے عثمان کے گھر میں سے کسی نے میری لینڈ کروزر کو دیکھا ہو۔ لوگ اس گاڑی کو پہچانتے ہوں گے۔ وہ خاموش بیٹھ کے اپنے جرم کو زیادہ سنگین بنانے کی غلطی نہیں کرسکتے۔ شاید ابھی مشورے جاری ہوں یا اوپر تک رابطے قائم کیے جارہے ہوں کیونکہ شاہ عالم بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا جس کے خلاف اغوا کی رپورٹ آسانی سے لکھ دی جائے۔ اسے بہت سے اثر رسوخ رکھنے والے سیاست دانوں کی حمایت حاصل تھی جو اعلیٰ ترین سطح پر حکومتی حلقوں کی ڈوری ہلا سکتے تھے۔ اس کے برعکس خود شاہ عالم ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کراسکتا تھا کہ اسے گزشتہ رات فلاں شخص نے گن پوائنٹ پر اغوا کیا اور فلاں جگہ لے گیا۔ اغوا کرنے والا بابر تھا اور پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ پرنس اور ٹائیگر براہِ راست اغوا میں ملوث نہیں تھے۔ وہ انکار کرسکتے تھے کہ انہوں نے بابر کو شاہ عالم کے پاس ضرور بھیجا تھا۔ وہ اکثر انہیں لینے جاتا تھا کیونکہ ہم آپس میں دوست تھے۔ بابر کو کیا ضرورت تھی شاہ عالم کو زبردستی اغوا کرنے کی۔ اس معمولی ڈرائیور کی کیا مجال کہ ایسی بے وقوفی کرے مگر اس نے کی تو ضرور وہ نشے میں ہوگا۔ پرنس اور ٹائیگر کہیں روپوش ہوئے تو صاف انکار کریں گے کہ گزشتہ رات ان کی شاہ عالم سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ بصورتِ دیگر پرنس' عثمان اور ٹائیگر کی بازیابی کے لیے کوشش جاری ہوگی اور اس کا ردِعمل بھی سامنے آجائے گا۔

فائرنگ کو پرنس کی مافیا کا کارنامہ بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کو ایسے ہی خبردار کرتے ہوں گے اور ایسی ہی طاقت سے اپنی دہشت قائم رکھنے کے عادی ہوں گے۔ شاہ عالم کے لیے بھی یہ وارننگ ہوگی کہ ابھی وقت ہے۔ وہ سمجھ جائے اور اپنے ضمیر صاحب کو بھی سمجھا بجھا کے خاموش

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
شارٹ کٹ
قیمت: ۱۲۵ روپے

جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کردینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
دل پارہ پارہ
قیمت: ۱۲۵ روپے

محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
اجازت
قیمت: ۱۵۰ روپے

محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
پتھر
دو جلدیں
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
جرم وفا
قیمت: ۲۰۰ روپے

محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
کمبل
قیمت: ۱۸۰ روپے

محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
اجل نامہ
قیمت ۲۲۵ روپے

محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
ایمان والے
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردے۔ اگلی بار فائرنگ کرنے والے گھر پر گولیاں برسا کے نہیں جائیں گے۔ وہ راستے میں روک کے گاڑی کو بھی چھلنی کردیں گے اور اسے بھی۔

قریشی یا شمس سے میں ایسے شدید ردِعمل کی توقع نہیں رکھتا تھا مگر میں ان کی اصلیت اور طاقت سے بہت کم واقف تھا۔ میں نے ایف اے ایف کے سرکش نوجوانوں کو سخت ذلت کے ساتھ اپنی حفاظت کی ذمے داری سے سبک دوش کیا تھا اور ساتھ ہی اس تنظیم کو ختم کرنے کے ارادے کا اعلان بھی کردیا تھا۔ وہ خود کو جن سمجھتے ہوں گے جو بوتل سے باہر آکے بے قابو ہوجاتا ہے۔

اچانک مجھے تیمور کا خیال آیا۔ آخر اس نے کیوں خاموشی اور لاتعلقی اختیار کر رکھی ہے؟

رخشی نے کہا "کم سے کم ناشتے کے وقت تو فکروں کو ایک طرف رکھ دو۔"

میں چونکا "کس طرف، تمہاری طرف؟"

"پریشان میں بھی ہوں۔ یہ سب میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ وہ سیاست کو گھر سے بہت دور رکھتا تھا۔"

میں نے کہا "آدمی کنڑ میں گر جائے تو گندگی اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ گندگی خود اس کے ساتھ آجاتی ہے گھر میں۔ تم ایسا کرو ہمّاؤں چلی جاؤ۔ ماں جی کے پاس، وہ بھی اکیلی ہیں۔"

"اکیلے ہم سب ہیں۔ میں بھی، تم بھی، شہر یا گاؤں سے کیا فرق پڑتا ہے۔" رخشی نے کہا۔

"نہیں جانا تو زبردستی کوئی نہیں" میں نے کہا "میری مجبوری یہ ہے کہ ابھی میں اپنے دشمنوں کو پوری طرح جانتا اور پہچانتا ہی نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ خود کو بے نقاب کررہے ہیں۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اٹھا۔ دوسری طرف سے اشرف بول رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ "سر، مجھے مجبوراً گھر کا فون استعمال کرنا پڑا۔ آپ کے موبائل سے جواب نہیں آرہا تھا۔ بڑا خراب معاملہ ہوگیا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "اطمینان سے بات کرو اشرف۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"پارٹی کے سیکریٹریٹ سے سر۔ نو بجے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تھا، میں آٹھ بجے یہاں آیا تو باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔"

"کون لوگ؟"

"شمس صاحب کے اور ڈپٹی صاحب کے حمایتی۔ انہوں نے مجھے بھی اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ وہ بڑے جارحانہ موڈ میں تھے۔ میرے کپڑے پھاڑ دیے۔ عینک بھی ٹوٹ گئی میری۔ میں نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ یہ کہہ کر کہ میرا کسی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سیکریٹری ہوں اور پارٹی سیکریٹریٹ کا انچارج، میں پولیس کو بھی طلب کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں پہلے ہی پولیس سیکیورٹی کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ یہ ردِعمل متوقع تھا۔"

"میں نے ڈی آئی جی صاحب کو بتادیا تھا کہ نو بجے میٹنگ ہوگی۔ اس میں کشیدگی ہوسکتی ہے۔ نقصِ امن کا بھی اندیشہ ہے۔ انہوں نے احکامات جاری کردیے تھے مگر پولیس ابھی نہیں پہنچی۔"

"تم گیٹ بند کروادو۔"

"گیٹ بند کروادیے تھے میں نے مگر باہر ہجوم بڑھتا رہا ہے اور وہ سب بہت مشتعل ہیں۔ کچھ لوگ اخبار لہرا کے نعرے لگا رہے ہیں، آپ کے خلاف۔ اگر انہیں حملے پر اکسایا گیا تو وہ گیٹ توڑ کے اندر آجائیں گے۔"

میں نے کہا "اندازاً کتنے لوگ ہیں حملہ آوروں کے ساتھ؟"

"دو سو سے زیادہ۔ شاید تین سو۔"

میں نے کہا "شمس یا قریشی صاحب بھی ہیں باہر؟"

"نہیں سر۔ آپ کسی سے بات کریں۔ اگر سیکریٹریٹ پر حملہ ہوگیا تو یہ لوگ سب شمس شمس کردیں گے۔"

میں نے کہا "ایف اے ایف کے جوان کہاں ہیں؟"

"انہیں تو خود آپ نے سیکیورٹی ڈیوٹی سے ہٹادیا تھا۔ وہ پارٹی کے لوگوں سے نمٹ لیتے تھے۔"

"تم نے تیمور سے کہا؟"

"وہ گھر سے نکل چکے ہیں۔ اف، باہر بہت شور ہورہا ہے سر۔ دیکھ کے آتا ہوں۔ گیٹ پر جو سیکیورٹی سسٹم تھا وہ کام نہیں کررہا ہے۔ کلوز سرکٹ کیمرے توڑ دیے ہیں انہوں نے۔ ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔"

"تم جلدی سے دیکھو۔"

اس نے ایک منٹ بعد کہا "غضب ہوگیا سر۔ مشتعل ہجوم نے تیمور صاحب کی گاڑی کو گھیر لیا ہے۔ اس پر ڈنڈے، ہاکیاں اور سریے مار رہے ہیں۔ آپ جلدی سے فون کریں پولیس کو۔" وہ بڑی طرح نروس تھا۔

"دیکھو اشرف۔ مجھے لگتا ہے کہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی حالات قابو سے باہر ہوجائیں گے۔ تم ضروری ریکارڈ قبضے میں کرو اور نکل جاؤ پیچھے سے۔ جتنی جلدی ہوسکے۔ اپنی

جان کو خطرے میں ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ان حالات میں میٹنگ کیسے ہوسکتی ہے۔"

"جی۔۔۔ جی سر۔ وہ دراصل۔۔۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ لوگ پارٹی سیکریٹریٹ پر قبضہ نہ کرلیں۔ میں نے رات کو ہی اہم ریکارڈ شفٹ کردیا تھا۔"

"کہاں شفٹ کردیا تھا؟"

"اپنے گھر۔ میں نے آپ سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن آپ کا موبائل فون بند تھا۔ مجبوراً میں اپنے گھر لے گیا۔"

"اچھا کیا تم نے" میں نے کہا۔

اچانک شور بڑھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ حملہ آور اندر گھس آئے ہیں۔ اشرف مجھ سے موبائل فون پر بات کررہا تھا۔ میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "یہ کیا کررہے ہیں آپ لوگ۔ دیکھیں یہ آپ کی پارٹی کا آفس ہے۔ یہ آپ کی پراپرٹی ہے۔ اسے نقصان مت پہنچائیں۔"

پس منظر میں چیزوں کے اٹھانے پٹخنے اور توڑ پھوڑ کے شور میں مخالف نعروں کی آوازیں بہت واضح تھیں۔ میں نے فون بند کردیا۔ شمس اور قریشی کی بغاوت کامیاب ہوگئی تھی۔ ان کے حامی پارٹی آفس پر قابض ہوچکے تھے۔ وہ خود ابھی تک منظر سے غائب تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ میٹنگ کے وقت سے کچھ پہلے نمودار ہوں گے۔ اس وقت تک صحافی بھی پہنچ چکے ہوں گے۔ وہ پریس کانفرنس کریں گے اور بتائیں گے کہ چیئرمین کے غیر قانونی اقدام نے کارکنوں کو مشتعل کردیا ہے۔ اظہارِ وجوہ کا نوٹس جاری کیے بغیر اور صفائی کا موقع دیے بغیر بیک جنبشِ قلم دو نائب صدور کو نکال باہر کرنا شاہ عالم صاحب کی آمرانہ اور فاشسٹ سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہم معطلی کے ان احکامات کو عدالت میں چیلنج کریں گے۔ ابھی پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ یہ صورتِ حال وہاں بھی زیرِ بحث آئے گی اور ممکن ہے چیئرمین پی جے ایف کے اس اقدام کو کمیٹی غیر آئینی قرار دیتے ہوئے خود انہی کے خلاف تادیبی کارروائی کے احکامات پر غور کرے۔ پارٹی کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ پرانے کارکن شاہ عالم کے ذاتی ملازم نہیں ہیں۔ انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں پارٹی کے لیے۔ یہ پارٹی کے نظریاتی فلسفے کی نفی ہے۔ امنِ انصاف اور آزادی کا خون ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ باقی سب ان سے صحافی اگلوالیں گے مثلاً یہ کہ شاہ عالم کی بحیثیت چیئرمین کے برقرار رہی تو کیا مخالفین کسی اور پارٹی میں شامل ہوں گے۔ پارٹی کی قیادت پر زبردستی قبضہ کرلیں گے یا اپنا الگ گروپ بنالیں گے۔ مرحوم

عمودار کی طرح!

میں نے ڈی آئی جی اور ایس ایس پی سے بات کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ نہ گھر پر تھے اور اور نہ آفس میں۔ شاید انہیں مجھ سے پہلے ہی گڑبڑ کی اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بھی بعید از امکان تھا کہ خود انہوں نے شمس اور قریشی کو خاموش تائید کا یقین دلایا ہو کہ یہ تو بڑی ناانصافی ہے آپ کے ساتھ اور بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ آپ کمیٹی کے اجلاس میں احتجاج کریں لیکن باہر کچھ نہ ہو۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ سیاست داں اور پولیس ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہوتے ہیں اور وقت کے بدلتے تیور دیکھ کر اپنے اپنے رویوں کا تعین کرتے ہیں۔

مجھے اب اشرف کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ ایک سمجھ دار اور قابلِ اعتماد سہارا ثابت ہوا تھا اور یہ اس کی دور اندیشی کا نتیجہ تھا کہ عملاً میں پارٹی سیکریٹریٹ میں داخلے کے حق سے محروم ہوگیا تھا مگر پارٹی پر میری گرفت برقرار تھی۔ ریکارڈ کے بغیر سیکریٹریٹ صرف ایک عمارت تھی۔ ریکارڈ میرے قبضے میں ہو تو سیکریٹریٹ کو شاہ عالم ہاؤس میں شفٹ کیا جاسکتا ہے۔

رئیس کا کہنا ٹھیک تھا۔ میں نے ایک ساتھ سب کے ساتھ پنگا لے کر اپنے مسائل میں اضافہ کیا تھا۔ پارٹی میں بغاوت ہوگئی تھی۔ ایف اے ایف والے سرکشی پر آمادہ تھے۔ پرنس ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن میری دشمن ہوگئی تھی۔ میں اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا۔ خان اعظم اور چندا تک شاہ عالم سے لاتعلق ہوگئے تھے۔ ثمر نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا۔ شبنم جیسی خطرناک صحافی مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے یکسر منکر تھی۔ مصائب اور مسائل نے مجھے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میٹنگ میں جانے سے پہلے کمال فاروقی سے بھی بات کروں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ شبنم کا حال کیسا ہے باقی سب لوگوں کا موڈ کیسا ہے لیکن وہ سب اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ فوری طور پر مجھے اشرف کی اور تیمور کی سلامتی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیمور کا انجام بھی شاہ عالم جیسا ہوجائے۔

رخشی میری صورت سے میرے تفکرات پڑھ رہی تھی اور اس کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ "سیکریٹریٹ پر حملہ ہوگیا؟ وہ لوگ ادھر تو نہیں آجائیں گے۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کیا پتا۔"

"پھر بیٹھے کیوں ہو ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ کچھ کرو، فون کرو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی کو۔ یہاں سے نکلو۔"

میں نے کہا "بک بک بند کرو۔ مجھے سوچنے دو۔"

میری کوشش بالآخر کامیاب ہوئی۔ میں نے دو اہم سیاسی شخصیات سے رابطہ قائم کیا اور انہیں مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے وزیرِاعلیٰ سے بات کی۔ احکامات کمشنر تک پہنچنے میں دس منٹ لگ گئے مگر مجھے اطمینان حاصل ہو گیا کہ اب سرکاری مشینری حرکت میں آگئی ہے تو میری جان و مال کی حفاظت کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں نے چند اخبار کے مدیروں اور مالکوں سے بات کی مگر انہوں نے کہا کہ ہمارے نمائندے سیکریٹریٹ پہنچ چکے ہیں۔

اشرف ایک ہائی ایس وین کے ساتھ پہنچا تو اسے بھی گیٹ پر روک لیا گیا۔ رات بھر ڈیوٹی دینے والے چلے گئے تھے اور ان کی جگہ۔ دوسری پولیس وین میں چھ افراد آگئے تھے۔ نئے سب انسپکٹر نے صبح چار بجے ہونے والی فائرنگ کی واردات کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب میں اشرف کو داخلے کی اجازت دلوانے کے لیے گیٹ پر پہنچا تو دونوں تھانے دار آپس میں لڑ رہے تھے۔ نئے تھانے دار کا مؤقف یہ تھا کہ اسے غلط حفاظتی ڈیوٹی دی ہے۔ فائرنگ کے واقعے سے وہی لوگ جو چشم دید گواہ بھی تھا اور اس میں براہِ راست ملوث بھی تھا۔

فیصلہ میں نے کیا۔ میں نے رات والے تھانے دار سے کہا "تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ یہاں ابھی تمہارے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"آپ کا بیان باقی ہے سر جی۔"

"ہاں۔ تم اندر آجاؤ۔ میں لکھواتا ہوں" میں نے کہا۔ "اسی کی بنیاد پر تم ایف آئی آر درج کراؤ گے۔"

"ایف آئی آر آپ لکھوا سکتے ہو جی۔"

"اوکے۔ میں پارٹی کے سیکریٹری کو پولیس اسٹیشن بھیج دوں گا یا خود آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اشرف خود ہی وین کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وین کو گیراج میں لے جائے اور گیراج کو لاک کر دے۔ اس نے اندر کھڑی ہوئی شیراڈ کو باہر نکالا اور پھر وین کو آگے لے گیا۔ شیراڈ اس کے پیچھے آگئی تو اشرف نے شٹر گرا کے دونوں جانب تالے لگا دیے۔

میں نے اسے کہا "تم اندر جا کے ذرا پُرسکون ہو جاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو پھر گرم چائے یا کافی۔"

"میں ٹھیک ہوں سر" اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"نہیں۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہاری حالت بتا رہی ہے۔ یقین نہیں تو اپنی صورت دیکھو آئینے میں۔ میں شمس اور قریشی کے خلاف اقدامِ قتل، بلوا اور ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات درج کرا رہا ہوں۔"

اس نے جھنجلا کے کہا "یہ سب بے کار ہے سر۔ جب کوئی قانون اپنے ہاتھ میں لے لے تو۔"

"مجھے معلوم ہے۔ شمس اور قریشی جائے واردات پر موجود ہی نہیں ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں انہیں ملوث بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ تو کرنا ہے اشرف۔ ٹیک اٹ ایزی۔ میں نے سب سے بات کر لی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے کہا۔

رخشی نے برآمدے سے چلا کے کہا "کیا کر رہے ہیں آپ باہر؟ اندر آجائیں۔"

میں نے کہا "تم باہر کیوں آئی ہو۔"

"یہ بتانے کہ حملہ آوروں نے تیمور کو مار دیا ہے" رخشی نے ہذیانی لہجے میں چیخ کے کہا "تمہارا فون مسلسل بج رہا ہے۔ میں کس کس کو جواب دوں، کیا بتاؤں؟"

ایک لمحے کے لیے تیمور کی موت کی خبر نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر دیا۔ خود اشرف کا رنگ اڑ گیا لیکن یہ سب غیر متوقع نہیں تھا۔ ایسے حالات میں شاہ عالم کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ کسی مشتعل ہجوم کے جذبات کا پاگل پن ایسا ہی تباہ کن اور قاتلانہ ہوتا ہے۔ میں رخشی کو اندر لے گیا اور اشرف کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ میں نے رخشی سے کہا کہ وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نہ نکلے۔

"کیوں؟ تم مجھے اپنے ہی گھر میں قید کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "پاگل مت بنو۔ تم بلاوجہ پریشان ہو گے میری کیا مدد کر سکتی ہو آخر؟ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔"

"کیا ٹھیک کر لیا ہے۔ میں کہتی ہوں ہم یہاں سے نکل کیوں نہ جائیں۔"

"کیوں نکل جائیں اور نکل کے کہاں جائیں۔" میں نے برہمی سے کہا "کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو میں خود تمہیں نکال کر لے جاؤں گا۔ سب سے بات ہو گئی ہے میری۔ وزیرِاعلیٰ نے خصوصی حفاظت کے لیے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ ابھی مسلح پولیس کے دستے پہنچ جائیں گے۔ دو تین سو حملہ آور سیکریٹریٹ کی بلڈنگ پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ میرے گھر پر نہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آیا تو

اشرف کے ساتھ رات بھر جاگنے والا سب انسپکٹر تھکا ہارا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"بیان لینے کے لیے ایک اے ایس پی صاحب آرہے ہیں سر" وہ بولا "علاقہ ایس ایچ او ایف آئی آر بھی لکھے گا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر میٹنگ میں ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب گیارہ بجے دورہ کریں گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ اب یہی ہو گا۔ میرے گھر پر فائرنگ کی خبر کے بعد پارٹی کے سیکریٹریٹ پر قبضے اور تیمور کے مارے جانے کی خبر پر سیاسی ردِعمل فوراً سامنے آئے گا۔ میرے حامی اسے بغاوت قرار دیں گے تو میرے مخالفین میری حماقت کا شاخسانہ۔ اخبار والے بھی اپنی اپنی کہیں گے۔ پارٹی میں ٹوٹ پھوٹ، فارورڈ گروپ کا قیام۔ شاہ عالم کا سیاسی مستقبل داؤ پر۔ ایک نائب صدر کا قتل۔ دو کی معطلی۔ دونوں فریق عدالت میں جانے کے دعوے دار۔ پارٹی کی مسلح تنظیم توڑ دی گئی۔ باغیوں کی شاہ عالم ہاؤس پر فائرنگ۔ دو حملہ آور ہلاک۔

سرکاری عہدے دار رسمی کارروائی کے طور پر افسوس کا اظہار کرنے آئیں گے۔ بیان دیں گے کہ اس سازش میں ملوث افراد کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ مجرموں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ وہ غیر ملکی ہاتھ کے ملوث ہونے کے سوال پر ذومعنی جواب دیں گے۔ ہاں بھی اور نہیں بھی۔ امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

جب اے ایس پی کے ساتھ علاقے کا ایس ایچ او آیا تو اس کے ساتھ ہی ایک ٹرک میں بھر کر آنے والے مسلح پولیس والوں نے ہر طرف سے شاہ عالم کو نرغے میں لے لیا اور ادھر آنے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کر دی۔ میرے آس پاس رہنے والوں کے لیے یہ صورتِ حال بڑی ناخوش گوار اور ناپسندیدہ تھی مگر وہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

میں نے کھل کے شمس اور قریشی کے خلاف بیان دیا۔ میں نے انہیں گزشتہ شب کے حملے کا ذمے دار قرار دیا اور یہ کہا کہ حملہ آوروں کے ساتھ وہ خود بھی آئے تھے مگر گیٹ پر مسلح پولیس گارڈ دیکھ کر لوٹ گئے۔ میں نے ان پر سازش اور بدعنوانی کے الزامات عائد کیے اور ان کی معطلی کو جائز قرار دیا۔ تھانے دار میری مرضی کے مطابق ایف آئی آر لکھنے پر مجبور تھا۔ ابھی میرا بیان جاری تھا کہ اشرف نے اشاروں ہی اشاروں میں رات کی ڈیوٹی دینے والے تھانے دار کو سمجھا دیا کہ وہ میرے بیان کی توثیق کرے گا تو فائدے میں رہے گا۔ شاید وہ خود بھی معطلی کے خوف میں مبتلا تھا۔ اگر میں کہہ دیتا کہ اس نے حملہ آوروں کو فرار کا موقع فراہم کیا تو وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ اس نے تائیدِ بیان میں ہی عافیت جانی۔ جب میں نے کہا کہ حملہ آوروں کی گاڑی کا رنگ کیا تھا اور نمبر کیا تھا۔ تو اے ایس پی نے پوچھا کہ یہ سب میں نے کیسے دیکھا؟ کیا فائرنگ کے وقت میں باہر تھا۔

"وہ شمس کی گاڑی تھی" میں نے کہا "مجھے اس سب انسپکٹر نے بتایا بعد میں۔"

سب انسپکٹر نے سر ہلایا "ہاں جی۔ ایک اور گاڑی پیچھے آئی تھی مگر دور سے واپس چلی گئی۔"

میں نے کہا "سرخ رنگ کی نسان تھی یا سفید کرولا۔"

"سفید کرولا تھی جناب!" تھانے دار نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "ہاں۔ قریشی کی ہے سفید کرولا۔ مجھے تو نمبر بھی معلوم ہے مگر میں نے دیکھا نہیں تو کیا کہوں؟"

"نمبر تو میں بھی نہیں دیکھ سکا تھا سر" تھانے دار بولا "گاڑی دور تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس بھی آف تھیں۔"

"کل رات سے مجھے دھمکی والے فون بھی موصول ہو رہے تھے" میں نے کہا۔

اے ایس پی نے کہا "آپ نے رپورٹ کیوں نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ سب ہوتا رہتا ہے ہمارے ساتھ اے ایس پی صاحب اور فون کرنے والے اپنا نام کب بتاتے ہیں۔"

"کیا دھمکی دی گئی تھی آپ کو؟"

میں نے کہا "یہی کہ شمس اور قریشی کو معطل اور برطرف کرنے کا خمیازہ بھگتنا ہو گا مجھے۔"

"سر جی، مجھے بھی کسی نے فون کر کے کہا کہ تم شاہ جی کو نہیں بچا سکتے" تھانے دار بولا۔

اے ایس پی نیا تھا مگر علاقہ تھانے دار معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود تھانے دار کو میں نے پہلے ہی اپنا ہم نوا بنا لیا ہے اور اسے ہمنوائی کا صلہ بھی فراخ دلی سے عطا کیا ہے چنانچہ وہ میرا گواہ بن گیا ہے۔ عدالت میں وکیل اپنے مؤکل سے ایسے ہی بیان دلواتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ اس ایف آئی آر کی بنیاد پر کچھ بھی نہیں ہو گا، نہ کسی کو گرفتار کیا جائے گا اور نہ مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہو گا۔ شمس اور قریشی جائے واردات پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود بھی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی موجودگی کسی اور جگہ ثابت کرنے کا پکا انتظام پہلے ہی کرلیا ہوگا۔ ان کے وکیل بھی جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہوں گے اور اب میرے خلاف دو جواب آں غزل کے طور پر ایسے ہی مقدمات کسی اور تھانے میں درج کرائے جائیں گے۔ اصل جنگ ہوگی بیان بازی کی۔ الزام تراشی اور کردار کشی کی۔ خود کو فرشتہ اور اپنے حریف کو شیطان ثابت کرنے کی۔ رہے مقدمات تو ایسے سیاسی مقدمات کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ کچھ عرصے بعد جب اخبار والے بھی دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور پڑھنے والے بور ہوجاتے ہیں تو مقدمات خود بخود سرد خانے میں اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔

تفتیشی افسر رخصت ہوگیا تو میں نے کہا "اشرف۔ ہمیں فوراً پارٹی سیکریٹریٹ پہنچنا چاہیے۔"

"آپ کا وہاں جانا ٹھیک نہیں سر۔ معلوم نہیں وہاں کیا صورتِ حال ہو؟" اشرف نے کہا۔

"ہم پولیس کے گارڈ لے جاسکتے ہیں اپنے ساتھ" میں نے کہا۔

"پھر بھی رسک ہے اس میں۔۔۔"

"یہ رسک تو لینا پڑے گا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں شاہ عالم ہاؤس میں چھپ کر بیٹھ جاؤں اور اپنے مخالفوں کو پارٹی آفس پر قبضہ کرنے دوں۔ اس کے علاوہ مجھے ایف آئی آر بھی کٹھوانی ہے۔ پارٹی آفس پر حملے کی اور تیمور کے قتل کی۔ قریشی اور شمس کے خلاف۔"

حفاظتی پولیس فورس کے انچارج نے پہلے کچھ قانونی نکات اٹھائے مثلاً یہ کہ انہیں شاہ عالم ہاؤس کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے اور ان کے پاس اتنی نفری نہیں ہے کہ میرے ساتھ بھی جائے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ میرے ایک فون پر اسے اسکورٹ فراہم کرنے کے احکامات مل جائیں گے مگر وہ بھی خدمت اور تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرنے سے پہلے کچھ توقعات رکھتا تھا۔ اشرف نے بڑے دوستانہ انداز میں یہ معاملات طے کرے تو ایک پولیس مین ڈرائیور بن گیا۔ دوسرا اس کے ساتھ بیٹھ گیا اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔

میں اور اشرف پیچھے بیٹھ گئے۔ مجھے مسلسل فون موصول ہورہے تھے۔ فون کرنے والوں میں میرا خیر خواہ کوئی نہیں تھا۔ ان میں کچھ صحافی تھے جو خبر کو زیادہ چٹپٹا اور مسالے دار بنانے کے لیے مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ ان سب کو میں نے ایک ہی جواب سے ٹال دیا کہ سارے سوالوں کا جواب میں پریس کانفرنس میں دوں گا۔ پریس کانفرنس جلد ہوگی۔ آج بھی ہوسکتی ہے۔ بڑے سیاسی لیڈروں نے غیر جانب داری (یا منافقت) کا انداز اختیار کرتے ہوئے محض افسوس کیا کہ سیاست میں ہم سب کو شرافت اور بردباری سے کام لینا چاہیے اور اختلافات کو جمہوری طریقے پر طے کرنا سیکھ لینا چاہیے۔

چھوٹی سیاسی جماعتوں کے لیڈر زیادہ بولے۔ میرے مقابلے میں انہوں نے قریشی اور شمس کی زیادہ حمایت کی۔ پی جے ایف بڑی جماعت تھی۔ ان کی عین خواہش ہوگی کہ... وہ ٹوٹ کر دو چھوٹے حصوں میں بٹ جائے اور شاہ عالم کی مرکزی حیثیت ختم ہوجائے۔ شاید ان میں سے کچھ قریشی کو تھپکی دے رہے ہوں گے کہ تم آگے بڑھو اور پی جے ایف کے حامی ارکان کا الگ گروپ بنالو۔ کچھ اسی طرح شمس کو میرے مقابلے پر لانے کے لیے اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلا رہے ہوں۔

زیادہ حیرت مجھے اپنی پارٹی کے سرکردہ لوگوں پر تھی جن میں اکثریت ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کی تھی۔ انہوں نے کھل کر میرے طرزِ عمل کی مخالفت کی اور میرے یکطرفہ فیصلے پر ناراضی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے یہ معاملہ پہلے ایگزیکٹو کمیٹی کے سامنے اٹھانا چاہیے تھا۔ شمس اور قریشی کے خلاف کارروائی ضابطے کے مطابق نہ ہونے سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ انہیں الزام کے جواب میں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دینا ضروری تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اصل شاہ عالم کا طرزِ عمل بھی آمرانہ ہی تھا لیکن لوگوں کو بولنے کا موقع اب ملا تھا۔

میں سیاست داں کبھی نہ تھا۔ مجھے سیاست کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ زبردستی مجھے اس خارزار میں گھسیٹ لیا گیا تھا اور میں نے شاہ عالم بننے کے چکر میں وہی غلطیاں کی تھیں جو بنس کی چال چلنے کی کوشش کرنے والا کوا کرتا ہے۔ اپنی چال تو میں بھول ہی چکا تھا۔ شاہ عالم کی چالبازی ابھی مجھے نہیں آتی تھی چنانچہ میں غیر سیاسی فیصلے کررہا تھا اور ایک کے بعد دوسری سیاسی غلطی کرتا چلا جارہا تھا۔ میرے مخالفین پہلے بھی کم نہ تھے مگر اب وہ زیادہ ہوگئے تھے اور زیادہ طاقت حاصل کررہے تھے۔ میرا ایک مضبوط سہارا تیمور تھا مگر وہ مارا جاچکا تھا۔ شاید میری اپنی غلطی اور شامتِ اعمال کے باعث مجھے اکیلا اور کمزور کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ اب میرے ساتھ صرف اشرف تھا۔ وہ نوجوان تھا اور شاید منافقت اس کے مزاج میں نہ تھی ورنہ وہ انجام پر

نظر رکھے بغیر یوں کھل کے میرا ساتھ نہ دیتا۔ وہ انتظار کرتا اور دیکھتا کہ کس کا پلہ بھاری ہے اور پھر اپنا پورا وزن بھی اسی پلڑے میں ڈال کے پورا فائدہ اٹھاتا۔

شمس اور قریشی کو نائب صدر کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ میں نے سیاسی انداز میں نہیں کیا تھا۔ میری کامیابی یہ ہوتی کہ میں ان پر اپنی نیت کا دوغلا پن ظاہر نہ ہونے دیتا۔ پہلے انہیں اعتماد میں لیتا' انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا کہ میں بے وقوف ہوں اور وہ مجھے اپنی مٹھی میں لے سکتے ہیں پھر میں ان سے غلط کام اور غلط فیصلے کراتا۔ ان کے خلاف ثبوت جمع کرتا جاتا اور ایسے ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا کہ انہیں شک بھی نہ ہوتا کہ وہ میرا ہاتھ تھا۔

ایف اے ایف کو شاہ عالم ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ شاید ہر سیاسی جماعت اسی طرح طاقت کا توازن برقرار رکھتی ہے۔ امن اور عدم تشدد کا فلسفہ گزرے وقتوں کا افسانہ ہوا۔ اگر مجھے ایف اے ایف کے سرکش رویے اور بدمعاشی کے انداز سے اختلاف تھا تو میں اسے بدلنے کا کام ہوش مندی سے آہستہ آہستہ کرسکتا تھا۔ پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد میں ایف اے ایف کی کمان کرنے والوں میں اپنی مرضی کے لوگ آگے لاتا۔ انہیں خود کنٹرول کرتا اور اس طاقت کو اپنا ہتھیار سمجھتا جسے وقتِ ضرورت اپنی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ کوئی ہتھیار بُرا نہیں ہوتا' اس کا استعمال بُرا ہوتا ہے۔ اپنی حفاظت کے مقصد کو بھول کر کوئی ہتھیار سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار شروع کردے تو اس میں ہتھیار کا کیا قصور۔ ایف اے ایف کو ختم کرنے کی خبر نے بوتل سے باہر آکے بے قابو ہوجانے والے جن کو ہوشیار کردیا تھا۔ خبردار' تجھے بوتل میں بند کرنے کی بات ہورہی ہے۔

پارٹی آفس کے باہر صورتِ حال انتہائی دھماکا خیز تھی۔ میرے دونوں نائب صدر اپنے حامیوں کے ساتھ عمارت میں پہلے داخل ہوکے مورچا بند بیٹھے تھے۔ انہوں نے اندر سے سارے دروازے بند کرلیے تھے اور پارٹی سیکریٹریٹ پر پوری طرح انہی کا قبضہ تھا۔ میرے حامی تعداد میں زیادہ تھے مگر باہر جمع تھے اور ہر طرف سے عمارت کا محاصرہ کیے کھڑے تھے۔ اندر سے جو نعرے میرے خلاف لگائے جارہے تھے' ان کا جواب باہر سے دیا جارہا تھا۔

پولیس کے لاٹھی بردار جوان ہیلمٹ پہنے اور پتھراؤ سے بچنے والی ڈھال جیسی لوہے کی جالی اٹھائے درمیان میں دیوار بنے کھڑے تھے ورنہ مخالف گروہوں کے درمیان نعرے بازی براہِ راست تصادم اور خون خرابے میں بدل جاتی۔

میرے حامی مجھے دیکھتے ہی چاروں طرف جمع ہوگئے اور زیادہ بلند آواز سے شاہ عالم زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ خاصی عمر کا ایک ڈی ایس پی سیدھا میری طرف آیا۔ وہ شاید کوئی انسپکٹر تھا جسے ریٹائرمنٹ سے کچھ پہلے سفارش پر یہ عہدہ دے دیا گیا تھا۔ اس کی وہ رعونت اب بھی باقی تھی جو ایس ایچ او کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے اور اپنے ماتحتوں کے درمیان جنگل کے بادشاہ کی طرح گھوم رہا تھا مگر میرے سامنے آتے ہی بھیگی بلی بن گیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں اس کے خلاف کسی سیاسی راہنما کا بیان کتنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "سر' اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے۔"

میں نے کہا "آپ کو تشریف لائے کتنی دیر ہوگئی؟"

"ہم تو جناب حکم ملتے ہی حاضر ہوگئے تھے۔ آپ مہربانی کرکے اپنے بندوں کو سمجھائیں۔"

میں نے کہا "تم نے آنے کے بعد کیا کارروائی کی؟ یہ کون لوگ ہیں جو اندر گھسے ہوئے ہیں۔ انہیں باہر نکالو۔ جانتے نہیں یہ میری پارٹی کا آفس ہے۔"

"جانتا ہوں سر مگر اندر بھی آپ کے نائب صدر بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آفس ہمارا ہے۔ کسی نے زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی تو ہم مزاحمت کریں گے۔"

"اور تم ڈر گئے؟"

"سر۔ بلاوجہ خون خرابا ہوگا۔ آپ کے آدمی بھی مسلح ہیں اور اسلحہ اندر والوں کے پاس بھی ہے۔ میں نے ڈی آئی جی صاحب کو مطلع کردیا ہے۔ ابھی خود ایس ڈی ایم صاحبہ آنے والے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم کیسے ڈی ایس پی ہو۔ اتنی نفری کے ساتھ دو مجرموں کو اندر جاکے نہیں گرفتار کرسکتے۔ ان کے خلاف ایک نہیں دو دو ایف آئی آر درج ہیں' پہلے اقدامِ قتل اور بلوا کے کیس تھے مگر اب قتل کا جرم بھی ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

ڈی ایس پی بوکھلا گیا "میرے علم میں کوئی ایف آئی آر نہیں ہے سر۔ اور۔۔۔"

"میں جو بتا رہا ہوں۔ ابھی خود اے ایس پی صاحب آئے تھے میرے گھر پر اور تھانے دار نے وہاں بیٹھ کے ایف آئی آر کاٹی ہے۔" میں نے کہا "انہوں نے میرے گھر پر فائرنگ کرائی تھی۔ قریشی اور شمس قاتل ہیں۔ میرے سینئر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نائب صدر تیمور کے قاتل۔"

"تیمور۔۔۔ تیمور صاحب۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

اس سے پہلے بہت سی آوازوں نے کہا "شاہ جی۔ وہ ٹھیک ہیں۔ اسپتال میں۔۔۔"

میں نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا "مجھے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ۔۔۔ خدانخواستہ ان کو شہید کردیا گیا۔"

"او نئیں سر۔ وہ پھنس گئے تھے بلوائیوں میں۔ ان کی گاڑی کا حشر کردیا انہوں نے مگر پولیس فورس وقت پر پہنچ گئی۔ ان کو زخم آئے ہیں کچھ لیکن سب خیر ہے۔ ہم نے انہیں فوراً اسپتال بھجوادیا تھا۔ انہی کی گاڑی میں۔ اس کے شیشے ٹوٹے تھے اور ڈرائیور بھی زخمی ہوا تھا مگر وہ گاڑی لے گیا۔"

"خدا کا شکر ہے" میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ آخر فون پر یہ جھوٹی اطلاع کس نے دی تھی۔ اس کا مقصد محض مجھے ہراساں کرنا تھا اور میری حوصلہ شکنی۔ وقتی طور پر یہ مخالف کامیاب بھی ہوگئے تھے مگر اچانک تیمور کے زندہ ہونے کی اطلاع نے میرا حوصلہ دوچند کردیا۔ اس نے مجبوری میں ہی سہی مگر شاہ عالم بننے میں میری مدد کی تھی۔ وہ پارٹی کا سب سے سینئر عہدے دار تھا اور میں آیندہ بھی اس پر انحصار کرسکتا تھا۔ اشرف کی وفاداری میں شک نہیں تھا لیکن وہ سیاست میں تیمور جیسی سمجھ بوجھ اور تجربہ نہیں رکھتا تھا۔

اچانک سائرن بجاتی ہوئی جیپ کے پیچھے ایس ڈی ایم صاحب اور ڈی آئی جی صاحب ایک ساتھ وارد ہوئے۔ پولیس کی ساری سپاہ نے انہیں گارڈ آف آنر پیش کرنے کے انداز میں سیلوٹ کیا۔ انہوں نے صورتِ حال کے بارے میں ڈی ایس پی سے سرسری رپورٹ لی اور پھر گویا "دقومہ" کا معائنہ فرمایا۔

ڈی آئی جی بڑی بے رخی سے بات کرتا تھا۔ اس نے میرے مؤقف کو نظرانداز کردیا۔ "آپ کے گھر پر بیٹھ کے ایف آئی آر لکھی جائے گی تو وہ کتنی سچ ہوگی" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مخالف بھی کسی دوسرے ایس ایچ او کو اسی طرح گھر بلا کے آپ کے خلاف ایسی ہی رپورٹ لکھوادیں گے۔ کون ایس ایچ او انکار کرسکتا ہے انہیں مگر اس پر میں آپ کو گرفتار کرلوں تو یہ ٹھیک ہوگا؟"

ایس ڈی ایم نے کہا "پلیز، آپ اپنے لوگوں کو یہاں سے ہٹادیں۔"

میں نے کہا "آپ صرف مجھے حکم دے رہے ہیں اور وہ جو اندر گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"دیکھئے، یہ آپ کی آپس کی لڑائی ہے۔ ایک سیاسی معاملہ ہے مگر میرے لیے یہ انتظامی مسئلہ ہے۔" ایس ڈی ایم بولا "یہاں خون خرابا ہوگیا تو کون ذمے دار ہوگا۔ پہلے آپ اپنے لوگوں سے کہیں کہ وہ گھر جائیں پھر میں اندر والوں کو بھی باہر نکالتا ہوں۔ قاعدے قانون کے مطابق ہونا چاہیے سب کچھ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"میں عمارت کو سیل کردوں گا اور پھر عدالت کے حکم پر ہی قبضہ ملے گا۔ جس کو بھی عدالت کہے گی۔" ایس ڈی ایم نے کہا "میں آپ کو دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد پولیس آنسو گیس استعمال کرے گی یا لاٹھی چارج کا حکم دینا پڑے گا مجھے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ پارٹی کا چیئرمین ہوں میں" میں نے بگڑ کے کہا "میں نے دونوں نائب صدور کو برطرف کردیا ہے۔ یہ سب اخبار میں ہے۔"

ڈی آئی جی نے ایس ڈی ایم کو مخاطب کیا "آپ [illegible] میں مت پڑیں، ناکام کریں۔ جو مزاحمت کرے اسے گرفتار کریں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

ایس ڈی ایم کے کہنے سے پہلے میں نے اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ مشتعل نہ ہوں "مخالفین کی اشتعال انگیزی کے جواب میں آپ کوئی غیر قانونی قدم نہ اٹھائیں۔ ہم پارٹی میں انتشار پسندوں کی رخنہ اندازی کے عزائم کو اسی طرح ناکام بناسکتے ہیں کہ ہم متحد رہیں۔"

مجھے اپنی آواز لوگوں تک پہنچانے کے لیے چلّا کے بات کرنی پڑرہی تھی۔ میرا اندازِ خطابت بھی ایک سیاسی مقرر جیسا تھا جو اسٹیج پر کھڑا کسی جلسۂ عام سے مخاطب ہو۔

میں نے مکالمے کا کہا "انشاء اللہ جیت حق کی ہوگی۔ ہم ان غاصبوں اور غداروں کو نکال باہر کریں گے۔"

عین ممکن تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا اور لوگوں کو قائل کرلیتا کہ وہ پُرامن طور پر منتشر ہوجائیں مگر اچانک پیچھے سے ایک پتھر آیا اور میرے سر پر لگا۔ دوسرا پتھر ایس ڈی ایم کی گاڑی پر پڑا۔ اشرف نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکال لے۔ اسی وقت ڈی آئی جی کی گاڑی بھی روانہ ہوئی تھی۔

"سر۔ آپ بیٹھ جائیں" اشرف نے مجھے زبردستی اندر کھینچ لیا "آپ کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔ یہاں ہنگامہ ہونے والا ہے۔"

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ گاڑی پر پتھر لگتے ہی ایس ڈی ایم نے چیخ کر شیلنگ کا حکم دے دیا۔ پولیس نے ہوائی فائر کیے اور لوگوں کی طرف آنسو گیس کے گولے پھینکے۔ کچھ لوگ بھاگے۔ کچھ نے پولیس کی طرف پتھر پھینکے۔ شاید یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ میری حالات کو پُرامن رکھنے کی کوشش کامیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میرے اندر بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ماتھے پر بہنے والا خون صاف کیا اور شیشے سے باہر دیکھا تو ہر طرف میدانِ کارزار کا سماں تھا۔ پولیس والے ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے جو باہر ہنگامہ آرائی کررہے تھے۔ جو پارٹی سیکریٹریٹ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے، وہ محفوظ تھے۔ پولیس صاف جانبداری برت رہی تھی۔

میں نے کہا "اشرف، یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم چھوڑو مجھے۔ میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔"

اشرف نے مجھے پکڑلیا "آپ زخمی ہیں سر۔"

میں نے کہا "یہ معمولی خراش ہے۔" میں نے جیب سے رومال نکال کے زخم پر رکھ لیا "موبائل فون دو مجھے۔"

"ڈی آئی جی صاحب چلے گئے ہیں سر۔" اشرف نے کہا۔

"میں آئی جی سے بات کروں گا۔ تم کمشنر یا چیف منسٹر کا نمبر ملاؤ۔" میں نے چیخ کے کہا "یہاں کھلی دھاندلی ہو رہی ہے۔ یہ ظلم ہے۔"

"سر۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ پولیس اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتی۔" اشرف نے کہا "پولیس وہی کررہی ہے جو انہیں کرنے کے لیے اوپر سے کہا گیا ہے۔"

میرا جوش و خروش سرد پڑنے لگا "تمہارا مطلب ہے۔۔۔"

"جی سر۔ ہنگامہ کرانے کا مقصد اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ہمارے کارکن نہیں تھے لیکن پکڑے وہی جائیں گے اب۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ قریشی اور حکس کا قبضہ کرایا گیا ہے۔"

اس کی تصدیق فوراً ہوگئی۔ میں نے کمشنر سے بات کی کیونکہ چیف منسٹر یا چیف سیکریٹری میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے کہا "شاہ عالم صاحب۔ یہ سب عدالتی دائرۂ اختیار کے معاملات ہیں۔ آپ نے انہیں برطرف کیا۔ وہ کہتے ہیں برطرفی غیر قانونی ہے اور ایگزیکٹو کمیٹی نے آپ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کی ہے۔

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے کمیونٹی کی سفلی نیچری جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ ہدیہ ادارہ ہوگا

اپنے بک سیلر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک سیل سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ
اُردو بازار لاہور
©7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ چیئرمین ہی نہیں رہے۔ بتایئے ہم کس کی مانیں۔ وہ کہتے ہیں پارٹی ہماری ہے چنانچہ پارٹی سیکریٹریٹ بھی ہمارا ہے۔ آپ کہتے ہیں انہیں نکال دو۔ وہ کہتے ہیں کہ باہر کے کسی آدمی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔"

"مگر میں نے ایف آئی آر لکھوادی ہے۔"

"ایف آئی آر تو آپ کے خلاف بھی لکھوادی گئی ہے اور شاید آپ کو علم نہیں' عدالت سے حکمِ امتناعی کی درخواست بھی دائر کردی گئی ہے۔"

"کس کے خلاف؟"

"آپ کے خلاف" وہ حیرانی سے بولا "کہ آپ کو بہ حیثیت چیئرمین اپنے اختیارات کے استعمال سے روک دیا جائے اور میرا خیال ہے کہ عدالت اس میں صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم صادر کرے گی۔ سماعت اور فیصلہ ہونے تک اسٹیٹس کو STATUS QUO"

میں نے فون بند کرتے ہی اشرف سے کہا "ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"اسپتال سر۔ آپ کے سر کا زخم۔"

"جہنم میں گیا زخم۔ میں کہہ رہا ہوں کہ معمولی خراش ہے۔"

"وہاں مسٹر تیمور بھی داخل ہیں۔ کیا ان کی عیادت نہیں کریں گے آپ؟" اشرف نے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے خلاف ORDER STAY کے لیے کیس کردیا گیا ہے۔ قریشی اور شمس مجھے چیئرمین کی حیثیت سے کام کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی نے میرے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کی ہے۔"

"لیکن ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تو ہوا ہی نہیں۔"

"وہ کہتے ہیں ہوگیا۔ ممکن ہے انہوں نے قرارداد پر سب کے دستخط لے لیے ہوں یا بنا لیے ہوں۔"

"ہم چیلنج کریں گے انہیں" اشرف بولا۔

"کب؟ اگر فیصلہ ہمارے خلاف ہوگیا۔"

"فیصلہ یکطرفہ نہیں ہوسکتا۔ عدالت دوسرے فریق کو نوٹس جاری کرتی ہے۔ ایک کی نہیں سنی جاتی۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتے ہو تم مگر تب تک وہ سیکریٹریٹ پر قابض رہیں گے۔ عدالت STATUS QUO کا حکم سنادے گی پھر ہم بے بس ہوجائیں گے۔ تم عدالت چلو' ہمارا کوئی وکیل ہے؟"

"عدالت میں بیرسٹر سلطان محمود ہماری پیروی کے لیے موجود ہوں گے" وہ بولا "آخر ان کی لا فرم ہماری قانونی مشیر ہے۔"

"انہیں پتا چلے گا تب نا۔"

"کورٹ میں ایسا کیس ہو تو سب وکیلوں کو پتا چل جاتا ہے" مگر ہم دیکھ لیتے ہیں" اس نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی موڑ لے۔

میں مایوسی اور جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اشرف اور تیمور نے کیوں اندازہ نہیں کیا کہ حالات کیا رخ اختیار کرسکتے ہیں۔ اشرف اگر رات کو ہی بیرسٹر سلطان محمود کو بتادیتا تو عدالت میں ہماری درخواست صبح سب سے پہلے لگادی جاتی۔ ہم پہلے مدعی ہوتے مگر بات وہی ہوتی۔ ہم یکطرفہ طور پر اپنے حق میں فیصلہ حاصل نہیں کرسکتے تھے پھر شمس اور قریشی کو نوٹس جاری ہوتا اور سماعت کے مراحل طے ہونے تک عدالت صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم صادر کرتی۔ اب بھی یہی ہوگا۔ ہم اس کے حکم کے خلاف عدالتِ عالیہ میں اپیل کرسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب جنگ قانونی نکات سے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی ہوگی تو فیصلہ ہونے تک پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم رہے گی۔ شمس اور قریشی بھی بیان بازی کی حد تک خود کو مجھ سے بڑا لیڈر ثابت کریں گے۔ خود کو قیادت کا اہل ثابت کرنے کے لیے اپنی خدمات اور قربانیوں کا حوالہ دیں گے اور میرے خلاف الزام تراشی کریں گے۔ جو ثبوت انہوں نے اکٹھے کیے ہوں گے وہ سب کے سامنے پیش کریں گے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے اس مقابلے میں پارٹی کارکن ورکر اور ووٹر کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ وہ خاموش تماشائی ہوں گے اور انہیں دکھ ہوگا کہ ان کے لیڈر بھی ویسے ہی تھے جیسے پچھلے پینتالیس سالوں میں حالات کو بدتری اور ابتری کی طرف لے جانے کے ذمے دار تھے۔ اب کسے راہنما کرے کوئی۔

گاڑی کورٹ میں داخل ہوئی تو شمس اور قریشی کے وکیلوں کے ساتھ ان کے حامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ نعرے لگاتا ہوا باہر آیا۔ جن کے چہروں پر فتح مندی کی خوشی تھی۔ ان میں سے دو میری گاڑی کے سامنے آکے ناچنے لگے اور منہ سے تضحیک آمیز آوازیں نکالنے لگے۔ پولیس نے انہیں ہٹادیا مگر وہ میری طرف دیکھ کے فحش اشارے کرتے رہے "اوئے شاہ جی' ایک بار پھر مرجا" کسی نے کہا "اس بار شرم سے مرجا" دوسرا کھڑکی کے قریب بولا "قریشی صاحب کے پیشاب میں ڈوب کے" تیسرا چلایا۔

اشرف نے کہا "ان کی باتوں کا جواب دینا فضول

ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور گاڑی راستہ ملتے ہی آگے بڑھ گئی۔ بیرسٹر سلطان محمود ہمیں بار روم کے باہر ملا۔ وہ اپنے ساتھی وکیلوں کے ساتھ مشورے میں مصروف تھا اور ظاہر ہے اس فیصلے سے ناخوش تھا۔ ہمارے آٹھ دس کارکن اس کے گرد تھیرا ڈالے منہ لٹکائے کھڑے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف آیا "ہم کل اپیل کریں گے شاہ جی۔"

میں نے کہا "انہیں STATUS QUO مل گیا ہے۔"

"جج نے بڑی جانب داری سے کام لیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ قصہ سچا دعویٰ جھوٹا۔"

"مجھے حالات سے بے خبر رکھا گیا۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ کیا رات کو مجھے فون پر وہ بات نہیں بتائی جاسکتی تھی جو مجھے صبح اخبار پڑھ کے معلوم ہوئی؟ اور آپ نے رات بھر میں کیا کیا؟ کس سے بات کی؟ یہ نہ آپ پہنچے نہ تیمور صاحب اور نہ آپ کے سیکریٹری صاحب۔ آپ خود عدالت میں اپنا مؤقف بیان کرنے کے لیے موجود ہوتے تو شاید صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی" بیرسٹر سلطان محمود نے اپنی ناکامی کا سارا غبار نکال دیا۔

اس کی بات ٹھیک تھی۔ قصوروار ہم تھے کہ ہم نے پیش بندی نہیں کی تھی اور اس کے نتیجے میں آدھی بازی ہار چکے تھے۔ شمس اور قریشی کی عطلی اور برطرفی بھی اتنی ہی غیر اہم ہوگئی تھی جتنی میری چیئرمینی۔ میں بیرسٹر سلطان محمود جیسے قانونی اور آئینی امور کے ماہر وکیل کے تعاون سے بھی محروم ہوجاتا تو یہ خرابی میں مزید خرابی ہوتی۔ اس کی قانونی فرم شروع سے پی جے ایف کی مشیر تھی اور وہ تمام معاملات کو سمجھتے تھے۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ ایک جیپ ہمارے پاس آکے رک گئی۔ اس میں سے ڈی ایس پی غلام محمد اترا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ یہاں ملیں گے" وہ خباثت سے مسکرایا "اور یہاں نہ ملتے تو اسپتال جاتا۔"

"ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی میری؟" میں نے کہا۔

"میرے پاس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ ناقابلِ ضمانت۔"

میں نے جیپ میں بابر علی کو دیکھا اور سب سمجھ گیا مگر میں نے انجان بن کے سوال کیا "کس جرم میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں آپ مجھے؟"

"اغوا اور قتل۔ شہر کے دو ممتاز تاجر خالد عثمان اور مرزا خادم کے اغوا اور قتل کا الزام ہے آپ پر" غلام محمد نے اپنے ساتھ آنے والے پولیس کے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ہتھکڑی لے کر آگے بڑھے۔

میری شامتِ اعمال مجھے یہاں لے آئی تھی۔

○☆○

میرے لیے فرار کے سارے راستے مسدود ہوگئے تھے۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو شاہ جی پیچھے سے مجھے گولی مار دیتا۔ دل ہی دل میں میں نے شادو کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ یقیناً اس نے ڈرائیور کو کہیں چلنے کا کہا ہوگا۔ وہ اپنی مرضی سے گاڑی لے کر کہاں جاسکتا تھا۔

شاہ جی نے چلا کے کہا "ناصر۔ رک جا۔۔۔ میں گولی ماردوں گا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ واقعی نشانہ لے رہا تھا۔ مجھے ایک ٹھوکر لگی اور میں مٹی دھول میں منہ کے بل گرا۔ میری پیشانی ایک پتھر پر لگی۔ درد کی ٹیس میں نے بعد میں محسوس کی۔ فائر کی آواز نے اس سے پہلے میرے کانوں میں سنسنی پیدا کردی۔

میں ٹھوکر کھا کے نہ گرتا تو شاید گولی میرے سر میں سوراخ کردیتی۔ شاہ جی نشانے کا کچا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی موت کا یقین آگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسرا فائر شاہ جی میرے اٹھنے اور پھر بھاگنے سے پہلے میری کمر پر پیر رکھ کے کرے گا مگر اسی وقت ایک گاڑی مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر رکی۔ میں نے شادو کی وحشت زدہ آواز سنی۔

میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور پلک جھپکنے سے پہلے دروازہ کھول کے اندر جا گرا۔ شاہ جی نے دوسری گولی نہیں چلائی۔ شاید ایک گولی کی آواز نے آس پاس سب کو متوجہ کرلیا ہوگا۔ سب نے دیکھ لیا ہوگا کہ گولی چلانے والا کون ہے اور شاہ جی کو اپنی فکر پڑ گئی ہوگی۔ اس نے بہتر سمجھا ہوگا کہ گاڑی میں بیٹھ کے نکل جائے۔

گاڑی روانہ ہوتے ہی میں نے خود کو سنبھالا۔ میں پچھلی سیٹ پر شادو کی گود میں جا گرا تھا۔ میرے ماتھے سے بہنے والا خون اس کے کپڑوں پر لگ گیا تھا۔ اس نے سہم کے کہا "ناصر۔ کیا ہوا۔۔؟"

میں نے بڑے ضبط سے کام لیا "کیا تو نے دیکھا نہیں؟"

"تو بھاگ کے کہاں جارہا تھا؟"

میں نے کہا "تو کہاں دفع ہوگئی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے تو؟" ڈرائیور نے کہا کہ گاڑی کو چوک سے گھما کے اس طرف لے آؤں؟ بس نے کہا لے آؤ۔ مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے" شاہد نے کہا۔

"پانچ منٹ کی بچی۔ ابھی یہاں لاش پڑی تھی میری" میں نے غصے میں کہا "اس نے میری بات سننے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔"

شاہد کا رنگ اڑ گیا "یہ فائر کی آواز۔۔۔"

"مجھ پر گولی چلائی تھی اس نے۔ اللہ نے بچالیا ورنہ سر سے سارا مغز نکل کے خاک میں مل جاتا۔"

"مت کر ایسی باتیں" وہ چلائی "تمہیں کس نے کہا تھا کہ خود جاؤ اور کہو آنٹی مجھے مار۔ کارڈ دے دیا تھا' اسے مل جاتا۔"

میں نے گہری سانس لی "پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کے جوش آگیا تھا۔"

"اب ہوش آگیا؟ گئے تھے ہیرو بن کے۔"

میں نے خفت سے کہا "شاہد جی۔ وہ میرے پاس بھی تھا۔" نام لینے کے بجائے میں نے انگلی کے اشارے سے ریوالور کا مفہوم واضح کیا۔

"یہاں گر گیا تھا سیٹ پر۔ شاہد نے اپنے بیگ میں ریوالور کی جھلک دکھا کے کہا "تمہاری جیب سے نکل گیا ہوگا۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "اسی کے بھروسے پر میں شاہ جی کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ عین وقت پر پتا چلا کہ اپنے پاس کچھ نہیں تو جان بچا کے بھاگا۔ ٹھوکر نہ لگتی تو جان بھی نہ بچتی۔"

شاہد نے پلٹ کے دیکھا "وہ ہمارے پیچھے تو نہیں لگا ہوا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دیر لگی ہوگی۔ وہ میرے پیچھے بھاگا تھا۔ لا یہ مجھے دے۔"

اس نے بیگ دور کر لیا۔ "ایسے نہیں' پہلے وعدہ کر کہ ایسی بے وقوفی پھر نہیں کرے گا۔ یہ نامراد چیز اسی لیے بُری ہے کہ مجنوں بھی نارزن بن جاتا ہے خواہ مخواہ۔ ایسی بہادری سے بزدلی اچھی جس کا انجام پھانسی کے تختے پر ہو۔"

میں نے کہا "اچھا آئندہ کوئی بے وقوفی نہیں کروں گا۔"

"کھا میری قسم۔ میرے سر کی قسم۔"

"تیرے سر پیر کی قسم۔ ناک کان کی قسم۔ تیرے بالوں کی اور گالوں کی قسم۔"

اس نے گھبرا کے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ سب سن رہا تھا مگر انجان بنا سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ شاہد نے ریوالور میری طرف کھسکا دیا اور میں نے اسے زیادہ احتیاط کے ساتھ جیب میں رکھ لیا۔ اس کا جیب میں سے سلپ ہو کے سیٹ پر رہ جانا تو میری سمجھ میں آتا تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مجھے اس کی عدم موجودگی کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔

"قسم کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے کہا "کیونکہ ہر قسم بے مقصد ہے۔ بے وقوفی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ تو جانتی ہے کہ میرا آئی کیو ایک سو بیس تھا۔ یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے اونٹ قسم کھائے کہ وہ اڑنے کی کوشش کبھی نہیں کرے گا۔"

"بدمعاشی مت کر ورنہ میں۔۔۔"

"ورنہ تم کیا کرو گی؟"

"میں وکیل صاحب کو بتا دوں گی" شاہد نے کہا۔

"بتا کے دیکھ ذرا۔ اس دن کے بعد سمجھ لینا کہ میں مر گیا۔"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا "میں۔۔۔ مذاق کر رہی تھی۔ مگر میں ڈرتی ہوں نامعلوم کیا نہیں کیوں' اندر سے دل کانپتا ہے میرا۔ برے برے خیال آتے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس ٹینشن ہے۔ جب سے ہم نکلے ہیں' دن رات اعصاب پر ایک ہی مسئلہ سوار ہے۔ ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتے ہیں اور کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہوگا اور انشاء اللہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اب ہاشمی صاحب نے سارے معاملات سنبھال لئے ہیں تو شاہ جی سے کیا ڈرنا۔ وہ شام کو آئے گا تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اس پر۔"

شاہد کچھ پُرسکون ہو گئی "ہاشمی صاحب انسان نہیں فرشتہ ہیں۔"

"ہاں۔ تم پری ہو اور میں بھوت ہوں۔ وہ فرشتہ ہیں۔ خوب ہے یہ قبیلہ جس میں انسان کوئی نہیں" میں نے ہنس کر کہا "چلو تمہیں ایک تماشا دکھاؤں۔ تھوڑی سی تفریح ہو جائے گی۔"

"میں بالکل تفریح کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "موڈ بن جائے گا۔ ڈرائیور سے کہو ڈاکٹر رانجھا کے کلینک چلے۔ آج اس کا افتتاح ہے۔ رنگیلا آئے گا۔"

حمزہ خان بڑا مہذب اور فرض شناس ڈرائیور تھا۔ ہاشمی صاحب نے گاڑی شاہد کے حوالے کی تھی تو کہا تھا کہ یہ تمہارے ڈسپوزل پر ہے۔ ڈرائیور اس حکم کا پابند تھا۔ میں نے اسے راستہ سمجھایا اور وہ میری ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی وہاں رکی جہاں پہلے مسٹر رانجھا شربت فروش کی ریڑھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ریڑھی کچھ آگے موجود تھی اور اسے خریدنے والا ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کاروبار کی گڈول سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنا نام مسٹر رانجھا کے نام کی جگہ لکھوا دیا تھا لیکن ابھی وہ علاج معالجے کے چکر میں نہیں پڑا تھا۔ صرف شربت بیچ رہا تھا۔ آئندہ کے عزائم خدا جانتا تھا۔

دکان کے اوپر "ہیر کلینک" کا سائن بورڈ ڈاکٹر رانجھا نے خود ڈیزائن کیا تھا اور بقلم خود لکھ کے ثابت کر دیا تھا کہ۔ ان کی تخلیقی صلاحیت بھی خداداد ہے۔ بورڈ کے دائیں بائیں دو چہرے تھے جو نقوش سے ایک ہی لگتے تھے مگر جنس کے فرق کو نمایاں کرنے کے لیے ایک پر مونچھیں بنائی گئی تھیں اور دوسرے کی زلفوں سے اس کا صنف نازک ہونا ثابت تھا۔ اس سے یہ وضاحت مقصود تھی کہ یہاں حضرات اور خواتین کے جملہ امراض کا علاج ایک ہی طرح کیا جاتا ہے۔

دکان کے اندر جو شیلف لگائے گئے تھے ان میں ایک ہی جیسی بہت سی شیشیاں تھیں اور مرتبان تھے۔ شیشیوں میں مختلف رنگ کے مشروبات دکھائی دیتے تھے جو پہلے ریڑھی پر روح افزا سائز کی بوتلوں میں نظر آتے تھے اور مرتبان بھی ہر قسم کے پھلوں اور سبزیوں کے بیجوں سے اور مشروبات سے بھرے ہوئے تھے لیکن مجھے ایک شیلف میں انگریزی دوائیں بھی نظر آئیں۔ یہ کھانسی کے شربت تھے اور وٹامن کی گولیاں تھیں۔ ایک اور شیلف میں ہومیو پیتھی کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ غالباً ڈاکٹر رانجھا مریض کی خواہش کے مطابق طریقۂ علاج استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو آپ کو پسند ہو۔ حکمت' ایلوپیتھی یا ہومیو پیتھی۔ اس کے مطابق دوا حاضر۔ شفا منجانب اللہ ہے اور مسیحا کے ہاتھ میں ہے۔

دکان کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا اور باہر پانی کا چھڑکاؤ کر کے کریاز الگا دی گئی تھیں۔ ایک قنات نے اس حصے کو سڑک سے جدا کر دیا تھا۔ دکان کے سامنے کامیڈین رنگیلا کی بہت بڑی تصویر لگا کے لکھا گیا تھا "افتتاح بدست مبارک شہنشاہ ظرافت' چارلی چپلن آف پاکستان' کامیڈی کنگ مسٹر رنگیلا۔"

ڈاکٹر رانجھا نے یقیناً بڑی ترقی کی تھی۔ وہ آج پتلون پہن کے پھر رہے تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی اور چشمے کے ساتھ وہ ایک ڈاکٹر نظر آنے کی کوشش میں سنجیدگی سے مصروف تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ گلے میں پڑے ہوئے ہار کی وجہ سے وہ بن برات کے دولہا لگتے تھے اور ان کا زیادہ وقت شریر بچوں اور آوارہ گردوں کو بھگانے میں صرف ہو رہا تھا جو بار بار معزز مہمان بن کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ سب رنگیلا کی آمد کے اشتیاق میں چشم براہ تھے اور بار بار پوچھتے تھے کہ آخر وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

گاڑی رکی تو ڈاکٹر رانجھا سمیت تمام حاضرین و ناظرین ہماری طرف لپکے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایسی شاندار گاڑی میں وہی ہمہ صفت شخصیت آئی ہوگی جو بیک وقت ایکٹر' پروڈیوسر' ڈائریکٹر' منگر' میوزک ڈائریکٹر' مصنف' کامیڈین اور بہت سی بیویوں کا شوہر تھا۔

مجھے اور شاہد کو دیکھ کر مسٹر رانجھا کو مایوسی اور خفت سے زیادہ حیرت ہوئی۔ کچھ تماشا دیکھنے والوں نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ ہم نئے ہیرو ہیروئن ہیں۔ جن کی فلمیں آنے والی ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا کے [illegible] رنگیلا کی عقیدت کے جذبات کم نہیں ہوئے تھے مگر وہ مایوسی کا شکار تھے "دو بجے کا ٹائم دیا تھا' چار بج گئے۔"

میں نے کہا "وہ معصوف آدمی ہے' بھول گیا ہوگا۔"

"نوجی۔ بندہ قول کا پکا ہے۔ کوئی اور بات ہوگی۔"

میں نے کہا "کب تک انتظار کرو گے اس کا آخر؟"

"یہی میں سوچ رہا تھا" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "ابھی ایک خیال آیا ہے میرے دماغ میں۔ کیوں نہ تم سے افتتاح کرا لوں میں۔"

"ہم سے؟" میں نے ہنس کے کہا "ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری۔ "میری عزت کا سوال ہے یار۔ میں حاضرین سے کہتا ہوں کہ رنگیلا نہیں آسکا۔ اس نے اپنی نئی فلم کے ہیرو ہیروئن کو بھیج دیا ہے۔ ایسی شاندار گاڑی میں آئے ہو تم۔"

میرے انکار یا اقرار سے پہلے ڈاکٹر رانجھا نے حاضرین و ناظرین سے خطاب شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ رنگیلا ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھا چنانچہ اس نے اپنی ذاتی گاڑی میں فلمی دنیا کے افق پر چمکنے والے دو نئے ستاروں کو اس تقریب کی رونق بڑھانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ اس نے فوراً مجھے پاکستانی فلموں کے مستقبل کا دلیپ کمار اور شاہد کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بینا کماری قرار دیا۔

مجھے اس تماشے پر ہنسی آرہی تھی۔ شادو کو پریشانی لاحق ہورہی تھی کیونکہ چالیس پچاس افراد کا بے ہنگم ہجوم منہ کھولے پلک جھپکائے بغیر اسے گھور رہا تھا اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے ترپ سے دیکھنے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ وہ آگے آنے کے لیے زور لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے کچھ لڑکے باقاعدہ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں مار رہے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا اپنی تقریر سے اس اجتماع میں نظم و ضبط برقرار رکھنے میں ناکام تھے۔

بالآخر ہم اٹھ کے باہر گئے اور ڈاکٹر رانجھا نے دروازے میں ایک رسن باندھا۔ میری ساری توجہ بے قابو ہوجانے والے شائقین کی طرف تھی کہ کہیں جوشِ جذبات میں کوئی حد سے نہ گزر جائے۔ شادو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور لوگوں کی حرکتوں اور باتوں سے اسے پسینہ بھی آرہا ہوگا مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ خود مجھے اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے کی توقع نہیں تھی۔

میں نے جلدی سے فیتا کاٹا۔ ڈاکٹر رانجھا نے تالیاں بجائیں مگر باقی لوگ یا ہنستے رہے یا سیٹیاں بجانے لگے۔ اگلا مرحلہ مٹھائی کی تقسیم کا تھا جس کے دوران میں ڈاکٹر رانجھا کی ٹوپی گر گئی اور بینک ٹوٹ گئی۔ وہ چیخنے چلانے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے مٹھائی تقسیم نہ کرسکے۔ مٹھائی کا ٹوکرا الٹ گیا۔ کسی کے ہاتھ ایک لڈو لگا تو کوئی چار لے گیا اور کسی کو محض چورا ملا۔ وہ ہانپتا ہوا سخت غصے کی حالت میں واپس آیا اور تمیز تہذیب سے عاری قوم کے نوجوانوں کی اخلاقی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے شادو کو پریشانی سے بچانے کے لیے رخصت کی اجازت مانگی مگر ڈاکٹر رانجھا نے پھر کہا کہ "میری عزت کا سوال ہے یار، تم لوگ مہمانِ خصوصی ہو۔ چائے پیے بغیر کیسے جاسکتے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

لوگ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سب ہم سن کے برداشت کرتے رہے اور آدھے گھنٹے بعد بڑی مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ خبر پھیلتے ہی کہ وہاں فلموں کے ہیرو ہیروئن آئے ہیں، راہ چلتے لوگ بھی رک جاتے تھے اور مجمع اتنا بڑھ گیا تھا کہ سڑک پر ٹریفک جام ہورہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا کی دکان کے اندر مہمانِ خصوصی کے لیے ایک صوفہ لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بارہ کرسیاں تھیں جو کلینک میں آنے والے مریضوں کے لیے تھیں مگر ان پر بھی چیدہ چیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب ڈاکٹر رانجھا کے مستقل گاہک تھے اور اس سے سارا سال کسی نہ کسی مرض کی دوا لے جاتے رہتے تھے۔ مجھے ان میں بیشتر دہم کے مریض، مخبوط الحواس اور عمر کے اس حصے میں نظر آئے جب آدمی کی عقل پرانی گاڑی کی طرح بھروسے کے قابل نہیں رہتی۔

تقریباً بیس کرسیاں دکان کے سامنے بھی لگائی گئی تھیں اور ڈاکٹر رانجھا کی پوری کوشش تھی کہ ان پر صرف بالغ حضرات تشریف فرما نظر آئیں۔ نتیجہ یہ کہ بچے اور فقیر آس پاس جمع تھے۔ جب مٹھائی تقسیم ہوئی تو مجھے اس مجمع میں سارے بھیک مانگنے والے ہی ملے۔ اس سے مجھے تشویش لاحق ہونی لازمی تھی۔ شاید شادو کی پریشانی کا بھی ایک سبب یہی تھا۔

ہمیں انہی پرستاروں کے ہجوم سے گزر کے کار تک جانا تھا اور یہ مجھے بہت مشکل کام نظر آرہا تھا۔ فرطِ جذبات میں حد سے گزر جانے والے ایسے مواقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعد میں بڑی شان سے بتاتے ہیں کہ انہوں نے کسی ہیروئن کو کیسے چھو کر دیکھا تھا۔ ..... چھونا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر رانجھا سے کہا کہ وہ راستہ بنانے میں میری مدد کریں۔

ہم اٹھنے ہی لگے تھے کہ ایک فقیر آگے آیا اور شادو کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے ہٹا کٹا نظر آتا تھا۔ یہاں وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا چنانچہ اندھے معذور کی اداکاری بھول گیا تھا۔

"اوئے پاگل ہو تم سارے" اس نے قہقہہ مار کے حاضرین کو مخاطب کیا "یہ کون سی ہیروئن ہے؟"

کسی نے اسے بتایا "اوئے رنگیلا کی نئی فلم میں ہے یہ۔"

"اچھا!" وہ مذاق اڑانے لگا "رنگیلا تو اس کے ساتھ ہے۔ ساجن رنگ رنگیلا۔ اوئے یہ ایک فقیر کی بیٹی ہے، شادو۔ جو اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور یہی ہے وہ حرامی۔"

فقیر کی آواز بھیک مانگنے والوں کی طرح دبنگ تھی۔ لوگ پہلے حیران ہوئے پھر خاموش سوالیہ نظروں سے شادو کو اور مجھے دیکھنے لگے۔ شادو کی حالت غیر ہورہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا کی پوزیشن خراب ہوگئی تھی۔ اس نے ابھی ابھی اپنی تقریرِ دل پذیر میں جو کچھ فرمایا تھا وہ جھوٹ قرار دیا جارہا تھا۔

میں نے فقیر کی گردن پکڑلی "یہ کیا بکواس ہے۔ چرس کا سوٹا لگا کے آیا ہے یا شراب پی ہے۔ چل ہٹ راستے سے۔"

میرے دھکے سے وہ پیچھے گرا مگر سنبھل کر چلانے لگا "اوئے مجھے جھوٹا کہتا ہے لعنتی۔ نمک حرام، بے غیرت۔ قسم کھا کے کہہ شادو نہیں ہے یہ؟"

میں نے پلٹ کر شادو سے انگریزی میں کہا "اسے بھونکنے دو، تم آؤ میرے ساتھ۔"

میری انگریزی نے بھی لوگوں کو قائل کیا کہ فقیر جھوٹ بول رہا ہے اور واقعی نشے میں ہے۔ ہمارا حلیہ اور ہماری شوفر والی گاڑی سب اسی کے جھوٹ کا ثبوت تھے مگر وہ فقیر کچھ لوگوں کی شہ پر دوبارہ سامنے آگیا تھا۔

"تو سچا ہے تو بتا۔ ناصر نہیں ہے تو شاہ جی کے ڈیرے پر ہوتا تھا۔"

میں نے اسے پھر دھکا دے کر الگ کیا "اگر بکواس بند نہ کی تو میں پولیس کو بلالوں گا۔"

وہ مشتعل ہوگیا "بلا پولیس کو۔ تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے۔ شاہ جی تیرے خون کا پیاسا ہے۔ تو اس کی بیٹی کو بھگا کے لے آیا اور ہیرو بن گیا۔ شادو، کیا تو ہیروئن ہے۔ بول۔۔۔؟"

فقیر کے لہجے اور اعتماد نے لوگوں پر اثر کیا تھا اور وہ کچھ قائل ہونے لگے تھے مگر ان کی دلچسپی صرف تماشا دیکھنے تک محدود تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اس معاملے کے قانونی پہلو پر غور کرتے ہوئے خود کو عملاً ملوث کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کے لیے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے فقیر کی بات کو جھوٹ قرار دے۔ اس نے بہ آوازِ بلند کہا "اوئے پراں کر اس پاگل دے پتروں۔ روز آجاتا ہے دماغ کھانے میرا۔ میں تو جانتا ہوں اسے۔"

فقیر نے چلا کے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ تم بھی پھنس جاؤ گے۔ اس لڑکی کے باپ نے پرچہ کٹوایا ہے پولیس میں۔"

رانجھا کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "او جا یار۔ چل پکڑ اپنے دو روپے جا تیرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔"

لوگ اب منتشر ہورہے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا کی بات سے فقیر بہت جز بز ہوا۔ اسے جھوٹا ہی نہیں نشے کا عادی بھی ثابت کردیا گیا تھا۔ ایک ایسا پاگل جو اکثر ڈاکٹر رانجھا سے دو روپے لے جاتا تھا۔ اس نے دو روپے لینے سے انکار نہیں کیا مگر ایک طرف کھڑا ہو کے بولتا رہا "ہیرو دے پتر۔ میں بتادوں گا شاہ جی کو۔ اسے خبر مل جائے گی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے گاڑی کا دروازہ کھولا "یہ تو بڑا کام خراب ہوگیا۔ تم نکل جاؤ فٹافٹ۔"

میں نے کہا "تم اس کا منہ بند کرو نا۔ اپنی بات پر قائم رہنا کہ میں سب کو نہیں پہچانتا مگر یہ فلمی ہیرو اور ہیروئن تھے۔ بہت لوگ جانتے ہیں۔"

"تم فکر ہی مت کرو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا" اس نے دروازہ بند کردیا۔

ہاشمی صاحب کا ڈرائیور حمزہ خان اس سارے کھیل تماشے سے بے نیاز گاڑی میں خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

شادو ایک دم پھٹ پڑی "اچھی تفریح کے لیے لائے تھے مجھے۔"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا۔۔۔ کہ ایسی بات ہوجائے گی۔"

"تمہارا کچھ نہیں جائے گا۔ رانجھا مشکل میں پڑجائے گا۔ اگر شاہ جی کو خبر پہنچ گئی تو وہ یہاں بھی آجائے گا۔"

میں نے کہا "آج شام ہاشمی صاحب سے ملنے کے بعد وہ ساری بدمعاشی بھول جائے گا۔ صرف فقیروں پر چلتا ہے اس کا زور۔"

شادو میری بات سے مطمئن نہیں ہوئی "ہاشمی صاحب خفا ہوں گے کہ ایسی جگہ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"انہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔"

شادو نے نظروں سے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ انہیں پتا چل جائے گا۔ وہ ہمارے لیے اتنی کوشش کررہے ہیں پھر ہم ان کے لیے اتنے مسائل کیوں پیدا کریں۔ ابھی اس فقیر کا ساتھ دینے والے دو چار پیدا ہوجاتے تو پتا نہیں کیا ہوتا۔"

"کیا ہوتا۔۔۔؟"

"پولیس آجاتی۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ جھک مار کے ہم پھر وہیں پہنچ جاتے۔"

میں نے کہا "پھر اب کیا فائدہ یہ سوچنے سے کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ جب کچھ نہیں ہوا تو بات ختم کرو اور مجھے چھوڑ دو یہاں۔ میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ کے جاؤں گی۔"

میں نے کہا "شادو جی، مجھے کچھ اور کام ہے۔ کہیں اور جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے، مجھے بتاؤ۔ خدا کے لیے ناصر، ابھی دو چار دن ضرورت کے بغیر گھومنا چھوڑ دو۔ آج کیا ہوا تھا، اتنی جلدی بھول گئے۔ تمہیں کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے گالوں سے لگالیا اور رونے لگی۔

میں پگھل کے پانی ہوگیا۔ ڈرائیور کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کی آنکھوں کا سارا پانی ہونٹوں سے پی جاتا۔ "اچھا اچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جاؤں گا کہیں میں۔ رات کو فون کروں گا دس بجے کے بعد۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہاشمی صاحب سے شاہ جی کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔"

"میں ہاشمی صاحب سے پوچھ کے بتاؤں گی" اس نے کہا۔

گاڑی مجھے نہر کے کنارے اتار کے آگے بڑھ گئی۔ میں گھر پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ رئیس زندگی سے بیزار دروازے پر بیٹھا تھا۔

"آگیا شہزادے۔ کہاں سیر سپاٹے کیے۔ ہم تو سالے یہاں قید خانے میں رہے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اگر میں اسے بتاتا کہ میں اور شادو گاڑی میں گھوم رہے تھے اور وہ کیسی شاندار گاڑی تھی تو اسے زیادہ دکھ ہوتا۔ میں نے کہا "یار، آج بہت کام تھے۔ سب ٹھیک ہو گئے۔ بس ایک حادثہ ہو گیا۔"

"کیسا حادثہ؟"

"شاہ جی ٹکرا گیا۔ سؤر کے بچے نے ریوالور نکال کے گولی چلا دی مجھ پر۔ زندگی تھی کہ میں بچ گیا" میں نے کہا۔

"شادو بھی ساتھ تھی؟" رئیس کی دلچسپی جاگ اٹھی "کہاں ملا تھا؟"

میں نے کہا "بتاتا ہوں یار۔ پہلے ذرا چائے۔"

ماسی ہیر نے میرا استقبال ایسے ہی کیا جیسے ماں سارا دن باہر آوارہ گردی کر کے واپس آنے والے نکھٹو بیٹے کا کرتی ہے لیکن بولنا اس کی عادت تھی اور مجبوری بھی۔ جب میں نے اپنی اسٹوری شروع کی تو اس کی بولتی بند ہو گئی۔ میں نے پہلے بتایا کہ ہم نے کیسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ "وہ سول سرجن کہلاتا ہے۔ ہاشمی صاحب کا پکا دوست ہے۔ اس نے بڑی عزت سے بٹھایا۔ چائے پلائی اور کیک کھلایا پھر سرٹیفکیٹ بنا کے دیا۔"

رئیس اور ماسی ہیر بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے سنتے رہے پھر میں نے بتایا کہ کیسے ہماری ملاقات شاہ جی سے ہوئی تھی "ہم نے کارڈ تو ایک فقیر کو دے دیا تھا مگر وہیں شاہ جی کی گاڑی نظر آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اسے خود بتا دوں۔"

"یعنی خود پنگا لیا تھا تو نے؟"

میں نے کہا "یہ ضروری تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ بس اس کے ڈر سے چھپ کر نہیں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"سالے بہادر خان کی اولاد۔ لگ جاتی گولی تو اس وقت لینا سونا قبریں" رئیس بگڑ کے بولا "مجھے پتا ہے تو شو مارنے کیلئے گیا ہو گا۔ یہ دکھانے کہ تو ایک شاندار گاڑی میں گھوم رہا ہے۔ اس نے شادو کو بھی دیکھ لیا ہو گا کہ تیرے ساتھ تھا سے گھوم رہی ہے۔ طیش تو آنا تھا اسے۔"

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور پھر موضوع بدل کے کلینک کی افتتاحی تقریب پر آ گیا۔ ہیر نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔ میں نے بتایا کہ کس طرح رانجھا نے ہمیں ہیرو ہیروئن بنا کے پیش کیا تھا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

"مجھے پتا تھا کہ رنگیلا آئے گا نہیں۔ وہ خود ہی دیوانہ ہے اس کا۔ جان کے یہ بات مشہور کی ہو گی اس نے تاکہ لوگ جمع ہو جائیں۔"

میں نے کہا "بالکل صحیح سمجھتی ہو تم اپنے شوہر کو۔ اس کے باوجود کچھ نہیں کرتیں۔"

"ہائے۔ میں کیا کروں؟"

"ارے نکال باہر کرو جوتے مار کے" میں نے کہا "ایسے چکرباز شخص کو خواہ مخواہ سر چڑھا رکھا ہے۔ کوئی اور جانور پال لو اتنا شوق ہے تو۔"

اس نے چمٹا اٹھایا "بتاؤں تجھے حرامی۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتا ہے۔ خبردار جو میرے رانجھے کو پھر کچھ کہا۔"

میں تھوڑا سا دور ہو گیا "باقی بات تو سن لو۔ وہاں آگے کیا ہوا؟"

میری بات ختم ہوئی تو رئیس تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "اب یہ تو پکی بات ہے پیارے کہ شاہ جی کو خبر مل جائے گی آج ہی۔"

میں نے کہا "تو بھی لکھوا لے مجھ سے کہ آج ہاشمی صاحب سے ملنے کے بعد اس کی عسکری پھل ہو جائے گی۔ سمجھ جائے گا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کرے گا تو مرے گا۔"

رات کا اندھیرا پھیل گیا تو رئیس کی وحشت بڑھ گئی "یار چل کہیں باہر۔ اپنا تو سارا دن گھومتے پھرتے گزرتا تھا۔ پتا نہیں گھر میں بیٹھ کے کیسے گزرے گی زندگی۔ میں تو ایک دن میں خوار ہو گیا۔"

اس کی خاطر میں نے رضامندی ظاہر کی ورنہ مجھے باہر کی دنیا میں صرف ایک دن گزار کے خطرات کا اچھا اندازہ ہو گیا تھا۔ شاہ جی ایک زخمی آدم خور شیر بنا ہوا تھا اور اس کے سیکڑوں جاسوس شہر کے ہر کونے میں ہماری تلاش پر مامور تھے۔ میرے مقابلے میں رئیس کو پہچاننے والے زیادہ تھے اور اگرچہ اصل مجرم میں ہی تھا مگر رئیس کے جرم کی سنگینی بھی کم نہیں تھی کیونکہ مجھے شاہ جی کے ڈیرے پر لے جانے والا وہی تھا اور ایک دوست کی حیثیت سے سازش میں

شریک تھا۔ ہم ماسی ہیر کی آنکھ بچا کے نکل آئے۔

میں نے کہا "یار تو ایک ہی دن میں گھبرا گیا۔"

"کیا کروں یار۔ عادت جو نہیں ہے ٹک کر بیٹھنے کی اور پھر کام کوئی نہ ہو تو مرد کیا عورت کی طرح گھر میں کشیدہ کاری کرے۔ قسم اللہ کی ہم تو پیدا بھی سڑک پر ہوئے ہوں گے اور مریں گے بھی۔ اوپر سے تیری ماسی ہیر کی زبان۔ قینچی اس کے سامنے خاموش ہو جائے۔"

"بات ٹھیک ہے تیری لیکن جب تک یہ شاہ جی والا معاملہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، باہر جا کے تو کیا کام کرے گا۔ کچھ دن آرام کر۔"

"ابے یار دم گھٹ کے مر جاؤں گا میں۔ اب وہ دن یاد آتے ہیں کہ صبح سے رات تک گھومتے تھے۔ میں اور تو کہاں کہاں جاتے تھے۔ کہیں بیٹھ کے چائے پی، کہیں بن کباب کھا لیا۔ عمران خان اور گوا سکر کی لڑائی پر شرط لگا کے کتنا مزہ آتا تھا۔"

میں نے بھنا کے کہا "الو کے پٹھے۔ ایسے یاد کر رہا ہے جیسے وہ بچپن کی باتیں تھیں اور تو بڈھا ہو گیا ہے۔ چل آج رات بھر گھومتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں پہلے، پھر تجھے لکشمی چوک پر کڑاہی گوشت کھلاؤں گا میں۔ اس کے بعد جہاں تو کہے گا چلیں گے۔"

"شاہی محلے چلیں گے" وہ بولا۔

میں اچھل پڑا "کیا؟ شاہی محلے۔"

"ابے ہاں، بڑے مزے کی جگہ ہے۔ گانا سنیں گے۔"

"بھانبڑ مار کے تیرا دماغ درست کر دوں گا پھر ایسی بات کی تو۔ وہ کوئی شریفوں کے جانے کی جگہ ہے" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "سالے شریف زادے۔ ایسی بات مت کیا کر میرے سامنے۔ پتا نہیں کتنی فلموں میں دیکھا ہو گا تو نے کہ اپنی شرافت پر غرور کرنے والے آخر میں ثابت ہوئے کسی کوٹھے والی کی ناجائز اولاد۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "یہ گالی نہیں سن سکتا میں۔"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا "میں نے کب گالی دی ہے تجھے۔ تو ہی سمجھ رہا ہے ایسا۔ آخر کیوں؟"

میں نے اسے چھوڑ دیا "پھر ایسی مثال دینے کا مقصد کیا تھا؟"

"کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری ماں کون تھی اور باپ کون تھا، نہیں معلوم نا" اس لیے تجھے یہ بات گالی لگی۔"

"میں جانتا ہوں وہ شریف لوگ ہوں گے" میں نے کہا۔

"تو چاہتا ہے کہ وہ شریف لوگ ہوں۔ جیسے سب کے ماں باپ ہوتے ہیں مگر چاہنے سے کچھ ہوتا پیارے تو اپنے نصیب میں یہ خواری نہ ہوتی۔ میرے ساتھ جا کے دیکھنا ذرا شرفا کیسے کیسے آتے ہیں وہاں۔"

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا تجھے جانا ہے تو جا۔"

وہ ہنسنے لگا "سالے ابھی بچہ ہی ہے نا۔"

میں نے بگڑ کے کہا "جوان نہ ہوتا تو شادو سے شادی کیسے کرتا۔"

"ابے لعنت ایسی جوانی پر جس کے دامن پر گناہ کا داغ نہ ہو۔ یہ کیا کہ زندگی کی ٹرین بچپن سے سیدھی جا کے نھمری پچپن پر۔ جوانی کا اسٹیشن ہی نہیں آیا۔ ابھی نہیں جائے گا تو کیا شادی کے بعد جائے گا۔ آپا جی سے پوچھ کے" وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

میرا چہرہ سرخ ہو گیا "اچھا چل، مگر دیکھ۔ گانا ہی سنیں گے۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے مرد بن سالے مرد۔ ایسے لونڈیوں کی طرح مت جھینپ۔"

میں نے کہا "تو۔ پہلے کبھی گیا ہے؟"

"قسم اللہ کی۔ دسیوں بار۔" اس نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیا۔

خود پر قابو رکھنے کی کوشش کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں اور میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا ہے۔ ایک احساس جرم و گناہ نے میرے دل کو جکڑ رکھا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہاں ہر نظر مجھ پر ہے اور دیکھنے والے میری حالت پر خندہ زن ہیں اور میری نیت پر خندہ زن ہیں۔

اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے میرے کانوں نے گانے کی آواز بھی سنی اور طبلے کی تھاپ بھی پھر اچانک رئیس نے کہا "ابے اوپر دیکھ۔ کیا مولویوں کی طرح سر جھکائے چل رہا ہے۔ دیکھ یہ کون ہے؟"

میں نے سر اٹھایا "کون ہے۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔"

"پیارے ہم تو جانتے ہیں۔ یہ وسیم کی بیوی ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ ایک عورت تھی جب وہ فلم کا ٹکٹ بلیک میں خریدنے گیا تھا۔"

میں رک گیا "ناصر کے چچا کی دوسری بیوی۔ یہاں۔؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب اس جیسی ہو گی کوئی..."

"قسم اللہ کی ہماری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی" رئیس بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگا۔ "ابھی پتا چل جائے گا۔"

میری مزاحمت آدھی ادھوری تھی۔ رئیس مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔ یہ خیال کہ میں ایک طوائف کے بالاخانے پر قدم رکھ چکا ہوں' میرے ضمیر کا آزار بن گیا تھا اور میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا جس کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اگر شادو کو پتا چل جائے' اگر آج نہ سہی کبھی رئیس ہی اس کے سامنے کچھ بک دے تو اس کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔

دوسری طرف رئیس نے میرے دل میں نیا تجسس بیدار کر دیا تھا۔ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ جس عورت کو نامرکا قاتل چچا اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا اور جسے اس نے اپنی بیوی بنا لیا تھا وہ ایک طوائف کے بالاخانے پر کیسے نظر آ رہی تھی۔

اچانک میں نے خود کو ایک سجے سجائے کمرے کی تنہائی میں ایک مرے سانولے رنگ کی فربہ بدن چالیس سالہ عورت کے سامنے پایا جس نے اپنا رنگ نکھارنے کے لیے کریم پر پاؤڈر تھوپ رکھا تھا مگر پھر بھی اصل رنگ روپ یوں جھلکتا تھا جیسے دھوئیں سے کالے باورچی خانے کی دیواروں پر سفیدی کی کوچی پھیرنے کے باوجود برسوں پرانی نیچے کی سیاہی اور بدصورتی کا تاثر اور احساس ختم نہ ہو۔ اس کے بارے میں رئیس مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اپنے اطوار سے وہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے مجھے تعجب نہیں تھا۔ اس نے چست نیاس اور بھڑکیلے گریبان سے اپنی لٹی ہوئی جوانی کی بھرپور نمائش کا پورا اہتمام کیا تھا۔

دو تجربہ کار نوجوان لڑکوں کا اس نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کے استقبال کیا۔ حیران ہونے کی اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں ہو گی۔ اس کے پاس پرانے تجربہ کار لوگ کم ہی آتے ہوں گے۔ میری گھبراہٹ اور بدحواسی کو اس نے ایک اچھے سیلز مین کی طرح نظر انداز کیا۔

میں نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ دس بارہ فٹ کے سامنے والے حصے میں فرش پر ایک پرانا قالین تھا جس کا سرخ رنگ خیالا ہو رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ لگے گاؤ تکیوں کے ریشمی غلاف بھی کھس چکے تھے۔ دیواروں پر انگریزی رسالوں سے نکالی ہوئی بیجان انگیز تصویریں چپکا دی گئی تھیں مگر کچھ خاص تصویریں فریم میں بھی لگی ہوئی تھیں۔

"کھڑے کیوں ہو' بیٹھو۔ گانا ہی سنو گے یا۔" اس نے یوں سوال کیا جیسے اس کے اور ہمارے بیچ میں ہی سب کچھ ہے۔

رئیس گاؤ تکیے کے سہارے پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ بٹھا لیا "یہ سالا پہلی بار آیا ہے۔"

وہ ہنسی "پہلی بار سب ہی آتے ہیں۔"

میں درمیان میں پڑے ہوئے پردے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے آنے والی آوازیں سن کے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر تجسس نے میرے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔

"میرا ریٹ بہت زیادہ ہے۔ میں رعایت بھی نہیں کرتی۔ بی اے پاس ہوں اور... مجھے خوش کرنا آتا ہے" وہ بے شرمی سے ہنسی۔

"کیا قیمت ہے تمہارے وقت کی...؟" رئیس بولا۔

"کیا رات رکنے کا خیال ہے" وہ بولی "پانچ نوٹ ہیں تو بات کرو۔"

رئیس نے مجھے ایسے اشارہ کیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہے اور میں اس کا غلام درباری "دے دے اسے جو مانگ رہی ہے۔"

میں نے احتجاج کرنے کا سوچا مگر پھر مصلحت کو سمجھتے ہوئے اسے پانچ نوٹ تھما دیے۔ وہ کچھ حیران ہوئی۔

"لمبا ہاتھ مارا ہے کہیں" اس نے نوٹ ایک گاؤ تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

"اب بیٹھ جاؤ یہاں" رئیس نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"الماس۔ تم کوئی اخبار والے تو نہیں ہو۔" وہ بولی۔

"نہیں مگر ہم کچھ پوچھنا ضرور چاہتے ہیں۔ ایک بار میں نے تمہیں سینما میں دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھ ایک شخص تھا جس کا نام تھا وسیم!"

"ہو گا۔ ایسے تو بہت لوگ نظر آتے ہیں میرے ساتھ۔"

رئیس نے کہا "مجھے پتا چلا تھا کہ تم سے شادی کرنا ہے اس نے۔"

وہ رئیس کو گھورنے لگی "تم کیا لگتے ہو اس کے؟"

"کچھ نہیں" رئیس نے کہا۔

"پھر کیا بات ہے۔ پولیس والوں کی طرح سوال کیوں کر رہے ہو؟ کوئی ایسی ویسی بات ہے کیا؟"

اب مجھ میں اتنا حوصلہ آ گیا تھا کہ اس سے بات کر سکوں "تم کافی تجربہ کار لگتی ہو۔ تمہیں انسانوں کو صورت سے پہچان لینا چاہیے۔ کیا ہم اخبار والے یا پولیس والے نظر آتے ہیں؟"

"یہ وسیم نے کہا تھا ہم سے کہ تم اس کی بیوی ہو۔"

وہ طنز سے بولی "جب تم نے دیکھ لیا تو وہ اور کیا کہتا۔"

"دراصل وہ پہلے ہی شادی شدہ تھا۔ اس نے طلاق بھی دے دی تھی اپنی بیوی کو۔"

"ایسا ہوتا ہے مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ مت پوچھنا کیوں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے مردوں کو خوش کرنا آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اب گھر بسا لینا چاہیے۔ موقع ملا ہے تو کمائی کرلی بہت۔ اب گزارا بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو پہلے انکار کر کے پچھتا رہا تھا۔ یہ دوسرا آدمی تھا جو اتنا سیریس ہو گیا کہ بیوی کو طلاق تک دے دی۔ تھا کھاتا پیتا مگر اس کے ساتھ رہ کے اندازہ ہوا کہ میرا گزارا نہیں ہو گا۔ ایک تو عادت نہیں تھی' پھر وہ جتنا پیسے والا خود کو ظاہر کرتا تھا' اتنا نہیں تھا پھر مصیبت ڈال دی اس کے سالے نے۔ وہ تھانے دار تھا۔ میں دو ہفتے بعد بھاگ آئی واپس یہاں۔"

"اس نے کبھی بتایا نہیں کہ اتنا پیسہ کہاں سے آیا اس کے پاس۔ کتنا خرچ کر دیا تھا اس نے تم پر؟"

"لاکھ تو لٹا ہی دیے تھے۔ اولاد نہیں تھی اس کی۔ ایک دن شراب کے نشے میں رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اپنے بھائی کی بیوی سے میں اس لیے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ ایک بچے کی ماں تھی۔ دوسرا بھی پیدا کر سکتی تھی۔"

میری دلچسپی اچانک بڑھ گئی "پھر... شادی سے انکار کر دیا تھا بھابی نے۔"

"پہلے بتا رہا تھا کہ... بھاگ گئی تھی کسی کے ساتھ پھر نشے میں بکنے لگا۔ کہنے لگا کہ میں نے بیچ دیا تھا ساہی کو۔ اس نے عجیب باتیں بتائی تھیں مجھے مگر وہ نشے میں تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ بکواس کرتا رہا۔ میں سو گئی۔ صبح اسے کچھ یاد نہیں تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو الماس۔ تمہیں کچھ یاد ہے... اس نے کیا باتیں کی تھیں۔ اسے چھوڑو کہ جھوٹ تھیں یا سچ۔"

"ویسے شراب کے نشے میں جھوٹ نہیں بولتا آدمی۔"

"تم اس کا ذکر کیوں لے کر بیٹھ گئے۔ اپنی بات کرو" وہ بولی۔

میں نے کہا "تمہارے وقت کی قیمت ادا کر دی ہے ہم نے۔ ہم صرف باتیں کریں تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کبھی اس کے سامنے ساری باتیں دہرانی پڑیں۔"

"نہیں... میں کچھ نہیں بولوں گی۔" وہ پریشان نظر آنے لگی۔

"سوچ لو... تم کو پچاس ہزار مل سکتے ہیں اور کسی کے سامنے نہیں' صرف وسیم کے سامنے... وہ سب کہہ دینا جو اس نے تم سے کہا تھا۔"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظر دروازے پر تھی۔ میں نے پلٹ دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:

جلد اوّل: ۱۵۰ روپے

جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۳۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کوئی نیا تھانے دار تھا۔ اس کی وردی کے کاندھے پر ابھی ایک ہی پھول نظر آرہا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے بھی وہ بائیس چوبیس سال کا ہی لگتا تھا۔ اس عمر کے کسی نوجوان کے چہرے پر جو کالج یونیورسٹی میں پڑھتا ہو' ڈاکٹر انجینئر بننے والا ہو' کہیں قدم جمانے کی کوشش کررہا ہو یا کچھ بھی نہ کررہا ہو' لڑکپن کے بھولے پن کی جگہ جوانی کے بانکپن کا غرور سارے جہان کو چیلنج دیتا محسوس ہوتا ہے کہ دیکھو' میں جوان ہوگیا ہوں اور اب ساری دنیا میری قوتِ تسخیر میں ہے۔ کوئی ہے جو کامیابی کی راہ پر میری پیش قدمی کو روک سکے۔ میرے عزائم کی بلند پروازی کا مقابلہ کرسکے۔

اور وہ جوان طاقت کے ساتھ اختیار کے گھوڑے پر بھی سوار ہو۔ وہ خوبیٔ قسمت سے یا دوسروں کی بدقسمتی کے باعث سی ایس پی افسر بن جائے یا پولیس اور کسٹم جیسے محکمے میں انسپکٹر لگ جائے تو گویا کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ اس کا بے ضرر غرور ایک پُرخطر رعونت میں بدل جاتا ہے۔ پھر وہ چیلنج نہیں دھمکی دیتا محسوس ہوتا ہے۔

اس نوجوان تھانے دار کی صورت پر مجھے شرافت کی جگہ وہی خباثت نظر آئی جو کچھ تھانے داروں میں زندگی کے کئی سال مجرموں کے درمیان گزارنے کے بعد نظر آتی ہے۔ جو کئی سال کوٹھے پر گزارنے والی ویشیا کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔

احساسِ گناہ کی ندامت نے مجھے پہلے ہی کمزور کردیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کے میں نروس ہوگیا۔ طوائف کے کوٹھے سے ساری معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کے ساتھ جرم وگناہ کا سلسلہ بھی منسوب ہے۔ اغوا' بردہ فروشی' قتل اور معاشرتی جبر کی ساری کہانیاں میرے ذہن میں تھیں اور دیکھے جانے یا پکڑے جانے کا ڈر میرے لاشعور میں بیٹھا ہوا تھا۔

اے ایس آئی تکبر سے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے رئیس کو کہنی مار کے اشارہ کیا "چل یار۔۔۔ اُٹھ۔"

اے ایس آئی مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے بدمعاشی سے مسکرایا اور اپنی برائے نام مونچھوں کو تاؤ دینے لگا "بھاگنا چاہتے ہو؟"

رئیس کی حالت بھی غیر ہوگئی تھی مگر وہ کچھ پُراعتماد نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا "لو جی۔ بھوگے وہ جس نے کچھ کیا ہو۔"

"ہاں۔۔۔ ہم پھر آئیں گے۔۔۔" میں نے حلق سے تھوک نگل کے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "بیٹھو آرام سے۔ اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو جیرا ہے۔"

اے ایس آئی نے بُرا سا منہ بنایا "فیروی جیرا' یا تو نام لو محمد نذیر یا پھر جیسے ساری دنیا کہتی ہے جیرا بلیڈ۔"

"میں جوتی کھینچ کے ماروں گی حرامی۔ چل دفع ہو یہاں سے۔۔۔"

میں ایک اے ایس آئی کی یہ بے توقیری دیکھ کے حیران ہوا۔ اول تو ایک طوائف کے کوٹھے پر پولیس کا کیا کام اور پھر کسی تھانے دار کو ایک معمولی طوائف ایسے مخاطب کرے' جیرا بلیڈ مشہور فلم تھی اور اس کی کامیابی کے بعد یہ نام خود کو بدمعاش سمجھنے والوں نے بطور ٹریڈ مارک اپنا لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شیدا پستول یا مولا جٹ لیکن کوئی تھانے دار اس نام سے شہرت پسند نہیں کرسکتا تھا۔

"ایسے سب کے سامنے بے عزتی خراب مت کیا کرو۔ میرا نہیں تو اس وردی کا ہی کچھ خیال کرو" اے ایس آئی خفت سے سر کھجانے لگا۔

میں نے اور رئیس نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں کہتی ہوں' تا روے اندر جا کے یہ وردی۔ کہیں کوئی پیچھے لگا ہوا ہو تو ابھی ساری تھانے داری نکل جائے گی۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"اوئے پاگل۔ ہے کسی کی مجال کہ ایک تھانے دار کے پیچھے لگے۔ رعب کتنا ہے میری یہ سنٹی کا۔" اس نے مسکرا کے ہماری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا "کوئی اصلی تھانے دار ہی دیکھے تو یوں گھٹنے جوڑ کے سیلیوٹ کرے۔" اس نے کھٹاک سے جوتوں کی ایڑھی ملا کے اسے فوجی اسٹائل میں سیلیوٹ مارا۔

"جیرے۔۔۔ چھوڑ دے یہ سب۔ کسی دن پولیس کے ہاتھ لگ گیا نا تو تیری ہڈیوں پر سے چمڑی اتار لیں گے اور اس کے جوتے بنا کے ایسی پھینٹی لگائیں گے' تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بیٹھو یار تسلی سے۔ ہم تو تھانے دار نہیں ہیں مگر تم ضرور چور ہو ورنہ اتنا کیوں ڈرتے؟"

میں نے سکون کی گہری سانس لی اور رئیس کے ساتھ پھر بیٹھ گیا "تم جعلی تھانے دار ہو۔ وردی پہن لی ہے پولیس کی۔"

اس نے فریادی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا "اس پاپی کی خاطر بندہ سارے

سوانگ رچاتا ہے۔ اپنے مولا نے اتنے کل پرزے لگائے بندے میں' ہاتھ پاؤں' ناک کان' دل گردے۔ ایک معدہ نہ لگاتا تو کیا تھا؟"

وہ بولی "ایویں کفرنہ بکا کر۔ شکر کیا کرنا شکرے۔"

"لوجی" وہ بولا اور پھر گانے لگا "میں کوئی جھوٹ بولیا؟ کوئی نا۔ میں کوئی کفر تولیا؟ کوئی نا بھئی کوئی نا۔ تو خود یہاں کیوں بیٹھی ہے آخر؟ بول' اسی پیٹ کی خاطر۔"

اس نے اپنی چپل اٹھا کے پھینکی "بکواسی۔۔۔ جا یہاں سے۔"

اس نے ہنستے ہوئے خود کو بچایا "ایویں غصہ کرتی ہے۔ ابھی ایک سیکنڈ میں سارا غصہ بھول جائے گی۔ تم دیکھنا" اور مجھ سے اور رئیس سے مخاطب ہو کے بولا پھر پتلون کی جیب میں سے اپنا پرس نکالا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

"ہائے او ربا۔ کیا ڈاکا ڈالا ہے کہیں؟" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے پرس کو دیکھا۔

پرس اس کے قدموں میں آگرا "دیکھ کیسے رنگ برنگے نوٹ ہیں۔ تو گنتی رہنا بعد میں۔ ابھی ایک بڑا نوٹ دے دے مجھے۔ سب سے بڑا' ہم بھی کچھ موج میلہ کرلیں۔"

وہ پردہ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ کسی عورت نے ایک مصنوعی غصے والی چیخ مار کے اسے گالی دی جو خاصی فحش تھی۔ جواب میں وہ ہنسا اور اس سے زیادہ فحش جواب دیا۔

میں بھونچکا بیٹھا تھا "یہ۔۔۔ نذیر۔۔۔ جیرا بلیڈ کون ہے؟"

اس نے پرس کو احتیاط سے قالین کے نیچے دبا دیا لیکن ایک ہزار کا نوٹ نکالنے کے بعد۔ "جیرا۔۔۔ جیرا سب کچھ ہے میرا۔ محافظ' بھائی' بیٹا' کچھ بھی سمجھ لو۔"

میں نے کہا "بھائی اور بیٹے اتنے بے غیرت نہیں ہوتے۔"

وہ ہنس پڑی "ہوتے ہیں کاکا جی' ہوتے ہیں۔ پر ابھی دیکھے نہیں تو نے۔ آگے بڑی عمر پڑی ہے۔ تو دیکھ لے گا۔"

رئیس نے کہا "یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ پولیس کی وردی پہن کے تھانے دار بنا پھرتا ہے' کسی دن پکڑا جائے گا۔"

"یہ تو میں بھی سمجھاتی ہوں اسے۔۔۔ ابھی تمہارے سامنے بھی کہا تھا۔"

"پھر۔۔۔ وہ مانتا کیوں نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔"

"چھوڑ مطلب کو۔ اپنے مطلب کی بات کر" اس نے تلخی سے کہا "دنیا میں لوگ پتا نہیں کیا کچھ کررہے ہیں۔ میں کون سی نیکی کمارہی ہوں یہاں۔ پیسہ کمانے کے لیے بیٹھی ہوں نا۔"

جیرا پھر باہر آیا اور مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔ اب وہ جینز کی پرانی پتلون اور پیلی بنیان میں تھا۔ اس نے ایک چنگی سے نوٹ اچک لیا اور اسے بلب کا رخ کرکے دیکھا اور پھر ہونٹوں سے لگا کے چوما۔ "تو کیش تو عیش۔۔۔ لوجی میں چلا اس کو ٹھکانے لگانے" پھر وہ سیڑھیاں اتر گیا۔

"پھر۔۔۔ کیا سوچا ہے تم نے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "کس بارے میں؟"

وہ جھلا کے بولی "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"آئے تو بس ایسے ہی تھے۔۔۔ جیسے سب آتے ہیں لیکن تم سے مل کے بات کچھ اور ہوگئی" میں نے کہا۔

رئیس نے سرہلایا "تمہارے ٹائم کی قیمت ہم نے ادا کردی ہے۔ اب ہم کچھ بھی نہ کریں' باتوں کے سوا۔۔۔ تو ہماری مرضی۔"

اس نے سوچ کے کہا "دیکھو۔ یہ بڑا مشکل ہے میرے لیے۔ میں پولیس کے سامنے کوئی بات نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم نہیں تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہم صرف وسیم کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ تم کتنا عرصہ اس کے ساتھ رہیں؟"

"ڈیڑھ مہینہ۔"

"اس نے شادی کی تھی تم سے۔۔۔ باقاعدہ نکاح پڑھوایا تھا؟"

"وہ تو چاہتا تھا۔۔۔"

میں نے کہا "مگر تمہیں یہ منظور نہیں تھا کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ تمہارے لیے عیش وعشرت کی شاہانہ زندگی کے اخراجات پورے کرسکے۔ صرف محبت اور عزت کی زندگی پر قناعت کرنا تمہارے لیے مشکل تھا۔"

"اگر وہ مجھے آرام سے رکھتا' عیاشی کو چھوڑ۔۔۔ میں سکھ سے رہتی اور اسے سچ مچ محبت ہوتی مجھ سے تو شاید میں گزارا کرنا سیکھ جاتی مگر مجھے بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ محبت نہ عزت۔ وہ محبت کرنا جانتا تو اتنا عرصہ ساتھ گزار کے اپنی بیوی کو میرے لیے کیوں چھوڑتا؟ ایسی کوئی خرابی نہیں تھی اس کی بیوی میں بلکہ جو باتیں اس نے بتائیں' ان سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اچھی محبت کرنے والی وفادار بیوی تھی جس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ اس کی اچھائی برائی میں رازدار رہی۔ باقی رہی عزت تو اس آدمی کی اپنی کوئی عزت نہیں تھی۔ وہ مجھے کیا عزت دیتا۔ دولت کے فریب کو میں نظرانداز کرسکتی تھی۔ اس نے خوب خرچ کیا مجھ پر۔ پہلے دو مہینے وہ یہاں آتا رہا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "برا مت ماننا' ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"ایسا کیا دیکھا تھا تم میں اس نے۔؟"

"یہ تم اسی سے پوچھنا۔" وہ تنک کر بولی "میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ دل آگیا تھا اس کا مجھ پر۔"

رئیس نے کہا "دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ اندازہ ہے۔ کتنا خرچ کردیا تھا اس نے تمہارے عشق میں؟"

"جتنا اس کے پاس تھا۔ سب لٹا کے کنگال ہوگیا تھا وہ۔ ایک مکان رہ گیا تھا۔ دکان بھی بیچ ڈالی تھی اس نے۔"

میں نے کہا "ان دو مہینوں میں جب وہ تمہاری خاطر یہاں آتا تھا' اس نے تمہیں کیا دیا' میرا مطلب ہے کتنا؟"

"زیور کپڑے۔ تحفے' نقد۔ سب ملا کے ایک لاکھ سے اوپر ہی ہوں گے۔ پچاس ہزار نقد دے کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اتنے ہی ایک مہینے میں اور خرچ کیے ہوں گے۔"

وہ بولی "مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کردیا "یعنی دو لاکھ اس نے تم پر لٹادیے۔ وہ خاندانی رئیس تو تھا نہیں۔ تم نے کبھی پوچھا کہ۔۔۔"

"ہاں۔ اس نے وہی کہا جو کہنا چاہیے تھا۔ یعنی یہ کہ میرا بزنس ہے بہت بڑا۔ اچھی خاصی کمائی ہے لیکن یہ جھوٹ تھا۔ اس کی ایک دکان تھی۔ المونیم کے برتنوں کی۔ وہ بھی بند پڑی تھی۔ سچ اس نے بعد میں بتایا' جب وہ شراب کے نشے میں تھا۔"

"وہ سچ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ تم کیوں جاننا چاہتے ہو آخر؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "جانتا نہیں۔ میں وہ سچ تم سے خریدنا چاہتا ہوں۔ تم اس کی جو قیمت چاہو مجھ سے لے سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے ترچھی نظر سے میرا جائزہ لیا "واہ سیٹھ۔ اتنی بڑی بات؟"

میں نے کہا "ایک بار' صرف ایک بار تمہیں وہ سب بتانا ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں کہہ چکی ہوں۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتی' کسی قیمت پر نہیں۔"

"تم وسیم کے سامنے تو سب دہرا سکتی ہو۔ وہ سب جو اس نے تم سے کہا تھا۔ لفظ بہ لفظ۔ کم نہ زیادہ۔" مجھے اچانک ایک اور خیال آیا۔

"تمہارے سامنے؟" وہ مجھے نظر جما کے دیکھتی رہی۔

"ہاں۔ صرف میرے سامنے۔"

"اس سے کیا ملے گا تمہیں۔"

"کچھ تو ملے گا جس کے لیے میں تمہارے سچ کی اور تمہارے وقت کی قیمت چکا رہا ہوں۔" میں نے کہا "تم یہ سمجھ لو کہ منہ پر ایک جھوٹے آدمی کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی غرض بھی نہیں ہونی چاہیے کہ کیوں؟ ایک دن تم میرے ساتھ چلو۔ اس کے گھر۔۔۔ یا کسی اور جگہ۔ جہاں صرف ہم تین ہوں گے' ایک گھنٹے میں تم سب کچھ کہہ سکتی ہو۔۔۔ جو تمہیں معلوم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے یہ سودا منظور ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم پھر کب آؤ گے؟"

"کسی بھی دن۔ کل پرسوں۔ جیسے ہی موقع ملا اور میری وسیم سے بات ہوگئی" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا ٹسک دور نہیں ہوا تھا لیکن جو بات میرے ذہن میں تھی' وہ اس کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے رقم کے لالچ نے مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنے شک کو نظرانداز کردے۔ وہ بہرحال ایک زرپرست کسبی تھی اور اس زر پرست دنیا نے ہی اسے ایسا بنایا تھا۔

رئیس زیادہ وقت خاموش ہی رہا تھا مگر نیچے آتے ہی اس کی زبان کھل گئی "ابے' تو چاہتا کیا ہے آخر؟"

میں نے کہا "تو جانتا ہے اچھی طرح۔ میں ناصر کے چچا کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ پہلے میں سزا دلوانا چاہتا تھا مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اسے سزا دلوا کے مجھے کیا ملے گا۔ ناصر تو واپس ملنے سے رہا۔ اس کی ماں' اس کا باپ' اس کا گھر' سب ختم ہوگیا۔ لیکن میرے دل میں وہ دکھ کی چنگاری ابھی روشن ہے۔ اسے بجھانا ضروری ہے۔"

رئیس کا موڈ آف ہوگیا تھا "ابے ہم یہاں اس لیے تو نہیں آئے تھے' جھک مارنے۔"

میں نے کہا "اچھا ہے یار' کچھ گنوا کے نہیں جا رہے ہیں ہم۔"

"اپنے پاس تھا کیا گنوانے کو۔؟"

میں نے کہا "اپنی عزت تھی۔ ہم خود اپنی نظر سے گر جاتے۔ اللہ نے بچالیا اور دیکھ تقدیر کے کھیل' ساری چالیں وہی چل رہی ہے۔"

رئیس خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا۔ "یار ناصر تیری میری یاری پتا نہیں کیسے چل رہی ہے؟"

"جو کسی غرض اور فائدے کے لیے چلے وہ یاری نہیں

ہوتی" میں نے گھڑی دیکھی "اب بیٹا شرافت سے چلتے ہیں لوٹ کے اپنے گھر۔"

"وہ اپنا گھر ہے؟" وہ سخت ڈپریشن میں مبتلا تھا۔

"ہاں۔ گھر دیواروں سے نہیں' رشتوں سے بنتا ہے اور رشتے نبھانے کے لیے بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ گنوانا پڑتا ہے' قربان کرنا پڑتا ہے۔"

"پاگل ہوگیا ہے تو کتابیں پڑھ پڑھ کے۔ پتا نہیں شادو کی تیرے ساتھ کیسی گزرے گی۔ بولتا رہتا ہے انٹ شنٹ۔ پاگل کردے گا اسے بھی۔"

"تو اس کی فکر مت کر۔ میں اسے فون کرکے پوچھتا ہوں کہ آج کیا ہوا؟ شاہ جی پہنچا کہ نہیں" میں نے کہا اور پی' سی' او کی تلاش میں چاروں جانب نظر دوڑائی پھر ہمیں ایک جگہ پی' سی' او کا بورڈ نظر آگیا۔

گھنٹی کئی بار بجی پھر کسی نے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "یہ ہاشمی صاحب کا گھر ہے؟"

"جی۔ وہ اسٹڈی میں ہیں۔"

"میری ان سے بات کراؤ" میں نے کہا۔

"سوری سر۔ اس وقت وہ کیس اسٹڈی کرتے ہیں۔ ان کو ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک ایمرجنسی نہ ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "تو سمجھ لو کہ سخت ایمرجنسی ہے۔"

"یس سر۔ کیا نام بتاؤں میں آپ کا؟"

"ناصر عظیم" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کے بعد ہاشمی صاحب نے کہا "ہاں بھئی ناصر۔ خیریت تو ہے؟"

میں نے کہا "سر۔ پوچھنا صرف یہ تھا کہ شاہ جی آپ کے آفس پہنچا تھا یا نہیں۔ پیغام تو دے دیا تھا میں نے اسے اور کارڈ بھی۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا "بس یہی معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا اس وقت۔ یہ بات صبح بھی ہوسکتی تھی۔"

میں نے ان کے لہجے کی ناگواری کا اندازہ کرلیا "آپ جانتے ہیں کہ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں جب اسے آپ کا کارڈ دینے گیا تو اس نے گولی چلادی تھی مجھ پر۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہوا تھا" انہوں نے سرسری لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "وہ آپ سے ملنے آیا تھا؟"

"آیا تھا لیکن ابھی میں مصروف ہوں' ہم صبح بات کرلیں گے۔"

میں نے جلدی سے کہا "بہت بہتر۔ کیا میں شادو سے بات کرسکتا ہوں۔"

"بھئی شاہدہ تو سو رہی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں آج اور طبیعت بھی کچھ ناساز تھی ان کی۔ صبح بات کرلینا ان سے بھی" ہاشمی صاحب نے کہا اور فون بند کردیا۔

مجھے ان کے لہجے اور رویے سے اہانت سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے میری بات کو غیر اہم سمجھتے ہوئے مجھے ٹال دیا تھا۔ مجھے سخت طیش آیا۔ ٹھیک ہے وہ بہت بڑے وکیل ہیں اور اس وقت وہ عدالت میں صبح پیش ہونے کے لیے کیس تیار کرتے ہیں مگر میں شادو سے کیوں بات نہیں کرسکتا۔ ابھی کون سی آدھی رات ہوگئی ہے اور اسے جگایا کیوں نہیں جاسکتا۔ اگر اسے بتایا جائے کہ نا سہ بات کرنا چاہتا ہے تو وہ آدھی رات کو بھی خود اٹھ کے دوڑی چلی آئے گی۔

میں نے پھر وہی نمبر ملایا اور اسی ملازم نے پھر ریسیور اٹھایا۔

میں نے کہا "مجھے شاہدہ پروین سے بات کرنا ہے۔"

اس نے اپنے مہذب' سپاٹ اور بیزار کن لہجے میں کہا۔ "وہ اس وقت سو رہی ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ تم جگا دو اسے۔ کہو ناصر نے فون کیا ہے۔"

"سوری سر۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"کیوں نہیں کرسکتے؟" میں نے چلا کے کہا۔

"آرڈر ہے سر!"

"آرڈر کے بچے۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟" میں احساسِ تذلیل پر بھڑک اٹھا "میں خود پہنچ جاؤں گا اس سے ملنے۔"

اس نے کہا "جیسی آپ کی مرضی۔" اور فون بند کردیا۔

میں نے اس ملازم کو اور ہاشمی صاحب کو غصے میں ایک سو ایک گالیاں دیں "دیکھ یار۔ اس نے کیسے ٹال دیا مجھے۔ جیسے میں کوئی ایرا غیرا ہوں۔"

رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "نہیں۔ تو بڑا دی آئی پی ہے۔ وزیراعظم ہے۔"

میں نے کہا "مذاق مت کر یار۔ وہ سالا وکیل پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے اور شادو ہوگئی ہے شاہدہ پروین۔ سو رہی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں آج" میں نے اس کے لہجے کی نقل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُتاری۔

"ابے یار۔ تُو جانتا ہے ان بڑے لوگوں کے دستور کو۔ یہ اپنے باپ سے نہیں ملتے بے وقت۔ کیا پتا بیوی کو بھی انکار کر دیتے ہوں کہ آج تو مصروف ہوں میں اور محبوبہ کو بھی انکار کر دیتے ہوں کہ اپارٹمنٹ نہیں تھی تو ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"اپارٹمنٹ نہیں جاہل کی اولاد "اپائنٹمنٹ۔"

"ابے ہاں وہی چھوڑ غصہ۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ میں ابھی ملوں گا اس سے۔ ہاشمی صاحب کے گھر جا کے۔ ایسی تیسی ان کے دستور کی۔"

"سالے اتنی ذلت کافی ہے آج کے لیے۔ وہاں جا کے اور ذلیل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ گیٹ پر کھڑا ہو گا کوئی جنگلی قسم کا چوکیدار۔ وہ گیٹ ہی نہیں کھولنے کا پھر کیا کرے گا تو؟ تیر مارے گا دروازے پر۔ ہنگامہ کرے گا؟ پولیس پکڑ کے لے جائے گی بیٹا اور رات بھر میں سارا نشہ اتار دے گی عشق کا۔ ہاشمی صاحب خود کچھ نہ کریں' پڑوس میں رہنے والے کسی طرم خان سے فون کرا دیں گے۔ وہاں تو رہتے ہی سارے ایسے ہیں جن کے حکم پر پولیس بھی سر کے بل آتی ہے۔"

میرا جوش اور جنون ٹھنڈا پڑ گیا "مگر یار۔ میں اب شادو کو وہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

"پاگل مت بن۔"

"اتنی سختی تو شاہ جی کے گھر میں نہیں تھی۔ پابندی کے باوجود میں اس سے مل سکتا تھا۔ یہ ہاشمی کون ہوتا ہے بیچ میں زبردستی ٹانگ اڑانے والا خدائی فوج دار۔" میں نے کہا۔

"ابے وہ جو کر رہے ہیں' اچھا کر رہے ہیں۔ ہمارے بھلے کے لیے کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کر کہ اتنے بڑے وکیل کی حمایت حاصل ہو گئی جس کے سامنے شاہ جی بھی اکڑ فوں نہیں دکھا سکتا۔ آدھا کام تو آج ہی ہو گیا۔ کچھ دن صبر سے کام لے پھر شادو بھی آزاد ہو جائے گی شاہ جی کی قید سے۔"

"ابھی تو ہاشمی صاحب کی قید میں ہے وہ" میں نے کہا۔

رئیس ہنس پڑا "مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ اتنے آرام سے ہے وہ اور محفوظ بھی ہے۔ عدالت کے حکم پر اسے اجازت مل جائے گی اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کی تو سارا جھگڑا ہی ختم۔ تیری ضمانت قبل از گرفتاری بھی ہو جائے گی اور یہ کیس بھی ختم ہو جائیں گے پھر کسی کا ڈر نہیں ہو گا۔ سینہ تان کے پھریں گے اسی شہر میں۔"

رئیس کی باتوں نے مجھے تصورات کی دنیا میں پہنچا دیا۔

"ہاں۔ ہم شادی کر لیں گے اور اپنے گھر میں رہیں گے۔ ہم مل کے کوئی کام کریں گے' میں اور تو۔"

"مگر مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔ ایک ہی کام کیا ہے اب تک۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا" وہ مایوسی اور شرمندگی سے بولا۔

"کام میں نے بھی کوئی نہیں کیا مگر جو کرنا چاہئے اس کے لیے کام بہت ہیں یار۔ ہم بزنس کریں گے" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "سالے کنجی چلی۔ بزنس ہوتا ہے پیسے سے اور اپنے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "دو ہاتھ سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اس دنیا میں لاکھوں لوگ ہیں ایسے جو خالی ہاتھوں سے کام شروع کرتے ہیں۔ بس ایک چیز ہوتی ہے ان کے پاس جو سب کے پاس نہیں ہوتی اور وہ ہوتی ہے یہاں" میں نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔

میری وہ رات بڑی بے چینی میں گزری۔ ابھی تک میں اپنے ماضی کے پُرعذاب زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ یادوں کے اور اندیشوں کے آسیب میرا تعاقب کر رہے تھے اور مستقبل صرف ایک حسین خواب تھا۔ میں گزر جانے والے وقت کی سب یادوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر وقت کی زنجیر نے مجھے باندھ رکھا تھا اور اسے محض خواہش سے کاٹ کر الگ کر دینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ صبر' صبر اے دلِ ناصبور۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر ہے۔ ارمانوں کے راکٹ نے پرواز شروع کر دی ہے۔ اس کی منزل افق کی آخری حد سے بھی آگے ہے۔ ایک بار اپنے مدار میں داخل ہو گیا تو عشق کا سیارہ سارے جہاں کو نگاہوں سے دور اور اوجھل آزادانہ گردش کرتا رہے گا۔

اس راحت خیز خیال کے بعد میں سو گیا۔ صبح میں اور رئیس بڑی تیاری سے ہاشمی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ یہ طے تھا کہ آج بھی انہوں نے ایک وکیل سے زیادہ مربّی اور چاچا خواہ مخواہ بننے کی' میرے اور شادو کے درمیان فاصلے کو بڑھانے اور اخلاقی حدود کو دیوارِ برلن بنانے کی کوشش کی تو میں شادو کا ہاتھ پکڑ کے کہوں گا کہ بس جناب' اس سے زیادہ عنایاتِ خسروانہ کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔ آپ وکیل ہیں اور ہم مؤکل۔ نہیں منظور تو ہم وکالت نامہ منسوخ کرتے ہیں۔ نقد فیس ادا کریں گے اور دوسرا وکیل کر لیں گے' خدا حافظ۔

رئیس کا مجھ سے اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں

ایک جذباتی غلطی کروں گا۔ موجودہ حالات میں شادو کو اسی گھر میں رہنا چاہیے اور مجھے ایک مخلص وکیل کی بے معاوضہ خدمات پر کسی پیشہ ور وکیل کو ترجیح دینے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ مؤکل کو بے وقوف بنا کے خوب لوٹتے ہیں اور کیس کو بلاوجہ لمبا کرتے ہیں۔ مگر مجھ پر صرف ایک ضد سوار تھی۔ میں بلا روک ٹوک جب چاہوں گا شادو سے ملوں گا ورنہ اسے ہاشمی صاحب کے گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔

ہاشمی صاحب کورٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ مجھے اور رئیس کو بڑی عزت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد شادو آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ دوسرے زیادہ نظر نواز اور بیش قیمت سوٹ میں تھی اور اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی تازگی تھی اور اس بدلے ہوئے روپ میں اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ جو پرفیوم اس نے لگائی تھی' وہ خود اپنی سحر آفرینی پر نازاں تھی۔

"میں ناشتا کر رہی تھی" اس نے کہا "تمہارے لیے چائے آ رہی ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحب۔ ہم چائے پی کے آئے ہیں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے۔ دماغ کیوں خراب ہو رہا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "رات کو فون کیا تھا میں نے؟"

"میں ذرا جلدی سو گئی تھی۔"

"ہاں۔ تمہارے اس چاچا خواہ مخواہ نے کہا کہ وہ سو رہی ہیں۔ طبیعت ناساز ہے۔ میں نے ملازم سے کہا کہ جگا دو تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ آرڈر نہیں ہے۔" میں نے غصّے سے کہا۔

"میرے سر میں درد تھا۔ پلیز آہستہ بات کرو۔" شادو نے گھبرا کے اندر دیکھا۔

میں نے کہا "شادو۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ کیوں پٹتے ہیں تم نے یہ کپڑے۔ تمہارے اپنے کپڑے تھے اور تمہیں ضرورت ہے تو مجھ سے کہو۔"

"جب یہاں ڈھیروں بے کار پڑے ہیں۔"

"اس سے کہو کہ انہیں آگ لگا دے۔ کسی غریب کو خیرات کر دے۔ کسی اور کی اُترن وہ تمہیں پہنا کے۔"

ہاشمی صاحب کے آنے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا "بھئی پہلے تو مجھے معذرت کرنی چاہیے تم سے۔ دراصل ایک اصول ہے میرا۔ میرے دوست رشتے دار' بہن بھائی تک یہ بات جانتے ہیں کہ رات آٹھ سے دس میں کیس تیار کرتا ہوں۔ اب یہ پیشہ ہی ایسا ہے کہ اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے محنت ضروری ہے۔"

اس کے لہجے کی متانت اور انکساری نے مجھے کچھ شرمندہ کر دیا۔ اتنا بڑا وکیل مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اور اپنے رویے کی وضاحت کر رہا تھا۔ میں نے کہا "دراصل مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد آپ کے ملازم نے مجھے شادو سے بھی بات نہیں کرنے دی۔"

ہاشمی صاحب کے بولنے سے پہلے شادو نے کہا "خود میں نے بھی اسے منع کر دیا تھا کہ مجھے نہ جگائے' طبیعت خراب تھی میری۔"

شادو نے جھوٹ بولا تھا۔ ہاشمی صاحب نے پُرتفکر نظروں سے دیکھا "ذرا دیکھو شاہدہ۔ چائے کیوں نہیں آئی ابھی تک؟"

میں نے بدمزگی سے کہا "رہنے دیں شاہدہ پروین۔ ہم یہاں چائے پینے نہیں آئے ہیں۔"

ہاشمی صاحب نے ہنس کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے معلوم ہے مگر ہمارے مہمان ہو تم۔ ہمارا دل رکھنے کے لیے ہی ایک کپ پی لو۔ بیٹھو' میں تمہیں بتاتا ہوں کل شاہ جی سے ملاقات میں کیا ہوا۔ ابھی دس پندرہ منٹ ہیں۔"

شادو مجھ سے نظر ملائے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ میرے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اس نے بلاوجہ ہاشمی صاحب کا دفاع کیا تھا اور انہیں بچانے کے لیے الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ وہ اس گھر میں یوں پھر رہی تھی جیسے یہاں برسوں سے رہتی ہو۔ وہ اس گھر کی مالکن بنی ہوئی تھی۔ کسی روک ٹوک اور جھجک کے بغیر وہ گھر کی ہر چیز استعمال کر رہی تھی۔ نوکروں پر حکم چلا رہی تھی اور مجھے اس کے اطوار و انداز ہی بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔

ملازم چائے کی ٹرالی لایا تو اس میں کھانے پینے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ رئیس نے بڑی مشکل سے کچھ تکلف کا مظاہرہ کیا اور پھر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے بڑے رکھ رکھاؤ اور احتیاط کے ساتھ چائے کا ایک کپ مجبوراً پینے کی اداکاری کی۔

ہاشمی صاحب نے بتایا کہ شاہ جی بڑے طمطراق سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ناصر کے خلاف اغوا' ڈکیتی اور اقدامِ قتل کی ایف آئی آر درج ہے۔ وہ کچھ مسلح غنڈوں کے ساتھ آیا تھا اور شادو کو زبردستی لے گیا۔ جاتے ہوئے انہوں نے الماری سے ساری نقدی اور زیور بھی اٹھا لیا اور اب ناصر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...ر نہیں۔ پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔ اسے سات سال کی ...یل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

ہاشمی صاحب نے سب خاموشی اور سکون کے ساتھ ...نا۔ ان کی دراز میں رکھے ہوئے ایک ٹیپ ریکارڈر نے شاہ ...ن کی ساری لاف زنی ریکارڈ کرلی تو انہوں نے اسے مطلع کیا ...کہ شاہدہ پروین ان کے گھر میں ہے اور ان کی حفاظتی تحویل ...میں ہے۔ شاہ جی بڑا جز بز ہوا اور اس نے کہا کہ وکیل ...صاحب' میری بیٹی مجھے واپس کردیں ورنہ آپ بھی پھنس ...جائیں گے۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ شاہدہ پروین کا عدالت ...میں بیان ہوگا۔ اس کے بعد عدالت کی مرضی ہے کہ اسے ...کس کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔ ویسے وہ عاقل و ...بالغ ہے اور جو کچھ اس نے بتایا ہے' اس سے شاہ جی کے ...بیان کردہ حقائق کی نفی ہوتی ہے۔ ہاشمی صاحب نے یہ بھی کہا ...کہ ناصر عظیم بھی ان کا موکل ہے اور اگر شاہدہ کے بیان سے ...ثابت ہوا کہ شاہ جی نے جھوٹی ایف آئی آر لکھوائی ہے تو پھر ...اسے لینے کے دینے پڑجائیں گے کیونکہ اس کیس میں سب ...سے اہم گواہی خود مغویہ کی سمجھی جائے گی۔ رفتہ رفتہ ہاشمی ...صاحب نے اس پر واضح کردیا کہ خود اس کی پوزیشن کتنی ...خراب ہے۔ ناصر کے علاوہ رئیس نام کا ایک لڑکا اس کے ...کاروباری معاملات کا راز فاش کرسکتا ہے۔ انہوں نے کسی ...لالہ ٹھیکے دار کی بیٹی کے معاملے کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ رفیق عرف ...ٹیکا کون تھا؟ اور اب کہاں ہے؟ ایک لڑکے عامر نے کسی فقیر ...کو مار ڈالا تھا۔ وہ کیا کیس تھا؟

یہ سب سن کے شاہ جی کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ پہلے جتنی ...گرفتوں دکھا رہا تھا' بعد میں اتنی ہی خوشامد کرنے لگا کہ وکیل ...صاحب کسی طرح یہ معاملہ ختم کرادو۔ ناصر اگر شادی کرنا ...چاہتا ہے شادو سے تو اسے منظور ہے۔ وہ ایف آئی آر واپس ...لے سکتا ہے ورنہ پولیس خود کیس دبادے گی۔

ہاشمی صاحب نے گفتگو کا یہ حصہ بھی ریکارڈ کیا اور کہا کہ ...فی الحال وہ کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ عدالت ...میں شاہدہ کا اور ناصر کا بیان ضرور ہوگا اور باقی سب عدالتی ...حکم پر منحصر ہے۔ ناصر کی ضمانت بھی ہوجائے گی۔ ان حالات ...میں شاہ جی کو خود اپنے لیے کوئی اچھا سا وکیل کرلینا چاہیے ...اور سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ صلح صفائی ...کے لیے وہ براہِ راست ناصر اور رئیس سے رجوع کرے۔

جب شاہ جی چلے گئے تو اس کی ریکارڈ شدہ گفتگو کے ٹیپ ...کی ایک کاپی ہاشمی صاحب کے ایک ماتحت نے اسے لفافے ...میں ڈال کے دی کہ اسے گھر جاکے سن لینا اور پھر صبح اچھی طرح غور کرنا کہ تم نے کس کے سامنے کیا کہا تھا۔ ظاہر ہے اس کیسٹ کو سن کے شاہ جی کی بدمعاشی کا بھوت ایسے اُتر گیا ہوگا جیسے لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

"تو بھئی دو کام ہوگئے۔ ایک تم دونوں کی بلوغت کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ دوسرے شاہ جی کو دن میں تارے دکھادیے گئے۔ اب دو کام اور ضروری ہیں۔ ایک تم دونوں کا بیان عدالت میں' یہ آج ہی ہوجائے گا انشاء اللہ۔ میں نے بات کرلی تھی لیکن ضمانت بھی ضروری ہے تمہاری اور تمہارے اس دوست کی۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ جی ایف آئی آر کو دبانے کے لیے پولیس سے تک مک کرلے گا۔ ہوسکتا ہے وہ عدالت میں ہی نہ آئے۔ میں صرف اندیشے کا اظہار کروں گا کہ میرے مؤکل یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بے سبب انتقامی کارروائی ممکن ہے اور شاہ جی انہیں کسی بھی ناکردہ جرم میں ملوث کرسکتا ہے۔ اگر کوئی ایف آئی آر پیش نہ کی گئی تو میرا خیال ہے کہ بہت معمولی رقم پر ضمانت قبل از گرفتاری ہوجائے گی۔ تم پچیس پچیس ہزار کی نقد ضمانت کا انتظام کرسکتے ہو؟"

رئیس کا منہ کھل گیا "یعنی پچاس ہزار..... وکیل صاحب۔"

میں نے اسے خاموش کردیا "آپ فکر نہ کریں' میں بندوبست کرلوں گا۔"

"اچھا۔ تو پھر تم آجانا۔ تقریباً بارہ بجے میرے پاس" انہوں نے کہا "نہیں' گیارہ بجے۔ عبوری ضمانت آج ہی کرانے کی کوشش کروں گا میں۔ ایک ہفتے کے لیے' اس کے بعد توثیق بھی ہوجائے گی۔ تم جاؤ رقم کا بندوبست کرو۔"

میں نے کہا "میں شادو کو ساتھ لے جاؤں؟"

ہاشمی صاحب کے ماتھے پر بل پڑگئے "تمہاری عقل کیا مخنوں میں ہے؟ میں اسے یہاں گھر پر اس لیے نہیں چھوڑ کے جارہا ہوں کہ شاہ جی پاگل پن میں یہاں آکے اسے زبردستی واپس لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ کورٹ میں میرے ساتھ رہے گی۔ تم خود ابھی خطرہ ساتھ لیے پھر رہے ہو۔ اسے کیوں خطرے میں گھسیٹتے ہو یا تم سمجھتے ہو کہ یہی ہوتی ہے محبت۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

وہ وکیل تھا اور اپنے دلائل سے سیاہ کو سفید ثابت کرنے پر قادر تھا لیکن میرا معاملہ جذبات کا تھا۔ لاجواب ہوکے میں قائل ضرور ہوگیا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے مگر خوش نہیں ہوا "بہت بہتر جناب۔ میں چینک سے ہوکے فوراً آتا ہوں۔"

آپ سے کہاں ملاقات ہوگی؟"

"بھئی وہیں بار روم میں آجانا۔" ہاشمی صاحب بولے "شاہدہ پروین چلے' دیر ہورہی ہے۔"

شادو نے بڑے اسٹائل سے کندھے پر کپڑوں سے میچ کرنے والا خوب صورت بیگ لٹکایا اور کھڑی ہوگئی۔ "دیر آپ خود کررہے ہیں باتوں میں۔"

میں نے اس کے رویے سے سخت حسد محسوس کیا "یہ بیگ بھی ہاشمی صاحب کی پہلی بیوی کا ہوگا۔ ایسے درجنوں سوٹ کے رنگ سے میچ کرنے والے قیمتی بیگ اور شوز ہوں گے۔ چوڑیاں ہوں گی اور گھڑیاں ہوں گی۔ ابھی تک بالکل نئے لگتے ہیں سب۔ آپ نے بہت سنبھال کے رکھا تھا اس کی چیزوں کو۔ بہت محبت ہوگی آپ کو اس سے یقیناً۔" میں نے کہا۔

ہاشمی صاحب کا رنگ خفت سے پھیکا پڑگیا "بس بھئی۔ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب دیکھیے نا' آپ جیسے اندازہ کرسکتے تھے کہ اچانک آپ کے گھر میں شاہدہ پروین نام کی کوئی لڑکی مہمان بن کے آئے گی اور یہ سب اس کے کام آئے گا جیسے یہ سب اسی کے لیے بنوایا گیا تھا۔ آپ کی پہلی بیوی قد' قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی ایسی ہی ہوگی۔ کتنے فٹ آئے ہیں شاہدہ پروین کو اس کے کپڑے۔ کیا اسے دیکھ کے آپ کے جذبات....."

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟" ہاشمی صاحب نے برہمی سے کہا۔

شادو کے چہرے کی لالی میں شرم یا ندامت سے زیادہ غصہ تھا "تم جاتے کیوں نہیں' فضول باتوں سے کیا فائدہ؟"

رئیس نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "چل یار۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ یہ تو ہوتا ہے ہاشمی صاحب۔ آپ کو بالکل ایسا لگتا ہوگا جیسے گھر میں شاہدہ پروین نہیں' آپ کی پہلی بیوی پھر رہی ہے۔ یہ احساس اور جذبات کی بات ہے۔ اس کی برباد آپ کے تصور میں ہوگی۔ اچھا شادو جی' میں چلتا ہوں۔"

ہاشمی صاحب نے ضرور سکون کا سانس لیا ہوگا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب آدمی جذبات کی تندروی پر قابو پانا سیکھ لیتا ہے۔ شاید اپنی فطرت میں بھی وہ سرد مزاج تھے اور کسی شدید ردِعمل کا اظہار ان کی عادت نہیں تھی۔ یہ پُرسکون' فراخ دلانہ اور بردبار رویہ ان کی شخصیت کے وقار کا ضامن تھا اور یقیناً ایک قابلِ تعریف خوش گوار تاثر مرتب کرتا تھا۔ وہ خوش لباس تھے' خوش اطوار تھے اور انہیں خوش شکل بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ ان کی عمر پینتالیس پچاس ہوگی مگر اچھی صحت اور رکھ رکھاؤ سے وہ چالیس کے لگتے تھے۔ ان کا نام بڑا تھا اور یہ نام انہوں نے اپنی ذہنی صلاحیت کی بنا پر کمایا تھا۔ وہ دولت مند بھی تھے اور مجموعی طور پر ایک کامیاب انسان پھر ان کی ازدواجی زندگی کیوں ناکام رہی۔ شاید وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت میں بیوی کے لیے وقت نہیں نکال پاتے ہوں گے۔ شاید ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوگی اور ان کے مزاجوں میں زمین' آسمان کا فرق ہوگا۔ شاید وہ کسی اور سے محبت کرتی ہوگی یا ہاشمی صاحب کا دل کسی اور کا ہوگا۔ شادی کے بعد ان کے درمیان کسی غلط فہمی کی خلیج بڑھتے بڑھتے کبھی ختم نہ ہونے والی دوری میں بدل گئی ہوگی۔ ایسے ان گنت امکانات تھے جو ایک حقیقت کو چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہ کے وہ دیکھا تھا جو باہر کسی کی نظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں ہیں جن کی زندگی کی ہر کامیابی قابلِ رشک حد تک مکمل اور بھرپور نظر آتی ہے مگر اندر کہیں ایک ناکامی کا دکھ' ایک حسرتِ ناتمام کی خلش اور ایک آرزو کی شکست کا آزار یوں چھپا رہتا ہے جیسے کسی قصرِ عالی شان کے باغ اور فوارے' سبزہ و گل اور سنگِ مرمر کے قالین پوش فرش کے نیچے زمین کی گہرائی میں کسی مقتول کا ڈھانچا پڑا ہو جس کا علم صاحبِ خانہ کے سوا کسی کو بھی نہ ہو۔

رئیس نے باہر آکے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں خاموشی سے سب سنتا رہا۔ میں خود بھی جانتا تھا کہ میرا رویہ غلط ہے۔ مجھے ہاشمی صاحب جیسے مہربان مددگار اور وسیع القلب شخص کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے مگر میں شادو کے بدلے ہوئے انداز کا قصور کرتا تھا تو میرے دل میں حسد کے کینے جذبات کی آگ بھڑکنے لگتی تھی اور احساسِ کمتری کا زہریلا سانپ مجھے اندر سے ڈستا تھا۔ مجھے ہاشمی صاحب کی نیت پر شک ہونے لگتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چار سال شادو سے دور رہ کے محبت کروں۔ اپنی تعلیم مکمل کروں اور زندگی میں عملی کامیابی کی بنیادیں استوار کروں۔ شادی کی کیا جلدی ہے۔ اگر محبت ہے تو محبت رہے گی۔ چار سال کی دوری اسے اور بڑھادے گی۔ جذبات کی آگ ہجر میں بھڑکتی ہے۔ اگر ایک چنگاری ہو تو شعلہ اور شعلہ ہو تو آتش فشاں ہوجاتی ہے۔

ان کی بات غلط نہیں تھی۔ بات کی حد تک' عملاً یہ ناممکن تھا۔ وہ چار سال کی بات کرتے تھے اور مجھے چار دن کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدائی نے بے ترتیب کردیا تھا۔ کھو کھلا کردیا تھا اور ادھورا کردیا تھا۔ مجھ پر ایک خوف قبضہ جمانے لگا تھا کہ یہی حالت رہی تو میرا ذہنی انتشار بڑھ کے دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگے گا۔ اپنے خیالوں پر میرا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ خیالات مجھے کنٹرول کررہے تھے اور میں کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شادو کے اور اپنے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں فیصلہ کرنے کے اختیار سے محروم ہوتا جارہا ہوں۔ یہ میرے لیے پریشانی کی بات تھی جس کو میں جان کا روگ نہیں بنا سکتا تھا۔

ہم بینک تک پیدل گئے۔ یہ دو میل کا فاصلہ ہوگا۔ آٹھ بجے ہاشمی صاحب کورٹ جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پیچھے شادو کے ساتھ بیٹھ جائیں' وہ ہمیں بینک کے سامنے ڈراپ کردیں گے مگر میں نے ان کی فرمائش قبول نہیں کی تھی۔ ہم اتنی جلدی بینک جاکے کیا کریں گے۔ بینک تو اپنے وقت پر نو بجے کھلے گا۔ ہم ان کی کوٹھی سے چند قدم اور ہی گئے تھے کہ ان کی چم چم کرتی کار بادِ صبا کے جھونکے کی طرح ہمارے پاس سے گزری۔ اس کے پیچھے پیٹرول کے دھوئیں کی بو نہیں آئی۔ وہی خوشبو فضا کو معطر کرگئی جو شادو نے اور شاید ہاشمی صاحب نے بھی اپنے لباس پر اسپرے کی تھی۔

میں نے رئیس سے کہا "تو نے دیکھا۔ وہ کیسے شادو کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ سؤر کا بچہ' پیچھے۔"

"اب پھر کیا ہوا۔" رئیس نے کہا "گاڑی اس کی ہے' وہ آگے بیٹھے یا پیچھے اور وہ پیچھے ہی بیٹھتا ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ خلافِ آداب ہے۔ پیچھے آدمی اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھتا ہے یا محبوبہ کے ساتھ۔ جب کوئی اجنبی خاتون ہو تو مرد یوں ساتھ نہیں بیٹھتے اور شادو کو دیکھ' لوکی پتی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ایک بار۔ ایک نظر بھی نہیں ڈالی ہم پر جیسے ہم سڑک پر جوتیاں چٹخانے والے سیکڑوں لوگوں میں سے ہیں۔ ان کو وہ جانتی ہی نہیں۔"

"یار تو کیوں اتنا سینٹی مینٹل ہورہا ہے۔"

میں اداس بھی اور مشتعل تھا کہ میں نے اس کی تصحیح نہیں کی "کیا میرا شادو کے لیے سینٹی مینٹل SENTIMENTAL ہونا غلط ہے۔ اور وہ ہے کہ میرے جذبات کی پروا ہی نہیں اسے۔ وہ سمجھتی کیوں نہیں۔"

"دیکھو یار۔ اس وقت تو خود نہیں سمجھ رہا ہے کوئی بات۔ ذرا سوچ کہ شادو نے کس کی خاطر یہ جان کی بازی لگائی تھی۔ ابے ناشکرے۔ ایک ہم... اور ہم جیسے نہ جانے کتنے جو اس کی ایک پیار کی نظر کے لیے ترستے رہے اور تجھے اس نے پہلے دن ہی نظر سے اٹھا کے دل میں بٹھالیا۔ کیا نہیں کیا اس نے تیری خاطر۔ کتنا خطرہ مول لے کر وہ تجھ سے ملتی تھی۔ کیسے تجھے پولیس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس نے دس ہزاریوں پھینک دیے تھے جیسے کوئی دس پیسے کا سکہ فقیر کی طرف پھینکتا ہے اور فقیر اسے اٹھاتا تک نہیں۔"

میں نے کچھ شرمندہ ہوکے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے یار۔"

"خاک ٹھیک ہے۔ اس لڑکی کا باپ قصائی سے زیادہ پتھر دل ہے۔ چھری پھیر دیتا اس پر۔ تیرا کیا جاتا اور یہ جانتے ہوئے بھی اس نے تیری جان بچائی۔ وہ لائٹ آف نہ کرتی تو بیٹا شاہ جی سے بچ کے نکل نہیں سکتا تھا تو۔ کتنی مار کھائی اس نے۔ مرتے مرتے بچی اور اس کے باوجود اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ آج تو شک کرتا ہے اس پر۔ ذرا ذرا سی بات پر بکواس کرتا ہے... جھانپڑ ماروں گا تیرے منہ پر۔ اگر تو نے پھر ایسی بات کی۔"

میں نے ہنس کے اس کا کندھا دبایا "استاد۔ ایک نہیں دو مارنا۔ ایسے کہ دماغ درست ہوجائے میرا۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا "بڑا چھوٹا دل ہے یار تیرا۔ پتا نہیں تو ساری زندگی شادو کے ساتھ کیسے گزارے گا۔ ابے ہم بھی تو تھے کہ سوتے جاگتے اس کے خواب دیکھتے تھے۔ فقیر تھے مگر اللہ سے مانگتے تھے بادشاہت سے بھی بڑی چیز۔ پاگل ہوجاتے تھے خوشی سے اگر کبھی وہ کوئی کام کہہ دیتی تھی۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کڑے رہتے تھے گھنٹوں۔ مگر تو دیکھ کہ اس نے ہمیں چھوڑ کے تجھے چن لیا تو قسم اللہ کی اپنے دل میں بال تک نہیں آیا۔ ہم تو جانتے تھے کہ اپنے نصیب میں پتھر ہیں۔ کوہِ نور ہیرا ایک ہے۔ سب کو نہیں مل سکتا۔ تیری خوش قسمتی کہ وہ تیرے حصے میں آیا۔ تو بھی یار تھا اپنا۔ تجھ سے حسد بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے آج خوش ہیں کیونکہ اپنی تو یہی خوشی ہے کہ شادو خوش رہے مگر اتنی خوشیاں پاکے بھی تو خوش نہیں ہے۔ یہ دیکھ کے مجھے افسوس بھی ہوتا ہے اور ڈر بھی لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے' کس بات سے؟"

"دیکھ پیارے' اپن سالے ان پڑھ ہیں۔ کوئی فلسفی نہیں۔ مگر ہماری ایک بات لکھ لے تو۔ زندگی بڑی ہے آزمائے کو۔ آدمی کسی چیز کی خواہش کرے مگر قدر نہ کرے تو وہ چیز اسے نہیں ملتی۔ مل جائے تو پاس نہیں رہتی' ولی کی بادشاہت ہو یا دنیا کی۔"

میں نے کہا "بات تو نے دو لاکھ روپے کی کہی مگر اس کا مجھ سے اور شادو سے کیا تعلق؟"

"تو قدر نہیں کرتا اس کی محبت کی۔" وہ آزردہ لہجے میں بولا "کیونکہ تجھے وہ دکھ اٹھائے بغیر مل گئی ہے۔ سب کچھ بنا مانگے ہی ملتا رہا ہے تجھے بیٹا۔ ابھی تک تو نے صرف پایا ہے' گنوایا کچھ نہیں ہے' ناشکرے۔"

"شاید اسی لیے میں زیادہ ڈرتا ہوں کہ کہیں شادو کو گنوا نہ دوں۔ یہ شک نہیں' ڈر ہے میرا۔"

"بعد میں کیا کرے گا تو۔ اسے برقع پہنائے گا؟ تالے میں بند کرکے رکھے گا۔ اسے کہیں کسی کے ساتھ آنے جانے نہیں دے گا۔ وہ کسی سے ہنس کے بات کرلے گی تو سمجھے گا کہ بس اب یہ گئی۔ ہنسی تو پھنسی۔ مسکرائی تو آئی۔ اس ڈر سے پہرے میں بٹھا کے رکھے گا؟ خود کو بھی دیکھ سالے کہ ادھر شادو سے محبت کررہا تھا اور ادھر اس ڈاکٹرنی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ ہیرو کی اولاد۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے یار۔ میں نے اس پر ڈورے نہیں ڈالے تھے۔"

"بکواس مت کر میرے سامنے۔ تو اسے بے وقوف بناتا تھا۔ اپنی عیاشی کے لیے' اس کی تعریف کرتا تھا۔"

"وہ سب جھوٹ تھا۔"

"کون سی عورت ہے جو اپنے حسن کی تعریف کو جھوٹ سمجھے؟ اور انجام کیا ہوا تیرے جھوٹ کا؟ کیا تجھے پتا نہیں تھا کہ ایک دن یہی ہوگا؟ بالکل معلوم تھا تجھے۔ ایک بار تو بھاگ آیا تھا تو پھر لوٹ کے کیوں گیا تھا؟ قسم اللہ کی' تو مجرم ہے شادو کا۔ بڑا گناہ کیا ہے تو نے محبت کے نام پر یہ داغ لگا کے۔"

میں نے کہا "میں مجبور ہوگیا تھا یار۔ تو جانتا ہے۔"

"ابے چھوڑ۔ مجبوری کا بہانہ کبھی نہ بنا' اگر تو اس کے لیے حالات پیدا نہ کرتا۔ خیر ہم سے مت ڈر۔ قسم اللہ کی کوئی ہمیں ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال دے پھر بھی تیرا یہ راز کسی کو نہیں بتا سکتے۔ شادو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس تو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ۔ ویسے تو سب ٹھیک ہوگیا ہے مگر چند دن میں ہاشمی صاحب قانونی کارروائی پوری کرلیں گے۔ اس کے بعد جو تیری اور شادو کی مرضی۔"

ایک بے وقوف اور کمزور ارادے والے' لاابالی سے نوجوان نے جو کسی کمپلیکس کے بغیر اپنی ہر کوتاہی اور خامی کو تسلیم کرتا تھا' خود کو پیدائشی بدبخت' بدصورت اور بداطوار مانتا تھا۔ جس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین نہیں تھا اور جس کو اپنی عقل یا ذہانت کے I.Q کا علم تک نہیں تھا۔ اس وقت مجھ پر اپنی نیک نیتی' خلوص اور عملیت پسندی اور فراخ دلی کے مظاہرے سے ایک نفسیاتی برتری حاصل کرلی۔ میں نے خود کو اس کے مقابلے میں بہت گھٹیا' کم ظرف اور کم قیمت محسوس کیا۔

بینک کھلنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے' اب ہم اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ محض وقت گزارنے کے لیے ہم ایک نزدیکی ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ چائے ہم نے کچھ دیر پہلے پی تھی مگر وہاں بیٹھنے کے لیے کم سے کم چائے پینا ضروری تھا۔ میں نے اپنی چیک بک نکالی اور پچاس ہزار کا چیک کاٹ کے اپنے دستخط کیے تو رئیس دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"ناصر۔ تو میرے لیے ضمانت کی رقم کیوں دے رہا ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں پھکڑ ہوں۔" رئیس بولا "تیرا یہ قرض نہیں چکا سکتا۔"

"یہ قرض نہیں ہے" میں نے کہا۔

"پھر کیا ہے؟ احسان ہے تو زیادہ مشکل ہے۔ پچیس ہزار تو شاید زندگی میں کبھی ادا کردوں' احسان کا قرض کیسے اتاروں گا؟"

"مجھ پر احسان کرکے" میں نے کہا "اور احسان یہ ہوگا آپ کاکہ اپنی بکواس بند کریں۔ ہمارا جو کچھ ہے ایک دوسرے کا ہے۔ سانجھا ہے۔ دکھ بھی اور سکھ بھی پھر پیسہ کیا چیز ہے جو ہاتھ کا میل کہلاتا ہے۔ ہوسکتا ہے جج صرف پانچ دس ہزار کی ضمانت لینے پر راضی ہوجائے۔"

"ایک بات کہوں ناصر' مجھے یہ سب ایسے ہی لگتا ہے' یہ عدالتی کارروائی اور ضمانت وغیرہ۔ اگر شاہ جی ارادہ کرلے تو سب کچھ کرا سکتا ہے۔ خود اسے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی ہم بڑے مزے سے یہاں بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ جائیں گے عدالت اور وہاں شاہ جی کی ایسی تیسی ہوجائے گی۔ شادو صاف کہہ دے گی کہ مجھے نہیں جانا اپنے باپ کے ساتھ۔ میں ناصر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں اپنی مرضی سے۔ جج کہے گا کہ چل پھٹ ادھر سے شاہ جی کی اولاد۔ ساری بدمعاشی نکال دوں گا اگر پھر پنگا لیا کسی سے اور شاہ جی مجبور ہوگا یہ ساری بے عزتی برداشت کرنے پر۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ تو ہے' وہ کیا کرسکتا ہے۔"

"اس غلط فہمی میں مت رہنا بیٹا۔ بے شک وہ عدالت میں نہیں بولے گا کبھی' وہ کسی کو بول دے گا کہ اس رئیس کو غائب کردو۔ اس طرح جیسے فیکا غائب ہوا تھا۔ آدمی کو زمین کھا جاتی ہے' آسمان نگل لیتا ہے۔ ابھی نہ سہی دو چار مہینے بعد سہی جب یہ بات پرانی ہوجائے۔ وہ تیری اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاد کی خود شادی کرادے اور تمہیں لے جائے اپنے ساتھ اور کسی دن سڑک پر تیرا حادثہ کرادے۔"

میں نے پریشان ہو کے کہا "ایسی باتوں سے میری حوصلہ شکنی نہیں ہو سکتی اور یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔"

رئیس ہنسا "شاہ جی کے لیے سب آسان ہے۔ فرض کر آج ہی میں اور تو عدالت سے بڑے سکندر اعظم بن کر باہر آئیں۔ شاہ جی اور ہاشمی صاحب اور شاد سب ایک ساتھ ہوں اور وہیں کوئی گولی مار دے تجھے یا مجھے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے عدالت میں۔ کیا ہوگا اس کے بعد؟ تفتیش۔۔۔ کیا ملے گا تفتیش سے یا شاہ جی کے خلاف مقدمہ درج کرانے سے؟ کچھ نہیں بیٹا' جو گیا سو گیا۔۔۔ اور عدالت کی بات چھوڑ۔ ابھی آجائے کوئی یہاں۔ باہر نہ جانے کتنے فقیر پھر رہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ چکے ہوں گے۔ شاہ جی کو بتا چکے ہوں گے کہ مجرم یہاں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ہمارے باہر نکلتے ہی کوئی ہم پر فائرنگ کر کے فرار ہو جائے۔ شاہ جی اس وقت بیٹھا ہو کسی ایس پی یا مجسٹریٹ کے پاس پھر کیسی عدالت اور کیسی ضمانت؟"

میں اس کی بات کو غیر سنجیدگی سے نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ "ٹھیک کہتا ہے تو۔ عدالتی حکم کا ایک کاغذی پروانہ' ضمانت قبل از گرفتاری' سب دل کی تسلی کی باتیں ہیں۔ قانون شریف آدمی کو روک سکتا ہے جو قانون کا احترام کرتا ہو۔"

"اور جنگل کا قانون ہو تو ہاتھ میں ہونی چاہیے بندوق۔"

میں نے کہا "وہ میرے پاس ہے۔"

"بس یہی ہے تیری اور میری حفاظت کی ضامن۔ جتنا ڈر ہمیں شاہ جی کا ہے' اتنا ہی اسے بھی ہونا چاہیے ہمارا۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ اگر ہم محفوظ نہیں رہے تو محفوظ وہ بھی نہیں ہے۔ قانون کو وہ رکھتا ہے جوتے کی نوک پر اور سے بڑا مان ہے اپنے بدمعاشوں کی طاقت پر۔ ابھی وہ ڈر گیا ہے اس دھمکی سے کہ ایک تو جھٹکا دیا ہے اس کی بیٹی نے' منہ سیاہی مل دی ہے اس کے۔ دوسرا ڈر اسے یہ ہے کہ عدالت میں اس کے کالے کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ س کے جتے جمائے کردار کو اخبار والوں کا دو بلا چوپٹ نہ کردے۔ اس کی کوشش ہوگی کہ ایک وقت میں ایک ہی سئلے کا سامنا ہو۔ شاد کے بیان سے بے عزتی ہوگی۔ فی الحال برداشت کرو۔ ورنہ عزت کے ساتھ کاروبار بھی گیا۔ اور حالات ہر طرف سے بے قابو ہوں تو پھر کچھ بھی اپنے بس میں نہیں رہتا۔ سلام کرنے والے ہاتھ ہی اس کو پتھر مارنے کے لیے اٹھنے لگیں گے۔ جو اس کا سارا ہیں وہی اسے دھکیل کر پھانسی کے تختے تک پہنچا دیں گے اس لیے ابھی وہ کچھ نہیں کرے گا یا تو آنکھوں میں آنسو بھر کے بیٹی سے کہے گا کہ گھر چلو' میں خود ناصر کی شادی تمہارے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کروں گا۔ میں عدالت کو اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں۔"

"میں اس چکر میں نہیں آنے والا" میں نے کہا۔

"شاد کب مانے گی۔ چنانچہ وہ عدالت کے حکم پر خاموشی سے سر جھکا کے لوٹ جائے گا۔ پھر وہ انتظار کرے گا کہ شور شرابا ختم ہو۔ یہ معاملات ٹھنڈے پڑ جائیں اور بات اتنی پرانی ہو جائے کہ کسی کے ذہن میں نہ رہے پھر وہ زخمی سانپ کی طرح پھن پھیلا کے کھڑا ہو جائے گا۔"

"تو بہت دور کی سوچ رہا ہے۔"

"ابے نہیں۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ہمارے پاس بھی یہی وقت ہے مقابلے کی تیاری کے لیے۔ جب سانپ پھن اٹھائے تو ہم اتنے طاقتور ہوں کہ اس کا پھن کچل دیں۔"

"تو کیا سوچ رہا ہے' میں سمجھا نہیں۔"

"میں شاہ جی کے مقابلے پر آنے کے لیے اتنی ہی طاقت حاصل کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ میں اس کے مخالفوں کو اور دشمنوں کو جانتا ہوں۔ میں انہیں ساتھ ملا کے شاہ جی کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اسے اپنے گروہ کی طاقت پر گھمنڈ ہے تو میرا بھی گروہ ہے۔"

"تو بدمعاش بننا چاہتا ہے گروہ بنا کے۔"

"ہاں یار۔ یہ سالی دنیا شریفوں کی نہیں رہی۔ بدمعاشی کا راج ہے یہاں سے وہاں تک۔ تو کیا حرج ہے اگر ہم بھی بدمعاش بن جائیں۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا یا بھاگ۔ جائیں یا مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ بھاگنے والے کو کوئی بھاگنے بھی نہیں دیتا۔ دنیا اتنی چھوٹی جگہ ہو گئی ہے کہ کوئی بھاگ کے امریکا چلا جائے تو ایک دن پورا ہونے سے پہلے موت کے فرشتے وہاں پہنچ سکتے ہیں اس لیے مقابلہ اور صرف مقابلہ کر کے جینے کا حق اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔"

رئیس کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا جس کی نظر بڑی دور تک اور بڑی گہرائی میں دیکھ رہی تھی جو میری نظر سے اوجھل تھا۔ اس کے تجربے اور شعور کی پختگی کا یہ انداز میرے لیے نیا تھا اور اس کی ظاہری شخصیت کے تاثر سے بالکل مختلف۔

میں نے کہا "رئیس۔ کیوں سوچتا ہے تو ایسی باتیں۔ چند دن بعد میں میٹرک کا امتحان دوں گا۔ اس سال نہ سہی' آئندہ سال تو بھی میٹرک پاس کر سکتا ہے۔ میں پڑھا سکتا ہوں تجھے۔ شاد پڑھا سکتی ہے۔ وہ خود بی اے' ایم اے کرنا چاہتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "کیا ہوگا بی اے' ایم اے کرنے سے؟"

میں نے کہا "کیا تیرے دل میں بڑا آدمی بننے کی خواہش نہیں ہے؟"

"بڑا آدمی۔ کون ہے بڑا آدمی؟ شاہ جی یا اسکول ٹیچر جسے دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی۔ کس کو زیادہ عزت ملتی ہے یہاں۔ پروفیسر کو یا ٹی وی ایکٹر کو۔ بس میں لٹک کر جانے والے ادیب' شاعر اور موسیقار کو یا مرسیڈیز سے اترنے والے کسی مزدور یونین کے لیڈر کو۔ چل بیٹا کھل گیا ہے۔"

بحث کے لیے وقت نہیں تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے پاس رئیس کو قائل کرنے والی دلیل بھی نہیں تھی۔ سب سے بڑی دلیل خود حقیقت ہوتی ہے جو اپنا وجود تسلیم کرا لیتی ہے۔ ہر کالج میں پرنسپل موجود ہے' پروفیسر ہیں۔ ہر یونیورسٹی میں وائس چانسلر صرف ایک ہوتا ہے۔ اسپتالوں میں ڈاکٹر بھرے پڑے ہیں۔ کوئی مرے گا یا ریٹائر ہوگا یا باہر چلا جائے گا تو سال بھر میں کتنے لوگ ان کی جگہ لیں گے؟ اور یہ جو سال بہ سال ایم اے' بی ایچ ڈی کرنے والوں' ڈاکٹروں اور انجینئروں کی فوج ڈگریاں لے کر نکل رہی ہے' یہ سب کہاں جائیں گے؟ یہ تو کلرکی بھی نہیں کر سکتے۔ پھر بڑے آدمی کیسے بنیں گے؟

چیک میں نے کاؤنٹر پر دیا تو کلرک نے مجھے غور سے دیکھا "یہ چیک کس نے دیا ہے آپ کو؟"

میں نے کہا "یہ میرا چیک ہے۔ اس پر میرے دستخط ہیں۔"

"آپ کو معلوم نہیں کہ اتنی بڑی رقم کے لیے ایک ہفتے کا نوٹس بھی ضروری ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"ایک ہفتے کا نوٹس؟۔۔۔ نہیں' مجھے معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو یہ رقم آج ہی چاہیے۔" میں نے کہا "ورنہ۔۔۔ بہت نقصان ہو جائے گا۔"

اس نے مجھے بینک منیجر کے پاس بلا لیا۔ ڈاکٹر مشہود نے اس سے مجھے متعارف کراتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ مجھے دبئی جانے کے لیے ضرورت پڑنے پر یہ رقم فراہم کر دی جائے۔ یہ بات مجھے اچانک یاد آ گئی۔

"تو آپ دبئی جا رہے ہیں" منیجر بولا "ویری گڈ۔ چلیں یہ نوٹس سائن کر دیں۔ تاریخ ایک ہفتے پہلے کی ڈال دیں۔"

اس نے ایک قانونی مسئلہ ایسے حل کر دیا تھا جیسے عام طور پر بینک منیجر کرتے ہیں۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے اٹھنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر مشہود اندر آ گئے اور مجھے رئیس کے ساتھ دیکھ کے کچھ خوش نہیں ہوئے۔

بینک منیجر نے ان سے ہاتھ ملایا "سر' آپ کے حکم کی تعمیل میں ان کو پچاس ہزار روپے دے دیے ہیں میں نے۔ بھئی مسٹر ناصر' آپ تشریف رکھئے' رقم یہیں آ جائے گی۔" اس نے گھنٹی بجا کے چیک چپراسی کو دے دیا۔

"تو تم جا رہے ہو دبئی۔ کب ہے تمہاری فلائٹ۔" ڈاکٹر مشہود نے کہا۔

میں نے کہا "یہی۔ دو چار دن میں۔ دراصل یہ سب وہی کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ایک فیملی کے بارے میں۔"

انہوں نے سر ہلایا "پاسپورٹ' ویزا سب انہوں نے کیا ہوگا۔ تم نے کہا تھا کہ سارے اخراجات بھی انہی کے ہوں گے۔"

"جی۔۔۔ لیکن کچھ رقم تو ہونی چاہیے اپنے پاس۔"

"بالکل ہونی چاہیے۔ لیکن وہاں روپے کام نہیں آئیں گے۔ تمہیں فارن کرنسی میں ٹریولر چیک لینے چاہئیں۔"

"مجھے یہ سب معلوم نہیں۔ وہی لوگ کر لیں گے سارا انتظام۔ میں تو رقم ان کے حوالے کر دوں گا" میں نے کہا۔

"ہوں۔۔۔!" وہ سوچ کے بولے "اتنا اعتبار ہے ان پر' آخر کون لوگ ہیں وہ۔ تم نے کچھ بتایا نہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ فون نمبر کیا ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟"

میں ان کے سوالات سے گھبرا جاتا تو میرے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا۔ میں نے اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا اور کہا "حاجی عبدالرزاق' دبئی میں ان کا بزنس ہے۔ کنسٹرکشن' امپورٹ ایکسپورٹ۔"

"امپورٹ ایکسپورٹ!" وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کے بولے۔

اسی وقت رقم آ گئی۔ یہ سو سو کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں تھیں۔ میں نے انہیں جلدی سے اٹھایا "اچھا سر۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "یہ تمہارا وہی دوست ہے نا جسے تم زخمی حالت میں لائے تھے۔ اس کے دشمن ہو رہے تھے اور لوگ۔۔۔"

"جی۔۔۔ وہ بات تو ختم ہو گئی" میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا یہ بھی جا رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں" اور کمرے سے نکل گیا۔ دوسری باتوں میں ڈاکٹر صاحب کو خیال نہیں آیا تھا کہ میں نے حاجی عبدالرزاق کا پتا اور ٹیلی فون نمبر تو بتایا ہی نہیں۔ ان کے لہجے سے پتا چلا تھا کہ انہیں میرے بیان کی صداقت پر شک ہے مگر وہ سمجھ دار آدمی تھے اور اس حد تک میرے معاملات میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتے تھے کہ میں ادب لحاظ بھول کے انہیں اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دوں اور بامعنی انداز میں واک آؤٹ کر جاؤں۔

رئیس نے کہا "یار' تو نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا' اس شریف آدمی سے۔"

"اور کیا کرتا۔ جان چھڑانے کے لیے کیا کہتا؟"

"یہ جھوٹ کھل جائے گا کسی دن۔ پھر ملاقات ہونے پر۔ ویسے بھی تو بینک آتا جاتا رہے گا۔ نیجر بتا دے گا۔"

"چل یار۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلے ہی معلوم ہے سب۔ تو دیکھ لینا کہ وہ پھر ملیں گے تو پوچھیں گے بھی نہیں کہ دینی کیوں نہیں گئے؟"

بینک سے باہر قدم رکھنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اپنے اکاؤنٹ کا بیلنس چیک کرلوں۔ میں نے دو بار دس دس ہزار روپے نکلوائے تھے اور آج پچاس ہزار۔ میرے حساب سے اب اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پندرہ ہزار بچے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے اسی کلرک سے پوچھا تو اس نے میرے سامنے ایک چھپا ہوا کاغذ رکھ دیا "یہاں دستخط کریں" وہ بولا پھر اس نے لیجر کھول کے چند صفحات الٹے اور اس کاغذ کے پیچھے میرے اکاؤنٹ کا بیلنس لکھ دیا۔

اس پر ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار دو سو چورانوے دیکھ کر میں نے کہا "پلیز ایک بار پھر چیک کرلیں۔ مجھے یہ غلط لگتا ہے۔"

کلرک نے منیجر کا میرے ساتھ رویہ دیکھ لیا تھا چنانچہ اس نے لیجر کھول کے کہا "آپ اندر آ کے دیکھ لیں۔ یہ آپ کا اوپننگ بیلنس پانچ تاریخ کو تھا۔ ایک لاکھ اسی ہزار نو سو۔ آپ نے نو تاریخ کو نکلوائے دس ہزار۔ پھر سترہ تاریخ کو دس ہزار۔ اسی دن آپ نے پچاس ہزار کیش جمع بھی کرایا۔ آج پچاس نکلوالیا تو بیلنس وہی ہوگیا۔ باقی کلوزنگ پر انٹرسٹ ہے۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "سترہ کو میں نے کیش جمع کرایا تھا پچاس ہزار؟"

"جی۔ آپ کی جگہ کوئی اور آیا ہوگا مگر اکاؤنٹ میں اسی دن یہ رقم کریڈٹ ہوئی ہے" اس نے لیجر بند کردیا۔

میں اور رئیس باہر آگئے "یہ اسی کی مہربانی ہے؟"

رئیس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنسا۔

میں نے سر ہلایا "اور کون ہو سکتا ہے۔"

"ابے تو رونی شکل کیوں بنالی ہے۔ خوش ہونا چاہیے تجھے سالے مگر تو ہے ناشکرا۔ ہمیں کوئی پچاس کا نوٹ غریب کے بغیر نہیں دیتا۔"

مجھے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے وہ گھر یاد آ رہا تھا جہاں مجھے عزت اور محبت پہلی بار ملی تھی اور بدلے میں اس گھر کے رہنے والوں کو میں نے کیا دیا تھا؟ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔ ان کا چوری کیا ہوا ریوالور میری جیب میں تھا۔ ان کی کمائی کے پچاس ہزار میرے اکاؤنٹ میں پہنچ گئے تھے۔ اگر انہیں سچ معلوم ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک ایسی باعزت اور خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے جس کی بنیادیں ہی جھوٹ پر استوار تھیں۔ وہ خود اپنے آپ سے جھوٹ بولتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی ایک جھوٹ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی جھوٹ بولتی ہے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں نے بھی جھوٹ بولا ہے۔ وہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیتے تھے۔ اسی انداز مفاہمت سے ان کی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے احساس محرومی کے دکھ کا انتقام غیر شعوری طور پر بھی کسی سے نہیں لیا تھا۔

میں بیگم صاحبہ سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ انہوں نے اس عنایت خسروانہ کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے مجھے اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت کے طور پر یہ رقم بتائے بغیر میرے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہوگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ انہوں نے محض مجھ پر ایک اور "مہربانی" کی تھی۔ میری ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اتنی رقم خاموشی سے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی تھی جتنی وہ کرا سکتی تھیں۔ اگر میں ان سے پوچھتا تو وہ صاف مکر جاتیں۔

ہم ساڑھے دس بجے ہی کورٹ پہنچ گئے۔ شاہد ہمیں ہال روم کے کیفے ٹیریا میں ملی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہاشمی صاحب کی ایک معاون وکیل خاتون بیٹھی تھی۔ سوکھی سڑی اور گہرے سانولے رنگ کی وہ لڑکی کالے کوٹ میں اور زیادہ بدصورت لگ رہی تھی مگر اس کا نام گلبدن تھا۔ شاہد اس سے ایسے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی جیسے وہ پرانی

سہیلیاں ہیں۔ شاہد نے صرف اس کا تعارف کافی سمجھا کہ یہ نئی وکیل ہیں۔ ابھی ٹریننگ لے رہی ہیں۔

چار افراد کی اس ٹیبل پر آمنے سامنے کی دو کرسیاں خالی تھیں۔ میں اور رئیس ان پر بیٹھ گئے تب بھی گلبدن موجود رہی۔ میں شاہد سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کی موجودگی میں نہیں۔ گھر کے باہر سڑک پر' بینک جاتے ہوئے اور بینک سے کورٹ آتے ہوئے میں لاشعوری طور پر کچھ خوف زدہ اور چوکنا تھا۔ ہر جگہ نظر آنے والے فقیر مجھے شاہ جی کے ایجنٹ لگتے تھے جو میری جاسوسی کر رہے تھے اور میرے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ موقع پاتے ہی میرا کام تمام کردیں۔ اچانک اپنے فقیرانہ لباس میں سے یا کشکول میں سے پستول نکال کے میرے سر میں ایک گولی ماریں اور فرار ہو کے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو جائیں کہ مائی باپ' آپ کا کام ہم نے کردیا ہے۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کرو۔ شاہ جی وس ہیں ہزار روپے انعام دے کے اس کو چلتا کریں کہ بس آگے کی تو فکر مت کر۔ میں سب سنبھال لوں گا۔

بیشتر فقیر صرف اللہ کے نام پر خیرات مانگ کے گزارا نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم میں بھی حسب توفیق اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق شریک ہونے سے نہیں چوکتے تھے۔ سٹہ اور جوا تو معمولی بات تھی۔ وہ چوری' ڈکیتی کی وارداتوں میں مخبری کرتے تھے اور خود بھی ملوث ہو جاتے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں کسی کی پاکٹ صاف کردینا یا کسی عورت کا پرس چھین لینا۔ گھروں اور دکانوں سے کوئی بھی چیز اٹھا لینا عام سی بات تھی۔ زیادہ محبت والے ہیروئن کی پڑیاں بیچتے تھے اور گلی محلوں میں جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے دلال تھے۔ ان سے بڑے مجرم بچوں اور لڑکیوں کے اغوا کرنے والے گروہ کے آلہ کار تھے۔ یہ مخلوق جسے لوگ رحم اور خیرات کا مستحق سمجھتے تھے۔ غریب جان کے اور ترس کھا کے ان کی مدد کرنا ایک نیکی مانتے تھے' ان کی اکثریت پیشہ ور گداگروں پر مشتمل تھی اور وہ ہر قسم کی معاشرتی خرابیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ فقیروں کے ڈیرے پر رہ کے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ گداگروں کی الگ مافیا ہے اور اس کا سرغنہ شاہ جی کتنا خطرناک آدمی ہے۔

چنانچہ میں کسی فقیر کے پاس سے گزرتا تھا تو محتاط ہو جاتا تھا کہ وہ اچانک حرکت میں آئے تو میں بھی اپنا دفاع کر سکوں۔ ریوالور کی طاقت پر مجھے بڑا بھروسا تھا حالانکہ بُرا وقت آنے پر مجھے اس کے استعمال کی صلاحیت بھی نہ ملتی۔ شاہ جی کے اشارے پر کوئی گاڑی مجھے کچلتی ہوئی گزر جاتی یا گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ مجھے کھینچ کے اندر ڈالتے اور شاہ جی کے سامنے پیش کردیتے۔ میرے خلاف پولیس میں ایک ایف آئی آر بھی درج تھی۔ پولیس ہر سڑک پر تھی اور عدالت میں تو ہر قدم پر نظر آ رہی تھی۔ یہ صرف میری تقدیر اور اللہ کی مہربانی تھی کہ میں محفوظ تھا۔

عدالت میں پیشی کے وقت شاہد کا ظاہری اطمینان بھی رخصت ہوگیا۔ جس کا مظاہرہ وہ بڑی بہادری سے مسکراتے ہوئے کر رہی تھی۔ اس کی خوف اور وحشت زدہ نگاہیں ہر طرف جانے پہچانے دشمنوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دشمن اس نے خود بنائے ہیں اور وہ کتنے سفاک ہیں۔ ہاشمی صاحب نے اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ عدالت میں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ ان کی ماتحت گلبدن نے بھی شاہد کو پوری تسلی دی تھی مگر اس کا وقتی اطمینان تھوڑی دیر بعد اندیشوں کے بھنور میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ اتنی ہی مضطرب اور پریشان میری سلامتی کے خیال سے بھی تھی اور اسے رئیس کی فکر بھی کم نہ تھی کیونکہ رئیس میرا ساتھی' مددگار اور محافظ بنا ہوا تھا۔

عدالت میں پیشی سے پہلے اس نے کئی بار مجھ سے پوچھا "ناصر۔ تمہیں یقین ہے کہ یہاں آس پاس کوئی نہیں ہے؟"

"آس پاس سیکڑوں لوگ ہیں۔"

"میرا مطلب تھا۔ کوئی دشمن جو تمہارے یا میرے پیچھے لگا ہوا ہو۔"

میں نے کہا "اس بھیڑ میں کیا پتا چلتا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی آشنا چہرے کی جھلک تک نہیں دیکھی۔"

"وہ بھیس بدل کے بھی تو آسکتے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا "فقیر تو پھرتے ہی بھیس بدل کے ہیں۔ اگر تمہاری مراد اپنے والد صاحب قبلہ سے ہے تو ان سے کچھ بعید نہیں۔"

"شاہ جی مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

"کیا مجھے چھوڑے گا۔ اصل مجرم تو میں ہوں جس نے ساری خرابی تمہیں ورغلا کے پیدا کی۔ تم پہلے صرف اس کی بیٹی تھیں' میرے آنے سے پہلے۔"

"یہ غلط ہے۔ نہ میں اس کی بیٹی ہوں اور نہ مجھے تم نے ورغلایا۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ورغلانے والی تم ہو۔ کہہ دینا یہ بات اپنے باپ سے بھری عدالت میں اس کے منہ پر کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناصر بے گناہ ہے' معصوم ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "تم دونوں بچ جاؤ گے۔ مارا جائے گا صرف غریب رئیس۔ ایک بیٹی ہے' دوسرا بیٹی کا ساگ ہے۔"

ہاشمی صاحب بڑی عجلت میں آئے "چلو بھئی' وقت تو ہو گیا تھا مگر میں نے دس منٹ کی مہلت مانگ لی۔ تم نے بندوبست کر لیا ہے؟"

میں نے انہیں نوٹوں کی گڈی دکھائی "اب آپ کا کام ہے سارا۔"

میں اور رئیس عدالت کی بینچ پر خاموش بیٹھے رہے۔ ہاشمی صاحب نے مختصراً بتایا کہ شاہدہ پروین ایک فقیر کی بیٹی ہے۔ فقیروں کے ڈیرے پر ہی پیدا ہوئی اور پل بڑھ کے جوان ہوئی۔ اس کو گداگری کے پیشے سے نفرت ہے اور اس نے اپنے طور پر کچھ تعلیم حاصل کی' میٹرک کا امتحان چوری چھپے دیا اور پاس کر لیا۔ میٹرک کی سند میں دی ہوئی تاریخ پیدائش کے مطابق اس کی عمر ابھی بیس سال ہونے والی ہے چنانچہ قانونی طور پر وہ عاقل و بالغ اور خود مختار ہے۔ اب وہ فقیروں کے ڈیرے پر نہیں رہنا چاہتی کیونکہ وہاں اسے زبردستی بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اب اس کے باپ نے طے کیا ہے کہ شاہدہ پروین کی شادی ایک مالدار فقیر سے کر دے جو عمر میں تین گنا ہے یعنی ساٹھ سال سے زائد۔ شاہدہ پروین کی درخواست ہے کہ اسے اپنی زندگی آزادانہ گزارنے کی اجازت دی جائے۔

اس کے بعد شاہدہ کا بیان ہوا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کتنی نروس اور گھبرائی ہوئی ہے۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے بھی وہی کہا جو ہاشمی صاحب نے عدالت کو بتایا تھا۔ اس نے ہاشمی صاحب سے ملاقات کے بارے میں بھی کہا کہ وہ فرشتہ ہیں جنہوں نے اس کی مدد کی۔ آئندہ وہ انہی کے ساتھ رہنا پسند کرے گی اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ وہ انہی کی طرح وکیل بنے گی۔

اس بیان میں میرا نام کہیں نہیں تھا۔ بیان ختم ہوا تو ہاشمی صاحب نے سول سرجن کا بلوغت کا سرٹیفکیٹ عدالت میں پیش کیا اور بتایا کہ انہیں شاہدہ کو اپنے گھر میں جگہ دے کر خوشی ہوگی۔ وہ اس کے سرپرست کی حیثیت سے اسے تعلیم کے مواقع فراہم کر سکتے ہیں اور اس کی حفاظت کی ذمے داری بھی قبول کر سکتے ہیں۔ اس کی تمام ضروریات کی کفالت ان پر کوئی بار نہیں کیونکہ خدا کے فضل سے ان کی آمدنی معقول ہے اور ان کے گھر میں شاہدہ کے رہنے سے کسی قسم کے مسائل پیدا نہیں ہو سکتے۔

"کیا آپ کی موکلہ کا باپ یا اس کا کوئی وکیل عدالت میں ہے؟" جج نے سوال کیا۔

ہاشمی صاحب نے عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر کہا "جی نہیں جناب والا!"

جج نے کہا "شاہدہ پروین کے خلاف کوئی رپورٹ پولیس میں درج ہے؟"

پی ایس آئی نے اٹھ کے کہا "نو سر۔"

اور اس وقت میں نے پیچھے سے شاہ جی کی رنگ غصیلی للکارتی آواز سنی "یہ جھوٹ ہے جناب والا!"

میرا دل سینے میں اچھلا اور ایک لمحے کے لیے جیسے ساکت ہو گیا پھر میں نے رئیس کے ساتھ سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ شاہ جی پچھلے دروازے سے آگے آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی گر کے بے ہوش ہو جائے گی۔ اس نے کٹہرے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

شاہ جی نے جج کے سامنے پہنچ کے مجھ پر' شادو اور ہاشمی صاحب پر ایک نظر ڈالی۔ ہاشمی صاحب پُرسکون انداز میں زیرِ لب مسکراتے رہے۔

"تم کون ہو؟" جج نے سوال کیا۔

"میں اس لڑکی کا باپ ہوں۔ عنایت شاہ" اس نے وہ کاغذ جج کی طرف بڑھا دیا "اور یہ ہے وہ رپورٹ جو میں نے پولیس میں درج کرائی تھی۔"

جج نے رپورٹ کی نقل لے لی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ عدالت میں اتنے لوگ کیوں بھرے ہوئے تھے۔ یہ کوئی مشہور کیس نہیں تھا جس کی پبلسٹی پریس میں ہوئی ہو۔ اس میں کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ باقی لوگ دوسرے مقدمات کے فریق ہوں گے مگر شاہ جی کے آتے ہی ان میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ ان میں سے کچھ نے عادت کے مطابق اسے سلام کیا اور میں نے "خیر ہووے شاہ جی بادشاہ دی" کی آوازیں بھی سنیں۔ وہ عام لوگوں کے شریفانہ حلیے میں شاہ جی کے چیلے چانٹے تھے جو اس کے حکم پر وہاں براجمان تھے۔

ہاشمی صاحب نے کہا "یہی ہے شاہ جی جناب والا!"

جج نے رپورٹ ہاشمی صاحب کی طرف بڑھا دی "دیکھیے اسے۔"

ہاشمی صاحب نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "کیا ہے اس میں میری موکلہ کے خلاف۔ یہ رپورٹ جھوٹ ہے یا سچ' اس پر میں فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کروں گا مگر اس کا شاہدہ پروین کی درخواست سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ناصر عظیم نے رئیس احمد اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شاہ جی کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ مسلح تھے اور شاہدہ پروین کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ نقد اور زیورات بھی لے گئے اور انہوں نے شاہ جی پر فائرنگ بھی کی لیکن شاہدہ پروین کے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں جناب والا۔ وہ اپنی مرضی سے اور خود اپنے پیروں پر چل کے عدالت آئی تھی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میری بیٹی جھوٹ بول رہی ہے۔ عدالت میں حلف اٹھا کے۔ اس کو ناصر نے ورغلایا اور اغوا کیا۔" شاہ جی نے چلاتے ہوئے میری طرف انگلی اٹھائی "یہ ہے وہ بدمعاش۔"

جج نے اسے سختی سے ڈانٹا اور خاموش ہو کے بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہاشمی صاحب نے ایف آئی آر کی نقل پی ایس آئی کو تھما دی۔ اس نے رپورٹ کو اول تا آخر غور سے پڑھا۔

جج نے کہا "آپ اس ایف آئی آر کے حوالے سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔"

پی ایس آئی نے کہا "مسماۃ شاہدہ پروین۔ کیا آپ عنایت شاہ کو جانتی ہیں؟"

شادو انتہائی خوف کے مرحلے سے گزر کے سنبھل گئی تھی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اچانک اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا اور وہ بالکل سیدھی کھڑی تھی۔

"جی سر۔ یہی میرے والد شاہ جی ہیں۔ فقیروں کے ٹھیکے دار۔"

"یہ آپ پر جبر کرتے تھے کہ دوسرے فقیروں کی طرح شہر میں گھوم پھر کے بھیک مانگو" ہاشمی صاحب نے پوچھا۔

"جی۔"

"کبھی نہیں' میں نے اس کو کبھی مجبور نہیں کیا" شاہ جی نے کہا۔

جج نے اسے آخری وارننگ دی کہ وہ خاموش بیٹھے ورنہ توہینِ عدالت پر اسے جیل بھیج دیا جائے گا۔

"تمہارے انکار پر یہ کیا کرتا تھا۔ تشدد؟"

"جی۔ یہ مجھے مارتا تھا۔" شادو نے کہا "یہ مجھے پڑھنے سے روکتا تھا۔ میں چھپ چھپ کے پڑھتی تھی پھر بھی یہ کتاب دیکھ لیتا تھا تو پھاڑ دیتا تھا یا جلا دیتا تھا۔ یہ کہتا تھا کہ فقیر کی بیٹی کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب یہ چاہتا تھا کہ میں ایک ساٹھ سال کے بوڑھے فقیر سے شادی کر لوں۔"

شاہ جی کرب میں اٹھا مگر پھر خود ہی بیٹھ گیا۔ میں صورت سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ ایف آئی آر میں اس نے دل کھول کر جھوٹ بولا تھا۔ جواب میں وہ عدالت کے سامنے جھوٹ سن رہا تھا اور اسے جھوٹا کہنے والی' اس کی وہ بیٹی تھی جسے وہ ساری دنیا کے سامنے بیٹی کہتا تھا۔

"کیا تم ناصر عظیم کو جانتی ہو؟" ہاشمی صاحب نے کہا۔

شاہدہ نے میری طرف دیکھا "جی۔ یہ بھی ایک فقیر ہے اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا رئیس احمد بھی۔ میں زیادہ تر فقیروں کو صورت سے پہچان سکتی ہوں۔ وہ عدالت میں بھی موجود ہیں۔ آپ کے پیچھے۔"

"کیا تم ان میں سے کچھ کے نام بتا سکتی ہو؟" ہاشمی صاحب بولے۔

شادو نے انگلی کے اشارے سے چند افراد کی نشاندہی کی۔ وہ بوکھلا کے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ تقریباً آدھا کمرا خالی ہو گیا۔

"تمہارے والد شاہ جی نے ناصر عظیم پر الزام لگایا ہے کہ وہ رئیس کے علاوہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ تمہیں گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گیا تھا' زبردستی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں خود وہاں سے آئی تھی۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "کیا ناصر عظیم کے خلاف نقد اور زیور لے جانے اور فائرنگ کرنے کا الزام بھی غلط ہے؟"

"ظاہر ہے۔ جب وہ وہاں آیا ہی نہیں تو رپورٹ کی ہر بات جھوٹ ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "جناب والا۔ شاہدہ پروین کے اس بیان کے بعد بھی کوئی الزام ہے تو وہ ناصر عظیم پر یا اس کے ساتھیوں پر۔ وہ بے گناہ ہیں یا قصوروار؟ یہ الگ معاملہ ہے۔ اگر بالفرض..... ایسا ہی ہوتا۔ کسی نے میری موکلہ کو اغوا کیا ہوتا گن پوائنٹ پر۔ تب بھی شاہدہ پروین کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا تھا۔ اس سے میری موکلہ کی آزادانہ زندگی گزارنے کا حق متاثر نہیں ہوتا۔ تاہم فیصلے سے قبل میں درخواست کروں گا کہ شاہ جی کو بولنے کا موقع دیا جائے۔ میں اس سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔"

شاہ جی کٹہرے میں آتے ہی پھٹ پڑا۔ اس نے کھل کے کہا کہ ناصر عظیم نے شادو کو ورغلایا۔ اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسا اور مجبور کیا کہ اس کے ساتھ فرار ہو جائے۔ وہ ناسمجھ لڑکی جذبات کی رو میں بہہ کے ایسا ہی کرتی مگر میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کو سمجھایا تو وہ مان گئی۔ میں نے ناصر سے اس کی شادی کے لیے پہلے ہی تیار تھا اور آج بھی ہوں۔ شادو کی شادی کسی ساٹھ سال کے بوڑھے فقیر سے کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر وہ بیٹی ہے میری اور کوئی باپ کتنا بھی بُرا کیوں نہ ہو' بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرتا۔ مجھے ایسی کون سی مجبوری تھی کہ میں بیٹی سے بھیک مانگنے کے لیے کہتا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی اسے۔ یہ ناصر عظیم ایک لاوارث یتیم لڑکا تھا جس کی زندگی یتیم خانے میں گزری۔ اس کا کوئی گھر نہیں' کوئی رشتے دار نہیں' آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اسے ہوس نے اندھا کردیا تھا۔ وہ بہت چالاک لڑکا ہے' ابھی اس کی کیا عمر ہے صرف سولہ سال۔"

ہاشمی صاحب نے اسے ٹوکا "ناصر بالغ ہے اور اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے۔"

ہاشمی صاحب کے ماتحت نے عدالت میں میرے شناختی کارڈ کی کاپی اور سول سرجن کا سرٹیفکیٹ پیش کیا۔

"اچھا ہوگا اٹھارہ سال کا۔" شاہ جی نے مجھے گھور کے کہا "پھر بھی میری بیٹی بائیس سال کی ہے۔ اس سے چار سال بڑی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ وہ میری ہی اولاد ہے۔ میرا جو کچھ ہے شاہدہ کا ہے۔ ناصر اپنے سے چار سال بڑی لڑکی سے صرف اس لیے شادی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی دولت پر قبضہ کرسکے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "تم خود کو دولت مند سمجھتے ہو؟"

"اس کنگلے کے مقابلے میں تو دولت مند ہی ہوں۔ دو کنال کی کوٹھی ہے میری۔ اس کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا تک نہیں۔"

"کتنی دولت ہے تمہارے پاس شاہ جی؟" ہاشمی صاحب نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "یہ دولت آئی کہاں سے؟"

شاہ جی نے کہا "بزنس ہے میرا۔"

"کیا بزنس کرتے ہو تم؟" ہاشمی صاحب بولے "کہاں ہے یہ بزنس؟"

"اس شہر میں' امپورٹ ایکسپورٹ کا۔"

"کیا امپورٹ کرتے ہو اور کیا ایکسپورٹ؟"

"آپ کو اس سے کیا؟" شاہ جی بولا "کیا یہاں میری آمدنی کی تحقیقات ہورہی ہے؟" شاہ جی نے کہا۔

"کاروباری لوگ تمہیں جانتے ہوں گے ضرور۔ کیا تم کسی کا نام بتاسکتے ہو جن سے تمہارے کاروباری مراسم ہیں۔"

"ضرورت پڑے گی تو بتادوں گا۔ یہاں کیس ہے میری بیٹی کے اغوا کا۔ مجھے اپنی بیٹی واپس چاہیے۔"

"تمہاری بیٹی نے عدالت میں کہا ہے کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا اور وہ تمہارے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتی۔"

"ہاں۔ وہ جانا چاہتی ہوگی اس کے ساتھ" شاہ جی نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"نہیں۔ وہ ناصر عظیم کے ساتھ بھی جانا نہیں چاہتی اور نہ اس نے یہ کہا ہے کہ وہ ناصر عظیم سے شادی کی خواہش مند ہے۔ آپ خود پوچھ سکتے ہیں اس سے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے وکیل بننا چاہتی ہے۔"

"ضرور بنے۔ میں پڑھاؤں گا اسے۔ میں وکیل بناؤں گا" شاہ جی بولا۔

"اس کو تم نے ابھی تک کسی کالج میں داخلہ نہیں دلایا' وکیل کیسے بناؤ گے۔ اسے میٹرک کیے دو سال ہوگئے۔ اس سال وہ انٹر کا امتحان دے سکتی تھی لیکن تم اس کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھے۔ خیر' چھوڑو یہ بات۔ تمہاری ماہانہ آمدنی کتنی ہے؟"

"جج صاحب۔ اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟" شاہ جی بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ سالانہ انکم ٹیکس کتنا دیتے ہو۔ تم نے ابھی کہا کہ تمہاری دو کنال کی کوٹھی ہے۔ گاڑی بھی ہے تمہارے پاس۔"

جج نے کہا "ہاشمی صاحب۔ غیر متعلقہ سوالوں کے لیے عدالت کے پاس وقت نہیں ہے۔"

"یس یور آنر۔" ہاشمی صاحب نے کہا "عنایت شاہ۔ کیا تم فقیروں کے ٹھیکے دار ہو؟ ان سے بھیک منگواتے ہو اور اپنا حصہ وصول کرتے ہو؟"

"یہ غلط ہے۔"

"مگر تمہارے دو کنال کے گھر میں فقیر بھرے رہتے ہیں۔"

"جج صاحب' میں اکیلا آدمی ہوں۔ صرف ایک بیٹی ہے میری۔ مکان کی نچلی منزل خالی پڑی رہتی ہے۔ وہاں کچھ فقیر سونے آجاتے ہیں۔"

"اور تمہارے دل میں غریب اور بے گھر لوگوں کا اتنا درد ہے کہ تم نے کوٹھی کو کرائے پر اٹھانے کے بجائے خدمتِ خلق کے لیے وقف کردیا ہے یا تم ان سے کچھ لیتے ہو؟"

شاہ جی نے کہا "وہ۔ کرایہ دیتے ہیں مجھے۔ ہر فقیر دو سو روپے دیتا ہے۔"

"اور کتنے فقیر سوتے ہیں وہاں۔" ہاشمی صاحب کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

"کبھی پچاس۔ کبھی سو۔" شاہ جی بولا۔

"یعنی تمہیں ہر مہینے دس سے بیس ہزار کی آمدنی ہوتی ہے۔ صرف اس آمدنی کو دیکھا جائے تو یہ ایک لاکھ بیس ہزار سے کم سے کم۔ اس پر تو انکم ٹیکس ہی نہیں و۔لتھ ٹیکس بھی لاگو ہوتا ہے۔ پراپرٹی ٹیکس۔"

اس موقع پر جج نے پھر شاہ جی سے کچھ کہا مگر وہ میں نے نہیں سنا۔ ہاشمی صاحب کی ماتحت وکیل گلبدن نے پیچھے سے رئیس کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا۔

رئیس نے میرے کان میں کہا "ابے یار۔ عدالت میں رقعہ بازی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ وکیل ہے تو کیا لڑکی ہے۔"

میں نے کہا "کھول کے دیکھ' کیا لکھا ہے؟"

"محبت کا اظہار کیا ہوگا پیارے۔ اس کی نظریں مجھے جس طرح دیکھ رہی تھیں' وہاں کیتلین میں۔" اس نے میرے کان میں کہا۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"یار توہین عدالت تو نہیں ہوگی نا؟ اگر یہ محبت نامہ۔"

جج نے ہمیں گھور کے دیکھا تو میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور رئیس سے رقعہ لے لیا۔ اس میں لکھا تھا۔ "آج ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لیے وقت نہیں رہا۔ خاموشی سے نکل جاؤ' فوراً۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور رقعہ رئیس کے سامنے کردیا۔ اس کی صورت پر مایوسی اور خفت سے بارہ بج گئے۔ اسی وقت گلبدن اٹھی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔ ایک بغلی دروازے کے پاس پہنچ کے اس نے پلٹ کر دیکھا اور رئیس کو اشارہ کیا۔

رئیس نے مجھے کہنی ماری "قسم اللہ کی۔ وہ بلا رہی ہے مجھے۔ کیسے سب کے سامنے اشارے کررہی ہے۔"

"تیرے عشق نے دیوانہ کردیا ہے اسے" میں نے کہا "چل اُٹھ۔"

گلبدن اب دروازے میں کھڑی تھی اور منتظر تھی کہ ہم اس کے پیچھے جائیں۔ ہمارے دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی وہ غائب ہوگئی۔ رئیس نے بے چینی سے کہا "ابے یار۔ تو کیوں آگیا ساتھ۔ دیکھ وہ چلی گئی۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "الو کے پٹھے۔ رقعہ پڑھ۔ ہاشمی صاحب نے کہا ہے کہ بھاگ جاؤ ورنہ پولیس پکڑلے گی۔"

رئیس نے کہا "عدالت میں کیسے پکڑے گی اور کیوں؟"

میں نے کہا "شاہ جی ایف آئی آر کی نقل لایا ہے تو پولیس کو بھی بلایا ہوگا۔"

وہ ایک کمرا تھا جس میں فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کا باہر کھلنے والا دروازہ بند تھا۔ گلبدن ادھر سے پھر نمودار ہوگئی۔

"سامنے مت جانا ورنہ پولیس پکڑلے گی" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "اس جھوٹی ایف آئی آر پر؟"

"جھوٹ سچ طے کرے گی دوسری عدالت۔ گرفتار ہوگئے تو مصیبت میں پڑجاؤ گے" وہ بولی۔

"پھر کیا ضمانت نہیں ہوگی؟" رئیس بولا۔

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "آخر اتنے بے وقوف کیوں ہو تم؟ ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست پھر بے معنی ہوجائے گی۔ شوق ہے حوالات میں رات گزارنے کا تو جاؤ سامنے سے۔ سینہ تان کے جاؤ۔"

رئیس نے سرہلایا "آپ سچ کہتی ہو۔ ایک نمبر کا بے وقوف ہوں میں۔ کیا حوالات بہت بُری جگہ ہوتی ہے؟"

"جا کے دیکھ لو۔ رات بھر میں اعتراف کرالیں گے تم سے کہ تم نے ہر جرم کیا تھا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا جی! بہت مارتے ہیں؟" رئیس معصوم بن کے بولا۔

"آپ مجھے نہیں بچاؤ گی؟ آپ اتنی اچھی ہو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ادھر سے نکل جاؤ اور غائب ہوجاؤ۔"

"غائب کیسے ہوجاؤں' میں کوئی جن بھوت ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ رئیس خواہ مخواہ گلبدن سے باتیں کرکے اپنی ٹھرک پوری کررہا ہے' میں نے کہا "مس گلبدن۔ یہ رقم آپ رکھ لیں۔ پورے پچاس ہزار ہیں۔ ہاشمی صاحب کو پہنچادیں۔ خدانخواستہ ہم پکڑے گئے تو پولیس سب رکھ لے گی رسید کے بغیر۔"

یہ بروقت احتیاط میرے کام آئی۔ ہم عقبی حصے میں طلوع ہوئے تو پولیس وہاں ہماری منتظر تھی۔ انہیں بے وقوف سمجھنا ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم سیدھے راستے سے جاتے تو شاید نکل جاتے۔ پولیس کو معلوم تھا کہ فرار ہونے کے لیے ہم کس طرف سے برآمد ہوں گے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم حوالات میں کچھ دوسرے ملزمانِ زیرِ تفتیش کے ساتھ بیٹھے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رئیس سخت مایوس تھا" سالی نے سمجھایا۔"

میں نے کہا "بہت مزہ آرہا تھا اس کی باتوں میں۔ اب پتا چل جائے گا بیٹا اپنی اوقات کا۔ وکیل ہے تو کیا' لڑکی ہے" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"بہت بھوک لگی ہے یار۔ سوچا تھا باہر نکلیں گے تو شاہد جی کی گاڑی ہوگی۔ کل کی طرح وکیل صاحب تو آفس چلے جائیں گے اور ہم لمحات سے کسی ہوٹل میں جا کے تندوری چرغہ اڑائیں گے۔ کل تو اکیلا عیش کرتا رہا' آج ہم بھی ٹھنڈی ٹھار گاڑی میں شاہد جی کے ساتھ۔"

میں نے بگڑ کے کہا "وہ شاہد کے باپ کی گاڑی نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب کی ہے۔ میں دوبارہ اس میں بیٹھوں تو مجھ پر لعنت۔"

"تیری ہاشمی صاحب نے آج ہی ضمانت کرادی ہوتی تو پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی ہم پر۔" رئیس کچھ دیر بعد بولا۔

"ہاں یار۔ اس نے بلاوجہ شاہ جی پر جرح میں وقت ضائع کیا۔"

رئیس نے کہا "بلاوجہ تو نہیں۔ اس کو جھوٹا ثابت کرنا بھی ضروری تھا۔ سالے کی شامت نے گھیرا تھا کہ عدالت میں آگیا۔"

"مجھے تو امید نہیں تھی مگر وہ جذباتی ہو کے اندر آگیا۔ باہر ہی رہتا اگر پولیس کے ساتھ آیا تھا۔ خود بھی پھنسا ہمیں پھنسا کے۔"

رئیس نے حوالات میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ ان میں سے دو سو رہے تھے۔ دو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ "تھانے دار کون ہے یہاں کا؟"

ایک غلیظ داڑھی والے نے اپنا جسم سہلاتے اور کراہتے ہوئے کہا "وہی ہے۔ بشیر چوہدری۔"

میرے کان کھڑے ہوئے "بشیر چوہدری۔ رئیس خان' یہ تو وہی ہے نا' وسیم کا سالا۔"

رئیس نے حوالات کے باہر کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا "سنتری بادشاہ' اپنے بشیر چوہدری صاحب ہیں؟"

اس نے رئیس کو گھور کے دیکھا "اپنے کا کیا مطلب ہے اوئے؟ وہ تیری ماں کے یار ہیں تو پھر تو اندر کیوں ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "تم سے جو پوچھا ہے' وہ بتاؤ۔"

"واہ اوئے ٹنڈے لاٹ دے پتر" وہ آنکھ بگولہ ہو گیا "بچو کل صبح دیکھیں کے تیری کتنی آواز نکلتی ہے اور کدھر سے نکلتی ہے۔"

پچاس ہزار کی رقم گلبدن کو دینے کے بعد بھی میرے پاس کچھ رقم تھی۔ عدالت سے گرفتاری کے وقت کسی نے یہ رقم نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور تھانے پہنچنے کے بعد شاید انہیں خیال نہیں آیا تھا یا وہ جلدی میں تھے کہ ہمیں حوالات میں دھکیل کر چلے گئے تھے۔ میں نے جیب میں سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور سنتری کو تھما دیا "اب بتاؤ' وہ موجود ہیں یا نہیں؟"

اس نے نوٹ جیب میں رکھ لیا "ہیں تو سہی' کیا کہنا ہے ان سے؟"

میں نے کہا "انہیں بتاؤ کہ مجھے وسیم کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

سنتری نے سر ہلایا اور چلا گیا۔ رئیس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "بس بیٹے۔ آج کا دن اپنا ہے۔ سالے شاہ جی کی نہیں چلے گی کوئی چال۔"

سنتری مسکراتا ہوا واپس آیا "تو جی' آپ کو ویسے ہی بلانے والے تھے وہ" اس نے تالے کو چابی سے کھولا اور ہمیں باہر نکال کے پھر بند کر دیا۔ باقی حوالاتی ہمیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

بشیر چوہدری اب ایس ایچ او بن گیا تھا اور اپنے کمرے میں بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں اے سی چل رہا تھا اور اس کے سامنے میز پر لنچ کے برتن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا "اچھا۔ تم ہو' پھر آگئے؟"

میں نے کہا "آج عدالت کا وقت ختم ہو گیا تھا ورنہ ہاشمی صاحب ہماری ضمانت قبل از گرفتاری کرا لیتے۔ خیر کل ضمانت ہو جائے گی۔"

"کیسے ہو جائے گی ضمانت۔ ہم مہمانوں کو اتنی جلدی نہیں جانے دیتے" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا "اچھی طرح خاطر مدارات کریں گے کچھ دن۔ تم خیر سے دوسری بار آئے ہو۔ اب تیسری بار بھی آؤ گے۔ آتے رہو گے انشاء اللہ۔"

میں نے عاجزی سے کہا "چوہدری صاحب۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پہلی بار میں کسی جرم میں نہیں پکڑا گیا تھا۔ آج بھی کوئی جرم نہیں کیا ہے میں نے۔"

"اچھا! تیری ماں یا بہن کو لے جائے اس طرح کوئی۔ جیسے تو لے گیا شاہ جی کی بچی کو' تو یہ جرم نہیں ہے؟ بڑا کارنامہ ہے جس پر انعام ملنا چاہیے تجھے؟ ویسے کے انعام بھی۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اس کی بچی نے باپ کے سامنے

عدالت میں کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔"

"ابھی نئی یاری ہو گی نا۔ ایسا ہی کہتی ہیں پہلے آہستہ کے ساتھ فرار ہونے والی۔ چار دن بعد نئی یاری کرتی ہیں کسی سے۔ جو ایک بار گھر سے نکل جائے اسے روز نئے یار مل جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب' وہ ایسی نہیں ہے۔"

اس نے دہاڑ کے کہا "مجھے اس کا بتا رہے ہیں۔ میرے سامنے زبان چلاتا ہے۔ کتنا مال ساتھ لائی تھی؟ کہاں ہے سارا مال؟"

میں نے کہا "وہ گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔"

اس نے سر ہلایا "پتا لگ جائے گا۔ سب معلوم ہو جائے گا صبح تک تیری تو لاش بھی بولے گی۔" عادت کے مطابق وہ درمیان میں گالیاں بھی فٹ کرتا جا رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کی ساری دلچسپی مال میں ہے۔ لڑکی برآمد ہو گئی اور اسے ہاشمی صاحب جیسے وکیل نے عدالت میں پیش کر دیا۔ اس کے بیان کے بعد اغوا کا معاملہ تو تفتیش کے قابل نہیں رہا مگر لیف آئی آر میں نقد اور زیورات کا ذکر بھی تھا۔ وہ برآمد کیے جا سکتے ہیں۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ اکیلے میں۔"

اس نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں "یہ گلبدن کون ہے؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب کی معاون وکیل ہے۔ کیا اس نے فون کیا تھا؟"

اس نے گلبدن کو چند فحش گالیاں دیں "بڑا رعب ڈال رہی تھی مجھ پر قانون کا۔ ایک رات میرے ساتھ رہے تھانے میں تو رات بھر میں اپنا قانون پڑھاؤں اور پھر پوچھوں کہ کون بڑا ہے' قانون یا۔۔۔"

صاف ظاہر تھا کہ گلبدن نے عدالتی فیصلے کے حوالے سے ہماری سفارش کی ہو گی کہ ہمارا کوئی جرم نہیں۔ لیف آئی آر جھوٹی ہے اور آج وقت نہیں رہا مگر کل ہماری ضمانت پر رہائی لازمی ہے۔ کسی تھانے دار کے لیے قانون کیا چیز ہے' وکیل کے دلائل چلتے ہیں عدالت میں۔ تھانے میں سفارش چلتی ہے یا پیسہ چلتا ہے ورنہ تھانے دار کا حکم چلتا ہے۔ ڈنڈا چلتا ہے اور تفتیش چلتی ہے۔ کل بڑی دور تھی۔ صبح تک ہم بہت سے ناکردہ جرائم کا اقرار کر سکتے تھے اور ہمارے خلاف ایک نہیں دس جرائم کی تفتیش شروع ہو سکتی تھی۔

میں نے دوسری بار کہا "چوہدری صاحب۔ میری عرض سن لیں۔"

اس نے کھانے کے برتن اٹھانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور خود تولیے سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر میں نے کہا "جناب عالی۔ نقد اور مال کی بات تو لیف آئی آر کا پیٹ بھرنے کے لیے لکھوائی گئی ہے مگر آپ حکم کرو تو مال کیا جان حاضر ہے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "مجھے سمجھ نہیں آئی کہ تو چیز کیا ہے؟ پہلی بار تجھے خود شاہ جی لے گیا تھا۔ یہ بھی ساتھ آیا تھا اس کے۔"

رئیس نے کہا "ہاں جی۔ دس ہزار میں ہی لایا تھا۔"

"اب تو نے شاہ جی سے پنگا لیا ہے تو معاملہ مشکل ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "کتنا مشکل ہے سر جی' کتنا مشکل ہے؟"

وہ خباثت سے مسکرایا۔ اس نے رئیس سے کہا "چل تو جا کے بیٹھ حوالات میں۔ کچھ کھانا پینا ہو تو سنتری کو بول دینا۔"

اس کے رویے میں تبدیلی میری فراخ دلانہ پیشکش سے آئی تھی۔ اور یہی وقت تھا جب میں اپنا وہ سرا پتا چل سکتا تھا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب' گستاخی معاف۔ آپ کہو گے چھوٹا منہ بڑی بات۔ معاملہ آپ کے گھر کا ہے مگر پہلی بار میں اسی لیے پکڑا گیا تھا کہ آپ سے شکایت کرنے والا آپ کا بہنوئی تھا۔ آپ نے میری نہیں سنی۔ اس کی مانی' اب تو آپ بھی سمجھ گئے ہیں کہ وہ کتنا حرامی تھا۔ وہ لالچی اور بے غیرت آدمی تھا۔ شاہی محلے کی ایک طوائف کی وجہ سے اس نے اتنی اچھی بیوی کو چھوڑ دیا۔"

"کیا بکواس کرتا ہے۔" چوہدری نے کہا مگر اب اس کے لہجے میں خون آشامی کی تھکن گرج نہیں تھی۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے جناب عالی کہ جو بات مجھے معلوم ہوئی ہے وہ آپ کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی بہن کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے اس نے۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات نہیں کی ہو گی مگر مجھے پتا ہے کہ وسیم کیسا شوہر تھا۔ بیوی نے تو اتنا ساتھ دیا اس کا کہ کوئی دوسری عورت کبھی نہ دیتی اور اس کا بدلہ کیا ملا اس شوہر کو مجازی خدا ماننے والی عورت کو۔ توبہ توبہ۔ چوہدری صاحب' کیسا شرمناک الزام لگایا تھا اس حرامی نے مجھ پر۔ بیوی نے صرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہر کی خاطر کہا کہ میں نے دست درازی کی تھی۔"

"چھوڑو وہ بات۔ مجھے سب پتا ہے۔ جھوٹ سچ کا۔ یہ ای محلے کی طوائف والی بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔"

"بیٹھ جا" وہ بولا "اس ۔۔۔ وسیم کی تو میں ۔۔۔ کر دیتا مگر جوری یہ ہے کہ میری اپنی بہن پاگل ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں رنے دیتی۔ اس امید پر گھر میں بیٹھی ہے کہ کسی دن وہ واپس لے جائے اسے۔"

میں نے کہا "ابھی تک طلاق نہیں دی ہے اس نے ری کو؟"

"یہی تو مجبوری ہے میری۔ طلاق ہو جاتی تو میں اس کے لڑے کر کے کتوں کے آگے نہ ڈال دیتا۔"

میں نے کہا "آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ وسیم نے اپنے بھائی کی بیوی اور بیٹے کے ساتھ۔۔۔ بڑا ظلم کیا تھا۔"

وہ خلا میں دیکھتا رہا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے ایک بیوی اپنے شوہر کی وجہ سے بور تھی اور آپ مجبور ہیں اپنی بہن کی وجہ سے۔ ورنہ اب رے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ آپ چاہیں تو وسیم کے خلاف ردوائی کر سکتے ہیں۔"

"کیا ثبوت ہیں تیرے پاس؟"

میں نے کہا "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ناجائز فائدہ ٹھا رہا ہوں آپ کی مہربانی کا۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔ اگر چائے مل جائے۔"

چوہدری بشیر نے ٹھٹی بجا کے اپنے خدمت گار کانسٹیبل کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ میرے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لائے۔ میری چال کامیاب رہی تھی۔ یہ اشارہ دینے کے بعد کہ میں اس بار اپنی آزادی کی دگنی قیمت میں ہزار ادا کر سکتا ہوں' میں مجرم نہیں رہا تھا۔ اس کی بہن کا مسئلہ چھیڑ کے میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی بہن کی وجہ سے دکھی تھا۔ تھانے دار ہونے کے باوجود وہ ایک بھائی بھی تھا۔ جیسے عام بھائی ہوتے ہیں جو بہنوں کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔

میں نے اسے بتایا کہ وسیم نے ایک طوائف کے چکر میں بیوی کو چھوڑا تھا۔ وہ طوائف اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وسیم نے ظاہر یہ کیا تھا کہ وہ بہت بڑا بزنس مین ہے اور دولت مند ہے۔ ڈیڑھ مہینے ساتھ رہ کے طوائف کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ تمام پیسہ وسیم نے اس پر لٹایا وہ ختم ہو گیا تو طوائف اس سے شادی کیے بغیر ہی شاہی محلے لوٹ گئی۔ لیکن وسیم نے اس کو شراب کے نشے میں بہت کچھ بتا دیا تھا جو وہ وسیم کے منہ پر کہنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی گفتگو کو خفیہ طریقے سے ٹیپ پر ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ طوائف بھی گواہ بن جائے گی اور ٹیپ کی موجودگی میں گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکے گی۔ میں نے چوہدری بشیر کو اس خط کے بارے میں بھی بتایا جو مجھے وسیم کے پڑوس میں رہنے والی ایک پاگل عورت نے دیا تھا اور جس میں اس نے وہ سب بڑی تفصیل سے لکھا تھا جو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس عورت کو جوان بیٹے کی موت کے صدمے نے مخبوط الحواس بنا دیا تھا اور وہ چشم دید گواہ ہونے کے باوجود عدالت میں پیش نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے مگر وہ خط موجود ہے اور وسیم کے خلاف تفتیش کی بنیاد بن سکتا ہے۔

بشیر چوہدری بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا اور اپنے مخصوص تھانے دار والے ذہن سے اس کیس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یقیناً اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ اس کی بہن کا گھر پھر آباد ہو جائے اور اس کا شوہر اسے واپس اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ اپنے بہنوئی کو قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیکھنے کا آرزومند نہیں تھا کیونکہ اس کی بہن کو اپنا سہاگ ہر حال میں عزیز تھا۔ وسیم کے جرائم میں اس کی بیوی برابر کی شریک رہی تھی۔ بشیر چوہدری قتل کے کیس میں کارروائی کرتا تو اس کی اپنی بہن پر بھی الزام آتا۔ وہ چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

شاہی محلے کی ایک طوائف سے وسیم کے تعلقات کا انکشاف اس کے لیے نیا تھا۔ شاید خود اس کی بہن بھی دوسری عورت کے نام پر رقابت کی آگ میں جلنا ہو جائے گی اور وسیم کے خلاف انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے بھائی کو اجازت دے گی کہ اب جو چاہو کرو۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ آپ لاش کا ڈھانچا برآمد کر سکتے ہو۔ ثبوت شہادت سب ہو تو وسیم کو پھانسی چڑھا سکتے ہو۔"

وہ بگڑ گیا "اوئے پاگل دے پتر۔ کس کو پھانسی چڑھانے کی بات کر رہا ہے۔ میری بہن کا شوہر ہے وہ۔ عورت ذات بے وقوف' آج روتی ہے مگر کہتی ہے کچھ مت کرو۔ ایک دن وہ پچھتائے گا اور خود لینے آئے گا۔ کل اگر میں نے اس کے کہنے پر کچھ کیا تب بھی وہ روئے گی۔ اسے بیوہ کر کے اپنے گھر میں بٹھالوں ساری عمر رونے کے لیے۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ دراصل ۔۔۔ میری کوئی بہن

میں ہے نا اس لیے میں بھائی کے جذبات کو نہیں سمجھتا۔"

"لیکن تو نے کام کی بات بتائی ہے مجھے۔ میں بلاتا ہوں اس کو اور اس سے پوچھتا ہوں۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ وہ پولیس کے نام سے بھاگتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے سامنے صاف انکار کر دے' کچھ نہ بتائے۔"

اس نے مجھے ایک گالی دی "ہم جانتے ہیں منہ کھلوانا اور سچ نکالنا۔"

میں نے کہا "پھر بھی سر۔ جو کام آسانی سے ہو جائے' اس کے لیے مشکل طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا کام میں کروں گا۔"

"تو کیسے کرے گا؟"

میں نے کہا "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وسیم کے سامنے ہرہات دہرائے گی۔ جو بھی اس نے دیکھا یا سنا' اسے میں ٹیپ کر لوں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان کی ملاقات ایسی جگہ بھی کرا سکتا ہوں جہاں وسیم کی بیوی سب کچھ خود اپنے کانوں سے سنے۔ یہ شک نہ ہو کہ ٹیپ جعلی ہے یا وسیم کے خلاف اس عورت کا بیان جبراً لیا گیا ہے۔ پھر وسیم آپ کی مٹھی میں ہو گا' آپ اس پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ اپنی بیوی کو شرافت سے گھر لے جائے اور آئندہ بھی شرافت سے رہے ورنہ۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بشیر چوہدری کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "یار تو بندہ سیانا ہے۔ ذہین بھی ہے اور مجھے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تیرے ماں باپ کا پتا نہیں۔ یتیم خانے کا نہیں تو کسی اچھے عزت دار گھر کا لگتا ہے۔ پھر یہ بتا کہ شاہ جی کے چکر میں کیوں پڑ گیا تو؟"

"وہ خواہ مخواہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔"

"خواہ مخواہ نہیں ۔۔۔ اس نے مجھے پھر گالی دی "مجھے پتا ہے تو اس کی لڑکی کے چکر میں ۔۔۔ جھوٹ مت بول۔"

میں نے سر جھکا لیا "میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔"

وہ ہنسنے لگا "اوئے پاگل دے پتر۔ شادی کے لیے یہی ایک لڑکی رہ گئی ہے سارے جہان میں۔ ایسی کیا بات ہے اس میں آخر۔ تجھ سے عمر میں زیادہ ہے اور کیا ہے اس کا باپ' خود فقیر تھا۔ اب فقیروں کا ٹھیکے دار بنا ہوا ہے۔ کیا تو بھی یہی کام کرے گا؟ مجھے تو ٹھیک ٹھاک جوان لگتا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی مت کر۔ شادی کرے گا تو اس عمر میں تو ترقی نہیں کرے گا۔ شادی تو ایک نہ ایک دن سب کی ہو جاتی ہے۔ بہت لڑکیاں ملیں گی تجھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک' اچھے گھروں کی۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "آپ تھانے دار ہو کے ایک مجرم سے ایسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب!"

"اوئے جھلے۔ تھانے دار سارے بُرے نہیں ہوتے۔ برائی کے ساتھ اچھائی بھی کرتے ہیں مگر اسے کوئی شمار نہیں کرتا۔ رشوت سب دیکھتے ہیں' یہ نہیں دیکھتے کہ تنخواہ کتنی ملتی ہے۔ اس تنخواہ پر کوئی ہے جو چوروں' بدمعاشوں' ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلہ کرے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ ہر سال کتنے مارے جاتے ہیں' خیر چھوڑ۔ اس میں تیرا کیا قصور' لیکن تو شاہ جی جیسے لوگوں سے دور رہ۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ ہم بندے کو پہچانتے ہیں پتر کہ کون مجرم ہے یا مجرم بنے گا اور کس کی رگوں میں شریف خون ہے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "بڑی مہربانی ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔"

"پڑھا کتنا ہے تُو نے؟"

میں نے کہا "میٹرک کا امتحان دوں گا اس سال۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ کام جو چاہے کر مگر تعلیم بہت ضروری ہے۔ شادی سے زیادہ ضروری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تو ترقی کرے گا۔ یہ بات تجھے ہر تھانے دار نہیں سمجھائے گا۔ اگر تو اس طرح بار بار پکڑا گیا تو پھر ساری عمر تھانے کچہری اور جیل میں کٹ جائے گی۔ ان سب سے دور رہ۔ اوئے میری بات آ رہی ہے تیری سمجھ میں یا میں ایسے ہی بھونک رہا ہوں۔" اس نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔"

"یہ تو شاہی محلے کیوں گیا تھا؟" اسے اچانک یاد آیا۔ "اس کنجری سے اب تیری یاری ہے؟ جوانی کا زور ہے یا پیسے کا؟"

میں نے کہا "نہ میں پہلے کبھی گیا تھا' نہ آئندہ جاؤں گا۔ میری اپنی کوئی مرضی نہیں تھی' بس کسی نے زبردستی کی۔"

"کس نے۔۔۔ اسی پھکڑ نیس نے؟"

میں نے کہا "نہیں جناب۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔ آئندہ کے لیے تو۔۔۔ میں جان بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ خود مجھے بہت افسوس ہے اور بڑی شرم آئی مجھے بعد میں لیکن کسی برائی میں بعض اوقات اچھائی چھپی رہتی ہے۔ جس کا بندے کو علم نہیں ہوتا۔ مجھے نہ سہی آپ کو اس سے فائدہ ہو جائے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی بہن کو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ چیخ اٹھا کے پہلے
ی صاحب اندر آگئے۔ ان کے پیچھے شاہد تھی مگر اس نے
ے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ ہاشمی صاحب مسکرائے "ہاں
ئی' کیا ہو رہا ہے؟ ہم تو گئے تھے سیدھے حوالات کی طرف۔
یس نے بتایا کہ تم یہاں ہو۔"

بشیر چوہدری ہاتھ ملا کے پھر بیٹھ گیا تھا "ہاشمی صاحب'
پ کا پیغام نہیں' حکم تھا ہمارے لیے۔ دیکھ لیں آپ کا بندہ
را مہمان ہے۔"

ہاشمی صاحب ہنسے "صرف ایک کو مہمان جیسی عزت
دوسرا اس عنایت سے کیوں محروم ہے؟"

"جی بلا لیتے ہیں اسے بھی" بشیر چوہدری نے کہا "اور
پ کے لیے چائے منگاؤں یا ٹھنڈا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے آفس جانا ہے۔"

"سر جی' ہمارے آفس میں تشریف لائے ہو' اب تو
ے نہیں جا سکتے۔ آپ جیسے بڑے وکیل کہاں ملتے ہیں ہم
چھوٹے تھانے داروں سے۔"

تو جھے گئے میں ہاشمی صاحب نے صورتِ حال کی
اخت کر دی "شاہدہ پروین کو عدالت نے اجازت دے دی
اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اور اب یہ ہمارے
تھ ہمارے گھر میں رہیں گی۔ شاہ جی عدالت سے تو بھاگ
۔ اب وہ آرام سے بیٹھ جائے تو ہم بھی جھوٹی ایف آئی
ٹوانے پر اس کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے ورنہ
ت میں بیان دے کے وہ پھنس گیا ہے بُری طرح۔"

چوہدری بولا "سر' آپ کہیں تو میں سمجھاؤں اسے۔
ہے وہ سمجھ جائے گا۔"

"ہاں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ تم سے بھی
ے ہے اس کا تھوڑا بہت" ہاشمی صاحب نے محتاط رہتے
ئے کہا "میری طرف سے اس کو وارننگ دے دینا' اپنے
ے کام رکھے ورنہ سب چوپٹ ہو جائے گا اور خود اندر
ئے گا کم سے کم سات سال کے لیے۔ میں ان دونوں کو
ں ضمانت پر ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی
اض تو نہیں؟"

"جی' آپ شرمندہ کرتے ہو" وہ بولا "ایک چھوٹے
کام کے لیے آپ کو اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ تھانے
ی کیا ضرورت تھی' فون کر دیتے۔"

ہاشمی صاحب نے مسکرا کے شاہد کو دیکھا "بھئی یہ ہماری
صاحبہ نہیں ہیں۔ یہی ہیں شاہدہ پروین۔ شاہ جی کی
ب زادی۔"

شاہد کا چولہا لال ہو گیا۔ بشیر چوہدری کے بارے میں کہنا
مشکل ہے کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کہا تھا یا واقعی اسے
علم نہیں تھا کہ وہ شاہد ہے۔ اس کا ذکر دورانِ گفتگو کئی بار آیا
تھا مگر اس کا تعارف کسی نے نہیں کرایا تھا۔ بشیر چوہدری سمجھ
سکتا تھا کہ عدالت سے ہاشمی صاحب کے ساتھ آنے والی لڑکی
کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ہاشمی صاحب کے بارے میں لوگ
عام طور پر جانتے تھے کہ ان کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔
پولیس کا وکیلوں سے زیادہ رابطہ رہتا ہے۔ پھر بشیر چوہدری
نے کیسے شاہد کو ان کی بیگم صاحبہ فرض کر لیا۔ کچھ دیر پہلے
ہاشمی صاحب کی معاون وکیل گلبدن نے فون کیا تھا۔ اس کا
ذکر بھی ہوا تھا مگر شاہد نے کالا کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے مجھ پر اپنی اور شاہد کی عمر کا فرق واضح
کرنے کے لیے بشیر چوہدری نے شاہد کو ہاشمی صاحب کی بیگم
کہا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ مجھے اس بات پر بھی غصہ آیا کہ
تھانے دار کی نامعقول بات پر شاہد کو غصہ کیوں نہیں آیا۔
اس نے ہاشمی صاحب کے مسکرانے کا کیوں بُرا نہیں مانا۔ میں
نے دل ہی دل میں بشیر چوہدری کو گالیاں دیں۔ سؤر کا بچہ' کیا
شاہد کی اتنی عمر ہے کہ وہ دگنی عمر کے ہاشمی صاحب کی بیوی
سمجھی جائے؟

چلتے وقت اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا اور بولا "میری
بات یاد رکھنا ناصر خلیم' یہ نہیں کہ یہاں سے جاتے ہی گاڑی
پھر رانی لائن پکڑ لے۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ مسکرا کے کہا "نہیں جی۔ آپ کی
بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا "اس پر میرے گھر کا نمبر
ہے۔"

میں نے کارڈ رکھ لیا اور ہم باہر آ کے ہاشمی صاحب کی
گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہاشمی صاحب آگے تھے۔ شاہد پچھلے والی
سیٹ پر میرے اور رئیس کے درمیان تھی۔

"کیا بات سمجھا رہا تھا چوہدری؟" ہاشمی صاحب نے
گاڑی کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

میں نے انہیں ٹالنے کے لیے مختصر جواب دیا "کہہ رہا
تھا کہ شاہ جی جیسا لوگوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔"

وہ ہنسے "خود اپنے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ اتنی
محبت کہ تمہیں گھر کا فون نمبر اور کارڈ دے کر گویا دعوت دے
ڈالی۔ کہیں کوئی لڑکی تو نہیں ہے اس کی شادی کے قابل۔"

میں نے برہمی سے کہا "ہاشمی صاحب۔ یہ کیا فضول بات
ہے۔"

"بھئی تجربہ ہے ہمارا۔ تم جیسے نوجوان کو دیکھ کے ایسا
سوچنے لگتے ہیں لوگ۔ بے سبب کون مہربان ہوتا ہے کسی پر'
خصوصاً ایک گھاگ تھانے دار۔ خیر اب تم آزاد ہو خدا کے
فضل سے اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن میرا مشورہ ہے کہ
فی الحال کچھ محتاط رہنا ہی اچھا ہے۔ شاہ جی خود کچھ نہیں
کریں گے کا مگر وہ آدمی خطرناک ہے اور کینہ پرور۔"

شاہد نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور
کر دیا تھا۔ ہاشمی صاحب پیچھے دیکھے بغیر ہی بولتے جا رہے تھے۔
ان کا آفس آیا تو وہ اتر گئے۔

"ان سے کہو کہ آپ کا بہت بہت شکریہ" شاہد نے
میرے کان میں کہا۔

مجھے اپنی بداخلاقی پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ بلاشبہ یہ
ہاشمی صاحب کا ایک کارنامہ تھا کہ انہوں نے ہمیں مصائب و
مشکلات کی دلدل سے ایسے نکال لیا تھا جیسے مکھن سے بال۔
انہوں نے اپنی لیاقت سے زیادہ گڈول سے فائدہ اٹھایا تھا۔
اثر رسوخ استعمال کیا تھا۔ جو کام عام وکیل مہینوں میں نہ
کرپاتا' وہ ان کے چند دنوں میں نمٹ گیا تھا۔ وہ اسی کام کی
فیس ہزاروں یا لاکھوں میں لیتے تھے مگر ہم سے انہوں نے
ایک پیسہ نہیں لیا تھا۔ ہمارے ساتھ ان کا رویہ مؤکلوں جیسا
نہیں اپنوں جیسا تھا۔

میں نے نیچے اتر کے ان سے ہاتھ ملایا "میں آپ کا
شکریہ کیسے ادا کروں' یہ احسان ہے آپ کا۔"

وہ شفقت سے ہنسے "بھئی ایسی پُرتکلف گفتگو ہمیں کچھ
مصنوعی سی لگتی ہے۔"

رئیس نے ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ مصافحہ کیا۔
"ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں جناب۔ پھر بھی دل بڑا ہے ہمارا۔
قسم اللہ کی' آپ جان مانگو تو حاضر کر دیں گے۔ یہی کہہ سکتے
ہیں۔"

وہ اوپر جاتے جاتے رک گئے "بھئی شاہدہ پروین۔ وہ رقم
جو گلبدن نے ہمیں دی تھی۔ وہ آپ انہیں لوٹا دیں۔ اب
اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

شاہد نے سر ہلایا "جی میں دے دوں گی۔ میرے بیگ
میں ہے۔"

"آپ گھر جا کے آرام کریں" انہوں نے کہا "خدا
حافظ۔"

گاڑی پھر روانہ ہوئی تو شاہد نے بیگ کھولا اور مجھے
نوٹوں کے ڈھیر میں سے ایک پیکٹ نکال کے تھما دیا "یہ ہیں
تمہارے پچاس ہزار' گن لو۔"

میں نے کہا "تمہارا بیگ تو بھرا ہوا ہے اب بھی۔"

"ہاں۔ ہاشمی صاحب نے دیے تھے۔ ایک لاکھ ہیں
شاید۔"

"تمہیں کیوں دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"عدالت میں کسی نے انہیں فیس دی ہوگی۔ انہوں
نے مجھے پکڑا دیے کہ اپنے پاس رکھ لو' گھر لے جانا۔"

"پہلے وہ کیا کرتے تھے' جب تم نہیں تھیں؟" میں نے
تلخی سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔ تم ذرا ذرا سی بات کا بُرا کیوں مناتے
ہو۔ تم کو ذرا احساس نہیں کہ ہمارے لیے انہوں نے کیا
نہیں کیا؟"

"ہمارے لیے مت کہو' میرے لیے کہو۔" میں نے
بھنا کے کہا "تمہیں اپنے گھر میں رکھا' اپنی بیوی کے کپڑے
دیے پہننے کو۔ تمہاری ہر ضرورت کا ایسے خیال رکھا۔۔۔ جیسے
تم ہی گھر کی مالکن ہو۔ تم ان کی گاڑی میں گھومتی ہو۔ ان کا
ڈرائیور تمہاری مرضی کا پابند ہے۔ تم گھر کے ملازموں پر حکم
چلاتی ہو۔ اب تم ان کے روپے پیسے کا حساب بھی رکھنے لگی
ہو۔ یہ ڈیڑھ لاکھ رکھ لو۔ پچاس ہزار ناصر کو دے دینا۔ ایک
لاکھ اپنے پاس رکھنا۔ تھانے دار بشیر چوہدری نے تم کو بیگم
صاحبہ سمجھا تو قصور اس کا نہیں۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو
یہی ہوتا' اس کا امپریشن بھی شاہدہ پروین۔"

خلافِ توقع شاہد نے شدید ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔
وہ اچانک خاموش ہو گئی اور مجھے دکھی نظروں سے دیکھتی
رہی۔ احساسِ ندامت اور ذلت سے اس کے چہرے کا رنگ
اڑ گیا تھا۔ میں نے اسے جو کہا تھا انگریزی میں کہا تھا مگر میری
آواز بلند تھی۔ ڈرائیور نے سب سنا ہوگا۔ اگر وہ انگریزی
سمجھتا ہوگا تو سب سمجھ بھی گیا ہوگا مگر اس نے عادت کے
مطابق اپنا بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔

رئیس نے مجھے خاموش کرنے کی کوشش کی "اب بار۔
اس کا تو خیال کر۔" اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے
سرگوشی کی "جانا ہے تو گھر جا کے لڑنا۔"

شاہد نے آہستہ سے کہا "میں تمہاری مرضی سے اس گھر
میں تھی ناصر۔ اگر تم کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تو میں آج ہی
ہاشمی صاحب کا گھر چھوڑ دوں گی۔ میں کبھی وہیں آجاؤں گی
جہاں تم ہو۔ سب کے ساتھ رہوں گی۔ تمہارے لیے ہی اپنا
گھر چھوڑا تھا میں نے۔ بدنامی کی اور جان کی پروا کیے بغیر۔ تم
کو ناراض کر کے میں خوش رہ سکتی ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ
اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا سارا غصہ پانی کی طرح بہہ گیا "میں ناراض کیسے ہو سکتا ہوں تم سے شادو۔"

"نہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم جلے بھنے رہتے ہو۔ تم ہاشمی صاحب جیسے فرشتہ سیرت آدمی کا احسان نہیں مانتے۔ الٹا اس کی نیت پر شک کرتے ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ میں اس کے کام یا اس کی شاہانہ زندگی اور اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو جاؤں گی۔ تو تمہیں چھوڑ دوں گی۔ اتنی جلدی تمہارا بھوت سیانا ختم ہو گیا۔ چند دن میں۔ کتنے مہینوں میں اس شاہو کی یہ عمارت کھڑی کی تھی میں نے۔ ایک ٹھوکر سے تم نے یہ ریت کی دیوار گرا دی۔ مجھے میری نظر سے گرا دیا۔ میں خدا کے بعد صرف تم پر بھروسا کر کے گھر سے نکلی تھی" ہستہ ہستہ اس کے خاموش آنسو' سسکیوں میں بدل گئے اور وہ کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دینے کی بہت کوشش کی۔ ڈرائیور کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے پیار کیا اور دلاسا دیا مگر اس کے آنسوؤں کی ایسی بھیڑ پہنچی تھی کہ آنسوؤں کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا۔ رئیس الگ مجھ سے خفا تھا کہ میں نے ایسی دلدوز بات کیوں کہی۔

جب گھر آیا تو اس نے مجھے دھکا دیا "چھوڑو مجھے اور جاؤ' میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھ پر اعتبار کرے۔ سارا زمانہ مجھے آوارہ اور بدکردار سمجھتا ہے کہ آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ تم بھی یہی سمجھتے ہو۔ میں ایسی ہی ہوں۔ کوئی محبت نہیں مجھے تم سے۔ میں نے چار دن میں کسی اور کو پسند کر لیا' اس کی دولت کی وجہ سے۔"

میں نے کہا "شادو جی۔"

"مر گئی شادو جی" وہ چیخ کے بولی "بھول جاؤ شادو کو' ذلیل تھی۔ ایسی گھٹیا بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی تمہیں تو مجھے کیوں شرم آئے۔ تم جیسا سمجھتے ہو مجھے' میں ویسی ہی ہوں۔ نہیں ہوں تو بن کے دکھاؤں گی۔"

میرے اترتے ہی وہ زخم خوردہ جانور کی طرح گھر کی پناہ گاہ کی طرف لپکی۔ اس کے ابتدائی صدمے نے رفتہ رفتہ غم و غصے کی چنگاری کو ہوا دے کر غیظ و غضب کے آتش فشاں کو سزا میں بدل دیا تھا۔

میں نے بھی ڈپٹ کے کہا "جہنم میں جاؤ تم۔ میں بھی نہیں آؤں گا پھر یہاں۔ تم رہو خاوند سے اس کو گھی میں۔"

رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "پاگل ہو گئے ہو تم دونوں۔ اچھا تماشا کر رہے ہو سب کے سامنے۔ ناصر بند کرو اس بکواس اور چلو۔"

ڈرائیور ابھی تک گاڑی اسٹارٹ کیے خاموش بیٹھا تھا اور سامنے دیکھ رہا تھا۔ "آپ ٹھہریں گے یا کہیں جائیں گے سر؟"

میں نے کہا "ہم چلے جائیں گے جہاں جانا ہو گا۔ تم جاؤ۔"

"یس سر" اس نے کہا اور گاڑی گھما کے دوسرے گیٹ سے باہر لے گیا۔

رئیس نے کہا "چل۔ اندر جا کے دیکھتے ہیں۔ وہ رو رہی ہو گی۔"

میں نے صاف انکار کر دیا "ہرگز نہیں' آخر وہ کیا سمجھتی ہے خود کو؟"

رئیس ہنسا "یار وہی جو ہر معشوق سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ اتنا نخرا تو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

میں باہر کی طرف چل پڑا "اس نے بے عزت کیا ہے مجھے۔ خود جو بہت عزت دار ہو گئی ہے۔ چار دن میں دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔"

رئیس میرے پیچھے آیا "ابے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب وہی ہے جو تھا۔ تو بھی وہی ہے شادو بھی وہی ہے۔ بس محبت میں آدمی اتنا کمینہ اور خود غرض ہو جاتا ہے حسد کے مارے کہ ساری دنیا کو اپنا رقیب سمجھ لیتا ہے۔ جیسے تو خواہ مخواہ ہاشمی صاحب کی مہربانیوں کا غلط مطلب نکال رہا ہے۔ کسی دن مجھ پر بھی شک کرے گا۔"

"بکواس مت کر۔ میں آدمی کی نظر پہچان سکتا ہوں" میں غصے میں تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔ "اس آدمی کا التفات بے سبب نہیں۔ شادو کے دل میں چاہے کچھ نہ ہو' اس کی نیت پر میرا شک غلط نہیں ہو سکتا۔"

"پھر شادو پر غصہ کیوں؟"

"وہ بے وفائی کر رہی ہے۔ غلط مطلب نکال رہی ہے ہاشمی صاحب کے فراخ دلانہ رویے کا۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا لیکن میں شرط لگانے کو تیار ہوں رئیس کہ اس نے کبھی کسی کا کیس مفت نہیں لڑا ہو گا۔ ایسا کرتا تو اتنی بڑی کوٹھی کیسے کھڑی کرتا۔ یہ عالی شان کار اور یہ ٹھاٹ باٹ کیسے ہوتے۔ دنیا میں اور بھی مستحق ہیں۔ بے گناہ غریب ہیں جن کی گردن میں کسی اور کا پھندا ڈال دیا گیا ہے اور ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں صرف ہاشمی صاحب جیسا وکیل ہی ان کو انصاف دلا سکتا ہے مگر وہ روتے پھرتے ہیں۔"

رئیس خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس وقت' عنوانات پر کلام نرم و نازک ہے

اثر' والی بات ہے۔ [illegible] جذباتی طور پر ہاشمی صاحب کے خلاف ہوں۔ عقل کی بات نہیں سنوں گا۔ کچھ دیر بعد میں خود ہی چپ ہو گیا۔ اکیلا میں کتنی دیر بول سکتا تھا۔ دو کلومیٹر کے بعد میرا غصہ بھی اتر گیا تو مجھے احساس پشیمانی تنگ کرنے لگا۔ مجھے شادو کا خیال آنے لگا۔ کیا وہ ابھی تک رو رہی ہو گی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس وقت رئیس کی بات مان لیتا۔ اندر جا کے اسے منا لیتا۔ بات وہیں ختم ہو جاتی۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں اور رنجشیں نہ ہوں تو محبت بھی کتنا بے کیف اور سپاٹ جذبہ ہو جائے۔

میں نے رئیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "یار' چائے پیتے ہیں کہیں بیٹھ کے۔ تھکن محسوس ہو رہی ہے کچھ اور طبیعت بھی بیزار ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے کیا کہتے ہیں وہ۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ رات تک رونے لگے گا تو۔"

ہم اس وقت اسلامیہ اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ بات کرتے کرتے رئیس ایک پارک کے کونے میں لگے مجمع کی طرف دوڑا "ابے یہاں تو زبردست فائٹ ہو رہی ہے' آجا دیکھتے ہیں۔"

میں نے مجبوراً اس کا ساتھ دیا۔ اس کی طرح میں نے بھی مجمع کو چیر کر اپنا راستہ آگے تک بنایا جہاں دو مرغے اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کے آس پاس زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے یا گھٹنوں کے بل تقریباً سجدے کی پوزیشن میں تھے اور زمین پر ہاتھ مار مار کے چلا رہے تھے "شاباش ہے شاباش' اوئے آگے بڑھ میرے شیر۔"

"لے بھئی عمران خان پر پچاس اپنے۔"

"اوئے بس؟ یہ اپنے سوگوا سکرپہ۔"

"چل فیر میرے بھی سو عمران خان۔ واہ اوئے۔ صدقے تیری شان دے۔"

"فخر پاکستان۔ عمران خان' اوئے مار گوا سکر نوں۔"

شور مچا مچا کے مرغوں کے ساتھ اچھلنے اور کودنے والوں میں رئیس بھی شامل ہو گیا۔ اس نے عمران خان پر پہلے سو لگائے پھر کسی نے مقابلے پر دو سو کر دیے۔ رئیس بڑے جوش میں تھا۔ اس نے شرط ڈھائی سو کر دی۔ گوا سکر کے تیور دیکھتے ہوئے کوئی تین سو پر آگیا۔ عمران کے کسی حامی نے ایک دم چار سو لگا دیے۔ دونوں مرغے برابر کی لڑائی لڑ رہے تھے اور ان کی خونخواری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں اور جب تک ایک مارا نہیں جائے گا کوئی میدان چھوڑ کے نہیں بھاگے گا۔

گوا سکر پر شرط ساڑھے چار سو تک پہنچی تو رئیس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلایا۔ اس نے چلا کے کہا "پورے پانچ۔ چل عمران' لے لے جان۔ اس کھی شکر کی۔"

مجمع مرغوں کی لڑائی سے زیادہ مرنے لڑانے والوں اور شرط لگانے والوں کی حالت پر ہنس رہا تھا۔ ان کے جذبات وہی تھے جو میدان میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کسی کرکٹ ٹورنامنٹ کا فائنل دیکھنے والوں کے ہوتے ہیں۔ وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھے تھے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ وہاں ایک کے دو کا اصول چلتا تھا۔ رئیس ہار جاتا تو اس کے پانچ سو نہیں ہزار جاتے۔ جیت کی صورت میں اسے کچھ لگائے بغیر ایک ہزار ملتے۔ میں نے نیچے بیٹھ کے پانچ سو کا ایک نوٹ اسے تھمایا۔ اسے بہت عرصے بعد اپنی من پسند تفریح ملی تھی اور وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد گوا سکر کے حملوں کی شدت میں کمی آنے لگی۔ عمران خان کا دم خم ابھی تک وہی تھا۔ چند منٹ میں گوا سکر کی شکست کے آثار نمایاں ہو گئے۔ رئیس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ زمین پر الٹا پڑا زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہا تھا۔ سیٹیاں بجا رہا تھا اور فحش اشارے کر رہا تھا۔ ہارنے والوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

بالآخر گوا سکر میدان چھوڑ کے بھاگا۔ عمران خان نے اس کی ایک آنکھ زخمی کر دی تھی اور اس کی کلغی نوچ لی تھی۔ وہ زخمی تھا اور خون اس کی ٹانگوں پر بہنے لگا تھا مگر ہارنے جیتنے والے ان بے زبانوں کی حالت سے بے نیاز تھے۔ وہ اب ہاتھ جھاڑ کے شکست خوردگی کا دکھ اور رقم ڈوبنے کا صدمہ لیے رخصت ہو رہے تھے۔ شاید پھر یہ عزم کر کے کہ آئندہ کبھی مرغوں کی لڑائی پر اپنی کمائی نہیں لٹائیں گے۔ جیتنے والے بغلیں بجا رہے تھے اور ہتھڑا ڈالتے ہوئے نوٹ لہرا رہے تھے۔

اچانک مجمع میں افراتفری پھیل گئی۔ کچھ لوگ محاورے کے مطابق جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگے۔ ایک شخص جو صرف لنگی میں تھا اپنا خیمہ پیٹ بلاتا دوڑتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ "اوئے پلیز ہگنی پلیز۔۔۔" مگر جو لوگ براہ راست اس کھیل میں ملوث تھے انہیں اس وقت ہوش آیا جب ایک اے ایس آئی نے انہیں گھیر لیا "اوئے۔ کھلو جاؤ تھانے۔۔۔ خبردار' خبردار جو کوئی بھاگا۔ کس کے ہیں مرغے۔ کون لڑائی کراتا ہے' سامنے آجاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمران خان اور گواسکر کے مالکان اپنے اپنے مرغے بغل میں دبائے قانون کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہو گئے "مائی باپ' تھوڑی سی دل لگی کرتے ہیں۔"

اے ایس آئی نے کڑک کے کہا "دل لگی؟ تم جوا کراتے ہو۔ شرط کس کس نے لگائی تھی؟"

صرف ایک شخص نے رونی شکل بنا کے کہا "تھانے دار بادشاہ' چلو غلطی ہو گئی' مائی دے دو۔"

شرط لگانے والے آٹھ دس تھے مگر وہ سب اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ صرف ایک ہی ایسا بے وقوف تھا جس نے معافی مانگ کے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ خود رئیس وہاں سے سٹک گیا تھا اور میرے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں پہلے ہی پارک کی دیوار سے لگ کر قطعی لاتعلق نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "آج تو ہزار جیت گیا' مبارک ہو۔"

وہ بہت خوش تھا "میں نے کہا تھا نا یارے کہ آج کا دن اپنا ہے۔ ہمیشہ میں عمران خان پر شرط لگاتا تھا کہ کبھی تو جیتے گا۔"

"اور ہمیشہ ہار جاتا تھا پھر گواسکر پر شرط کیوں نہیں لگاتا تھا؟"

اس نے مجھے مجرمانہ نظروں سے دیکھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے یار۔ میں شرط لگاؤں گواسکر پر' لعنت ہے مجھ پر۔ سو دفعہ ہارے عمران خان مگر یارے' اپنا عمران خان تو شانِ پاکستان ہے۔"

تماشائی بچ گئے تھے مگر مرغوں کے مالک قانون کی گرفت میں آ گئے تھے۔ انسپکٹر نے ان پر انسدادِ بے رحمی حیوانات کے قانون کا اطلاق کر دیا تھا اور اب انہیں تھانے لے جانے پر مصر تھا۔ جب بالآخر وہ منت سماجت کے بعد اے ایس آئی کو ایک طرف لے جا کے بات کرنے میں کامیاب ہوئے اور "تک مکا" کے مذاکرات شروع ہوئے تو میری نظر اے ایس آئی کے چہرے پر گئی۔ ابھی تک میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔

میں چونک پڑا "یار رئیس۔ یہ تو وہی ہے' جیرا بلیڈ۔"

رئیس بھی چونکا "وہ نقلی تھانے دار۔ ابے ہاں یار' اس کی تو۔"

میں نے اسے روک لیا "ذرا ٹھہر۔ تماشا دیکھتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ہم سب فریقی مذاکرات کرنے والوں کے قریب پہنچ گئے۔ مرغوں کے مالک نے قانون کی فوری سماعت کرنے والی عدالت کی سزا روتے پیٹتے قبول کر لی تھی بصورتِ دیگر انہیں تھانے جانا پڑتا۔ انہوں نے اپنے منافع کی ساری رقم جرمانے کے طور پر ادا کر دی تھی اور مرغوں کو ذبح کرا کے صاف گوشت کی پوٹیاں تھانے دار صاحب کو پیش کرنے کی سزا بھی قبول کر لی تھی۔

میں نے رئیس سے کہا "ابے یہ واقعی ذبح کر دیں گے' اپنے مرغوں کو۔"

رئیس نے سہلایا "مرغے اب لڑائی کے کام کے نہیں رہے۔ اتنے زخمی ہیں کہ انہیں ذبح نہ کیا تو ویسے بھی مر جائیں گے۔"

"یعنی عمران خان اور گواسکر کی زندگی کی یہ آخری فائٹ تھی جس کی شرط تو نے جیتی۔"

وہ ہنس پڑا "ابے ہر ہفتے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ اسی نام سے دوسری جوڑی اتار دیں گے میدان میں۔"

جب سزا یافتہ سڑک کے پار کی دکان سے مرغ ذبح کرانے کے لیے جانے لگے تو میں نے درخت کی اوٹ سے آواز لگائی "جیرا بلیڈ!"

جیرے کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک دم پلٹا۔ سامنے رئیس کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ اگر وقت اور حوصلہ ہوتا تو جیرا بلیڈ ضرور رک کے کوئی سوال کرتا مگر ایک طرف اسے اندیشہ تھا کہ کہیں طرحان فرار نہ ہو جائیں' دوسری طرف اس کے جعلی تھانے دار ہونے کا سرعام بھانڈا پھوٹنے کا ڈر تھا چنانچہ اس نے مرغے بغل میں دبا کے سڑک عبور کرنے والوں کا کچھ فاصلے سے تعاقب جاری رکھا۔ رئیس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔

جیرا ایک مرغی فروش کی دکان سے کچھ دور رک گیا۔ ہم قریب پہنچے تو اس نے ہمیں پہچان لیا "یار ایویں کیوں ہتھے لگتے ہو۔ جاؤ موج کرو تم بھی۔ ابھی ہزار پورے ملے ہیں۔"

وہ بولا۔

"اس سے زیادہ تم نے کمائے مفت میں" رئیس بولا۔

اس نے افسوس سے کہا "مفت کا کیا مطلب یار۔ تم پھر سکتے ہو یہ وردی پہن کے شہر میں؟ میاں جی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہر قدم پر کوئی اصلی تھانے دار نظر آتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے گیدڑ چڑھا لے شیر کی کھال اور پھرنے لگے جنگل میں شیروں کے ساتھ۔ کیا حشر ہو گا اس کا' اگر شیر کو پتا چل جائے۔"

رئیس بولا "وہی جو تمہارا ہو گا کسی دن۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "او میاں جی' جیرا بلیڈ ہے میرا نام۔ دو سال ہو گئے ابھی تک سب خیر ہے۔ پوچھو کیسے؟"

"کیسے؟" رئیس نے کہا۔

اس نے بڑی رازداری سے اور دوستانہ انداز میں کہا۔

"میں بڑا چالاک ہوں۔ روز یہ کام نہیں کرتا۔ ہفتے میں دو دن لگاتا ہوں۔ پانچ دن عیش کرتا ہوں۔ اس سے اگلے ہفتے کیس اور۔ گجرانوالہ یا گجرات۔ جہلم اور چنڈی تک چلا جاتا ہوں۔ صبح گیارات کو واپس۔"

رئیس نے تسلیم کیا "تم واقعی بہت چالاک ہو۔"

مرغ لڑانے والے طرحان اور اس اور دکھی چہروں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ایک نے شاپنگ بیگ آگے بڑھایا۔

"لو جی۔ یہ ہے گواسکر۔"

دوسرے نے کہا "اور یہ ہے عمران خان۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ اور خبردار جو پھر یہاں نظر آئے" اس نے کہا اور پھر ایک بیگ ہماری طرف بڑھاتا "یارو۔ تم بھی لگژ کھاؤ' موج کرو۔"

رئیس نے دوسرے شاپنگ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "دینا ہے تو دو دو۔ آج گواسکر کو روسٹ کریں گے۔ یہ بتاؤ کہ میں تم سے ملنا چاہوں۔"

"جاؤ او ہرا اپنے ڈیرے پر۔ میں سو کے اٹھتا ہوں ذرا دیر سے۔ گیارہ بارہ بجے۔" وہ بولا "ویسے کام کیا ہے؟"

"کام کچھ نہیں۔ اپنی بھی ایسے ہی ہے یارے۔ آج کل بے روزگاری سے بیزار ہیں۔ مل کے کریں گے کچھ بلا گلا۔ موج میلہ۔" رئیس بولا۔

وہ ہنسا "واہ وا۔ فیر تے جم جم آؤ۔ پوچھنا کیسا۔ کہتے ہیں ناکہ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔"

"مسولا کی برکت سے ایک سو گیارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ گیارہ سو گیارہ بھی۔" رئیس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے بگڑ کے کہا "رئیس۔ تو اس سے نہیں ملے گا۔"

"میں ضرور ملوں گا اس سے۔ ایسے چوہے کی طرح بل میں گھس کے نہیں بیٹھ سکتا میں۔" رئیس نے کہا "ہم نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا تجھے یارے کہ فارغ رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ اتنا بیزار ہو جاتا ہوں میں کہ جی چاہتا ہے۔ چیزیں توڑوں' پتھر پھینکوں راہ چلتے لوگوں پر یا گاڑیوں پر۔"

"صوفہ رہنے کے لیے کیا ایسے ہی کام رہ گئے ہیں؟"

"ابے اور کیا کر سکتا ہوں میں آخر؟ کلرک کی کیا چپراسی کی نوکری تک نہیں مل سکتی مجھے۔ کوئی اور کام مجھے آتا نہیں۔ بزنس میں کر نہیں سکتا۔ اس کے لیے نہ مال ہے اپنے پاس اور نہ اتنی عقل۔ تیرا پیسہ میں لوں گا نہیں۔"

"کیوں نہیں لے گا۔"

"اس لیے کہ مجھے پتا ہے وہ ڈوب جائے گا۔ مجھے محنت کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں ریڑھی نہیں لگا سکتا کسی بھی چیز کی۔ پولیس الگ تنگ کرتی ہے اور پھر ایک سو ایک دشمن دیکھیں گے مجھے ہر جگہ۔ اپنا کام گھومتے پھرتے ٹھیک ہے۔ ابھی یہاں' ابھی وہاں۔ چھلاوے کی طرح نظر آئے اور غائب۔ تیرے ساتھ رہ کے تو زمانہ چھوٹ گیا ہم سے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل درآمد کے چکر میں پڑ گیا ہے' اسے پرانے وقتوں کے یار پھر یاد آ رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ مل کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتا تھا۔ ان سب کی قوت کو منظم کر کے شاہ جی کے خوف سے نجات پانا چاہتا تھا اور سینہ تان کے چلنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک قانون کے سارے دیمک زدہ لکڑی کی بیساکھی جیسے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں فائقونیت کی وہ لاٹھی رکھنا چاہتا تھا جس سے سانپ مر جائے مگر لاٹھی نہ ٹوٹے۔ زمانہ بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا تھا۔

میں نے اس سے بحث نہیں کی اور اسے سمجھانے یا اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا جسے اپنی مرضی سے صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے ان والدین کی طرح فکر کروں جو خود سیدھے راستے پر کبھی نہ چلے ہوں۔

رئیس نے بڑی رئیسانہ شان سے ہیر کو تھپکا دیا "تو تم بھی عیش کرو۔ چکن قورمہ پکاؤ یا چکن بریانی۔"

وہ خوش ہو گئی "یہ بڑا اچھا کیا تو نے۔ آج سالگرہ بھی ہے ہماری شادی کی" وہ شرما کے بولی۔

رئیس نے قہقہہ مارا "کون سی' پچاسویں کہ ساٹھویں۔"

"ہائے کیسی جھلوں والی بات کرتا ہے۔ ابھی بتاتی ہوں" اس نے انگلیوں پر گن کے بتایا "ہندوستان پاکستان کی جنگ ہوئی تھی اس سال۔"

میں نے کہا "یعنی اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں میری پیدائش ہوئی تھی بلکہ عین اسی دن چھ ستمبر ۱۹۶۵ء۔"

رئیس بولا "اسے کہتے ہیں 'کیا کہتے ہیں یار' خیر کچھ کہتے ہوں گے مگر دیکھ کیسے آج ہر کام خود ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا دن اپنا ہے۔ اس کے مالک یا جیرے بلیڈ کو کیا خود ہمیں پتا نہیں تھا کہ گواسکر مرحوم آج ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے دسترخوان کی زینت بنیں گے۔ شادی کی سالگرہ میں' واہ بھئی واہ۔"

رات کے کھانے میں ماسی ہیر نے میٹھے چاول بھی سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور جب مسٹر رانجھا تشریف لائے تو چکن قورمہ' چکن اور زردہ دیکھ کے اور اپنی جھمنی جیسی بیوی کا بناؤ سنگار کے دم بخود رہ گئے۔ انہیں بڑی مشکل سے یاد دلایا گیا بلکہ جتی ان سے منوایا گیا کہ آج ہی ہیر رانجھا کا ملاپ ہوا وہ خاصے افسردہ اور آبدیدہ نظر آنے لگے۔

"ناقدانی میں بندہ کیا نہیں کرتا" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "شادی تک کر بیٹھتا ہے پھر جوانی کی غلط کاریوں پر دم تک پچھتاتا ہے۔"

ہیر بچن میں تھی چنانچہ اس نے یہ دل شکن تبصرہ سنا اور کھانا ختم ہونے تک اپنی شادی کے دلچسپ قصے بھی سناتی رہی جیسے وہ شرمناک تھے۔ مسٹر رانجھا کے لئے دردناک یادوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھا۔ وہ تو حیران تھے آج اچانک ہیر نے یہ تقریب کیسے کرڈالی۔

"تمہیں تو کچھ یاد رہتا نہیں مگر ان منڈوں کو یاد تھا۔"

میں نے اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف اور پھر اتفاق رائے سے اس مفروضے کی تائید میں یا "ہم تو کیک بھی لانے والے تھے۔"

"ہائے اچھا کیا جو نہیں لائے۔ اس میں کریم ہوتی ہے ۔ میرا وزن بڑھ جاتا" اس نے یوں کہا کہ میرا جی چاہا مرپیٹ لوں۔

رئیس چپ نہ رہ سکا۔ "ارے ماسی۔ سمندر میں لوٹا بھر ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بھینس پر مچھر بیٹھ جائے تو کیا پاؤں بھاری ہوجاتا ہے۔"

ہیر نے برا نہیں مانا "رانجھے کو بھی گلاب لگ جاتے ہیں ۔ سے۔"

رانجھے نے کہا "ہاں۔ کریم اتار کے کھا سکتا ہوں میں۔ مریض تھا میرا' کینسر کی آخری اسٹیج پر۔ لوی دو بہنوں بھنا چنگا کردیا میں نے۔ وہ پانچ پاؤنڈ کا کیک لے کر آیا۔ کریم میں نے اتار کے ایک مرتبان میں بھرلی۔ دو مہینے سر لگائی۔ بالکل بریل کریم جیسی خوشبو آتی تھی۔"

میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا "سوتے میں یاں نہیں چڑھتی تھیں سر پر؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے بڑی سادگی سے تسلیم کیا "آجاتی تھیں نامراد ں چاٹتے۔ چیونٹے بھی کاٹتے تھے۔ پھر میں رات کو سر کے سوتا تھا۔"

ہیر نے افسوس ناک نظروں سے رانجھا کے سر کی انی شفاف سطح کو دیکھا "اس سے پہلے پنگھے بھلے بال تھے ۔"

"اس کا وزن بھی اتنا نہیں تھا پہلے۔ ایک ہفتے میں پورا کیک کھا گئی پھر ایک اور مریض مل گیا۔ وہ پیسے نہیں دیتا تھا۔ کیک دے جاتا تھا۔ یہ کھاتی رہی مفت کا مال۔ میں سمجھا اس کی بیکری ہوگی۔ ایک دن مالک اسے پکڑ کے میرے سامنے لایا اور دس چھترمارے تو پتا چلا ہیرا تھا۔ کینٹین سے چوری کرکے لاتا تھا پھر یہ خود ضد کرکے مجھ سے منگواتی تھی۔ اب دیکھ لو۔"

کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی تو ہیر اٹھ کے گئی اور خوشی سے چلانے لگی "ہائے میں صدقے۔ اپنی شاد آئی ہے۔"

"شاد آئی ہے؟" میں گھبرا کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

شاد مسکراتے ہوئے ہیر کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور شاید وہ ہاشمی صاحب کی گاڑی میں نہیں آئی تھی ورنہ دستک سے پہلے ہارن کی آواز آتی۔

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "آؤ بھئی۔ تھوڑا لیٹ ہوگئیں دعوت میں شریک ہوجاتیں۔"

"دعوت کا کوئی خاص موقع ہے؟" شاد اس کے پاس بیٹھ گئی۔

اس نے ایک آہ بھری "ہاں بھئی۔ اٹھارہ سال پہلے آج کے دن ہی عمر قید ہوئی تھی ہمیں۔ ابھی تک رہائی نہیں ملی۔"

"چل کڑیے' کھانا کھا۔ باقی گلاں بعد میں" ہیر نے ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"کھانا تو۔۔۔ کھالیا میں نے۔"

"چل فیر بیٹھا کھالے۔ زردہ چکھ لے" ہیر نے شاد کے نہ نہ اور تھوڑا تھوڑا کرنے کے باوجود پلیٹ بھر کے اسے تھمادی۔

ابھی تک اس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور مجھے اپنی طرف نظر جمائے دیکھتا ہوا پاکے اس کی نگاہیں ادھر اُدھر بھٹک جاتی تھیں۔ اس کے آنے سے میرے دل پر رکھا ہوا ندامت کا بھاری پتھر کچھ ہٹ گیا تھا۔ اب میں سکون کا سانس ضرور لے سکتا تھا۔ میری طرح اسے بھی اپنے رویے پر افسوس تھا۔ میری خفگی کا احساس تھا اور یہ خیال تھا کہ زیادتی خود اس نے کی۔ اسے دیکھ کے میری انا کا بت ٹوٹ گیا تھا اور میں پہلے سے زیادہ شرمندہ تھا کہ عورت ہونے کے باوجود اس نے پہل کی اور مجھے منانے چلی آئی۔ رونا بھی اس کا حق تھا اور اظہار ندامت کا خراج وصول کرنا بھی۔ یہ اندازِ محبوبی اور آدابِ

ماشقی کے تقاضے تھے جن کو میں سمجھا ہی نہیں تھا۔

رئیس کے سوا کسی کو ہمارے لڑائی کے سبب کا علم نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب کی کوٹھی سے وہ یہاں تک اکیلی آئی تھی اور پرانی شاد بن کے اس کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ ہیر کو احساس دلانے کہ اسے میرے جذبات کا کتنا پاس ہے۔ ہیر نے جشن کا نشہ غالب تھا۔ شاید پہلے ایسا موقع نہ آیا ہوگا کہ کسی نے شادی کی گولڈن جوبلی منائی ہو۔ ڈاکٹر رانجھا اس کے ساتھ کسی نے شادی کی سلور جوبلی کا دن ہر سال یاد رہتا تو سب کچھ بھول چکے تھے۔ ہیر کو رانجھا کو کبھی تو یاد آئے ہوگا اور ممکن ہے وہ انتظار کرتی رہی ہو مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور آج کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ گزرتے ماہ و سال کے ساتھ حالات کے سارے رنگ اس نے خود ایک اتفاق کا سہارا لیا اور خود ہی اسے تقریب یاد دلادیا۔ اب وہ شاد کو ہنس ہنس کے وہ سب باتیں سنا رہی تھی جو ہم سن چکے تھے۔ ہیر کا دنیا میں کوئی نہیں تھا یا تھا تو اتنی پرانی ہوچکی تھی کہ رشتہ بے وجود ہوگیا تھا۔ ہم اس کے نئے رشتے دار تھے جو قلیل بھی تھے اور اسے عزت بھی دیتے تھے۔ اس کا نیا گھر ایک طرح سے اس کی زندگی کا نیا خوش گوار موڑ تھا۔

ڈاکٹر رانجھا تھکن کا بہانہ کرکے اٹھ گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ اچھے کھانے کا نشہ ہیر کے بات کی تکرار سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انتخاب اور کتابِ زندگی سے منتخب اقتباسات کے بعد بھی وہ بے اولاد تھے اور ساٹھ سال کی ازدواجی زندگی میں شیشۂ تقدیر کو صبر شکر کے ساتھ قبول بھی کرچکے تھے۔ ایک ضع داری کے ساتھ وہ وفاداری کے راستے پر ساتھ چل رہے تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ انہیں کبھی اپنی زندگی میں اکیلے پن کا خلا محسوس نہ ہوتا ہو اور احساسِ محرومی کے دکھ کی پریشان نہ کرتی ہو۔ غیر شعوری طور پر ہیر نے اپنی زندگی میں اس اکیلے پن اور خلا کو پُر کرنے کی راہ نکال لی تھی اور ہمیں بچوں کی طرح اپنے قریب کرلیا تھا۔ وہ ہمیں پیار سے ڈانٹتی تھی کالیاں بھی دے دیتی تھی اور چمٹے سے مار بھی دیتی تھی کہ ہم نے اسے بڑی بہن یا ماں ہماری سعادت مندی کے حقوق یا اختیارات دیے۔ ہم خود اس محبت اور شفقت سے محروم لوگ تھے۔

کچھ دیر بعد رئیس نے بھی منہ پھاڑ کے جماہی لی "یار ہم تو چلے سونے۔ آج تو نیند بھی سکون سے آئے گی۔"

ہیر نے کہا "تو میں بھی ذرا برتن پانڈے سمیٹ لوں۔ تم لوگ باتیں۔ کہو تو چائے بنادوں؟"

شاد اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں ماسی۔ میں بھی چلتی ہوں۔"

"کہاں؟ اس وقت واپس جائے گی؟" ہیر نے کہا "رک جا اودھر ہی آج۔"

شاد نے کہا "نہیں۔ ہاشمی صاحب اسٹڈی میں تھے۔ میں بغیر بتائے نکل آئی تھی۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے۔ چلو ناصر' تم مجھے چھوڑ آؤ۔"

میں بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا "چلو۔ کہیں وہ حسیس ڈھونڈتے ہوئے یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

شاد نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ہم باہر آگئے اور رات کی خاموشی میں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بالآخر میں نے کہا "شاد۔ تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"تم بہت برے لگ رہے ہو مجھے۔ ابھی تک تم نے معافی نہیں مانگی مجھ سے۔" وہ بولی۔

میں ہنس پڑا "معافی مانگنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ میں رٹنا کہ دوں کہ آئی ایم سوری' دوسرا یہ کہ ہاتھ جوڑوں یا ناک رگڑوں زمین پر۔ سات لکیریں نکالوں اور سات بار کہوں کہ مجھے معاف کردو۔ اور۔"

وہ ہنسی کو دبا کے بولی "اور کیا۔ تیسرا طریقہ بھی ہے کوئی؟"

میں نے ایک دم اسے پکڑ کے ایک دیوار کے تاریک گوشے میں کھینچ لیا اور بانہوں کے حلقے میں لے کر جکڑ لیا "تیسرا یہ طریقہ ہے۔"

اس نے بدحواس ہوکے خود کو چھڑایا "خدا کے لیے ناصر۔ دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔ سڑک چل رہی ہے۔"

ایک کار نے ٹرن لیا تو ہیڈ لائٹس ایک لمحے کے لیے ہم پہ آئیں۔ کار میں سے کسی نے سر نکال کے قہقہہ مارا "ٹھیک ہے بھئی' ٹھیک ہے۔"

میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خوش دلی سے بتایا کہ میں نے برا نہیں مانا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں" شاد نے خفگی سے کہا۔

"جتنی تمہیں آرہی ہے وہ کافی ہے" میں نے کہا۔

"شکر کرو پکڑے نہیں گئے ورنہ صبح خبر آجاتی۔"

"نوجوان جوڑا سرِراہ بوس و کنار کرتے ہوئے گرفتار۔ اچھا تھا سارے شہر میں اعلان کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔"

"بدنامی کتنی ہوتی۔"

میں نے کہا "عشق میں بدنامی سے بڑی نیک نامی کوئی نہیں۔ خیر شاد' حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس وقت مجھے بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شرمندہ کیا۔ میرا رویہ بہت غلط تھا تمہارے ساتھ۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔"

"جو ہو گیا اس کی کیا معافی۔ آیندہ نہ ہو تب بات ہے۔ تمہیں واقعی کچھ احساس ہے کہ مجھ پر شک کر کے تم نے غلطی کی تھی؟"

"غلطی نہیں گناہ کیا تھا لیکن شک تم پر نہیں۔۔۔"

"اب چھوڑو ورنہ ہم پھر بحث کرنے لگیں گے۔" وہ بولی۔ "یہ مت بھولنا کبھی کہ میں نے تمہارے لیے اپنی دنیا چھوڑی تھی' صرف تمہارے لیے اور ہم نے کیا عہد کیا تھا' یاد ہے نا؟"

میں نے کہا "دل پر لکھا ہے سب۔"

"تو پھر مجھے بتاؤ۔ حوصلہ ہے اس عہد پر قائم رہنے کا؟ تم میٹرک کا امتحان دو گے پھر انٹر اور بی اے کرو گے۔ جب تمہاری عمر بائیس سال ہو گی' تب شادی کریں گے ہم' چار سال بعد۔"

میں چلتے چلتے رک گیا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو ہم نے طے کیا تھا۔ کون سی بات غلط کی میں نے' بولو۔"

میں پھر اس کے ساتھ چلنے لگا "شادو۔ یہ ظلم مت کرو۔"

"یہ چار دن میں ظلم محسوس ہو رہا ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ یہی آزمائش ہو گی ہماری محبت کی۔ تم ڈرتے ہو کہ اس آزمائش میں ناکام ہو جاؤ گے؟ ناکامی کا لفظ تمہاری لغت میں نہیں۔ یہ بھی تم نے کہا تھا۔"

میں نے بے بسی سے کہا "شادو جی۔ ذرا سوچو چار سال۔۔۔ ایک سال میں ہوتے ہیں تین سو پینسٹھ دن۔ چار سالوں میں پندرہ سو۔ مجھے ایک دن کی دوری عذاب ہے۔"

"اسی سے ثابت ہو گا کہ تم اپنے عہد و پیمان کو کتنی اہمیت دیتے ہو اور کتنی مستقل مزاجی سے ان پر قائم رہ سکتے ہو۔"

اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میرے لیے ذہنی فرار کے راستے مسدود کر دیے تھے اور مجھے اپنے ہی الفاظ کے جال میں اسیر کر لیا تھا۔

"شادو۔۔۔ تم سے عہد و پیمان پر میری جان قربان۔"

"فضول لفاظی مت کرو۔ جان نہیں چاہیے مجھے تمہاری۔ بس جو وعدہ کیا تھا پورا کرو۔ تم نے کہا تھا کہ یہ مرد کی زبان ہے۔"

میں نے چڑ کے کہا "اچھا بابا کہا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ چار سال تک میں کہاں رہوں گا اور تم کہاں رہو گی؟"

"تمہارے پاس ایک گھر ہے۔ عقل اور ذہانت ہے۔ ہمت اور حوصلہ ہے۔ تمہارے مقاصد تو بہت اونچے تھے۔ تم وزیراعظم بننے کی بات کرتے تھے۔"

"بھاڑ میں گیا وزیراعظم۔ میں بچہ تھا تو چاند بھی مانگتا تھا۔"

اس نے کہا "میرا مطلب ہے' میری جیسی کوئی لڑکی تمہاری منزل نہیں ہو سکتی۔ تمہاری منزل بہت آگے ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ صاف کہو" میں چونکا۔

"وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری شریکِ سفر ہوں۔ تمہیں منزل تک پہنچانے کے لیے کبھی ہمت نہ ہارنے دینا' مقصد کو فراموش نہ کرنے دینا اور جہاں تک ممکن ہو تمہارے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور تمہیں سہارا دینا' یہ سب میرا کام ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہو گی۔ اس بدنیت بوڑھے کے پاس تو نہیں چھوڑ سکتا میں تمہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا "ناصر' کتنے افسوس کی بات ہے کہ آدمی کسی کا احسان مانتے ہوئے ایسی کم ظرفی کا مظاہرہ کرے۔ آج تم بھی محفوظ ہو اور میں بھی آزاد ہوں۔ کس کی کوشش سے ہوا یہ سب۔"

میں نے کہا "کوئی بھی وکیل یہ کام کر سکتا تھا۔"

"تمہارے لہجے میں یقین نہیں ہے کیونکہ تم جانتے ہو یہ اتنا آسان نہیں تھا مگر خیر' تم نہیں چاہتے تو میں نہیں رہوں گی وہاں۔ جہاں بھی تم چاہو گے' میں رہ لوں گی۔ میں نے آج اپنے ہی کپڑے پہنے ہیں۔ اچھے کپڑوں میں تم کو میں بری لگتی تھی" شادو نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اس کی بیوی کے کپڑے اچھے نہیں لگتے تھے مجھے تمہارے جسم پر۔ تم کو کتنے اچھے کپڑے چاہئیں میں لا کے دیتا ہوں تم خود خرید لو۔ تم وہ پورے پچاس ہزار اپنے کپڑوں پر خرچ کر دو۔ جو تم نے مجھے لوٹانے تھے مگر اس کی دی ہوئی کوئی چیز مت لو۔ وہ اپنی دولت اپنے پاس رکھے۔"

"اور تم بھی اپنے پچاس ہزار اپنے پاس رکھو۔" اس نے خفگی سے کہا "مجھے پیسوں کی کمی نہیں ہے۔ کتنی بداخلاقی کی بات ہے کہ کوئی اتنی محبت سے۔"

"محبت سے۔۔۔ کیسی محبت۔" میں نے بھڑک کے کہا "کوئی فرق ہے اس کی اور میری محبت میں یا نہیں؟ وہ کہہ دے کہ تم کو بیٹی سمجھتا ہے وہ۔ ایک باپ کی طرح محبت کرتا ہے تم سے پھر ٹھیک ہے۔ باپ کا گھر بیٹی کا گھر۔ تم رہو

وہاں۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے شادو۔ جس طرح وہ تم کو شاہدہ پروین کہتا ہے۔ جب تم سج دھج کے اس کے سامنے آتی ہو تو جیسی تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے۔۔۔"

"بس کرو ناصر۔ بس کرو۔ خدا کے لیے بس کرو پھر وہی باتیں کر رہے ہو تم۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے معافی مانگی تھی اور کہا تھا کہ ایسی باتیں پھر نہیں کرو گے۔" وہ چلا کے بولی۔

اس کے چلانے سے میں ڈر گیا "اوکے' اوکے۔ آہستہ بات کرو' لوگ ہیں ہمارے آگے پیچھے۔"

"ایک بات سمجھ لو اچھی طرح۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر بار بار ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ ہاشمی صاحب کے دل میں کیا ہے' اس سے مجھے کوئی غرض نہیں' مجھے معلوم ہے کہ میرے دل میں کیا ہے اور یہی اہم ہے۔ ابھی تم ساری فضول باتیں دماغ سے نکال کے امتحان پر توجہ دو۔"

"کوئی امتحان میرے لیے تم سے زیادہ اہم نہیں۔"

"مگر میرے لیے ہے۔ اب میں تم سے امتحان کے بعد ملوں گی۔ آئی بات سمجھ میں؟ تم کو میٹرک کا امتحان دینا ہے اور پاس کرنا ہے۔ یہ سب سے اہم سنگِ میل ہو گا تمہارے مستقبل کی کامیابی کے راستے پر۔ اگر تم میٹرک نہ کر سکے تو جاہل رہ جاؤ گے۔ تمہاری ذہانت غیر معمولی ہے مگر یہ مثبت اور تعمیری مقاصد میں استعمال نہ ہوئی تو مجھے ڈر ہے کہ تم غلط راہ اختیار کر لو گے۔"

"یعنی چور ڈاکو بن جاؤں گا میں؟"

"چور ڈاکو بہت معمولی اور عام لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی جینئس نہیں ہوتے۔ تم چارلس سوبھراج بن جاؤ گے یا کارلوس۔ کسی انڈر گراؤنڈ مافیا کے بے تاج بادشاہ یا کرائم کنگ ہو جاؤ گے۔"

"ایسا سوچتی ہو تم میرے لیے۔۔۔؟" میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے ناصر۔ کامیابی کی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ دو راستے الگ الگ مختلف سمتوں میں ان منزلوں تک لے جاتے ہیں۔ ایک راستہ آج تمہارے سامنے ہے۔ تم اسے بچے کے دماغ کی بات سمجھو۔ تم وزیراعظم بننا چاہتے تھے تو یہ نیک مقصد تھا۔ تمہارے ذہن میں بہرام ڈاکو بننے کا خیال نہیں تھا۔ تم ایسا نہیں سوچتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کلاشنکوف آ جائے تو میں سب کو بھون کے رکھ دوں۔ ان سب کو جنہوں نے تم پر ظلم کیا۔ تمہارا استحصال کیا اور تمہیں محرومی کے عذاب میں مبتلا کیا۔ تم نظام کو سدھارنے کا سوچتے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم چاہتی ہو' میں سراب کے پیچھے دوڑتا ہوں۔"

"سراب کو حقیقت بنانا تمہارے اختیار میں ہے۔ تم کامیابی پسند ہو' ناکامی تمہیں توڑ نہیں سکتی۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ AMBITIOUS۔ تم AMBITIOUS چیلنج قبول کرتے ہو اور سب سے اوپر دیکھنا چاہتے ہو خود کو اس لیے میں کہتی ہوں کہ کبھی ترغیب' دباؤ' لالچ یا ناکامی کے باعث یہ راستہ مت چھوڑنا۔"

اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کی خیرخواہی میں پیار کا غرور تھا۔ بے غرض خلوص کی اپنائیت تھی اور اپنی محبت پر ناز تھا۔ میں نے کہا "اگر تم نے میرا ساتھ نہ چھوڑا تو میں کچھ نہیں چھوڑوں گا۔"

ہم ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ شاید دو میل کا فاصلہ تھا جو ہم نے گردوپیش سے بے خبر رہتے ہوئے ایک لمحے میں طے کیا۔ آدھی رات کے وقت سڑکوں اور بازاروں کی رونق ختم ہو گئی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑکیں سنسان تھیں۔ کہیں کہیں آوارہ کتے بھٹکتے بھونکتے نظر آ جاتے تھے یا چوکیدار سیٹیاں بجاتے پھر رہے تھے۔ بیشتر کوٹھیوں میں گیٹ لائٹ کے سوا کہیں روشنی نظر نہ آتی تھی۔

"اگر تم نے میٹرک کا امتحان نہ دیا ناصر۔۔۔ تو پھر میں تم سے نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں ملوں گی" اس نے اچانک کہا۔

"کبھی نہیں ملو گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں کبھی نہیں۔ میں اس شرمندگی کے ساتھ محبت نہیں کر سکتی کہ تم نے میری وجہ سے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ ہر مقصد کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا تھا۔ تمہاری ناکامی کی ذمے دار میں ہوں۔ کیا ہے وہ' عشق نے تم کو نکما کر دیا ورنہ تم بھی آدمی تھے کام کے۔ یہ الزام مجھے قبول نہیں ہو گا۔"

"میں امتحان ضرور دوں گا لیکن یہ شرط۔۔۔"

"شرط رہنے دو۔ امتحان کتنے دن چلے گا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ پندرہ دن کے لیے مجھے بھول جاؤ۔ اس کے بعد میرا وعدہ کہ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہو گا۔"

ہم مین گیٹ پر تھے جب میں نے ہاشمی صاحب کو دیکھا۔ وہ نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے بڑی بے قراری سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ شادو نے مجھے اشارے سے کہا کہ تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ؤ اور خود اندر چلی گئی۔ میں گیٹ سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"تو تشریف۔ آئیں آپ خاتون؟ ذرا وقت دیکھئے۔ کتنی دیر سے آپ غائب تھیں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس طرح مجھے بتائے بغیر رات کے وقت نکل جانے کا مقصد کیا تھا؟" انہوں نے برہمی سے کہا۔

شادو نے دبے دبے لہجے میں کہا "میں ذرا... ناصر سے ملنے گئی تھی۔ آپ اسٹڈی میں تھے۔ میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"غلط بات مت کرو۔ گھر میں ملازم بھی تھے۔ ان کو بتا سکتی تھیں تم۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کتنا پریشان رہا۔" ہاشمی صاحب اونچا نہیں بولتے تھے مگر خفگی کا اظہار ان کے لہجے سے ہوتا تھا۔ "آج ہی عدالت میں تمہارا بیان ہوا۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ عنایت شاہ نے کتنی بے عزتی محسوس کی ہوگی۔ ناصر کے خون کا پیاسا وہ پہلے سے تھا۔"

"جی۔ مجھے اندازہ ہے۔"

"خاک اندازہ ہے۔ اندازہ ہوتا تو آدھی رات کے وقت یوں سیر کرتی اکیلی نہ آتیں۔ ظاہر ہے ناصر ہی چھوڑنے آیا ہوگا تمہیں۔ اس میں ہمت نہیں تھی میرا سامنا کرنے کی۔ دروازے سے لوٹ گیا۔ اس کے ساتھ عنایت شاہ کا کوئی آدمی تمہیں دیکھ لیتا اور اسے اطلاع کر دیتا یا تمہارے پیچھے لگ جاتا تو کیا ہوتا؟" وہ بولتے رہے "میں تمہارا ضامن بنا ہوں۔ میں نے تمہاری حفاظت کی ذمے داری قبول کی تھی۔ ابھی ایک دن نہیں گزرا۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

"آئی ایم سوری ہاشمی صاحب!"

وہ کچھ نرم پڑے "شاہدہ پروین۔ عنایت شاہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ تم جانتی ہو نہ وہ ناصر کو معاف کرے گا اور نہ تمہاری سرکشی کو نظرانداز کر کے خاموش ہو گا۔ وہ چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے جو زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن تمہیں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ کہیں جانا ہو تو مجھے بتاؤ' مجھے بتائے بغیر بھی گاڑی میں جاؤ۔ ذرا ئیور کے ساتھ۔ وہ مسلح ہوتا ہے اور عنایت شاہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا کہ میرے گھر یا میری گاڑی میں تمہیں نقصان پہنچائے۔ مگر تم نے حد کر دی۔ تم تو خیر ہو نٹکھٹ مگر اسے بھی خیال نہیں آیا کہ پیدل جانے میں کتنا رسک ہے۔ ٹیکسی میں ہی چھوڑ جاتا۔ اور یہ کپڑے تم نے کیسے پہن کر لی تھیں۔ وہ جو آسانی سے پہچانے جاتیں۔"

میں غصے کی کیفیت میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کئی بار میں نے اندر جا کے ہاشمی صاحب کو کھری کھری سنانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ آخر وہ کون ہوتا ہے اس لہجے میں شادو کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا۔ اس نے حفاظت کی ذمے داری لی ہے' شادو کو قید میں رکھنا حفاظت نہیں ہے۔ شادو اگر اپنے باپ کا گھر چھوڑ سکتی ہے تو ہاشمی صاحب اسے زبردستی گھر میں کیسے رکھ سکتے ہیں۔ عدالت نے اسے آزادانہ زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کی اجازت دی تھی اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہنے سے ان شکوک و شبہات کی نفی کر دے جو اس کے اور میرے تعلق کی بنا پر شاہ جی کے بیان سے پیدا ہوئے تھے۔ شادو کا یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ نہ اس کے ناصر سے غلط مراسم تھے نہ ناصر نے اس کو اغوا کیا اور نہ وہ اس کے ساتھ گھر سے نکلی۔ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہنا شادو کی مجبوری نہیں تھی۔

لیکن ہاشمی صاحب کے خدشات بھی بے بنیاد نہیں تھے اور ان کی پریشانی بے سبب نہیں تھی۔ ان کی ناراضی برحق تھی۔ شادو نے واقعی اکیلے گھر سے نکل کے ایک جذباتی بے وقوفی کی تھی تو میں نے اس کے ساتھ دو میل کا فاصلہ اتنی بے خوفی سے پیدل طے کر کے زیادہ بڑی حماقت فرمائی تھی۔ وہ تو وقت ایسا تھا جب شاہ جی کی فقیر فورس سڑکوں پر سرگرداں نہیں تھی ورنہ ہم پہچانے جاتے۔

یہی سب سوچ کے میں نے خود کو روک لیا اور خون کے گھونٹ پی کے خاموش رہا۔ غصہ مجھے شادو پر بھی آیا جو میرے سامنے خوب بولتی تھی اور اپنی ہر بات منوا لیتی تھی۔ وہ کیسے بھیگی بلی بنی سب سنتی رہی۔ بس ایک جملے میں بات ختم ہو جاتی۔ دو ٹوک لہجے میں کہہ دیتی کہ میں کہیں آنے جانے کے لیے آپ سے اجازت لینے کی پابند نہیں ہوں۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں میرے لیے مگر شادو کو پہلے ہی احسان مندی کے بوجھ کا احساس ضرورت سے زیادہ تھا۔ وہ انہیں فرشتہ سیرت' فراخ دل اور بے غرض نہ جانے کیا کچھ سمجھتی تھی۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھی۔ ان کی علمیت' ذہانت اور فطرت عنایت شاہ جیسے باپ کے مقابلے میں اسے بہت عظیم اور مرعوب کرنے والی لگتی تھی۔ شاید ایسا ہی وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی۔

ہاشمی صاحب نے کہا "آیئے۔ اندر چلیں۔ آپ کی وجہ سے ابھی تک میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔"

"کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا' چلئے۔"

میں شادو کی بات پر حیران کھڑا رہا۔ ہیر کے سامنے اس نے کہا تھا کہ وہ کھانا کھا کے آئی ہے۔ کیا یہ جھوٹ شادو نے اس لیے بولا تھا کہ اسے کھانا واپس جا کے ہاشمی صاحب کے ساتھ کھانا تھا؟ وہ وہاں کھانا کھا لیتی تو دوسری دفعہ ہاشمی صاحب کے سامنے کچھ نہ کھاتی۔ لمحا خیال تھا اسے ہاشمی صاحب کے جذبات کا؟ اس نے زردہ صرف چکھ کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ خوشی کی ایک تقریب میں شریک نہیں ہوئی تھی۔

میں شادو کے خلاف غصے اور ہاشمی صاحب کے خلاف نفرت کے جذبات میں بھرا ہوا گھر پہنچا اور بستر پر لیٹ کے چھت کو گھورتا رہا۔ رئیس پہلے ہی گہری نیند میں تھا ورنہ وہ مجھ سے کچھ بھی پوچھتا' میں اپنا سارا غصہ اس پر نکالنے کے لیے اس سے لڑ پڑتا۔

میں بہت دیر تک اپنا خون جلاتا رہا اور سونے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کی بیگم کو سکون آور گولیاں کھاتے دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ یہ گولیاں میری مدد کر سکتی ہیں۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر ابھی سے میں نے ایسے مصنوعی سہاروں پر جینے کی عادت ڈال لی تو پھر ساری زندگی میں کسی نشے باز کی طرح معذور اور محتاج رہوں گا۔ ابھی تو میرے مسائل بھی ایسے نہیں۔ بہت کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور جو باقی ہے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے شادو کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شادو میری خیرخواہ ہے اور میرے ساتھ ہے پھر پریشانی کیسی۔

بالآخر میری کوشش کارگر ہوئی اور رات کے آخری پہر میں نیند کی مہربان آغوش نے مجھے ذہنی انتشار سے نجات دلا دی۔ میری آنکھ دیر سے کھلی۔ گھڑی دیکھے بغیر دن کے اجالے سے میں نے وقت کا اندازہ کر لیا۔

مجھے باہر سے ماسی ہیر کی آواز سنائی دی "ہائے اور بابا۔ اب کیا ہو گا۔"

ڈاکٹر رانجھا نے اسے ڈانٹا "شور نہ کر' کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اوئے یہ آج کل کے منڈے کڑیاں ہیں۔ ہمارا نیم اور تھا پھر ان کے ماں پیو نہیں ہیں۔ ہمارے بچے نہیں تھے۔ تو سمجھ لے کہ پلے پلائے جوان دھی پتر مل گئے۔ ان کو سنبھالنا ہمارا کام ہے اب۔ وہ بھی کتنا خیال کرتے ہیں۔ ناصر نہ ہوتا تو آج بیٹھے ہوتے کہیں جھونپڑی ڈالے۔ ایک دن خوار نہیں ہونے دیا اس نے۔"

"اسی لیے تو فکر ہے مجھے۔ اسے پتا چلے گا۔"

"او سب ٹھیک ہو جائے گا' انشاء اللہ۔"

میں گھبرا کے باہر نکلا تو ہیر کی میری طرف پشت تھی۔ رانجھے نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ میری طرف پلٹی اور پھر اس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

○☆○

میں نے پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "ای ایس پی۔ ایسا لگتا ہے کہ ذاتی طور پر بھی تم میری گرفتاری کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو۔"

اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "سر۔ ہم آرڈر پر عمل کرتے ہیں۔ کل آپ آرڈر کرو گے۔۔۔"

"کل کی بات مت کرو" بیرسٹر سلطان محمود نے آگے بڑھ کے کہا "مجھے دکھاؤ یہ وارنٹ۔"

غلام محمد نے وارنٹ ان کو دکھا دیے۔ ظاہر ہے وارنٹ غلط نہیں ہو سکتے تھے ورنہ وہ اتنے اعتماد کے ساتھ نہ آتا۔

"ہم غیر قانونی کام نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "REALLY۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کے۔ ملک کو تم جیسے فرض شناس اور ایماندار افسروں کی سخت ضرورت ہے۔ ویسے کیا تمہیں کچھ یاد ہے' زیادہ پرانی بات نہیں ہے اس لیے یاد ہو گی' اس سے پہلے بھی تم میرے گھر پر آئے تھے۔"

اس نے سخت لہجے میں کہا "ہم اپنی خوشی سے کہیں بھی نہیں جاتے۔"

"لیکن جاتے ہو تو خوش خوش لوٹ جانے کا راستہ کھلا رکھتے ہو۔ کیا خیال ہے' ہم بار کے کیفے ٹیریا میں ایک کپ چائے۔۔۔"

"جی نہیں۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ مجھے افسرانِ بالا کو بتانا ہے کہ گرفتاری کس وقت عمل میں آئی" اس نے کہا۔

"کیا گرفتاری کے لیے ہتھکڑی لگانا بھی انہی افسران کے حکم پر ضروری ہے؟" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا۔

"وکیل صاحب۔ آپ جرم کی نوعیت سمجھنے کے باوجود ایسا سوال کرتے ہو۔ یہ دہرے قتل کی واردات ہے۔ کوئی سیاسی مقدمہ نہیں ہے" وہ بولا۔

اس کا موڈ بہت واضح تھا۔ آج وہ نمک مکا کی بات بھی سننے پر راضی نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہ بے اختیار نہ ہوتا تو مجھ سے ایک اور چیک وصول کرنے کا موقع نہ گنواتا۔ وہ افسرانِ بالا کی وجہ سے مجبور تھا۔ افسرانِ بالا کیوں مجبور تھے'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سوال کا جواب شاید مجھے کوئی نہ دیتا چنانچہ میں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھادیے اور سپاہیوں نے ہتھکڑی لگا کے مجھے گاڑی میں بٹھادیا۔

اس وقت تک میرے تھوڑے بہت حامی شرمندگی سے بچنے کے لیے غائب ہوگئے تھے۔ مخالفین ابھی تک کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے کچھ خوشی سے ناچنے لگے اور حلق سے گیدڑوں جیسی آوازیں نکال کے چلانے لگے۔

"اوئے دیکھو دیکھو' چیئرمین صاحب کی شاہی سواری جارہی ہے۔"

کسی نے قہقہہ مارا "کیا شان ہے سرکاری مہمان کی۔"

تیسرا بے سُرے لہجے میں گانے لگا "جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔"

چوتھے نے اس کے ساتھ سُر ملایا "چیئرمین کا جنازہ جارہا ہے۔"

اشرف نے کہا "سر۔ آپ کتوں کو بھونکنے دیں۔"

میں نے کہا "کتوں کو بھونکنے سے کون روک سکتا ہے اشرف۔"

بیرسٹر سلطان محمود کے ماتھے پر تشویش کی شکنیں گہری ہوگئی تھیں "آپ بھروسا رکھیں۔ انشاء اللہ کل ہی ضمانت ہوجائے گی۔"

گاڑی چلنے لگی تو مخالفوں کے ہجوم سے قریشی اور شمس صاحب کا مسکراتا چہرہ برآمد ہوا۔ شاید وہ اسی لمحے کے انتظار میں ابھی تک روپوش تھے۔ گزشتہ رات اپنی معطلی اور برطرفی کے احکامات انہیں رئیس نے زبردستی وصول کرادیے تھے اور اس وقت ان کے لیے اخبارات کو تردیدی بیان جاری کرنا یا پریس کانفرنس بلانا ممکن نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر عملی اقدامات میں مصروف ہوگئے۔ رات بھر میں انہوں نے میرے سب مخالفین سے رابطہ کیا۔ ان میں کلیدی کردار ادا کرنے والے یوتھ فورس کے باغی اور مشتعل نوجوان تھے جن کو پارٹی سے صاف کرنے کا فیصلہ کرکے میں نے سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ ان کا ساتھ عمور راز گروپ نے بھی دیا تھا اور طاقت کے توازن کا پلڑا ان کی طرف جھکنا دیکھ کے راتوں رات بے پیندے کے سارے لوٹے بھی ادھر ہی لڑھک گئے تھے۔ انہوں نے اصول' قانون' شرافت اور اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بدمعاشی اور طاقت کے بل پارٹی آفس کا قبضہ حاصل کرلیا تھا اور ریورس کی ڈوریاں بھی ہلادی تھیں۔

وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ میں نے ان کے ساتھ کون سا شرافت کا سلوک کیا تھا۔

شمس نے میری طرف دیکھ کے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنایا۔ اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر عدالتی فیصلے کے بعد بھی موجود تھے اور اگر پولیس نہ آتی تو وہ مجھے گھیر کر اس صورتِ حال پر میرے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ ان کے قریب آنے کی کوشش بھی پولیس نے ناکام بنادی مگر دور سے انہوں نے میری رخصتی کے منظر کی قاتل دید تصاویر اتاریں۔ انہوں نے شمس اور قریشی کی تصویریں بھی اتاریں۔ ان کے فتح کے اشارے کا جواب میں نے بھی خالص سیاسی لیڈروں کے انداز میں مناقفت سے مسکراتے ہوئے دیا۔ وی فار وکٹری۔ سب یہی کہتے ہیں تو میں ابھی سے کیوں مایوسی کا اظہار کروں۔

غلام محمد نے مجھے حوالات میں عام مجرموں کے ساتھ بند کرانے کے بعد انچارج کو بہ آوازِ بلند ہدایات دیں تاکہ میں بھی سن لوں۔ "دیکھو تھانے کے آس پاس کسی قسم کی سیاسی سرگرمی نہ ہو۔ اگر کوئی مظاہرہ کرے یا نعرے بازی تو اسے بھی پکڑلو۔ آئی جی صاحب کا کہنا ہے کہ شرافت کی زبان نہ سمجھنے والے کے لیے 'ڈنڈا' تم سے کوئی ہوئی تو یہی ڈنڈا۔"

اس نے کہا "میں سب سمجھتا ہوں سر!"

"لازم خطرناک ہے۔ سیاسی اثر رسوخ استعمال کرے گا مگر یہاں تم کو صرف دہرے قتل کی واردات کی تفتیش کرنی ہے۔ پارٹی کا کوئی لیڈر کوئی اخباری نمائندہ بلکہ گورنر بھی آجائے تو بھگادو۔ کسی سے اس کی ٹیلی فون پر بات نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر۔"

"اور مجھے تفتیش کا رزلٹ چاہیے۔ کل صبح تک۔"

"سب پتا چل جائے گا سر۔ آلۂ قتل بھی برآمد کرلوں گا میں اور قتل کی وجہ بھی معلوم ہوجائے گی۔"

میں نے سب سن کے بھی اَن سنی کردی۔ پولیس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اشرف آگیا تھا اور بیرسٹر سلطان محمود بھی پہنچ گیا تھا۔ اشرف کو انہوں نے تھانے کے اندر ہی نہیں آنے دیا مگر بیرسٹر سلطان محمود سے ایس پی غلام محمد کی بہت گرما گرمی ہوئی۔ اس نے دھمکی دی "مجھے اپنے مؤکل کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنانے کے کیس میں ملاقات کی اجازت نہ دی گئی تو میں ابھی ہوم سیکریٹری' وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اعظم سے صدر تک سب کو فیکس بھیج دوں گا۔ آئی جی صاحب کا نام لے کر مجھے مت ڈراؤ' میں یہاں سے سیدھا اس کے آفس پہنچ جاؤں گا اور وہاں نہ ملے وہ تو گھر۔ کیا سمجھتے ہو آخر تم

غلام محمد کچھ نرم پڑا "چلیں آپ ان سے فون کرادیں تو میں آپ کو اجازت دے دوں گا۔ ابھی تو مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری ہے۔ کس قاعدے قانون کے تحت کررہے ہو تم یہ سب کارروائی۔" سلطان محمود بگڑگیا۔ "یہاں جتنے حوالاتی ہیں' کیا ان سے کوئی ملنے نہیں آتا؟ پیسے لے کر ملاقاتیں کراتے ہو تم دن رات۔"

اچانک اس کی آواز میں ایک زنانہ آواز شامل ہوگئی۔ "یہ کیا ہنگامہ ہورہا ہے سلطان صاحب۔ عدالت کے بجائے آپ تھانے میں بھی لڑنے لگے۔"

"او ویری گڈ۔ آپ بڑے وقت پر آئیں مس شبنم!" اس نے کہا "یہ مجھے کچھ بتانے پر آمادہ نہیں اور نہ مجھے شاہ عالم سے ملنے دے رہے ہیں۔"

شبنم کا نام سن کے ہی میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ میں بے اختیار اٹھا اور حوالات کی سلاخیں تھام کے کھڑا رہا۔ آخر وہ کیوں آئی تھی۔ میری رسوائی کا تماشا دیکھنے یا میرے خلاف انتقام کی خواہش کے اسباب سے فائدہ اٹھانے کے لیے؟ اس کی آمد کو میں کسی طرح بھی دیری گڈ نہیں مان سکتا تھا۔

شبنم نے کہا "میں نے سنا ہے کہ شاہ عالم پر دو ممتاز تاجروں کے قتل کا الزام ہے۔ خادم مرزا اور خالد عثمان؟"

"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے" ایس ایچ او بولا۔

"رپورٹ کس نے لکھوائی ہے؟" شبنم نے کہا۔

"بتایئے۔"

غلام محمد نے کہا "ایک کی بیوی نے' دوسرے کے ڈرائیور نے۔ آپ ایف آئی آر کی نقل دیکھ لیں۔ وکیل صاحب کے پاس ہے۔"

"ایف آئی آر بھی تم نے لکھی ہوگی نا۔ گلو چاچا' تم ہی بتادو تو اچھا ہے۔" شبنم نے کہا۔

"مس شبنم' پلیز۔ یہاں آپ کی میری رشتے داری نہیں ہے۔"

"رشتے کیا کہنے سے ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ رشتے آخر کام کب آتے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر۔۔۔ تم تو جانتے ہو کہ ہم ایک دوسرے کے ہمیشہ کام آتے ہیں۔ پردے کی بات کسی کے سامنے نہیں کرتے۔ میں خاندانی معاملات کو بالکل نہیں چھیڑوں گی۔" شبنم کے الفاظ میں بلیک میلنگ کی دھمکی بہت واضح تھی۔

"آخر کیا فائدہ ہے اس کا شبنم۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو۔ کہ میں تم کو گیٹ آؤٹ کہہ دوں۔"

"تمہارے کہنے کا میں برا نہیں مانوں گی اور جاؤں گی بھی نہیں۔ دھکے دے کر نکال سکتے ہو یا اٹھا کے باہر پھینک سکتے ہو تو کوشش کرکے دیکھو۔ کچھ اختیارات میرے پاس بھی ہیں۔ پہلے تم کرو جو کرسکتے ہو پھر میری باری آئے گی۔ کیا کہتے ہیں انگریز کہ کسی پر ہنسنا تو آسان ہے' دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔"

"میں تم سے درخواست کررہا ہوں' میری مجبوری کو سمجھو۔"

"میں ایک وعدہ کرسکتی ہوں' گلو چاچا۔"

وہ مشتعل ہوگیا "یہ کیا بکواس ہے۔ تم سب کے سامنے بے عزت کررہی ہو مجھے۔"

شبنم نے معصوم لہجے میں کہا "بے عزت! میں تو سب کو بڑے فخر سے بتارہی ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کتنا قریبی رشتہ ہے۔ جیسے مجھے تم پر فخر ہونا چاہیے' مگر نہیں ہے۔ ایسے ہی تم بھی اپنی اس بھتیجی کو گھاس نہیں ڈالتے جو اتنی چھوٹی سی تھی جب تم نے وردی پہنی تھی اور گھر آکے مجھے گود میں اٹھالیا تھا۔ یاد ہے نا۔ اتنا ڈر گئی تھی میں کہ۔۔۔ میں نے تمہاری نئی وردی بھگودی تھی" وہ ہنس پڑی۔

اس نے کہا "تم کیا چاہتی ہو آخر؟"

"کچھ نہیں۔ میں شاہ عالم سے بات کروں گی۔ آف دی ریکارڈ۔ PROMISE۔"

"میں تم پر اعتبار کیسے کروں۔ تمہارے پاس ہوگا کوئی چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر' تمہارے بیگ میں" غلام محمد بولا۔

"بیگ تم رکھ لو۔" وہ بولی "اور تلاشی لینا چاہو جسمانی تو تمہاری مرضی۔"

"نہیں۔۔۔ لاؤ یہ بیگ دکھاؤ۔۔۔ اور دیکھو' تم اکیلے میں بات کروگی۔ کوئی اور نہیں ہوگا جسے تم بعد میں گواہ بنالو۔"

بیرسٹر سلطان محمود نے احتجاج کیا "میں پوچھتا ہوں یہ کہاں کا قاعدہ قانون ہے کہ صحافی کو اجازت دی جائے اور وکیل کو روک دیا جائے۔۔۔ کیا حیثیت ہے اس ایف آئی آر کی جب نہ کسی کی لاش ملی ہے اور۔۔۔"

"لاش بھی مل جائے گی۔ تفتیش میں سب پتا چل جاتا ہے۔ کل رات شاہ عالم خادم مرزا کے ساتھ تھا۔ کسی کاروباری معاملے میں ان کا جھگڑا ہوا۔ شاہ عالم نے خادم مرزا کے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو مارا۔ ناک آؤٹ کردیا اور خادم کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔"

"مجھے ہنسی آتی ہے تمہاری بات پر۔ شاہ عالم نے کیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناک آؤٹ کردیا دو افراد کو؟ ان میں ایک باڈی گارڈ تھا۔ وہ مسلح بھی ہوگا۔"

"وہ جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ ماہر ہے مارشل آرٹ کا۔"

شبنم ہنس پڑی "اچھا؟ یہ تو خود شاہ عالم کے لیے بھی انکشاف ہوگا کہ وہ مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔"

"ہنسنے کے بجائے اس سے پوچھنا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ وہ اپنی گاڑی میں خادم کے علاوہ ایک اور بزنس پارٹنر عثمان کو لینے اس کے گھر گیا تھا۔ گاڑی اس وقت عثمان کا ایک آدمی چلا رہا تھا۔"

"وہ گاڑی شاہ عالم کی تھی؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ معلوم نہیں یہ کہاں جارہے تھے۔ آدھے راستے میں شاہ عالم کو فون موصول ہوا اپنی وائف کا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔ شاہ عالم فوراً واپس آیا اور اپنے گھر پہنچ کے اس نے گاڑی ایک پولیس ڈرائیور کے سپرد کردی کہ تینوں کو گھر پہنچا کے گاڑی واپس لے آئے۔ ایک خادم مرزا دوسرا خالد عثمان اور تیسرا ان کا ڈرائیور۔"

"کیا نام ہے اس ڈرائیور کا؟" شبنم نے کہا۔

"وہ ڈرائیور بھی ہے اور باڈی گارڈ بھی" غلام محمد نے کہا۔ "پولیس مین نے یہ بیان دیا ہے کہ راستے میں ان کی گاڑی کا راستہ ایک کار نے روکا۔ وہ شیراڈ کار تھی۔ اس میں سے چار افراد اترے جو سب نقاب پوش تھے اور وہ سب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سوائے پولیس ڈرائیور کے۔ اسے انہوں نے کہا کہ گاڑی واپس لے جاؤ۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ یہ سب شاہ عالم کا ڈراما تھا۔"

"ہاں۔ یہی شک ہے ہمارا کیونکہ گزشتہ رات ان کی کسی کو کوئی ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو شاہ عالم کو فون ہی نہیں کیا تھا۔ یہ ہم ان سے پوچھ چکے ہیں۔ خادم مرزا کے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو ایک گھنٹے بعد ہوش آیا تو انہوں نے ادھر اُدھر معلوم کیا۔ خالد عثمان کے گھر سے معلوم ہوا کہ شاہ عالم وہاں گئے تھے اور انہیں بھی ساتھ لے گئے۔"

"ایس پی صاحب۔" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا "اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ خادم مرزا اور خالد عثمان ضرور گئے تھے شاہ عالم کے گھر پھر وہ اپنے گھر چلے گئے۔ کسی لوگوں کو کسی نے اغوا کرلیا۔ اس سے نہ یہ ثابت ہوتا کہ اغوا کرنے والے شاہ عالم کے آدمی تھے۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ قتل تو کسی صورت ثابت نہیں ہوتا۔"

"مگر ثبوت اور شہادت کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ جیسے انہوں نے دو بندوں کو مارا۔"

"کیسے مارا؟ خالی ہاتھوں سے" شبنم نے کہا "یہ کیسی فضول بات ہے۔ شاہ عالم کے بارے میں اگر ایک شخص بھی کہہ دے کہ وہ مارشل آرٹ جانتا ہے تو وہ مجرم۔ اس کی بیوی سے پوچھو۔ مجھ سے پوچھو۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں جھوٹ بول رہے ہوں۔ خادم مرزا ڈرائیور اور باڈی گارڈ۔"

"پولیس مین نے جو بتایا ہے۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "پھر وہی احمقانہ بات۔ اس سے صرف اغوا ثابت ہوتا ہے۔ دہرے قتل کی واردات کیسے ہوگئی۔"

"احمق تم خود ہو" غلام محمد گرم ہوگیا "اگر ایک شخص کی بیوی یہ رپورٹ لکھواتی ہے کہ اسے شک ہے بلکہ یقین ہے کہ اس کے شوہر کو اغوا کرکے قتل کردیا گیا ہے اور اسے ساتھ لے جانے والا شاہ عالم تھا۔ تو کیا ہم تفتیش بھی نہ کریں۔ یہ جھوٹ ہوگا تب بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں ہیں۔ زندہ ہوں گے تو سامنے آجائیں گے۔"

"ویری گڈ ایس پی۔ اب مجھے بہت کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ کتنے بوکس گراؤنڈ ہیں جن پر تم نے شاہ عالم کو گرفتار کیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ یہ سب میں جس بے باکی سے درخواست میں بتاؤں گا اور اس کی گواہ ہوں گی مس شبنم۔ اگر کل ہی ضمانت نہ ہوجائے تو کہنا۔ یہ ایک سازش ہے میرے مؤکل کے خلاف۔ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا اور اس کی درجاتی آواز سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ چلا گیا ہے۔

"تم مشکل میں پڑجاؤ گے گلو چاچا۔ یہ کیس بنتا ہی نہیں..... لیکن یہ بھی مجبوری ہے تمہاری کہ آئی جی صاحب کی خواہش کا احترام کرو۔ نوکری جو کرنی ہے تمہیں اور ابھی کچے ایس پی ہو تم" شبنم بولی۔

"اور کسی وجہ سے چاہے نہ جائے مگر تمہاری وجہ سے ضرور جائے گی میری نوکری۔" وہ چراغ پا ہو کے بولا "تم بہت ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو اپنے عورت ہونے کا، صحافی ہونے کا اور۔"

"اور کیا۔ تمہاری بھتیجی ہونے کا۔" شبنم ہنسی "یہ بتاؤ کہ ایسا کون ہے جو موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا ہو۔ تم نے کب کہاں کیسے فائدہ اٹھایا۔"

"چلو بند کرو یہ بکواس۔ ادھر آجاؤ، میں بلاتا ہوں شاہ عالم کو مگر دیکھو، صرف پانچ منٹ دوں گا میں۔"

"پانچ تم دو گے، پانچ میں لوں گی۔ دس منٹ کافی ہیں۔"

چند منٹ بعد ایک کانسٹیبل نے مجھے حوالات سے نکالنے کے لیے تالا کھولا "آؤجی باہر۔ انچارج صاحب بلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر میں نہ آؤں تو، فرض کرو میں کہوں کہ انہیں یہاں بھیج دو حوالات میں۔ کبھی سلاخوں کے ادھر آکے بھی تو دیکھیں وہ۔"

کانسٹیبل نے افسوس سے سرہلایا "شرافت کا زمانہ ہی نہیں ہے۔"

میں نے باہر آکے کہا "کیا تم مجھے بتاسکتے ہو کہ تاریخ میں شرافت کا زمانہ کب آیا تھا؟"

وہ مجھے عقبی حصے کے ایک کمرے میں لے گیا "جاؤ۔ اندر ہیں انچارج صاحب۔" اس نے کھلے دروازے کے پاس رک کے کہا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو نیم تاریکی میں مجھے صرف ایک چارپائی دکھائی دی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ سرہانے کی طرف ایک میز پر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ یہ غالباً انچارج صاحب کے آرام اور قیلولے کی جگہ تھی۔

شبنم دوسری طرف کرسی پر بیٹھی تھی۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے اپنے حسن و شباب کی ساری فتنہ سامانی کے ساتھ دیکھا۔ اس نے مردانہ کالر والی سیاہ قمیص پہن رکھی تھی جس کا اوپر والا بٹن دانستہ کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا یا موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ جینز اور جوگرز میں وہ صحافی سے زیادہ ایتھلیٹ لگتی تھی۔ اس کے بال آج پھر پھسلنے بکھرنے اور سمٹ کر مچلنے کے لیے بے قرار تھے۔

میں اس کے سامنے رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔" اس نے مسکرا کے کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

میں نے کہا "ہیلو۔ یو آر لکنگ....."

"سو بیوٹی فل۔ آئی نو کہ تم یہی کہو گے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے دیکھ کر تم حیران نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔ تم کو ایک دن آنا ہی تھا۔ اگر میں کہوں کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"مجھے صرف دس منٹ ملے ہیں۔ تم سے کچھ پوچھنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اس میں سے پانچ مجھے دے دو۔ مجھے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"اچھا تم پہلے پوچھ لو۔"

"تم نے خواب آور گولیاں کیوں کھائی تھیں، میرے گھر میں؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایسی حرکت کرسکتی ہوں؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟"

اس نے کہا "نہیں۔ تم خود سازش کے ایک جال میں پھنس چکے ہو اور اتنے مجبور ہو کہ اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ "کیا تم کسی پرنس نام کے شخص کو جانتی ہو؟"

"ہاں۔ پرنس کو بھی، ٹائیگر کو بھی" وہ بولی "تمہارے بزنس پارٹنر ہیں وہ۔"

میں نے کہا "میں نے انہیں قتل نہیں کیا، وہ زندہ ہیں۔"

"یعنی تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "شبنم۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد..... جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ تم کون ہو؟"

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ میں شاہ عالم ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔" وہ بولی "مگر میں یہ ثابت نہیں کرسکتی۔"

"پھر تم کیوں ملنے آئی ہو مجھ سے؟"

"میں نے سوچا، شاید مجھے سچ بتادو اور....."

سچ! کیا میں اس سے سچ بول سکتا ہوں؟

ایک لمحے کے جذباتی تذبذب پر فوراً عقل کے تقاضے غالب آگئے۔ وہ میرے ہاتھوں زخم خوردہ عورت تھی جو ناگن سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ انتقام کے پاگل کردینے والے جذبات نے اسے میری جان کا دشمن بنادیا تھا۔ وہ کوئی عام عورت بھی نہیں تھی۔ سچ بول کے اپنی کمزور رگ اس کے ہاتھ میں دینے کا مطلب تھا، خودکشی۔ پولیس کے سامنے کیے گئے اعتراف جرم سے مکرنا آسان تھا مگر اس کے سامنے حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد میں جیتی ہوئی بازی ہار دیتا۔

اس نے کہا "کیا سچ بولنے کے لیے بھی سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے تمہیں؟ جھوٹ بولنے کے لیے یقیناً سوچنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے نزدیک سچ آخر کیا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سچ کبھی دو نہیں ہوتے۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ سچ ہے لیکن تم جذبات کی پٹی باندھ کے دیکھ رہی ہو۔ تمہیں مرضی کا سچ چاہئے خواہ اس کی بنیاد کوئی نہ ہو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس کے علاوہ تم کیا کہہ ہو۔ یہی ایک الزام ہے مجھ پر؟"

"اسے الزام صرف تم کہتی ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔ میں کسی کو قائل نہیں کر سکتی کہ خدا کو وجود کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں' ایسے میرا یقین ہے' کسی ثبوت کے بغیر بھی میں جانتی ہوں کہ سچ ہے۔"

"تم اتنی بڑی صحافی ہو۔ بال کی کھال نکالنا تمہارا شوق پیشہ ہے اور اس معاملے میں تو جنون بن گیا ہے۔ تم بار بار سے کیوں پوچھنے آجاتی ہو کہ میں کون ہوں۔" میں نے سے کہا "جاؤ گڑے مردے پھر اکھاڑو۔ دو بار عدالت حکم سے اکھاڑے جا چکے ہیں۔ تیسری کوشش تم خود کرو شاہ عالم کی لاش پر وہ سراغ تلاش کرو جو کسی اور کی نظر دیکھ پائی۔ نہ اس کی بیوی اور نہ میڈیکل بورڈ کے تم ان سے زیادہ جانتی ہو نا۔ جو کسی کی آنکھ نے دیکھا تھا' وہ تمہیں معلوم ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ میں یہی کروں گی۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا "کیا؟ یعنی تیسری بار پوسٹ مارٹم ل ہو گئی ہو۔ قانون کو کھیل سمجھ رکھا ہے تم نے۔ تم خود بن جاؤ گی۔"

"میں پہلے ہی تماشا بنی ہوئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے لوگ چتے ہیں میرے بارے میں اور کیا کہتے ہیں۔۔۔ میرے اور پیٹھ پیچھے کیا باتیں کرتے ہیں" اس نے کہا "مجھے پروا نہیں۔"

"اس بار عدالت یقیناً تمہیں دماغی معائنے کے لیے سپتال بھیج دے گی۔"

س نے کہا "مجھے کسی عدالت یا قانون پر بھروسا نہیں ہے لیے میں ان کا سہارا نہیں لوں گی۔"

"پھر کیا کرو گی۔ خود پوسٹ مارٹم کرو گی۔ خود لاش کھود لو گی اور گھر لا کے محدب عدسے کی مدد سے دیکھو گی کہ کہاں تمہارے عشق کی نشانیاں باقی ہیں۔ شاید مہینوں ی اس کے ڈھانچے سے تمہارے بدن کی خوشبو آئے۔ تمہارے لبوں کی لالی مل جائے۔ اس کے لہو کے خاک جانے والے ذرات کا تجزیہ کرنے سے تمہاری محبت کے جراثیم دریافت ہو جائیں۔ تم باہر سے D.N.A ٹیسٹ بھی کرا سکتی ہو۔"

وہ مجھے خالی چہرے اور ویران آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔

میں نے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پالیا "آئی ایم سوری۔ میں غصے میں اخلاق اور شائستگی کے تقاضے بھول گیا تھا۔"

وہ چونکی "شاہ عالم نے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ۔۔۔ ایک وحشی تھا۔ بعض اوقات انسانیت کے درجے سے گر کے حیوان بن جاتا تھا مگر وہ اپنے کو اشرف المخلوقات سے بھی زیادہ سمجھتا تھا۔ سپرمین یا فرشتے کے سب اوصاف رکھنے والا۔ تمام بشری خامیوں سے مبرا۔ یہ غور نہیں کیا کبھی تم نے اس کا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس کی ذات مجموعۂ صفات ہے۔ وہ ایک مثالی مو ہے' مثالی شوہر' مثالی سیاست داں' مثالی انسان۔ چنانچہ یہ بات جو تم نے ابھی کہی 'شاہ عالم نہیں کہہ سکتا تھا۔ کئی بار اس نے مجھے سرِعام ذلیل کیا۔ میری عزتِ نفس کو طوائف کی سطح پر لا کے رسوا کیا۔ مجھے نشے میں نہیں' ہوش میں گالیاں دیں۔ مارا۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ شاہ عالم جتنا پاگل تھا' اس سے ہزار گنا پاگل یہ لڑکی تھی جو آج میرے سامنے اپنی تذلیل کا ماجرا بیان کرتے ہوئے ذرا بھی احساسِ ندامت سے دوچار نہ تھی۔ اس کی صاف گوئی میں کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ وہ جس سے محبت کرتی تھی' وہ کیسا تھا' وہ جانور تھا' وحشی تھا۔ بداطوار تھا یا بدکردار تھا مگر اس کا محبوب تھا چنانچہ یہ شکوہ نہیں' اعترافِ حقیقت تھا۔ لوگ تو پتھر کی پرستش کرتے ہیں' شیطان کے پجاری ہیں۔

"یہ الفاظ بڑے اجنبی لگتے ہیں مجھے۔ الفاظ ہی نہیں' تمہارا رویہ بھی' تمہارے جھوٹ سے میل نہیں کھاتا۔ بے شک وہ اچھا ایکٹر بھی تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن الگ تھا اور وہ موقع محل کی مناسبت سے اپنی شخصیت بدلنے پر بھی قادر تھا۔۔۔ مگر۔۔۔"

میں نے کہا "مگر کیا۔۔۔؟"

"تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ تمہارا ظاہر تمہارے باطن سے الگ نہیں ہے۔ بے شک تم اسے الگ دکھانے کی کوشش کرتے ہو۔ تم بھی اچھے ایکٹر ہو۔ شاہ عالم کا رول خوب نبھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "پلیز مس شبنم! تم جو چاہو سمجھو۔ جو چاہو کرو' بس اپنے ساتھ میرا دماغ خراب مت کرو۔"

وہ مسکرانے لگی "مس شبنم؟ شاہ عالم تو مجھے شبو کہتا تھا۔"

میں سنبھل گیا "ہم خلوت میں نہیں ہیں۔ یہ تھانہ ہے۔ آس پاس ہماری گفتگو کا ہر لفظ سننے والے۔۔۔۔ گوش بر آواز ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ تم مجھ سے بحث کر کے مجھے قائل کرنے نہیں آئی ہو کہ میں اعترافِ جرم کروں۔"

"اعترافِ جرم سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟"

"رائٹ۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہاری نظر میں جو سراب ہے' وہ دنیا کو بھی حقیقت لگے۔ تمہارا وہم تمہارا مسئلہ ہے۔"

"ہاں۔ اگر کبھی اکیلے میں تم مان ہی جاؤ کہ تم شاہ عالم نہیں ہو تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ سیکڑوں بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک اژدہا ہے ابھی۔ پھر اس اژدہے کے ان گنت بچے ہو کے ہر سمت سے پھنکارتے ہوئے آجائیں گے۔ تم کون تھے' کیا تھے' کہاں تھے۔ شاہ عالم کیوں بنے اور کیسے بنے۔"

"کوشش جاری رکھو۔ شک اور وہم کے خود رو سنپولیوں کو پیدا کرتی رہو اور مارتی رہو۔ یہ زندگی تمہیں شاید کم پڑ جائے۔ ابھی تک تو تم اندھیرے میں ہو اور تمہاری آنکھوں پر پٹی ہے۔ تم صرف محسوس کر سکتی ہو کہ تمہارے ہر طرف شک اور وہم کے کالے ناگ ہیں جن کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وہ تمہیں ڈستے رہیں گے۔ آزار دیتے رہیں گے اور ان کا وِیا ہوا زہر تمہارے خون میں آگ بھرتا رہے گا۔ ابھی وقت ہے شبنم' پٹی اتارو اور باہر روشنی میں آجاؤ۔ تم حسین ہو' ذہین ہو اور۔۔۔ بہت اچھی ہو۔ کیوں اپنے آپ کو ضائع کرتی ہو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ فرض کرلو کہ شاہ عالم مر گیا" میں نے کہا۔

"کاش میں ایسا فرض کر سکتی۔"

"تو پھر جاؤ' تم بھی مر جاؤ۔" میں نے جھنجلا کے کہا "اس کی قبر میں جا کے لیٹ جاؤ۔ اس کی لوحِ مزار سے سر ٹکرا کے جان دے دو۔ تمہاری روح کو سکون تو مل جائے گا۔ اگر ایک ہی آدمی کے لیے زندہ تھیں تم تو اب کیا کرو گی' زندہ رہ کے۔ اگر شاہ عالم طبعی موت نہیں مرا تو تمہارے سامنے ضرور مر گیا ہے۔ تمہارے لیے اس کے جذبات وہ نہیں رہے۔ تمہاری کوئی ضرورت نہیں رہی اسے۔ وہ اجنبی ہو گیا ہے اچانک۔ اس حد تک کہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تمہاری زندگی بالکل بے مصرف ہو گئی ہے' بے مقصد ہو گئی ہے اور ناممکن ہو گئی ہے تو اپنی مشکل بھی آسان کرو اور دوسروں کی بھی۔ جگہ خالی کرو دوسروں کے لیے تاکہ کوئی اور صحافی تمہارے مقام تک پہنچے۔ زندگی کی یہ نعمتیں کسی اور کو میسر آئیں۔ تمہاری چھت کا سایہ کسی اور کو ملے۔ جو رزق تمہارا تھا خدا کسی اور کے نام لکھ دے۔ جو زندگی کی قدر کرے اور جینا چاہے۔"

وہ اچانک رونے لگی "اوہ۔۔۔ پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم شاہ عالم ہو۔ اپنی زبان کی گواہی سے انکار کرتے ہو۔ یہ لہجہ' یہ الفاظ' یہ انداز۔ شاید تم شاہ عالم سے نہیں ملے یا بہت کم ملے۔ تم نے اسے صرف دیکھا اور اس کی نقل بن گئے۔ تم نے سمجھ لیا اور سب نے مان لیا کہ نقل بمطابق اصل ہے۔ مگر غصہ ہوا نشہ' آدمی کا جی بے اختیار باہر آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے یہ رونا بند کرو۔ ابھی کوئی اندر آگیا تو نہ جانے کیا سمجھے گا۔ تم ایک صحافی ہو اور ایک ملزم سے نہیں' ایک سیاست داں سے ملنے آئی ہو۔ تمہاری بھی ایک خاص حیثیت اور اہمیت ہے اور میری بھی ورنہ ہمارے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں ہوتا؟"

اس نے اپنے آنسو پونچھے "میں بڑے عذاب میں ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کیسے نکلوں؟"

میں نے اسے تسلی دی "وقت سب سے بڑا غمگسار ہے۔ آہستہ آہستہ سب سکھاوے گا۔ حقائق سے سمجھوتا کرنا بھی۔۔۔ اور زندہ رہنا بھی۔"

"میرا یقین دو مخالف قوتوں کے درمیان کھنچا ہوا تار ہے۔ اس سے زیادہ کھنچاؤ برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک خفیف سے دباؤ سے یہ ٹوٹ جائے گا۔ اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ اپنے یقین کی شکست سے۔ آخر کیا بنے گا میرا۔ میں تمہیں شاہ عالم بھی نہیں مان سکتی۔ یہ بھی نہیں مان سکتی کہ شاہ عالم مر گیا ہے۔ ان میں سے ایک بات کو ماننے کی مجبوری ناگزیر بن گئی تو پھر دوسری بات خود بخود۔ خیر چھوڑو۔"

میں نے نرمی سے کہا "تمہاری بڑی شہرت ہے کہ تم سات پردوں میں چھپائی جانے والی سچائی تلاش کر لیتی ہو۔ INVESTIGATIVE رپورٹنگ سے تم نے بڑی دھاک بٹھا رکھی ہے اپنی۔ کیا یہ ناممکن ہے تمہارے لیے کہ تم خاموشی سے حقیقت کی کھوج میں لگ جاؤ۔ پتا چلاؤ کہ میں جعلی شاہ عالم ہوں تو اصلی کہاں گیا۔ میں نے اس کی جگہ کیسے لی۔ بانک کانگ سے سنگاپور اور کراچی تک کے سفر میں اصل کی جگہ نقل کیسے آگئی۔ اس تبدیلی کے پس پردہ کیا حالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمیشہ ایسی شکست سے ڈرتی ہوں حالانکہ شکست بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ میں شاہ عالم سے ڈرتی رہی اور اپنی محبت کے انجام سے ڈرتی رہی۔ وہ مجھے ذلیل کرتا رہا۔ صرف زبان سے نہیں' عمل سے بھی۔ وہ بار بار مجھے یاد دلاتا تھا کہ میں اس کی جان کا عذاب بن گئی ہوں۔ طوائف بھی پیسہ لے کر چھوڑ دیتی ہے۔ اسے مجھ سے بالکل بھی محبت نہیں ہے۔ وہ ایک وفادار شوہر ہے اور اس کی بیوی مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جھوٹ بولتا تھا وہ۔ یہی سمجھ کے میں سب سختی رہی اور برداشت کرتی رہی جیسے رخشی اسے شوہر سمجھ کے برداشت کرتی رہی۔ نہ کرتی تو کیا کرتی۔ یہی نہیں' وہ دن رات عورتوں کے چکر میں پڑا رہتا تھا۔ عیاش آدمی تھا۔ گھر کی نوکرانی سے اونچے طبقے کی شوقین مزاج خواتین تک وہ کسی کو نہیں بخشتا تھا اور پھر اپنے کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتا تھا۔ ایک بار اس نے اتنا کردی۔ خود بتایا کہ پہلے اس کے مراسم ماں سے تھے۔ تین ماہ بعد بیٹی اس کے چکر میں آگئی۔"

"وہ ایک بلیک میلر تھا" میرے منہ سے نکل گیا۔

"تھا؟" وہ بُری طرح چونکی اور ایک دم کھڑی ہوگئی "یعنی تم نہیں ہو' وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تم میری بات کا مطلب خود نکال رہی ہو۔ میری ذات پر تمہارے الزامات درست ہیں مگر میں اب وہ شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اتنا پیچھے کہ میرے مستقبل پر اس کا سایہ تک نہ پڑے۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "بہت خوب۔ اگر شیطان خود اپنی زبان سے کہے کہ میں اب فرشتہ بن گیا ہوں۔"

"تبدیلی تمہیں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ جب دیکھو گی تو خود ہی اعتبار آجائے گا کہ میں ایک نیا شاہ عالم ہوں۔ اس کی ذات کی ساری خامیاں اور خرابیاں نقشِ ماضی ہوئیں۔ میں فرشتہ بننے کا دعویٰ ہرگز نہیں کروں گا مگر کوشش ضرور کروں گا کہ انسان بن کے دکھاؤں۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں۔۔۔ اس انقلاب کا سبب۔۔۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"سبب خود اللہ پیدا کرتا ہے۔ کہیں بھی کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا کسی پیر کی کرامت سے ہو۔ خدا جب توفیق دیتا ہے تو حرص و ہوس کے پجاری سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کے فقیر ہو جاتے ہیں۔ گناہگار تائب ہو کے پرہیزگار ہو جاتے ہیں۔ بس وقت مقرر ہے ہر کام کا۔"

وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگی "پھر بھی۔۔۔ کوئی وجہ' کوئی حادثہ یا تجربہ۔ احساس کا کوئی لمحہ' کوئی خیال۔۔۔"

میں نے کہا "ہاں مگر یہ وارداتِ قلبی بیان کی محتاج نہیں۔ جو مجھ پر گزری۔ جو میں نے دیکھا اور سمجھا۔ محسوس کیا اور جانا' وہ سب الفاظ میں بتایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر میں کوشش کروں تب بھی۔ جو بات خود میں نہیں سمجھ پایا وہ کسی اور کو کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ بس ایسا ہو گیا۔ کیسے ہو گیا' مجھے نہیں معلوم لیکن تم دیکھ لو گی کہ جسمانی طور پر نہ سہی' عملاً وہ شاہ عالم مر گیا ہے جسے تم جانتی تھیں۔ شاید اس کے جذبات' خیالات' نظریات اور اعمال کی ایک جھلک بھی تمہیں میری ذات میں نظر نہ آئے۔ تم خود بہت ذہین ہو' ذرا خود کو میری پوزیشن پر رکھ کے سوچو۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ دشمن اس کے خلاف ایسی سازش کر سکتے ہیں۔ وہ تو بس زندگی اور موت کا اختیار خدا نے کلی طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس لیے میں بچ گیا۔ لوح جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔ حرفِ مکرر کو زمانے نے خود مٹا دیا۔ میں قاتلانہ حملوں سے بھی بچ گیا۔ تازہ ترین حملہ گزشتہ شب میرے گھر پر ہوا۔ دشمن اب ناکامی کا بدلہ لے رہے ہیں۔ اتنی مشکل سے انہوں نے ایک زبردست شیطانی منصوبہ بنایا تھا۔ شاہ عالم کو مار دو' اس کی نقل اصل کی جگہ رکھ دو۔ جیسے آرٹ گیلریوں میں ماہر جعلساز اصل فن پاروں کو نقل سے ایسے بدل دیتے ہیں کہ ساری دنیا دھوکا کھا جاتی ہے۔ کسی کو تبدیلی کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست نہ ہوتا تو آج میں کسی گمنام مدفن میں نہیں' اپنے شاندار مزار میں منوں مٹی کے نیچے دبا پڑا ہوتا اور اوپر وہ سب عقیدت کا ڈراما چل رہا ہوتا جو تم دیکھ چکی ہو۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں نے اس کے یقین کی بنیادوں میں خفیف سا ارتعاش ضرور پیدا کر لیا ہے۔ اب اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ مجھے جھوٹا کہہ سکے اور میری باتوں کو سفید جھوٹ قرار دے سکے۔ وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

میں نے اس کی کمزوری کے اس لمحے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش جاری رکھی۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ ہے قصے کہانیوں جیسی ناقابلِ یقین سی بات۔ ہم شکل انسانوں کے حادثات اور اتفاقات پر بہت فلمیں بنی ہیں اور بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن زندگی کے حقائق کہیں اس حد تک افسانوی ہو جاتے ہیں کہ خود اس تجربے سے گزرنے والے کو اعتبار نہیں آتا تو کسی اور کو کیسے آسکتا ہے۔ فرض کرو کسی دن ایسا ہی تمہارے ساتھ ہو۔ چونکہ یہ میرے ساتھ ہو چکا ہے اس لیے تمہارے ساتھ ناممکن نہیں ہے۔ اتفاقات بار بار نہیں ہوتے۔ ایک کروڑ یا دس کروڑ میں ایک چانس میرے ساتھ ہوا۔ اتنی جلدی تمہارے ساتھ یہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے دس بیس یا پچاس سال بعد کہیں ایسا واقعہ پیش آئے۔ کمبوڈیا کے کسی گاؤں میں یا سوئیڈن کے مضافات میں تو ہمیں پتا ہی نہیں چلے گا مگر فرض سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آدمی جنت دوزخ کا تصور کر سکتا ہے۔ عذاب' قبر کا' واقعۂ معراج کا' جن بھوت کا۔ پچاس سال بعد ایٹم بم کی تباہ کاری کا۔ تو تم تصور کرو کہ کسی دن اچانک تمہیں آفس جاتے ہوئے یا اپنے فلیٹ سے اغوا کر لیا جائے۔ تمہیں غائب کر دیا جائے۔ عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لیے۔ اور تمہارے دشمن' جو تعداد میں شاید میرے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہیں اور خطرناک ہیں۔ تمہاری جگہ بالکل تم جیسی ایک لڑکی کو بٹھا دیں کہ یہ ہے مس شبنم آغا۔ وہ اپنی گفتگو انداز و اطوار سے تمہارا نقشِ ثانی ہو اور اسے تمہارے ابوبکر آزاد سمیت سب لوگ شبنم مان لیں۔ دوسرے صحافی بھی فرق محسوس نہ کریں تو تمہاری حالت کیا ہوگی۔ کیا گزرے گی تم پر' کس قید خانے میں تم کو ہر روز شبنم آغا کی نئی اسٹوری پڑھنے کے لیے اخبار بھی فراہم کیا جائے اور تمہیں پتا چلے کہ وہ تمہاری جگہ پریس کانفرنس میں شریک ہے۔ لیکن اس شبنم آغا کو لانے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ وہ ایک خطرناک حد تک ایماندار اور ضمیر پرست صحافی عورت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ کسی کی دھونس میں آتی تھی نہ مرنے سے ڈرتی تھی اور نہ خریدی جا سکتی تھی یا خدانخواستہ تم کو مار کر کہیں گاڑ دیتے تو تمہاری روح کو کتنی تکلیف ہوتی۔"

اس نے اپنے سر کو جھٹکا "یہ ناممکن ہے۔ ساری دنیا اندھی نہیں ہے۔ آنکھوں والے عقل بھی رکھتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مگر میرے کیس میں کیا ہوا؟ کیسے مجھے مارا گیا' کیسے شاندار طریقے پر میرا جنازہ اٹھا اور کیا زبردست رونق تھی میرے مزار پر۔ شاندار مزار بھی بن ہی جاتا مگر دشمنوں کی بدقسمتی کہ میں ائرپورٹ سے چھپ کر نکل بھاگا۔ جب انہیں پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ قدرت کا نظامِ انصاف حرکت میں آچکا تھا۔ جعلی شاہ عالم کو لوگوں نے مار دیا غلط فہمی میں اور مجھ پر قاتلانہ حملے ناکام ہو گئے۔ میں بچ گیا اور پھر اپنی شناخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ میری کوشش کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ حضرت علیؓ کا قول تو سنا ہوگا تم نے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔ اگر انسان ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہونا چاہے تو سچ مچ خدائی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دعوئی کردے مگر جہاں وہ فرعون کی طرح غرور میں مبتلا ہوتا ہے کوئی موسیٰ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں اپنی کامیابی پر تکبر کا کیڑا کلبلاتا ہے۔ وہ دولت مندوں کی قوتِ خرید پر رعونت کا شکار ہوتا ہے۔ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اسے موت بھی شکست نہیں دے سکتی۔ وہ یورپ امریکا میں رہتا ہے اور اپنے ذاتی جہاز میں چوبیس گھنٹے نگرانی کرنے والے ماہر ترین ڈاکٹر ساتھ رکھتا ہے جو اسے مسلسل بتاتے رہتے ہیں کہ وہ سو فیصد صحت مند ہے۔ اس کا دل' گردے' جگر اور تمام اعضاء بلڈ پریشر' شوگر پورے جسم کی کیمسٹری سب ٹھیک ہے اور اسے کوئی بیماری لاحق نہیں ہو سکتی۔ تو اچانک کسی سبب اور وجہ کے بغیر دماغ میں یا سینے میں یا خون میں اور ہڈیوں میں سرطان کا ایک خوابیدہ خلیہ بیدار ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان خلیوں کی تعداد دن دو نی رات چوگنی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سزائے موت پر عمل درآمد کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ دن کم ہونے لگتے ہیں اور موت آگے بڑھتی آتی ہے۔ اسے کوئی روک ہی نہیں سکتا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو میرے دشمن بھی سو فیصد کامیابی کے یقین میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور ان کے ارادے انہیں ناقابلِ شکست محسوس ہوتے تھے۔ مگر پھر بات یہ کہ نہ خدا بے اختیار ہے اور نہ بندے کو بے اختیار ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ جب عمارت بنیادوں سے اٹھ کر انتہائی بلندی تک پہنچ گئی اور مکمل ہو جانے کے بعد صرف افتتاح کی رسمی کارروائی باقی تھی کہ زلزلے کے ایک جھٹکے نے اسے زمیں بوس کر دیا۔ یہ جھٹکا میرے دشمنوں کے لیے جتنا بڑا تھا' اس سے زیادہ شدید میرے لیے تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زندگی پر سارا غرور کتنا بے حقیقت ہے۔ میری دولت' میری ہوشیاری' سیاسی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی' موم شناسی اور دور اندیشی۔ سب اس کمپیوٹر کی طرح بے کار ثابت ہوئیں جو بجلی جانے سے ڈیڈ ہو جائے۔ روپوشی کے دوران میں مجھے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان ہوئی۔ میں نے جانا کہ میں کچھ بھی نہیں۔ فقط ایک نام ہوں جسے ایک گولی مٹا سکتی ہے۔ یہ خدا کی دی ہوئی ڈھیل تھی کہ میں حادثات اور خطرات سے بچ کر بڑھتا گیا اور کامیابی کے راستے پر چلتے ہوئے یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب میری عقل اور ذہانت کا کمال ہے کہ خوش قسمتی کا گھوڑا جس پر میں سوار ہوں' اس کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔ ایسا نہیں تھا' ایک ٹھوکر نے مجھے عرش سے فرش پر گرا دیا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میری قبر میں کوئی اور لیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس کی لاش کو دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سوچا کہ یہ میں ہو سکتا تھا۔ اس خیال سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ آخر مجھے کس نے بچا لیا؟ کیا خود میں اپنی کوشش سے محفوظ رہا یا ذہانت سے بچ گیا؟ دولت کی طاقت میرے کام آئی؟ میرے دوست کام آئے؟ نہیں۔ یہ وہی دستِ غیب تھا جس نے ریلوے اسٹیشن پر میری طرف آنے والی گولی کا رخ بدل دیا۔ جس نے فرشتۂ اجل کو پہلے سے بتا رکھا تھا کہ شباہت کچھ نہیں۔ قضا جس کی آئی ہے اسی کو نشانہ بنانا ہے۔ بس ایک بہانہ بن گیا ریلوے کراسنگ پر گاڑی کا رکنا۔ میری جگہ لینے والے کو لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے مار دیا۔ اس حادثے نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ میں اپنا سارا غرور اور تکبر بھول گیا۔ میں کس منہ سے خدا کا شکر ادا کرتا لیکن میں نے تہیہ کیا کہ اب میں اپنی زندگی کی اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں گزرے ہوئے ہر دن کی ہر غلطی کا' ہر گناہ کا اور ہر جرم کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں وہ سب نہیں کروں گا جو شاہ عالم نے پہلے کیا۔ شاہ عالم کو خدا نے ایک نئی زندگی دی تھی۔ میں نیا شاہ عالم بن کے دکھاؤں گا۔"

وہ سحر زدہ سی بیٹھی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ آس پاس کے کمروں سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی اور کان شاید میری گفتگو سن رہے ہوں گے چنانچہ جو کچھ میں شبنم کو قائل کرنے کے لیے بتا رہا ہوں' وہ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ میں بے خودی سے بات کر رہا تھا اور اس وقت میں نے اپنی ساری توانائی کے ساتھ ایک جھوٹ کو منطقی دلیلوں' جذباتی تاثرات اور اندازِ خطابت کی ڈرامائی کیفیت سے سچ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی مزاحمت کمزور ہو رہی ہے اور اس کے یقین کی دیوار میں رخنے نمودار ہونے لگے ہیں۔ یہ میری بہت بڑی کامیابی ہو گی اگر میں آج شبنم کی نظر کے ساتھ اس کے دل کو بھی قائل کر لیتا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں اور مجھ میں جو تبدیلی اسے محسوس ہوئی ہے' وہ حالات کی پیداوار ہے اور میری نیت سے ہے۔ وہ میرے ٹرانس میں آ چکی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ میں نے جو بات کبھی سرِعام نہیں کہی' کسی کو نہیں بتائی' وہ آج صرف اسے خلوت میں بتا رہا ہوں۔ صرف اسے کیونکہ وہ شبنم ہے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتی رہی اور میرے پیچھے کی دیوار کو گھورتی رہی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے شبنم!" میں نے بالآخر تھکے ہوئے لہجے میں کہا "مگر میں تمہارا جذباتی یا جسمانی استحصال نہیں کروں گا۔ جو کچھ آج تک میں نے کیا' اسے بھول جاؤ' میری ہر زیادتی کو اور ظلم کو معاف کر دو۔ وہ ایک خود غرض' ہوس پرست اور کمینہ شخص تھا جس نے تمہاری محبت کو بھی رسوا کیا اور تمہیں بھی۔ تمہارے خلوص کی قدر نہیں کی اور تمہیں عزت نہیں دی۔ میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ ہم اپنے پرانے تعلق کا نیا سفر نیک نیتی کے ساتھ شروع کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کر۔ پہلے کی طرح مگر بے غرض۔ آگے کیا ہو گا' ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی' یہ کہنا قبل از وقت ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن کیا؟" اس نے نظر اٹھائے بغیر جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رفاقت کی بنیاد میں زیادہ استوار بھی ہو سکتی ہیں' تعلق مستقل بھی ہو سکتا ہے۔ ناگزیر بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ پھر کھڑی ہو گئی "بے وقوف مت بناؤ مجھے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "بے وقوف آج تک بنا تا آیا تھا۔ اب نہیں بناؤں گا۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہاری ناقدری کی۔ تمہیں وہ اہمیت نہیں دی جس کا اہل تم نے خود کو بارہا ثابت کیا۔ تمہارے اعتماد کا صلہ میں نے فریب اور عدم اعتمادی سے دیا' پلیز' مجھے معاف کر دو۔"

وہ بگولے کی طرح اٹھی تھی' غبار کی طرح بیٹھ گئی "مجھے۔۔۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔۔۔"

"آ جائے گا' آ جائے گا۔ اس کا انحصار وقت پر ہے جو آنے والا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا "میں کوئی سبز باغ نہیں دکھا رہا ہوں۔ کوئی وعدہ نہیں کر رہا ہوں۔ کوئی جذبات کا جال نہیں بچھا رہا ہوں۔ صرف یہ بتا رہا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے سہارے کی' تمہاری مدد کی کیونکہ میں اکیلا کر دیا گیا ہوں۔ میں کسی اور پر بھروسا نہیں کر سکتا۔"

اس نے پھر کہا "تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "آزما کے دیکھو۔ ایک بار نہیں دس بار۔ میں وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ وقت نے مجھے بڑا اچھا سبق سکھایا ہے۔ اچانک تم میرے لیے ناگزیر اور اہم ہو گئی ہو اس لیے نہیں کہ تم ایک حسین عورت ہو' وہ تو تم ہو۔ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں مگر تم جانتی ہو کہ میں ایک وفادار شوہر کبھی نہیں تھا۔ میں رخشی کا بھی مجرم ہوں۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی۔ یہ میرا جبر تھا کہ اس کو میری شریکِ حیات بن کے رہنا پڑا۔ میں اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے اس پر جھوٹ کا پردہ ڈالے رکھا۔ رخشی سے کہا کہ میرے لیے اس کو قتل کرنا زیادہ آسان ہو گا' طلاق دینا نہیں۔ وہ ڈرتی تھی مجھ سے اور جو ڈرتا ہو وہ غلام ہو سکتا ہے' دوست نہیں ہو سکتا۔ خوف سے محبت پیدا نہیں ہوتی' نفرت جنم لیتی ہے۔ وہ نفرت کرتی ہے مجھ سے۔ مجھے معلوم ہے' میں اس پر مزید ظلم نہیں کروں گا۔ میری بزدلی کی سزا اسے کیوں ملے۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ چاہے تو مجھ سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ سب آنے والے وقت کی باتیں ہیں۔ کیا تقدیر مجھے اس کی مہلت دے گی؟ یہ میں نہیں جانتا' دشمن ہر طرف سے حصار قائم کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں اب پارٹی کا چیئرمین بھی نہیں رہا۔ غداروں نے مجھے آؤٹ کر دیا ہے۔ ان کی سازش بہرحال کامیاب ہو گئی ہے۔ میری زندگی محفوظ نہیں رہی۔ گزشتہ رات میرے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی۔ آج وہ یہاں حوالات میں مجھ پر گولیاں برسا سکتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "تم ضرورت سے زیادہ گھبرا گئے ہو۔"

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا "میں اطمینان سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ آج کوئی چیز میرے قابو میں نہیں ہے۔ کوئی میری سننے والا نہیں ہے۔ میں دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار ہوں۔ صرف اس لیے کہ خود بیوروکریسی نے میرے دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔"

"یہ سب تو ہوتا رہتا ہے سیاست میں۔ ہر بڑے لیڈر کے خلاف قتل' بغاوت' غداری اور ٹوپی سے بھینس کی چوری تک ہر طرح کے الزامات عائد کیے گئے' مقدمات کی تعداد بڑھائی گئی۔"

"میں سب جانتا ہوں لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔ میری سپورٹ ہر پارٹی کی قوت نہیں ہے۔ میرے حامی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ میں ایک عام آدمی رہ گیا ہوں جس کی حمایت میں کوئی بیان نہیں دے گا۔ جس کے حق میں کوئی مظاہرہ نہیں ہو گا۔ کوئی جلوس نہیں نکالے گا۔ مجھے قانون سے مدد حاصل کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ لالچی کتے جو زبانیں نکالے میرے سامنے دُم ہلاتے تھے اور ہڈی پر لپکتے تھے' اب غرا کے مجھے اپنے دانت دکھا رہے ہیں۔"

"تم اتنے بزدل اور کم ہمت کبھی نہ تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "جو تھا' نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔ مجھے تو یہ بھی ناممکن نظر نہیں آتا کہ مجھے یہاں تھانے میں ہلاک کردیا جائے' پولیس مقابلے۔"

"RUBBISH" اس نے کہا "مسٹر صاحب آج ہی ملیں گے تم سے۔ کل صبح بے جا کی درخواست دائر ہوجائے گی۔"

"یہ دہرے قتل کا کیس ہے' یہ مت بھولو۔"

"کیا تم نے دو قتل کیے ہیں؟" وہ بولی "نہیں تو پھر ان کو جو چاہیں کرنے دو۔ سات قتل ڈال دیں تمہارے کھاتے میں۔ میں ابھی تمہارے سامنے بات کرتی ہوں گلو چاچا سے۔ کہاں ہیں لاشیں' کہاں ہے آلۂ قتل؟"

میں نے کہا "سب کے سامنے تو اسے گلو چاچا مت کہا کرو۔ وہ بہرحال ڈی ایس پی ہے۔"

"ہونہہ" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "اس میں ہمت ہوتی تو مجھے روک کے دکھاتا۔ ذرا مجھے بتاؤ' یہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں کل بتاؤں گا تفصیل سے۔"

"کیوں؟ آج کیوں نہیں۔ مجھے رپورٹ فائل کرنی ہوگی۔"

میں نے کہا "ابھی مجھے بھی کچھ معلوم کرنا ہے۔ ساری تفصیلات کے ساتھ۔ ایک ہی دھماکے سے گلو چاچا کی ایسی تیسی کردینا۔"

"اچھا۔ میں اب چلتی ہوں۔ مجھے اور لوگوں سے بھی ملنا ہے" وہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے کہا "شبنم۔ تم میرا ساتھ دوگی نا؟"

اس نے مسکرا کے سرہلایا "میں نئے شاہ عالم کا نیا روپ دیکھ کے فیصلہ کروں گی۔"

میرا خیال تھا کہ شبنم سے ملاقات کی خصوصی اجازت دینے والے مجھے اس کے رخصت ہوتے ہی واپس حوالات کی سلاخوں کے پیچھے تشریف لے جانے کے لیے کہیں گے اور میں اس کے لیے تیار بھی تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔

کچھ دیر بعد ایک اسمارٹ قسم کا نوجوان سب انسپکٹر نمودار ہوا "میرا نام فرید عباسی ہے" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اس وقت میں ڈیوٹی افسر ہوں۔"

"کیا مجھے کہنا چاہیے کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی؟"

اس نے ٹوپی اتاری اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر شبنم بیٹھی تھی "جی نہیں' میں جانتا ہوں کہ ہم سے مل کے کوئی خوش نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "تم کو کچھ پوچھنا ہے یا میں واپس حوالات میں جاؤں؟"

"جناب' فی الحال اسی کمرے کو سرکاری مہمان خانہ سمجھیں' کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھے بتادیں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے خلاف الزامات کی نوعیت کتنی سنگین ہے؟"

وہ مسکرانے لگا "کیا فرق پڑتا ہے اس سے آپ کو سر۔ مجھے تو مبارک باد دینی چاہیے آپ کو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کس بات پر؟"

"بڑی اچھی پبلسٹی پلان کی ہے آپ نے۔ میں تو قائل ہوگیا آپ کی ذہانت کا۔ دو مہینے سے آپ نے خبروں کی دنیا میں سنسنی پھیلا رکھی ہے۔ جو اخبار اٹھاؤ' اس میں تین کالم کی چار کالم کی سرخی آپ سے منسوب نظر آتی ہے۔ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟"

"تم ایک نہیں سو سوال کرسکتے ہو۔"

"کیا آپ اس لیے باہر گئے تھے اس بار' اپنی پبلسٹی COMPAIGN کے لیے کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی فرم سے معاہدہ کرنے؟"

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟" میں نے کہا۔

"آج کل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں اشتہاری کمپنیاں ہیں۔ جو صابن سے کار تک کسی بھی چیز کو عوام کی نظر میں سب سے بہتر ثابت کردیتی ہیں مگر ایسے ادارے امریکا اور یورپ میں ہی ہیں جو عوام کو' میرا مطلب ہے پاکستان' بھارت یا بنگلہ دیش جیسے ملکوں کے عوام کو یہ بتاتے ہیں کہ ان کے لیے سب سے بہتر وزیراعظم کون ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک فرم ہے ساچی اینڈ ساچی۔"

"کیا ہمارے عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں عباسی۔"

"بے وقوف بنائے تو جاسکتے ہیں سر۔ پچاس سال سے اور کیا ہو رہا ہے اس ملک میں اور صرف اپنے پاکستان کی بات نہیں۔ عوام کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکا نے بے وقوف بنانے کے فن میں بھی بڑی ترقی کی ہے۔ رائے عامہ کو بدلنا یا گمراہ کرنا' حق میں یا خلاف کرنا ایک سائنس بن گیا ہے۔ گوری چمڑی والے اس میں بھی بہت آگے ہیں" وہ بولا۔

اس کی بات نے مجھے اس لیے حیران کیا کہ وہ کوئی سیاسی دانشور نہیں' ایک معمولی سب انسپکٹر پولیس تھا۔ "بات تمہاری بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہیں مجھ پر یہ شک کیوں ہے کہ میں شہرت حاصل کرنے کے لیے کسی غیر ملکی فرم کے تعاون سے یہ ڈراما کررہا ہوں۔"

"بس مجھے ایسا لگتا ہے سر۔ یہ بڑا زبردست آئیڈیا تھا۔ سب اصلی اور نقلی شاہ عالم کے چکر میں پڑگئے ہیں۔ سیاست دانوں اور اخبار والوں کے ہاتھ ایک ایسا موضوع آگیا ہے جس پر جتنا کہا جائے یا لکھا جائے کم ہے۔ پہلے آپ کے ایک ڈپلی کیٹ کی ایجاد' پھر عمر دراز کا قتل اور آپ کا بیک وقت دو جگہ موجود ہونا۔ پھر آپ پر قاتلانہ حملے' دو بار پوسٹ مارٹم اور مختلف عدالتی فیصلے۔ آپ کی پُراسرار روپوشی اور ایک دھماکے سے عدالت عالیہ میں ڈرامائی اخری۔ اور اب دہرے قتل کے الزام میں گرفتاری۔ کل سے بیان بازی اور مظاہرے۔ ہنگامہ آرائی' بہت زبردست پلاٹ بنایا ہے اس ڈرامے کا' جس نے بھی بنایا ہے۔ باقی سب چلے گئے ہیں خود بخود پس منظر میں۔"

اس کی ذہانت نے مجھے بہت متاثر کیا "شاید اس زاویے سے صورت حال کا جائزہ کسی نے نہیں لیا ہوگا۔"

وہ مسکرایا "ایسا نہیں ہے سر۔ سمجھ دار سب سمجھتے ہیں۔ یہ وہی پرانی تھیوری ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ باہر سے جو مداری ہمارے ملک میں سیاسی تماشے کراتے ہیں ان کا یہی طریقہ ہے۔ ہمارے عوام سخت جذباتی ہیں۔ مظلوم کے لیے فوراً آنسو بہانے نکلتے ہیں اور میدان میں اتر آتے ہیں۔ کسی کے باپ کو موادیا' کسی کے شوہر کو تو کسی کے بھائی کو۔ اب لواحقین میں سے جو مظلوم بن کے عوام کے سامنے پہنچ جائے' وہ شہید کے خون کی قیمت ووٹ کی صورت میں لے سکتا ہے۔ اس پورے برصغیر میں ایسا ہی ہوا۔ مظلوم کو زیادہ مقبول کرنا ہو تو اسے حکومت کے شیر جیل میں ڈلوادیتے ہیں۔ جلاوطن کرادیتے ہیں۔ باقی کام کرتے ہیں کرائے کے صحافی اور سیاسی کارکن جو خوب واویلا کرتے ہیں کہ ہائے ہائے' شوہر چھین لیا' باپ چھین لیا' جھوٹے مقدمات اور جیل میں تشدد۔ کیسا ظلم ہے۔ گھربار چھوٹ گیا۔ وطن سے بے وطن ہوگیا۔ آفرین ہے کہ حق اور اصول کی بات پھر بھی نہیں چھوڑی۔ ڈرامے کے آخری سین میں مظلوم حلف اٹھاتا نظر آتا ہے لیکن یہ کھیل ختم نہیں ہوتا۔ مداری ایک اور بچہ جمہورا لے آتے ہیں اور نیا ڈراما شروع۔ لوگ ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔"

میں عباسی کو دیکھتا رہا "عباسی' مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس محکمے میں کیسے آگئے اور کیوں آگئے۔ ابھی تک نکالے کیوں نہیں گئے؟"

وہ ہنسنے لگا "میری گڈ بک بہت اچھی ہے۔ افسر بھی خوش ہیں مجھ سے اور میری کارکردگی کسی سے کم نہیں۔"

"یعنی ان کے سامنے تم انہی کی زبان بولنے لگتے ہو؟"

"کیا کریں جناب۔ ملازمت بھی سیاست کے بغیر نہیں چلتی۔"

"تمہارا مطلب ہے منافقت کے بغیر؟"

اس نے سرہلایا "ایک ہی بات ہے۔ جس سیاست سے آپ کا تعلق ہے وہ ایک الگ پیشہ ہے۔ ہم کہنے کو قانون کے محافظ ہیں مگر یہ نوکری نہیں سر' بدترین غلامی ہے۔ غلامی بھی کسی ایک کی نہیں' یہاں سب ہمارے آقا ہیں۔ نیچے سے اوپر تک جتنے محکمے کے افسر ہیں اس سے کہیں زیادہ باہر کے خصم ہیں جو سب حکم چلاتے ہیں ہم پر۔ سیاسی لیڈر اور ان کے خاص بندے۔ اسمبلی کے ممبر اور ان کے چمچے۔ اعلیٰ افسر کا بھی افسر اور عدالتی حکام۔ وزیر' مشیر۔ پیرزادے اور نواب زادے۔ اپنی اپنی مافیا چلانے والے۔ اور پھر ان سب کے خاندان والے۔ جس کی نہ مانو وہ ناراض ہوکے تڑی دیتا ہے۔ پریس اور پبلک کی دشمنی بونس میں۔"

میں نے کہا "فرید عباسی۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنا چاہتے ہو تم۔ کتنے ہوں گے اس ملک میں ایسے لوگ جن سے تم ڈرتے ہو۔ ایک دو فیصد' باقی اٹھانوے فیصد کے ساتھ تم کیا کرتے ہو؟ یہ کون نہیں جانتا۔ دورِ جہالت میں غلاموں کے ساتھ بھی ایسا انسانیت سوز سلوک نہیں ہوتا تھا جو تم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آزاد شہری کہلانے والوں کے ساتھ کرتے ہو۔ کسی جرم کے بغیر بھی تم جسے چاہو گھر سے اٹھاسکتے ہو۔ سات سال کے بچے سے کیچنگ ریپ کا اعتراف کرالیتے ہو اور ستر سال کے قریبِ مرگ بوڑھے سے مسلح ڈکیتی کی دلیرانہ واردات کا۔ ان کے پورے خاندان کو برباد کرسکتے ہو اور ان کی عزت کو سربازار تماشا بناسکتے ہو۔ تفتیش کے نام پر تشدد کرکے جسے چاہو ہلاک کردو۔ کون پوچھ سکتا ہے تم سے۔ فرعونیت کی انہی روایات کی وجہ سے یہ ملک بدترین پولیس اسٹیٹ بن گیا ہے۔ جس پر لیبل آج بھی وہی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان جہاں کہنے کو قانون بھی ہے اور آئین کی حکمرانی بھی ہے' عدالتی نظام بھی ہے۔"

وہ زیرِلب مسکراتا رہا "یہ سب مسلسل کہا جارہا ہے سیاسی بیانوں میں۔ نام نہاد حقوقِ انسانی کی محافظ تنظیم اور سوشل ورکر۔ صحافی اور دانشور۔ سب کا پسندیدہ موضوع یہی ہے۔ بیان بازی کے ماہرین لگتے ہیں ماشاء اللہ اس قوم کے سب افراد۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا سب غلط کہتے ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔
"جھوٹ ہے سب۔۔۔؟"
"برا نہ مانیں تو ایک سوال میں بھی پوچھ لوں؟" وہ طنز سے بولا "کیا فرعونیت کی ساری روایات کی زندہ دار صرف پولیس ہے۔ اس ملک کو پولیس اسٹیٹ بنانے والا کون ہے؟ اس کا سارا کریڈٹ جاتا ہے ہمارے حکمرانوں کے سر۔ اور حکومت کس نے کی ہے اس ملک پر۔ آج بھی کون حاکم ہے۔ وہی انگریز کی نمائندہ بیوروکریسی۔ انگریز سے وفاداری کے انعام میں جاگیر پانے والے وڈیرے' موروثی سیاست کرنے والے۔"
میں نے کہا "میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔ اس ملک میں قانون کی عملداری اور اسلامی نظام کے نفاذ کی صرف بات ہوتی ہے۔ عملاً ہر شخص جس کے پاس اختیار ہے اور طاقت ہے' قانون کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔"
"اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے شاہ صاحب کہ ابھی آپ جو بات کہہ رہے ہو' بعد میں بڑی آسانی سے بھول جاؤ گے۔ جو آج آپ کے ساتھ ہو رہا ہے وہ آپ کو غلط لگتا ہے۔ آپ مانتے بھی ہو کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے مگر کل جب آپ خود کرسی پر بیٹھ جاؤ گے تو اسی نظام کی خرابی سے پورا فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس کی اصلاح نہیں کرو گے۔ آپ بھی اپنے سیاسی مخالفین کا حشر نشر کرنے کے لیے ہمیں ہی استعمال کرو گے۔"
میں نے خفت سے کہا "نہیں' اول تو میرا اقتدار میں آنا ہی بعید از قیاس ہے۔ ننگے مجھے اپنے حمام میں گھسنے ہی کب دیں گے۔ پھر بھی بالفرض محال ایسا موقع ملا مجھے تو۔۔۔"
"تو آپ یہ سب نہیں کرو گے۔ انقلاب لے آؤ گے۔ ملک اور قوم کی حالت بدل دو گے۔ اس ملک کو اسلام کا گہوارا اور جنت کا نمونہ بنا دو گے۔" وہ تلخی سے بولا۔
"بہت نفرت کا زہر بھرا ہوا ہے تمہارے وجود میں۔"
"کیا یہ میرا قصور ہے سر! میری ساری نسل کا یہی المیہ ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا اور ٹی وی پر قومی ترانے اور ملی نغمے اور خبرنامے کے جھوٹ کے سوا نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ بڑے اچھے بول ہوتے ہیں۔ بڑی خوب صورت دھن ہوتی ہے۔ گانے والے بھی خوب صورت ہوتے ہیں اور ان کے لباس بھی۔ تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے' تجھ پہ دل قربان تجھ پہ جان بھی قربان ہے مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ غاصب' منافق اور ڈاکو اس ملک کو ایسے کھا رہے ہیں جیسے مردار خور گدھ' اوارث جانور کی لاش کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ الزام دیتے ہیں صرف پولیس کو۔۔۔" اس نے ٹوپی سر پر رکھی اور باہر نکل گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk